سلسلہ مواعظِ اشرفیہ نمبر ۸

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

حقیقتِ مال وجاہ

از افاضات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح

مرتبہ

منشی عبد الرحمن خاں

شائع کردہ

مکتبہ اشرف المعارف، چہلیک

ملتان شہر ——— فون نمبر ۳۶۷۵

تعداد ۱۱۰۰

قیمت ۱۴ر۷ روپے

اشاعتِ اوّل اگست سنہ ۱۹۶۲ء

ناشر

مکتبہ اشرف المعارف۔ چہلیک۔ ملتان شہر

طابع

ویسٹ پنجاب پرنٹنگ پریس۔ اُردو بازار

لاہور

إِنَّمَآ أَمْوَالُكُمْ وَ
أَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ

تمہارے اموال اور اولادیں
تمہاری آزمائش کے لئے ہیں۔

ترتیب

تفصیل

المال والجاه

مال وجاہ کی نسبت یہ وعظ ۱۱ ؍صفر المظفر ۱۳۳۱ھ کو باغیچہ مکان عبدالباقی خاں صاحب الہ آباد میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔ جو تین گھنٹہ بیس منٹ میں ختم ہوا۔ مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ صلے اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔ هُمُ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ حَتّٰی یَنْفَضُّوْا وَ لِلّٰہِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰکِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَفْقَهُوْنَ۔ یَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَی الْمَدِیْنَةِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ وَلِلّٰہِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰکِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ٥

ترجمہ

یعنی یہ منافقین وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ
رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جو
لوگ جمع ہیں اُن پر کچھ خرچ مت کرو یہاں
تک کہ یہ آپ منتشر ہو جائیں گے۔ خدا تعالےٰ
ہی کے ہیں سب خزانے آسمانوں کے
اور زمینوں کے لیکن منافقین سمجھتے نہیں
ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ میں لوٹ
کر جائیں گے تو عزّت والا وہاں سے ذلت
والے کو باہر نکال دے گا۔ اللہ ہی کی
ہے عزّت اور اُس کے رسول صلی اللہ
علیہ وسلم کی اور مسلمانوں کی لیکن منافقین
جانتے نہیں ———!

فہم قرآن

حضرات! یہ آیتیں ہیں سورۂ منافقون کی۔ اس میں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے بعض اقوال منافقین کے بیان فرمائے ہیں اور یہ فرقۂ منافقین کا یعنی ان کا حکم اس وقت باقی نہیں رہا اور اس وقت تو کیا، خود حضورؐ کے زمانہ کے بعد ہی یہ نفاق جو اصطلاح شرعی میں ہے رفع ہو گیا تھا۔ مگر نفاق بمعنی عدم اتفاق یا بمعنی مطلق ظاہر کا خلاف باطن ہونا موجود ہے مگر اس محاورہ کو چھوڑ دینا چاہیے۔ کیونکہ اس وقت قرآن مجید کے ترجمے چھپ گئے ہیں۔ اور لوگ دیکھتے ہیں اور اس میں کامیابی ہونا مشکل ہے کہ لوگ ترجمہ دیکھنا چھوڑ دیں۔ اور اس وقت بھی اس مضمون سے کہ ترجمہ نہ دیکھیں، شاید وحشت ہوتی ہو۔

مگر بات یہ ہے کہ ان امور میں تجربہ کو زیادہ دخل ہے اور تجربہ ان امور کا اہل علم کو زیادہ ہے۔ تو میں چونکہ ان واقعات کو شب و روز دیکھتا ہوں

اس لئے میں بارہا کہہ چکا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں کہ ترجمہ اگر دیکھنے کو جی چاہے تو اس کی صورت صرف یہ ہونا چاہیئے کہ کسی عالم سے اس کو حاصل کیا جائے۔ چنانچہ ہر فن کے ساتھ ایسا ہی عمل کیا جاتا ہے۔ تو علم تفسیر بھی بغیر کسی عالم سے حاصل کئے نہیں آسکتا۔ تو غرض یہ ہے کہ اگر اوّل ترجمہ کسی عالم سے پڑھ لے اور پھر دوسری تفاسیر دیکھے تو غلطیوں سے بچ سکتا ہے اور اگر اوّل ہی سے ترجمہ دیکھے گا اور کسی عالم سے نہ پڑھے گا۔ تو اس کو مواقع مشتبہ کی تعیین ہی میں سخت دقت ہوگی۔ کیونکہ مبادی (شروع کی باتیں جن پر آگے علوم کا جاننا موقوف ہو) اور اصول (قواعد) کا اس کو علم نہیں اور اگر ہوگا، تو بے موقع ہوگا۔

اسی لئے اگر ترجمہ پڑھے بھی تو کسی متبحر عالم سے پڑھے۔ صرف عربی جاننے والے سے پڑھنا بھی کافی نہیں اور متبحر عالم سے بھی سبقاً سبقاً پڑھے۔ پھر اُن ہی سے پوچھے کہ میرا فہم قرآن شریف کے مضامین کا متحمل ہے یا نہیں اگر وہ متحمل تبلادیں تو خیر ورنہ چند روز کے لئے چھوڑ دیا جاوے اور پھر علماء سے مبادی اور اصول کو حاصل کرے اور پھر اس کے بعد ترجمہ پڑھے۔ تو قرآن مجید کا ترجمہ دیکھنے کے متعلق یہ تفصیل ہے۔ تو اگر دیکھا جاوے، تو اس طرح دیکھیں۔

لیکن ممکن ہے کہ اس پر کوئی عمل نہ کرے اور ایسا شخص اس میں منافق وغیرہ کا لفظ دیکھے جن میں لوگوں کی اصطلاحات بدل گئی ہیں تو اصطلاح بدلنے میں یہ خرابی ہوگی کہ جب آپ قرآن مجید میں دیکھیں گے کہ منافقین جہنم کے نیچے

کے وجہ میں ہیں اور منافقین کے معنی آپ سمجھیں گے نااتفاقی کرنے والے تو آپ ان گنہگاروں کے لئے یہ حکم دیں گے جو کہ محض غلط ہے۔

اس پر مجھے ایک قصہ یاد آیا کہ دیوبند میں ایک معقولی طالب علم آئے میں حجرہ میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ پوچھنے لگے کیا لکھتے ہو۔ میں نے کہا کہ تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں۔ تو تصور شیخ کا لفظ سن کر کیا کہتے ہیں کہ شیخ بوعلی سینا کا۔ انہوں نے عمر بھر سوائے بوعلی سینا کے اور کسی شیخ کا نام ہی نہیں سنا تھا تو جہاں کہیں شیخ کا ذکر آوے گا، وہ تو یہی سمجھیں گے کہ بوعلی سینا مراد ہیں۔ تو جو اصطلاح ذہن میں جمی ہوئی ہوتی ہے۔ ان الفاظ کو ہر جگہ اسی پر محمول کیا جاتا ہے۔

حکماء امت

اسی طرح ایسا ترجمہ دیکھنے والا شخص کرے گا۔ اور آج کل بڑی گڑبڑ کی وجہ یہی ہے کہ لوگ خود ترجمہ دیکھتے ہیں۔ اور شرعی اصطلاحات اور اصول سے واقف نہیں ہوتے اس لئے لڑتے ہیں اور اول خود لڑتے ہیں پھر علماء کو بھی شریک کرلیتے ہیں کہ ان سے اپنے مقابل کے لئے فتوے لیتے ہیں۔ اگر علماء ان کے [illegible] سے متنبہ ہو کر ان کی اصلاح کرتے ہیں تو یہ لوگ ان کو کہتے ہیں کہ [illegible] بداخلاق ہیں۔ حالانکہ خوش اخلاقی کی بدولت ہی یہ فتنے پیدا ہوتے ہیں۔

مثلاً کسی نے استفتاء کیا کہ ایک شخص نے ایسا کہا تو اس کا ایمان گیا یا رہا۔ جیسا کل ہی ایک شخص کا خط آیا ہے کہ زید نے فقہ کی فلانی کتاب کو برا کہا تو زید کا ایمان رہا یا گیا۔ تو اگر میں اس خوش اخلاقی کو کام میں لاؤں جس کو وہ

خوش اخلاقی سمجھتے ہیں کہ بدون اس کے کہ اُن کے سوال میں جرح قدح کروں کہ اُن کی مرضی کے موافق لکھ دوں جیسا ظاہری عنوان سوال کا مقتضا ہے۔ تو وہ دوسرے کو دکھلا دے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دیکھنے والے کہیں گے کہ اس کو فلاں شخص نے کافر کہہ دیا۔ بس یہ کافر ہے۔ پھر اُس قائل کو خبر ہوگی۔ تو بات بڑھے گی تو خوش اخلاقی سے یہ فتنے برپا ہوئے اور عام طور پر یہی فتنے مولویوں میں پھیل رہے ہیں۔

ہمارے مولانا فرمایا کرتے تھے کہ مولوی لوگ بھی بادشاہوں سے کم نہیں جیسے اُن کے یہاں پلٹن اور رسالے ہوتے ہیں، اسی طرح ان کے یہاں کتابیں اور رسالے ہیں۔

غرض عوام الناس ترجمے اور کتابیں دیکھ دیکھ کر مولویوں تک میں یہ فتنے پھیلا دیتے ہیں۔ اس لئے محققین ان کو ایسے مطالعہ سے روکتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ بعض بات ظاہر میں تو معمولی سی ہوتی ہے مگر فساد کی جڑ ہوتی ہے۔ حکماء اُمت کو حق تعالیٰ نے ادراک ایسا عنایت فرمایا ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات کو سمجھ لیتے ہیں کہ نتیجہ اس کا یہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ جو اوروں کو آئینہ میں نظر آتا ہے اہل نظر کو اینٹ میں نظر آتا ہے۔ سو ایسے مصلحین کو آج کل متعصب کہا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات یہ لوگ ایسی چیز کو جو بظاہر عبادت ہے روک دیتے ہیں تو ان کو خشک بتلایا جاتا ہے اور چاہا جاتا ہے کہ ایسے تر ہو جاویں کہ ڈوب ہی جاویں۔

خیال تو فرمائیے خود حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم نے بعضے ایسے امور کو

روک دیا ہے جو کہ حضورؐ کے زمانے میں ہوتے تھے۔ مثلاً عورتوں کا مسجد میں آنا کہ نصاً ثابت ہے اور صحابہ اُس کو روکتے ہیں۔ تو بظاہر یہ نص سے معارضہ ہے مگر حکمائے اُمت نے اچھی طرح اس کا راز سمجھ کر اتفاق کر لیا۔ کسی نے سختی کے ساتھ اور کسی نے ذرا نرمی کے ساتھ۔

چنانچہ ہمارے امام صاحبؒ نے اس باب میں نہایت سختی فرمائی ہے کہ عجوز (بڑھیا) کو بھی مسجد میں آنے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ فرماتے ہیں۔

لکل ساقطۃ لاقطۃ ہر گری پڑی چیز کا اٹھانے والا موجود ہے یعنی ہر عورت کی طرف کوئی نہ کوئی میلان کرنے والا موجود ہے۔

اور دوسرے علماء نے بھی اگرچہ کسی قدر نرمی کی ہو مگر اولیٰ اسی کو سمجھا ہے لیکن کسی نے اس انکار کو رد نہیں کیا۔

غرض علماء بوجہ اپنے تجربہ اور انجام بینی کے بعض ایسے امور کو روک دیتے ہیں جو بظاہر عبادت ہے لیکن چونکہ وہ مفضی الی المعاصی (گناہوں کی طرف پہنچانیوالا) ہوتے ہیں اس لئے علماء روک دیتے ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اس باب میں ہر شخص کی رائے قابل اعتبار نہیں ہوا کرتی۔

مثلاً اگر پارلیمنٹ کے ممبر ایک رائے تجویز کریں اور ایک دیہاتی یہ کہے کہ میری رائے اس کے خلاف ہے تو دیکھئے کیا گت بنتی ہے۔ اور معتبر وہی ہوگا جو ممبروں کی رائے ہے۔

اسی طرح دنیاوی معاملات میں وکیل کے سامنے کوئی نہیں بولتا۔ اور اسی

رائے کا اعتبار کرتا ہے جو وکیل کی رائے ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر اپنی سمجھ میں وکیل کی رائے نہ بھی آوے جب بھی اسی کی رائے پر اعتبار کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم چونکہ قانون سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں اس وجہ سے ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

مگر عجیب بات ہے کہ دین میں ہر شخص اپنے کو ماہر سمجھتا ہے اور اپنی رائے کو دخل دیتا ہے۔ اور دین میں یہ خیال نہیں ہوتا کہ چونکہ ہم اُس کے اصول اور مبادی سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں اس لئے ہماری رائے قابل اعتبار نہیں ہے اور علماء کی رائے میں دخل دینا مناسب نہیں۔ غرض ہر شخص کی رائے قابل اعتبار نہیں ہوتی جیسا اب نرا ترجمہ دیکھ کر اپنے کو اہل الرائے سمجھنے لگتے ہیں۔

ایک صاحب نے ترجمہ یاد کیا تھا اور ایک عالم کے پوچھنے پر نضاختان کے معنی بہت جوش مارنے والے بتلائے۔ خیر یہاں تک تو خیریت تھی۔ آگے اُن عالم نے پوچھا، بہت کا ہے کے معنی اور جوش مارنے والے کا ہے کے معنی۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ نضا کے معنی بہت اور ختان کے معنی جوش مارنے والے۔

تو کیا ایسوں کی بھی رائے معتبر ہوگی۔ البتہ جو لوگ مبادی اور اصول کے ماہر اور علوم عربیہ سے اچھی طرح واقف اور متبحر عالم ہوں اُن کی رائے معتبر ہوگی۔ اور دوسروں کو ایسے لوگوں کی تقلید ضروری ہوگی نہ کہ اُن کے فتووں پر قیل وقال اور جواب وسوال۔ اور مصلحین کو بھی چاہئے کہ ایسوں کے سوالات کے جوابات ضابطہ سے دیا کریں۔ عرفی خوش خلقی کو کام میں نہ لایا کریں۔

عرض علماء اور حکماء اُمت کو چونکہ حق تعالیٰ نے نتائج تک پہنچنے کا ادراک عطا فرمایا ہے۔ اُن کی نظر نتیجہ پر ہوتی ہے اور اس لئے وہ بعض ایسی چیزوں کو بھی روک دیتے ہیں جو بظاہر مستحسن ہوں اور اسی طرح سے ترجمہ قرآن مجید میں بھی گو بظاہر کوئی خرابی نہیں لیکن نتیجہ اُس کا یہ ہے کہ بغیر مبادی اور اصول کی واقفیت کے جب تک اُستاد سے نہ پڑھا جائے گا اُس وقت تک یہ اندیشہ ہے کہ شاید غلطی ہو جائے جیسے معنی نفاق میں عرض کیا گیا۔

منافقین کی حالت

اب میں پھر اپنے اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں تو کافر ہو اور خاص موقعوں پر اُس کفر کو ظاہر بھی کر دے اور ظاہر میں مسلمان ہو تو اُس وقت ایسے لوگ بھی تھے۔ اور گو حضورؐ کو علم ہو گیا تھا اُن کے منافق ہونے کا مگر حکم یہ تھا کہ جو اپنے کو مومن کہے اُس کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ کیجئے کہ اس میں مصلحت تھی۔ اور اس وقت چونکہ کوئی مصلحت نہیں۔ لہٰذا اگر دلیل سے کفر ثابت ہو جاوے گا اُس کے ساتھ کفار کا معاملہ کریں گے۔

خیر یہ تو لفظ نفاق کے متعلق کسی قدر بیان ہو گیا۔ اصل مقصود یہ ہے کہ اس مقام پر حق تعالیٰ نے منافقین کے مقولہ کو بیان فرما کر اُن کا رد کیا ہے۔ اوّل میں ترجمہ عرض کرتا ہوں:۔

وہ منافقین وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اُن لوگوں پر خرچ مت کرو جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ہیں تاکہ وہ منتشر ہو جاویں اور اللہ ہی کے لئے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے

ولیکن منافقین نہیں سمجھتے (اور) یوں کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ میں لوٹ کر گئے تو ہم میں جو عزت والا ہے (یعنی ہم) وہ ذلت والے کو (یعنی صحابہ کو) نکال دے گا۔ اور اللہ ہی کے لئے ہے عزت اور اُس کے رسولؐ کے لئے اور اہل ایمان کے لئے ولیکن منافقین نہیں جانتے۔

قصہ یوں ہوا تھا کہ ایک غزوہ میں حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مہاجرین اور انصار وغیرہ سب تھے۔ اور غزوہ (جہاد) اور لڑائیوں میں منافقین بھی اکثر ساتھ جایا کرتے تھے اور اُن کی غرض کبھی تو یہ ہوتی تھی کہ مسلمانوں کے اسرار بھید معلوم کر کے کفار کو اطلاع دیں جیسے جاسوس کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ

وفیکم سمٰعون لھم۔ یعنی تم میں اُن کے کچھ جاسوس موجود ہیں۔

قرآن مجید میں موجود ہے۔ اور کبھی غنیمت میں حصہ لینے کو جاتے تھے کیونکہ ظاہری اسلام کے سبب مال غنیمت میں اُن کو بھی حصہ ملتا تھا۔ اور حکمت اس کی یہ کہ لڑائی لڑنے والے اپنی کمک کی قوت پر لڑا کرتے ہیں۔ تو چونکہ یہ لوگ ظاہر میں بطور کمک کے جاتے تھے اُن کو بھی مال غنیمت میں حصہ ملتا تھا اور اُن سے معاملہ مسلمانوں کا سا کیا جاتا تھا؟ اور وہ جانتے بھی تھے کہ مسلمان ہم سے یہ برتاؤ کریں گے۔ اور بعض مرتبہ دونوں طرف سے لیتے تھے کہ کفار سے جا کر کہتے تھے کہ ہم نے تمہارے بھلے کی یہ رائے دی تھی۔ تو غرض یہ ہے کہ منافقین بھی جایا کرتے تھے۔ تو اس غزوہ میں بھی یہ لوگ شریک تھے اور

جہاں مختلف طبائع کے لوگ ہوتے ہیں وہاں اختلاف ہو ہی جاتا ہے۔ بلکہ اچھوں میں بھی ہو جاتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اچھوں کو اس پر اصرار نہیں ہوتا۔

صل علی النبی کا اثر

تو اتفاق سے دو شخصوں میں کچھ گفتگو بڑھ گئی۔ ایک مہاجر تھے اور ایک انصاری۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ ایک گندی بات ہے۔ تو وہ جوش اُن لوگوں کا فوراً کم ہو گیا۔

اور تعجب نہ ہو کہ اتنی سی بات میں کیوں کر جوش کم ہو گیا۔ تو اس کا نمونہ اب بھی موجود ہے کہ عرب سب سے زیادہ سخت مشہور ہیں۔ بالخصوص بدوی کہ اُن میں محسوسات کا بھی علم نہیں۔

چنانچہ ایک شخص کہتے تھے کہ کسی قافلہ کی لوٹ میں بدوؤں کو ایک گھڑی ملی۔ اُس کی آواز سُن کر کھٹی ہوئی کہ اس میں کیا ہے۔ اخیر تشخیص یہ تھی کہ اس میں جن ہے۔ پھر اس کو توڑا تو وہ بند ہو گئی۔ تو کہتے ہیں کہ

نحن قتلنا الجنی۔ یعنی ہم نے جن کو مار ڈالا۔

تو ایسی قوم بہت ہی خطرناک ہو گی۔ اور اُن کو دین کی بھی اطلاع نہیں بعض ایسے ہیں کہ کنواں موجود ہے اور تیمم کر کے نماز پڑھ لی۔ بعضے نماز ہی نہیں پڑھتے۔ غرض اُن میں نہایت ہی جہل ہے۔ غصہ میں فوراً تلوار نکل آتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے یہ حالت ہے کہ کیسے ہی جوش میں ہوں اور ایک ادنیٰ سا آدمی بیچ میں جا کر کہہ دے کہ

یا شیخ صل علی النبی یعنی اے شیخ! رسول اللہ صلی

ایک مرتبہ میرے پاس ایک عہدہ دار کا خط آیا کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے۔ میں نے لکھا کہ کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے اور خلاصہ اُن کے اس سوال کا علت کا سمجھنا تھا۔ تو سمجھ لیجئے کہ علت کا سمجھنا خواص کا کام ہے۔ تو اُن عہدہ دار صاحب نے علت پوچھی تھی۔ تو اگر میں خوش خلقی کو کام میں لاتا اور کچھ لکھ دیتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ ع

مغز ما خورد و حلق خود بدرید

ہمارا مغز کھایا اور اپنا حلق پھاڑا۔ یعنی ہمارا دماغ بھی خالی کیا اور خود کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔

تو میں نے یہ لکھ دیا کہ زنا کیوں حرام ہے۔ وہ بہت خفا ہوئے اور مجھ کو لکھا کہ علماء کو ایسا خشک اخلاق نہ ہونا چاہیے۔ میں نے اُس کو ردی میں ڈال دیا اس کے بعد اتفاق سے وہ مجھے ایک سفر میں ملے اور زبانی گفتگو سے سمجھ گئے اور پھر کبھی کوئی بات فضول نہیں پوچھی۔

اس پر میں عرض کرتا ہوں کہ اگر اوّل ہی سے جواب میں ضابطہ کا برتاؤ کیا جائے تو سائلین کی جرأت کی یہاں تک نوبت کیوں آئے۔

اسی طرح ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ افریقہ دارالحرب ہے یا دارالاسلام اب اگر میں ان کے ساتھ خوش خلقی کرتا تو چار گھنٹہ تک مغز مارتا۔ اس لئے میں نے اُن سے کہا کہ اوّل یہ بتلاؤ کہ اگر دارالاسلام ہونا معلوم ہو جائے، تو کیا کرو گے اور اسی طرح دارالحرب ہونا بھی۔ بس چپ ہو گئے۔ تو ایسی باتوں کو اس طرح روکنا چاہیے۔

غرض علماء اور حکماء اُمّت کو چونکہ حق تعالیٰ نے نتائج تک پہنچنے کا ادراک عطا فرمایا ہے۔ اُن کی نظر نتیجہ پر ہوتی ہے اور اس لئے وہ بعضی ایسی چیزوں کو بھی روک دیتے ہیں جو بظاہر مستحسن ہوں اور اسی طرح سے ترجمہ قرآن مجید میں بھی گو بظاہر کوئی خرابی نہیں لیکن نتیجہ اُس کا یہ ہے کہ بغیر مبادی اور اصول کی واقفیت کے جب تک اُستاد سے نہ پڑھا جائے گا اُس وقت تک یہ اندیشہ ہے کہ شاید غلطی ہو جائے جیسے معنی نفاق میں عرض کیا گیا۔

منافقین کی حالت

اب میں پھر اپنے اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں تو کافر ہو اور خاص موقعوں پر اُس کفر کو ظاہر بھی کر دے اور ظاہر میں مسلمان ہو تو اُس وقت ایسے لوگ بھی تھے۔ اور گو حضورؐ کو علم ہو گیا تھا اُن کے منافق ہونے کا مگر حکم یہ تھا کہ جو اپنے کو مومن کہے اُس کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ کیجئے کہ اس میں مصلحت تھی۔ اور اس وقت چونکہ کوئی مصلحت نہیں۔ لہٰذا اگر دلیل سے کفر ثابت ہو جاوے گا، اُس کے ساتھ کفار کا معاملہ کریں گے۔

خیر یہ تو لفظ نفاق کے متعلق کسی قدر بیان ہو گیا۔ اصل مقصود یہ ہے کہ اس مقام پر حق تعالیٰ نے منافقین کے مقولہ کو بیان فرما کر اُن کا رد کیا ہے۔ اوّل میں ترجمہ عرض کرتا ہوں:۔

> وہ منافقین وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اُن لوگوں پر خرچ مت کرو جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ہیں تاکہ وہ منتشر ہو جاویں اور اللہ ہی کے لئے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے

اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو۔

فوراً تلوار کو نیام میں کر لیتے ہیں اور اللھم صل علی سیدنا ——— الخ پڑھنے لگتے ہیں۔

تو اب بھی ایک داعی (دین کی طرف بلانے والے) کے سبب جوش فرو ہو جانے کا ایک نمونہ موجود ہے اور یہ نمونہ میں نے اس لیے بیان کیا کہ آج کل ہر واقعہ کو نظیر ہی سے مانا جاتا ہے۔

چنانچہ رام پور میں معراج کے متعلق ایک صاحب نے یہی سوال کیا کہ اس کی کوئی نظیر بھی ہے۔ حالانکہ اگر نظیر بھی نہ ہو لیکن نقل صحیح ہو اور عقل کے خلاف نہ ہو تو بس مان لو مگر پھر بھی انکار ہوتا ہے۔ جیسا کہ محدثین کے حافظہ کا انکار ہے کہ دو دو لاکھ حدیث کیسے یاد ہوئی۔ کہتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور ایک مقدمہ کا ضمنی دعویٰ ہے کہ جو سمجھ میں نہ آوے وہ غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر سمجھ سے کسی خاص آدمی کی سمجھ مراد لی جائے تو کبریٰ اس قیاس کا غلط ہے کیونکہ کسی خاص کی سمجھ میں نہ آنے سے کوئی بات غلط نہیں ہو جاوے گی اور جو عام مراد ہو تو صغریٰ غلط ہے۔ کیونکہ یہ تو ٹھیک ہے کہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن تمہاری سمجھ میں نہ آنے سے یہ کہاں لازم آیا کہ کسی کی سمجھ میں نہ آوے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک بخیل شہد سے روٹی کھا رہا تھا اس کے ایک دوست آگئے۔ تو بخیل نے یہ خیال کیا کہ یہ بھی کھانے میں شریک ہو جائے گا۔ کوئی ایسی صورت کرنی چاہیے کہ یہ نہ کھاوے۔ تو روٹی چھپا دی اور شہد اس خیال سے پیش کر دیا کہ خالی شہد کیا کھاوے گا۔ مگر وہ لگا چاٹنے تو

بخیل کہتا ہے کہ

یا اخی انہ یحرق القلب یعنی بھائی! یہ قلب کو جلا دیتا ہے

بخیل کے دوست نے یہ سُنا اور ہنس کر کہتا ہے کہ

نعم ولکن قلبک ہاں یہ سچ ہے مگر آپ کے دل کو

تو جیسے بخیل کا یہ کہنا تو سچ ہے لیکن کس کا قلب۔ اسی طرح یہ تو ٹھیک ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا لیکن کس کی سمجھ میں۔ ہماری تو سمجھ میں آتا ہے گو نمونہ بھی نہ دیکھا جاتا مگر حق تعالیٰ نے اس زمانہ میں ایک نمونہ اس کا بھی ظاہر فرما دیا۔

میں نے متعدد معتبر آدمیوں سے حافظ رحمت اللہ صاحب الہ آبادی کے حافظہ کے واقعات سُنے ہیں۔ قاضی وصی الدین صاحب کانپور میں قرق امین تھے اور نہایت ثقہ (معتمد) اور معتبر آدمی تھے۔ گو جنید بغدادیؒ نہ ہوں لیکن تاہم ایک ثقہ اور معزز آدمی تھے اور جو لوگ معزز ہوتے ہیں وہ عادۃً جھوٹ نہیں بولتے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک مرتبہ حافظ صاحب کانپور میں آگئے۔ میں نے درخواست کی کہ آپ کا حافظہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ فرمایا کوئی کتاب لا کر میرے سامنے طویل عبارت پڑھ دو۔ وہ کہتے ہیں کہ میں کتب خانہ میں سے افق المبین نکال لایا۔ جو بہت باریک لکھی ہوئی تھی اور بڑی تقطیع پر تھی۔ اور اس کے دو صفحے اُن کے سامنے پڑھے۔ اُنہوں نے بعینہٖ تمام عبارت سنا دی۔

اور بھی بعض علماء کی اس قسم کی حکایت سُنی گئی ہے۔ تو حق تعالیٰ کو سب قدرت ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ گو تمہاری سمجھ میں نہ آوے اسی طرح حق تعالیٰ نے صحابہؓ کے اخلاق کا نمونہ تھوڑا سا اب بھی باقی رکھا ہے

کہ ایسے جاہل عرب بدوی جن میں علم بھی نہیں اور ایسے سخت اور جوشیلے کہ ذرا سی بات میں معمولی غصہ میں تلوار نکال لیتا اور آپس میں کشت وخون کر ڈالنا اُن کے نزدیک ایک معمولی سی بات ہے۔ مگر باوجود اس کے چاہے کیسے ہی غصہ میں بھرے ہوں جس وقت صل علی النبی دنبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ بھیجی سُنیں فوراً غصہ کم ہو جاتا ہے۔ اور اللہم صل علی سیدنا ــــ الخ پڑھنے لگتے ہیں۔ تو اب تعجب نہ ہوگا کہ دو صحابی جو آپس میں بگڑ رہے تھے حضورؐ کے منع کرنے سے اُن کا غصہ فوراً کم ہو گیا۔

سماع قرآن کا اثر

ہاں تو قصہ یوں ہے کہ وہاں ایک رئیس تھا عبداللہ ابن اُبی منافق اُس کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے سخت حسد تھا اور وجہ حسد کی یہ تھی کہ حضورؐ کی تشریف آوری سے قبل لوگوں کا قصد تھا کہ اُس کو سردار بنا دیں مگر جب حضورؐ تشریف لائے تو گو آپ کو سرداری کی تمنا نہ تھی مگر منجانب اللہ آپ ہی کو سرداری ملی۔ یہ سچ ہے ؎

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقارا

یعنی اگر شہرت کی خواہش ہے تو گوشہ نشینی اختیار کرو۔ اس لئے کہ گوشہ گیری ہی سے عنقا کی شہرت ہے۔

اور عادۃ اللہ اسی طرح جاری ہے کہ من تواضع للہ رفعہ اللہ یعنی جو شخص اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کے مراتب بلند فرما دیتے ہیں، حتیٰ کہ مکہ میں ایک مرتبہ کفار نے باہم مشورہ کر کے ایک شخص کو پیام دے

کر بھیجا اور یہ درخواست کی تھی کہ آپ ہمارے بتوں کو بُرا نہ کہئے۔ تو آپ جو کچھ کہئے اُس کے لئے ہم موجود ہیں۔ اگر آپؐ کو عورتوں کی تمنا ہو تو جن عورتوں کو آپ پسند فرمایئں ہم دینے کے لئے تیار ہیں اور اگر آپ کو مال کی خواہش ہو تو جس قدر چاہیں ہم سے مال لے لیں۔ اور اگر آپ سرداری چاہیں تو ہم آپ کو سردار بنانے کے لئے موجود ہیں۔ اور اس رائے میں تمام بڑے بڑے کفار ابو جہل وغیرہ بھی شریک تھے۔

تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کفار کی اس درخواست کو نہایت تحمل سے سنتے رہے گو حضورؐ کو سخت ناگوار ہوا۔ اس سے حضورؐ کی کمال خوش اخلاقی بھی ثابت ہوتی ہے۔ آج ذرا سی بات خلاف مزاج ہو تو تحمل نہیں ہو سکتا جب کفار کہہ چکے تو حضورؐ نے بسم اللہ پڑھ کر یہ آیتیں شروع کیں۔

حٰمٓ تنزیل من الرحمٰن الرحیم کتاب فصّلت آیاته قرآنا عربیا لقوم یعلمون ——— الخ

حٰم، یہ کلام رحمٰن رحیم کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی زبان میں ہے۔ ایسے لوگوں کے واسطے مفید ہے جو دانشمند ہیں۔

جب اس آیت پر حضورؐ پہنچے۔

فان اعرضوا فقل انذرتکم صٰعقة مثل صٰعقة عاد وثمود

یعنی پھر اگر یہ لوگ اعراض کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو ایسی

آفت سے بچاتا ہوں جیسی عاد اور ثمود پر آفت آئی تھی۔

تو وہ شخص گھبرا گیا اور کہا بس کیجئے۔ اور وہاں سے بھاگا۔ اور اُس کمیٹی میں پہنچا تو ابوجہل اتنا عاقل تھا کہ اُس شخص کو دُور سے دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ گیا تھا اور چہرہ سے اور آرہا ہے اور چہرہ سے۔ اس کا تو خیال بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اُس نے آکر بیان کیا کہ بھائیو، قرآن سُن کر میری تو حالت بدلنے لگی۔ بخصوص اس آیت پر تو مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ایک بجلی گری اور میرا کام تمام ہوا۔ بڑی مشکل سے وہاں سے نکلا۔

حقیقی علم: میں اس قصہ سے کہ ابوجہل نے اُس شخص کے بشرہ (پیشانی) سے کیا استدلال کیا۔ جو اُس کے بڑے عاقل فلسفی ہونے کی دلیل ہے۔ یہ امر بھی بتلانا چاہتا ہوں کہ اس وقت لوگ کہتے ہیں کہ علم کو بہت ترقی ہے۔ سو علم کو بلشبہ ترقی ہے مگر کون سے علم کو۔ یہی ریل، تار، فونوگراف بس ان کو ترقی ہے۔ مگر حقیقت میں خود ان کو علم کہنا ہی غلطی ہے۔ اس کو صنعت کہئے تدبیر کہئے گو بالمعنی الاعم (اعم معنی کے اعتبار سے) علم ہی سہی۔ یوں بعضے علوم وہ بھی ہیں جن کی شان میں حدیث ہے۔

ان من العلم لجہلا   بعض علوم جہل ہوتے ہیں۔

مگر علم مطلوب واقعی میں تو وہی ہے کہ ۔

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت   زنگ گمراہی ز دل بزدایدت

واقع میں علم وہی ہے جو تم کو محبوب حقیقی کی راہ پر لگا دے اور تمہارے دل سے گمراہی کا زنگ دُور کر دے۔

ایں ہوس ہا از سرت بیروں کند   خوف و خشیت در دلت افزوں کند

خواہشات نفسانی و شیطانی کو تمہارے سر سے نکال کر اللہ تعالیٰ کا خوف و خشیت تمہارے دل میں زیادہ کر دے۔

اگر کہا جاوے کہ علم کے معنی جاننے کے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ کل ایک مہتر کو بھی حق ہو گا کہ وہ اپنے کو ذی علم کہے کیونکہ صحت کے لئے صفائی کی ضرورت اور مہتر صفائی کے فن کو جانتا ہے مگر آپ اس کو علم نہیں کہتے۔ تو جس طرح آپ اس کو علم نہیں کہتے۔ ہم ریل، تار، فونوگراف وغیرہ جاننے کو علم نہیں کہتے۔ ہاں صنعت ہے اور ضروری ہے۔ پس ایسا ہی ابوجہل فلسفی تھا اور یہی ابوجہل معبر بھی ایسا ہی تھا۔ تو تعبیر بھی کوئی بزرگی کی بات نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی فراست ہے۔ تو باوجود ان علوم کی مخالفت کے سبب جس کا منشاء علم مطلوب کا نہ ہونا تھا ابوجہل ہو گیا۔

آیۃ کریمہ کا شانِ نزول

غرض حضورؐ نے اہل مکہ کو یہ جواب دیا تھا پس نہ مکہ میں حضورؐ نے سرداری کی درخواست کی اور نہ مدینہ میں مگر بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس کو بڑا بنائیں اس کو کون چھوٹا کر سکتا ہے۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو گو سرداری کی تمنا نہ تھی مگر آپ کی تشریف آوری پر لوگوں نے آپؐ کو سردار بنا لیا۔ تو عبداللہ بن ابی جل مرا کہ میری سرداری آپ کی بدولت گئی۔ اور کیوں نہ ہوتی۔

طلعۃ الشمس ما یغنیک عن زحل۔

یعنی سورج کے طلوع ہونے سے زحل سے بے پروائی ہو گئی

جاتی ہے۔

تو خلاصہ یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی کو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس وجہ سے سخت حسد تھا۔ اور ہر وقت ایسے موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ تو اس واقعہ سے اُس کو سخت ناگواری ہوئی کہ شہری لوگوں کے مقابلہ میں ان پردیسیوں کو اتنی دلیری ہوگئی۔ تو اُس نے اپنی جماعت میں کہا کہ تم ہی نے تو ان کو جری کیا۔ تو اب مدینہ چل کر معاملہ کو بدل ڈالو۔ اور اُس کی یہ صورت بتلائی کہ جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ پس اُس کا پہلا مقولہ ہے کہ

ھم الذین یقولون لا تنفقوا علی من عند رسول اللہ حتیٰ ینفضوا

یعنی کچھ خرچ مت کرو رسول اللہ کے ساتھیوں پر کہ سب متفرق ہو جاویں کیونکہ یہ سب روٹیاں کھانے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور جب یہی نہ رہیں گی تو سب منتشر ہو جاویں گے۔

ایک مقولہ تو یہ تھا اور دوسرا یہ تھا کہ

لیخرجن الاعز منھا الاذل کہ مدینہ چل کر معزز ذلیل کو نکال دیں گے۔ (اور معزز اپنے کو سمجھتے ہیں۔)

تو یہ عبداللہ بن ابی نے کہا اور آہستہ اپنی جماعت میں کہا۔ مگر زید بن ارقم نے یہ سُن لیا اور جوش بیتابی میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ آپ نے فوراً عبداللہ بن ابی کو بلایا اور پوچھا۔ تو اُس نے آکر قسم کھالی کہ غلط ہے میں نے ہرگز نہیں کہا۔ اسی کو تو کہتے ہیں کہ

اذا جاءك المنفقون قالوا نشھد انك لرسول اللہ

یعنی جب آپ کے پاس یہ منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں۔

زید بن ارقم رضؓ کے چچا نے اُن کو ملامت کی کہ تم کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا۔ یہ مارے رنج کے گھر میں بیٹھ رہے کہ اب کیا منہ دکھلاؤں۔ اللہ اکبر کیا غیرت تھی حق تعالیٰ کو اُن کی یہ حالت رنج کی گوارا نہ ہوئی اور اس وجہ سے یہ سورت نازل فرمائی۔ حالانکہ صرف ایک شخص کا قصہ تھا۔ مگر مقبول ہونا یہ ہے کہ ایک شخص کے لئے ایک سورت نازل فرمائی جو کہ قیامت تک کے لئے نمازوں میں پڑھی جاوے گی اور عبداللہ بن ابی کا وہ مقولہ بالتصریح (ظاہر طور سے) نقل فرمایا کہ اُس نے ضرور یہ کہا ہے تاکہ زید بن ارقم کی راست بیانی اچھی طرح ثابت ہو جاوے۔

جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے زید بن ارقم رضؓ کو بلایا اور اُن کی تصدیق کے لئے سورت نازل ہونے کی اُن کو بشارت سنائی زید بن ارقم رضؓ کھل گئے۔ یہ خلاصہ تھا اس قصہ کا۔

مقصود بیان اب میں یہ بیان کرتا ہوں کہ مقصود میرا اس قصہ کے ذکر سے کیا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر حکایت سے ایک مقصود ہوا کرتا ہے اور یہی راز ہے کہ قرآن شریف میں قصے زیادہ مفصل بیان نہیں ہوئے۔ بہت لوگ قرآن سے مفصل قصے تلاش کرتے ہیں اور تاریخوں سے دیکھ کر منطبق کرتے ہیں۔ اگر کوئی قصہ مل جاتا ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں اور

اگر نہیں ملتا تو اُس کو کمی سمجھ کر جواب کے طالب ہوتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ کے اعتبار سے گو قصہ ناتمام ہے مگر واقعہ تو مقصود ہی نہیں بلکہ مقصود صرف نتیجہ ہے۔ جتنے جزو سے نتیجہ نکل آوے وہی مذکور ہونا کافی ہے۔ تو یہاں بھی چونکہ قصہ ذکر کیا ہے یہاں بھی کوئی نتیجہ ضرور ہوگا۔ اور اس کی تعیین اکثر قرآن ہی سے ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں اس قصہ سے مقصود ایک علم ہے جو ساتھ ہی مذکور ہے۔ چنانچہ منافقین کے پہلے مقولہ کے ساتھ فرمایا کہ

وللہ خزائن السموات و الارض — کہ حق تعالیٰ ہی کے لئے سب کچھ ہے۔

اور اُن کے دوسرے مقولہ کے ساتھ فرمایا۔

وللہ العزۃ ولرسولہ و للمؤمنین۔ — کہ عزت تو اصل میں حق تعالیٰ اور اُس کے رسولؐ اور مومنین کی ہے۔

ان دونوں آیتوں کے مضمون میں غور کرنے سے مفہوم ہوگا کہ مقصود کیا ہے تو پہلی آیت میں تو مقصود ہے مال کے ایک اثر کو بیان کرنا اور پھر اُس کا رد کرنا اور دوسری آیت میں مقصود ہے عزت کے اثر کو بیان کرنا اور پھر اُس کو رد کرنا۔ کیونکہ پہلی آیت میں منافقین کو مال کا دعویٰ تھا حق تعالیٰ نے اُس کو رد فرمایا کہ منافقین مال کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ اُن کا دعویٰ غلط ہے کیونکہ آسمان وزمین کے سارے خزانے تو حق تعالیٰ کے پاس ہیں اور دوسری آیت میں منافقین کو عزت کا دعویٰ تھا وہ اپنے آپ کو معزز خیال کر کے کہتے تھے کہ

لیخرجن الاعز منھا الاذل۔ یعنی مدینہ چل کر معزز ذلیل کو نکال دیں گے۔

تو حق تعالیٰ نے اس کو بھی رد فرمایا کہ عزت تو خدا اور رسول اور مومنین کے لئے ہے۔ تو خلاصہ ان دونوں آیتوں کے مضمون کا یہ ہوا کہ ایک آیت یعنی پہلی مال کے متعلق ہے اور دوسری جاہ کے متعلق ہے۔

اب یہ بات کہ اس وقت میں نے اس کو کیوں ذکر کیا تو دل یوں چاہ کرتا ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہو وہ بتلائی جاوے۔ تو آج کل جو امر زیادہ ضرر رساں اور زیادہ آزاردہ ہے وہ اختلافات ہیں جو باہم مسلمانوں میں پیدا ہو گئے ہیں۔ بالخصوص جب کہ دونوں طرف بڑے بڑے لوگ ہوں کہ چھوٹے لوگ اُن کے ساتھ ہو گئے ہوں۔ اس لئے بڑا ضروری امر اس وقت اختلافات کا فیصلہ ہے۔

علماء اور مال و جاہ

سو منجملہ اُن اختلافات کے ایک بڑی جماعت کا یہ اختلاف ہے کہ مال اور جاہ قابل تحصیل اور مطلوب ہیں یا نہیں۔ اور دونوں جانب بڑے بڑے لوگ ہیں۔ ایک جانب تو وہ لوگ ہیں جو اہل الرائے اور معزز طبقہ کے کہلاتے ہیں اور دوسری جانب علماء ہیں اور ممکن ہے کہ دونوں کی کچھ کچھ غلطیاں بھی ہوں اور کوئی زائد غلطی میں ہو۔ چنانچہ آج کل کے عقلاء تو اس میں منہمک ہیں کہ مال اور جاہ قابل تحصیل اور مطلوب ہیں۔ ان کی ترقی ہونی چاہیے۔ اور علماء کی رائے یہ مشہور کی جاتی ہے کہ مال اور جاہ اصلاً قابل تحصیل اور مطلوب نہیں اور ان کی ترقی کی کچھ ضرورت نہیں اور بعض مرتبہ

تو قول ہی ناتمام ہوتا ہے اور بعض مرتبہ ناتمام پہنچایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی بناپر علماء دین کے متعلق لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یوں چاہتے ہیں کہ مسلمان جوتیاں چٹخاتے پھریں۔ چنانچہ عموماً ان پر یہی گمان ہے کہ یہ علماء ترک دنیا کراتے ہیں اور جب یہ گمان ہوگیا تو اس خیال کی بناء پر یہ بھی شبہ ہوگیا کہ علماء کی زیادہ سختی اس لئے ہے کہ یہ زمانہ کی ضرورتوں سے بے خبر ہیں۔ ان کو یہ خبر نہیں کہ کس جگہ مال اور جاہ کو منع کرنے سے ترقی رُکتی ہے اور اگر ان کو خبر ہوتی تو اتنی سختی نہ کرتے بلکہ اپنے فتوٰی میں اس کی بھی رعایت رکھتے۔ ایسا نہ کرتے کہ ہر نوکری بھی لا یجوز (جائز نہیں)، اور تجارت بھی ناجائز۔ تو ان کے نزدیک نہ حیات کے افعال جائز نہ موت کے افعال۔

چنانچہ قنوج میں ایک صاحب نے کہا کہ ساری شریعت کا حاصل یہ ہے کہ نہ ہنسنے کی جگہ ہنسو، نہ رونے کی جگہ روؤ۔ میں نے کہا، سبحان اللہ، خوب سمجھے تو شریعت اس طرح بدنام کی جارہی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض علماء کی تعلیم میں کہیں لفظی اجمال ہو مگر اس اجمال کا مضائقہ بھی نہیں کیونکہ مخاطب مسلمان کم و بیش مسائل دین سے ضرور تعلق رکھتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ممانعت تو اُسی کی ہوگی جو حرام ہو مگر اُن کی مناسبت کے اعتماد پر بعض جگہ عنوان میں کچھ ابہام رہ گیا ہو۔

مثلاً اگر کسی مریض کو طبیب مرغ سے منع کرے اور کچھ تفصیل نہ کرے، تو وہی درجہ ممنوع ہوگا جو مریض کے لئے مضر ہو۔ تو اس طرح سے بھی غلط فہمی ہوگئی ہے اور اس کی وجہ سے اختلاف ہوگیا۔

پس ایک طبقہ تو حامی ہوگیا تعلیم دین کا جس کی غایت مال و جاہ نہیں ہے

اور ایک طبقہ حامی ہو گیا تعلیم دنیا کا جس کا مقصود ہی صرف مال وجاہ ہے۔

جدید طبقہ کے خیالات

اس طبقہ کی طرف سے پہلے طبقہ کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ تو کھانے پینے کے ذریعہ کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ سب سے اوّل یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر تعلیم دنیا کا اہتمام نہ ہو تو کھائیں کہاں سے اور علم دین کی ضرورت کا وہ انکار تو نہیں کرتے مگر علم دین صرف نماز روزہ ہی کے مسائل کو سمجھتے ہیں۔

مگر اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی کہے کہ قانون گورنمنٹ صرف یہ ہے کہ حکام کی تعظیم و تکریم کرو۔ پھر چاہے رات کو ڈکیتی ہی کا شغل ہو۔ لیکن تعجب ہے کہ ایسے شخص کا یہ اجتہاد تو کوئی نہ سنے گا مگر دین کے باب میں ایسی رائیں مسموع (سُنی جانے والی) ہوتی ہیں۔

شاید کوئی شخص کتاب راہ نجات کے نام سے استدلال کرے کہ راہِ نجات میں دیکھو نماز روزہ ہی کا بیان ہے اور پھر اُس کا نام راہ نجات ہے اس سے معلوم ہوا کہ نجات کا راستہ یہی نماز روزہ ہے وبس۔ تو یہ تو ٹھیک کہ نماز وروزہ نجات کا راستہ ہے لیکن یہ کاہے سے معلوم ہوا کہ پورا راستہ وہی ہے اور کسی جزو کی ضرورت نہیں۔

جیسے کوئی شخص سڑک پر جا رہا ہو تو یہ سڑک اُس کا راستہ ضرور ہے لیکن یہ کاہے سے معلوم ہوا کہ پورا راستہ یہی سڑک ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ دُور کے بعد دوسری سڑک بھی طے کرنا پڑے۔ تو بہت لوگوں نے دین میں بس یہ اختصار کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ بعضے تو قرآن شریف پڑھنے کو بھی تضییع اوقات سمجھتے ہیں

چنانچہ رام پور میں ایک صاحب نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ تم اپنے بچے کو انگریزی کیوں نہیں پڑھاتے۔ انہوں نے کہا کہ وہ قرآن پڑھ رہا ہے۔ ختم کر لے تو انگریزی پڑھاؤں۔ کہنے لگے کتنے دنوں میں کتنا قرآن ہوا ہے؟ انہوں نے کہا کہ دو برس میں آدھا قرآن۔ تو آپ کہتے ہیں کہ دو سال تو ضائع ہو گئے دو سال اور بھی کیوں ضائع کرتے ہو۔

اور قرآن سے بے تعلقی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی ایک بیرسٹر کی نسبت فرماتے تھے کہ انہوں نے مولانا سے کہا کہ اس وقت تو علماء اگر سود کو حلال کہہ دیں تو مصلحت ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ توبہ کرو جو چیز قرآن میں حرام ہے اس کو کون حلال کہہ سکتا ہے اور آیت پڑھی۔

احل اللّٰہ البیع وحرّم الربوٰا یعنی اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے۔

تو کہنے لگے اے اللہ توبہ! میں تو اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ مولویوں نے مل کر اس کو حرام کر رکھا ہے۔ تو یہ حالت بے خبری کی ہو گئی ہے اور بڑھتی جاتی ہے۔

یہیں الہ آباد کا قصہ ہے کہ ایک بچہ کی انگریزی تعلیم بہت دور تک ہو گئی تھی مگر وہ الحمد شریف دیکھ کر بھی نہ پڑھ سکا میں نے حروف پہچوائے تو معلوم ہوا کہ اس نے الف با تا بھی نہیں پڑھی اور میں نے ایک بہت بڑے شخص کے بچے کو دیکھا کہ وہ میم کی گود میں پلتا تھا اور باپ کو اس پر فخر تھا کہ وہ کلمہ

پڑھ سکتا تھا جیسے ہم اپنے طوطے کو کلمہ پڑھا دیں۔ تو اسلام سے یہ بے خبری کی نوبت ہو گئی ہے اور صاحب آپ نے تو پھر بھی چونکہ ایسے لوگوں کی آغوش میں پرورش پائی ہے جو پرانی روش کے تھے۔ آپ تو خیر اتنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر یہ بچے جو آپ کی اور میم کی گود میں پرورش پا رہے ہیں یہ تو اتنا بھی نہ سمجھیں گے۔ یہ حالت دیکھتے ہوئے مجھے تو خوف ہے کہ چند روز میں شاید لوگ اپنے کو مسلمان کہنا بھی پسند نہ کریں گے۔ جیسا کہ اس وقت میں اکثر عربی طلبا کو دیکھتا ہوں کہ وہ اپنے کو ایسی وضع سے رکھنا پسند نہیں کرتے جس سے طالب علم سمجھے جاویں۔ صاحب سُن لیجئے ؎

یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی   یا فرو شو جامہ تقویٰ بہ نیل

یا تو محبوب حقیقی کے عشق کا دعوےٰ مت کرو اور اگر کرتے ہو، تو عاشقوں کی وضع کو اختیار کرو۔

یا مکن با پیلبا ناں دوستی   یا بنا کن خانہ بر اندازِ پیل

یعنی یا تو فیلبان سے دوستی مت کرو یا اپنا مکان ہاتھی کے موافق بناؤ۔ یعنی یا طلبا اور اللہ والوں میں مت داخل ہو۔ اگر داخل ہوتے ہو تو اُن کی وضع اختیار کرو۔

تو جب یہ کیفیت طلبا میں داخل ہو گئی تو اوروں کا تو کیا ٹھکانہ ہے۔ تو جس طرح طلبا کو ایسی وضع بنانے میں عار ہے جس سے لوگ اُن کو طالب علم کہیں گے۔ تو دیکھئے اب یہ اپنے کو طالب علم کہنا پسند نہیں کرتے۔ اسی طرح اسلام کو بھی عجب نہیں کہ عار سمجھیں۔ چنانچہ نام تو بدلنے لگے ہیں کہ کوئی یہ نہ سمجھے

کہ یہ مسلمان ہیں۔ تو نام بدل گئے، وضع بدل گئی، خیالات بدل گئے مگر اُن کے نزدیک وہ اسلام ہی کچھ ایسا لوہے جڑا ہے کہ کسی طرح الگ ہی نہیں ہوتا۔

بس ایسا ہے جیسے مولانا شاہ رفیع الدین صاحب نے ایک سقّے کو نماز کی تاکید کی اور وضو کرا کر بتلا دیا۔ غالباً ایک ماہ کے بعد پوچھا کہ نماز بھی پڑھتا ہے معلوم ہوا پڑھتا ہے۔ فرمایا وضو بھی کرتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کیوں اُس دن کرا نہیں دیا تھا۔ تو جیسا اُس کا وضو تھا ایسا ہی آج کل کا اسلام ہے۔

علماء اور کافرگری

پھر اس حالت پر اگر علماء کچھ کہہ دیتے ہیں تو علماء پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ یہ بہت جلد کافر بناتے ہیں مگر یہ الزام سراسر غلط ہے کیونکہ کافر بنانے کا مفہوم تو ایسا ہے جیسا مسلمان بنانے کا اور مسلمان بنانے کے معنی ظاہر ہے کہ یہی ہیں اسلام سکھلانا، اسلام کی ترغیب دینا و تحریک کرنا۔ چنانچہ کہتے ہو کہ علماء کو حق تعالیٰ نے اس لئے بنایا کہ وہ کافروں کو مسلمان بنائیں۔ تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ کافروں کو مسلمان کہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ کافروں کو اسلام سکھلا دیں۔ اسلام کی ترغیب دیں اور اسلام کی طرف بلائیں تو اسی طرح کافر بنانے کے بھی یہی معنی ہوں گے کہ کافر ہونے کی تحریک کریں اور جب یہ معنی متعین ہوئے تو اب تم ہی بتلاؤ کہ کون سا عالم کفر کی تحریک کر رہا ہے۔ بس معلوم ہو گیا کہ علماء کافر نہیں بناتے۔ ہاں بے شک علماء بتاتے ہیں کہ فلاں بات سے کافر ہو گیا۔ تو کافر تو خود ہو گیا تھا مگر علماء نے صرف بتلا دیا۔

جیسے کوئی شخص امتحان میں فیل ہو جائے اور کوئی اُس کو بتلا دے

کہ تم فیل ہو گئے۔ تو کیا یہ کہا جائے گا کہ اس بتلانے والے نے اس کو فیل کیدیا نہیں بلکہ فیل تو خود ہوا۔ اس شخص نے صرف بتلا دیا۔ ہاں اگر کوئی ناحق کفر کا فتویٰ دے تو بے شک وہ بُرا ہے۔ تو علماء پر یہ الزام محض اس لئے ہے کہ ان لوگوں کو بھی خبر نہیں کہ اسلام کیا ہے اور زیادہ تو ایسے ہی لوگ ہیں اور بعضے ایسے بھی ہیں کہ وہ بے خبر تو نہیں ہیں بلکہ اُن کو خبر سب ہے پھر بھی استہزا (ہنسی مذاق) کرتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کی اُن کی ضرورتیں اُن کے خیال میں واجب الرعایت ہیں اور شریعت میں اُن کے نزدیک اُن کی کامل رعایت ہے نہیں۔ اس لئے کھینچ تان کر اُن پر شریعت کو منطبق کرتے ہیں اور علماء اُن پر انکار کرتے ہیں۔ اس لئے وہ علماء سے اُلجھتے ہیں۔

اسلام اور ترقی

اُن میں بعضے ایسے ہیں کہ یورپ کی تحقیقات کو بھی صحیح نہیں سمجھتے مگر پھر بھی کہتے ہیں کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا تو اس جماعت نے دین صرف قوم کا نام رکھا ہے۔

چنانچہ افسوس ہے کہ آج کل ایک طبّی وفد ترکوں کی مدد کو گیا ہے تو جہاز میں سوار ہونے کے بعد آپس میں گفتگو ہوئی کہ ہم لوگوں کو داڑھی رکھنا مناسب ہے یا نہ رکھنا۔ تو میں کیسے کہوں کہ یہ اسلام ہے۔ دیکھئے اوّل تو ایسے دینی کام کو جا رہے ہیں تو یہ دین کے خلاف تجویز کیسی۔ دوسرے ممکن ہے کہ اُن کے ایک گولی آ کر لگ جائے۔ تو کیا وہ چاہتے تھے کہ ایسی حالت میں خاتمہ ہو جو کہ اسلام کے خلاف ہو۔ تو اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس وقت مذہب

سے کوئی مطلب باقی نہیں رہا۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر اُن کو کسی وقت یہ معلوم ہو جاوے کہ اس مذہب کو اختیار کر کے ہماری قومیت باقی نہیں رہ سکتی اور فلاں مذہب اختیار کرنے سے باقی رہ سکتی ہے، تو فوراً اس مذہب اسلام کو چھوڑ کر وہ دوسرا مذہب اختیار کر لیں۔

چنانچہ لکھنؤ میں میرے ایک دوست میرے پاس روزانہ آتے ایک روز آنے میں کچھ دیر ہو گئی آنے کے بعد میں نے تاخیر کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے بیان کیا کہ آج ایک کمیٹی تھی اُس کے تماشے میں دیر ہو گئی اور گو میں اس کا ممبر نہ تھا۔ اور اُس کا ممبر نہ ہونا ہی اچھا تھا۔ کیونکہ بعض کمیٹی کا ممبر ہی نہ ہونا اچھا ہے۔

چنانچہ مشہور ہے کہ اکبر کے زمانہ میں ایک کمیٹی نبوت کی قائم ہوئی اُس میں ملّا دوپیازہ بھی حاضر تھے۔ کوئی نبی بنتا تھا، کوئی ابوبکر، کوئی عمر۔ یہ خاموش تھے۔ ان سے پوچھا گیا بھائی تم کیا بنو گے۔ انہوں نے کہا کہ میں ابوجہل بنوں گا تم سب کی تکذیب کروں گا۔ سو واقعی بعضی مجلس کا ابوجہل ہی ہونا اچھا ہے۔ اسی طرح اس کمیٹی کا ممبر ہی نہ ہونا اچھا تھا۔

سو انہوں نے بیان کیا کہ اس کمیٹی میں یہ بحث تھی کہ مسلمانوں کی ترقی نہیں ہوتی۔ تو اخیر میں تحقیق کے درجے میں یہ طے ہوا کہ اسلام کو باقی رکھ کر مسلمانوں کی جماعت ترقی نہیں کر سکتی اور یہ رائے قائم کی کہ اگر ترقی مطلوب ہے تو اسلام کو چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ اس میں حلال و حرام کا بڑا قصہ ہے۔ مثلاً ایک انجمن نے تو ایک تجویز کی کہ مسلمانوں کو یہ کرانا چاہیئے تو مذہب اسلام

کی رُو سے وہ حرام ہے تو اب اُس چیز پر عمل کیسے ہو۔

چنانچہ ایک بار میں لاہور گیا تو وہاں کے عقلاء نے یہ تجویز کر رکھا تھا کہ علماء پر زور ڈال کر سود کو حلال کرانا چاہیئے۔ جب علماء نے موافقت نہ کی تو وہ لوگ بولے بس صاحب اب ترقی کی کوئی امید نہیں۔

اسی طرح اس جماعت نے یہ رائے قائم کی کہ یہ ساری خرابیاں اور مسلمانوں کی پستی اسلام کی قید اور حرام و حلال کی بدولت ہیں۔ مثلاً اگر کوئی تجارت کرے تو شریعت میں تو روک ہے کہ ناجائز معاملہ نہ کرو، سود نہ لو پھر ترقی کہاں۔ اس لئے اس قید سے آزاد ہو جانا چاہیئے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر شریعت کو چھوڑ بھی دیا مگر آزادی تو پھر بھی میسر نہ ہوئی۔ کیونکہ گورنمنٹ کے قوانین کی قید اب بھی ہے۔

اگر کہو کہ کچھ کچھ تو آزادی ہو گئی۔ تو میں کہتا ہوں کہ اس کچھ قید کچھ آزادی سے تو بالکل قید ہی اچھی۔ ایک طرف تو ہوتے۔ اس لئے چاہیئے کہ جو خدا سے آزاد ہو وہ گورنمنٹ سے بھی آزاد ہو جاوے۔ پھر علاوہ حلال و حرام کی روک ٹوک کے ایک اور بات سے بھی ان لوگوں کو اسلام سے توحش (نفرت) ہوا۔ وہ یہ کہ انہوں نے دیکھا کہ بعض مسلمانوں میں تعصب اتنا ہے کہ کوئی آمین پر لڑتا ہے کوئی رفع یدین پر۔ تو جب اسلام ہی نہ ہوگا تو یہ سب کچھ بھی نہ ہوگا جس سے قوم کو ضرر پہنچ رہا ہے۔

انہوں نے جھگڑوں کے اعتبار سے اسلام کو ایسا سمجھ رکھا ہے جیسے کسی بادشاہ کے بڑے بھائی تھے مجذوب کہ برہنہ رہتے۔ بادشاہ نے کہا

کہ پائجامہ تو پہن لیجیئے۔ اُنہوں نے کہا، پھر کرتہ بھی لوں گا۔ بادشاہ نے کہا، وہ بھی حاضر ہے۔ وہ بولے پھر ٹوپی بھی لوں گا۔ بادشاہ نے کہا وہ بھی حاضر ہے اسی طرح سلسلہ چلاتے چلاتے سلطنت کی ضرورت ظاہر کی۔ بادشاہ نے کہا وہ بھی حاضر ہے۔ کہنے لگے تو میں پاجامہ ہی پہن کر کیا کروں گا جس سے یہ سب جھگڑے پیدا ہوں۔

اسی طرح انہوں نے کہا کہ سارے قصے اسلام ہی کے ہیں تو مسلمان ہی کیوں رہیں اور یہ لوگ جو مسلمانوں کو الزام دیتے ہیں کہ ذرا ذرا سی بات میں جھگڑا کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ ہی پر دیکھئے کس قدر اختلاف اور جھگڑا ہو رہا ہے۔ تو واقعی اتنے اختلاف کو تو ہم بھی پسند نہیں کرتے مگر یہ دیکھئے اصل سبب اس اختلاف کا کیا ہے۔ تو اصل سبب یہ ہے کہ مسلمان کی نظر میں دین کی تکمیل اتنی ضروری ہے کہ ذرا ذرا سی بات کو بھی وہ جانچتا ہے پھر اس میں کبھی نفسانیت بھی آ گئی جس کی وجہ سے اس میں زیادتی ہونے لگی۔ تو اصل میں خرابی یا ضرر جو کچھ لازم آیا وہ اسلام سے نہیں بلکہ نفسانیت سے ہے۔ مگر اُنہوں نے اس ضرر کو بھی اسلام کی طرف منسوب کیا۔ تو انہوں نے یہ تجویز کر لیا کہ اسلام کو باقی رکھ کر ترقی نہیں ہو سکتی۔ مگر تجویز ہی تھی، اپنے نزدیک اسلام کو ابھی چھوڑا نہیں مگر صاحبو! اسلام نے تو خود انہیں چھوڑ دیا۔ تو یہ لوگ متروک الاسلام (اسلام کے چھوڑے ہوئے) تو ہو ہی گئے۔ غرض یہاں تک مذاق بدل گیا ہے۔

ایک اور قصہ ہے رڑکی کا۔ وہاں ایک کمیٹی میں ایک یہ تجویز ہوئی تھی کہ نکاح بھی فضول ہے۔ آزادی تو یہ ہے کہ جیسے اور سودے سلف کا معاملہ

ہوتا ہے کہ جس سے جو معاملہ ٹھہر جاوے۔ اسی طرح یہ یاں بھی حاصل کر لی جاویں۔ یہ رائے تھی عقلاء کی۔

تو سبب اس کا فقط یہی ہے کہ ان کی نظر میں دنیا اصل چیز ہے۔ علماء نے اس مفسدہ کو دیکھ کر روکا اور روکنے کا مطلب یہ تھا کہ اس درجہ کی دنیا کو چھوڑ و مگر اس کے معنی غلط یہ سمجھے گئے کہ علماء کی رائے یہ ہے کہ دنیا کو بالکل چھوڑ دو۔ اس لئے اختلاف ہوا اور یہ گفتگو ہونے لگی کہ آیا اصل میں دنیا مطلوب ہے اور دین بقدر ضرورت حاصل کرنا چاہیئے یا اصل میں دین مطلوب ہے اور دنیا بقدر ضرورت ہونی چاہیئے۔ یہ ہے وہ مسئلہ جو اس بیان سے اصل مقصود ہے۔ اور مجھے ان آیتوں سے یہی نتیجہ نکالنا ہے۔

محبوب ترین چیزیں

تو دنیا میں دو ہی چیزیں ہوتی ہیں، مال اور جاہ اور یہی دو چیزیں ایسی ہیں جو ہر ایک کو محبوب ہیں۔ چنانچہ کیمیا جو ہر ایک کو ایسی محبوب ہے کہ اگر کسی کو بتلائی جاوے تو اہل اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں کہ اس سے انکار کرے۔ تو اس کی یہی وجہ ہے کہ اس میں مال و جاہ دونوں جمع ہیں اور اس کے سوا دنیا میں بہت کم ذرائع ایسے ہیں کہ اُن میں مال اور جاہ دونوں جمع ہوں۔ اکثر جاہ بدون مال کے تلف کئے ہوئے نہیں ملتا اور اس میں مال و جاہ دونوں جمع ہیں۔ اس لئے یہ اس درجہ کی محبوب ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہ دونوں چیزیں نہایت ہی محبوب ہیں اور انہیں کا نام دنیا بھی ہے۔ تو اب میرا یہ کہنا کہ دنیا مطلوب ہے یا نہیں۔ اس میں مال وجاہ دونوں آ گئے۔ تو اب دنیا سے مراد ان دونوں کا مجموعہ ہوگا۔ پس حاصل یہ ہوا

کہ مال وجاہ مطلوب ہیں یا نہیں حق تعالیٰ نے اس کا فیصلہ ان آیات میں فرمایا ہے
پس منافقین کے اوّل مقولہ کے بعد فرماتے ہیں۔

ولله خزائن السمٰوات و الارض — یعنی اللہ ہی کے ہیں تمام خزانے آسمانوں کے اور زمینوں کے۔

اس سے تو احکام مال کے تبلانا مقصود ہیں۔ اور دوسرے مقولہ کے بعد فرماتے ہیں

ولله العزة ولرسولہ و للمؤمنین — یعنی اللہ ہی کی ہے عزت اور اس کے رسول کی اور مسلمانوں کی

اس سے احکام جاہ کے تبلانا مقصود ہیں۔

پس اب اس میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سو غور کرنے سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ مال فی نفسہٖ محمود ہے۔ دوسرے یہ کہ مال سے اگر کوئی مفسدہ مرتب ہونے لگے تو مذموم ہے۔ مال کا فی نفسہٖ محمود ہونا تو اس لئے معلوم ہوا کہ اپنے کو مالک الاموال (سب مالوں کا مالک) فرمارہے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔ ولله خزائن السمٰوات والارض یعنی آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ ہی کی ملک میں ہیں۔ پس اگر مال فی نفسہٖ کوئی بُری اور معیوب چیز ہوتی تو جس طرح سے خصوص کے ساتھ اپنے کو خالق الکلاب والخنازیر نہیں فرمایا، اسی طرح اپنے کو خصوص کے ساتھ مالک الخزائن (خزانوں کے مالک) نہ فرماتے۔ اور اس میں نقود وعروض (روپیہ واسباب) سب داخل ہوگئے اور مال کا باعتبار عارض کے مذموم ہونا اس سے معلوم ہوا کہ مال سے اُن کو یہ ضرر ہوا کہ انہوں نے اُس کو بے موقع استعمال کیا۔ چنانچہ کہا کہ

لا تنفقوا علیٰ من عند رسول اللہ — یعنی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوں،
اُن پر کچھ مت خرچ کرو۔

سو اپنے تموّل کو وہ اس طرح کام میں لائے کہ مسلمانوں پر خرچ کرنا موقوف کر دیا جس سے اُن کو تکلیف پہنچی۔ تو یہ سوءِ (بُرا) استعمال ہوا مال کا۔ پس حق تعالیٰ نے اس پر رد فرمایا کہ تم کیا چیز ہو، خزانے تو سارے ہمارے پاس ہیں۔ پس اُن کی یہ مذمت سوءِ استعمال کی وجہ سے کی گئی۔ پس اس سے دوسری بات بھی ثابت ہو گئی کہ جب مال کے ساتھ سوءِ استعمال ہو تو وہ مذموم ہے۔

اسی طرح دوسرے مقولہ کے بعد فرمایا۔

وللّٰہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین — یعنی عزت اللہ ہی کی ہے اور اس کے رسولؐ کی اور مسلمانوں کی۔

تو یہاں بھی بتلا دیا کہ جاہ فی نفسہٖ مذموم نہیں مگر سوءِ استعمال کی وجہ سے مذموم ہو جاتا ہے۔ پس اس سے بھی دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ جاہ فی نفسہٖ محمود ہے۔ دوسرے یہ کہ جب سوءِ استعمال ہو تو مذموم ہے۔ جاہ کا فی نفسہٖ محمود ہونا تو اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے وللّٰہ العزۃ — الآیۃ فرمایا۔ تو اپنے لئے عزت ثابت فرمائی۔ اگر جاہ کوئی بُری چیز ہوتی تو اپنے لئے ثابت نہ فرماتے۔

اب اگر یہ شبہ ہو کہ جاہ اچھی چیز تو ہے لیکن یہ ممکنات کے لئے نہیں بلکہ

حق تعالیٰ کے لئے ہے۔ تو سمجھو کہ آگے وللمؤمنین (اور مسلمانوں کی) بھی تو ہے تو پس مسلمانوں کا ذی عزت ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے۔ تو یہ شبہ نہ رہا کہ شاید ممکنات کے لئے محمود نہ ہو اور جاہ کا مذموم ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ ساتھ ہی ساتھ منافقین کی اس بات پر مذمت بھی فرمائی ہے کہ انہوں نے اُن کا بے موقع استعمال کیا۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ

لیخرجن الاعز منہا الاذل یعنی جو عزت والا ہے وہ مدینہ سے ذلت والے کو نکال دے گا۔

تو اُن کا یہ کہنا سوء استعمال ہوا جاہ کا کہ ذریعہ بنایا جاہ کو مسلمانوں کے ضرر کا۔ اس پر حق تعالیٰ نے رد فرمایا کہ تم ہو گیا چیز، معزز تو خدا و رسول و مسلمان ہیں پس اُن کی یہ مذمت سوء استعمال کی وجہ سے کی گئی۔ پس ان دونوں آیتوں سے چار مسئلے ثابت ہوئے۔

ایک یہ کہ مال اچھی چیز ہے۔

دوسرا یہ کہ جاہ اچھی چیز ہے

تیسرا یہ کہ مال کو ناجائز طور پر استعمال کرنا مذموم ہے۔

چوتھا یہ کہ جاہ کو ناجائز طور پر استعمال کرنا مذموم ہے۔

تو ان چاروں مسئلوں کو مان لینے سے اگر دونوں جانب انصاف ہو تو سب اختلاف رفع ہو جاوے۔ کیونکہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ مال بُری چیز نہیں ہے تو اب مال کا مطلقاً بُرا کہنا ٹھیک نہ ہوگا۔ اسی طرح جاہ کو بھی اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ مال و جاہ ناجائز طور پر استعمال کرنا مذموم ہے تو وہ

لوگ باز آ ویں گے جو مال وجاہ کو علی الاطلاق محمود و مطلوب کہہ رہے ہیں۔ تو اتنے بڑے اختلاف کا فیصلہ ہو جاوے گا اور یہی مقصود ہے مجھے بیان کرنے سے اور یہ اجمال کے درجہ میں تو ثابت ہو گیا مگر میں تفصیل کے لئے کچھ اور بیان کروں گا۔ اور گو مقصود معلوم ہو گیا ہو مگر ابھی بہت مبہم ہے۔ اس لئے اس کا عنوان بھی واضح اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ پس دوسرے عنوان سے عرض کرتا ہوں۔

حقیقتِ حُب

ایک تو ہے مال اور ایک ہے حُب مال۔ اسی طرح ایک ہے جاہ اور ایک ہے حُب جاہ۔ تو مذمت مال کی نہیں ہے بلکہ حُب مال کی ہے۔ جس سے برے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ تو مذموم دو چیزیں ہوئیں حُب مال اور حُب جاہ۔ باقی رہے مال اور جاہ، سو یہ دونوں مذموم نہیں کیونکہ حق تعالیٰ امتنان (نعمت دینا) کے طور پر فرماتے ہیں۔

ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت	کہ ہم مومنین اہل عمل صالح کے
سیجعل لھم الرحمٰن ودا	لئے محبوبیت پیدا کر دینگے۔

اور محبوبیت ہی کا نام جاہ ہے۔ لوگ جاہ کے معنی بھی غلط سمجھتے ہیں کہ لوگ ہمارے خوف کی وجہ سے ہماری تعظیم کریں۔ حالانکہ جاہ کی حقیقت ہے ملک القلوب (یعنی دلوں کا مالک ہونا) پس ملک المال (مال کا مالک ہونا) تو تموّل ہے اور ملک القلوب (دلوں کا مالک ہونا) جاہ ہے اور خوف اور ہیبت ہو تو وہ صورت جاہ ہے۔ حقیقت جاہ نہیں اور یہ خود ہی اپنے

کو معزز سمجھتے ہیں ورنہ لوگوں کے دلوں میں کچھ بھی ان کی عزت نہیں ہوتی چنانچہ اُن کے پیچھے لوگ اُن کو گالیاں دیتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ بعضے لوگ اپنی نظروں میں بڑے ہوتے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک کلاب اور خنازیر (کتے اور سوّر) سے بدتر ہوتے ہیں اور اُن کے سامنے خوف کی وجہ سے لوگ تعظیم کرتے ہیں۔ تو یہ کوئی عزت نہیں ہے کیونکہ ایسی عزت تو سانپ کی بھی ہے۔

ایک مرتبہ دہلی میں میں بیان کر رہا تھا۔ رات کا وقت تھا کہ کچھ آہٹ ہوئی جس سے لوگوں کو سانپ کا شبہ ہوا۔ بس سانپ کے ڈر سے سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ تو کیا یہ اُس کی عزت تھی۔ ہرگز نہیں! تو جو تعظیم خوف کی وجہ سے ہو وہ جاہ نہیں ہے۔ جاہ تو یہ ہے کہ؂

صاحب دہ بادشاہ جسمہاست ۔۔۔ صاحب دل شاہ دلہائے شماست

یعنی گاؤں کا مالک جسموں کا بادشاہ ہے اور اہل دل دلوں کا بادشاہ ہے۔

تو جسموں کا شاہ ہونا جاہ نہیں ہے بلکہ دلوں کا شاہ ہونا جاہ ہے اور یہ بات محبوبیت سے ہی نصیب ہوتی ہے۔ پس محبوبیت ہی اعلیٰ درجہ کی جاہ ہے۔ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

سیجعل لھم الرحمٰن ودا ۔۔۔ اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبوبیت پیدا کر دیں گے۔

پس معلوم ہوا کہ جاہ بُری چیز نہیں بلکہ یہ تو ایک اچھی چیز ہے کہ حق تعالےٰ

بطور امتنان (نعمت) اپنے صالح بندوں کو عنایت فرماتا تبلا رہے ہیں ایسی طرح مال کی نسبت حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

نعم المال الصالح للرجل الصالح — نیک آدمی کے لئے نیک مال اچھی چیز ہے۔

پس مال اور جاہ مذموم خود نہیں ہیں بلکہ مذموم حُبّ مال اور حب جاہ ہیں جس کی نسبت حضورؐ فرماتے ہیں۔

ما ذئبان جائعان ارسلا فی غنم بافسد لھا من حب المال والشرف الدین المرء — یعنی حُبّ مال اور حُبّ شرف آدمی کے دین کو ایسا تباہ کرتی ہے کہ اگر دو بھیڑیئے بھوکے بھی بکریوں کے گلہ میں چھوڑ دیئے جاویں تو وہ بھی بکریوں کو اس قدر تباہ نہیں کر سکتے۔

پس حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے حُبّ کا لفظ تصریحاً فرما دیا ہے۔ تو حُبّ بُری چیز ہے۔ اب جہاں مال کی مذمت آوے اور اس کے ساتھ حُبّ کی قید نہ ہو تو سمجھ لیں کہ اس سے مراد وہی حُبّ کا درجہ ہوگا کیونکہ بعض قرائن ایسے موجود ہوتے ہیں جن سے وہ قید معلوم ہو جاتی ہے اور اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ تو چونکہ غالب عادت یہی ہے کہ جب مال ہوتا ہے تو حُبّ مال بھی ہوتی ہے۔ پس یہ اس کا قرینہ ہے کہ مال سے مراد وہی ہے جو حُبّ کے درجہ میں ہو۔

جیسے کوئی شخص پوچھے کہ رہن رکھنا کیسا ہے تو چونکہ عادت رہن سے

استغراق کی ہے۔ لہٰذا یہ بھی گنجائش ہے کہ ہم جواب میں اُس کو حرام کہہ دیں۔ تو بعض اوقات قرائن پر اعتماد کرنے کی وجہ سے قیود کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس کی حدیث سے تائید لیجئے۔ حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ

لیس من البر الصیام فی السفر — یعنی سفر میں ایسی حالت میں روزہ رکھنا نیکی نہیں۔

یہ آپؐ نے اُس وقت فرمایا تھا جب کہ ایک شخص نے نہایت سختی کی حالت میں سفر کے اندر روزہ رکھا تھا اور گرمی اور پیاس کی شدت کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ سفر میں روزہ ہی رکھنا نہ چاہیئے ہرگز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی حالت میں روزہ رکھنا اچھا نہیں۔ پس مراد خاص حالت ہے۔ مگر ایسی حالت کی قید تصریحاً نہیں فرمائی۔ کیونکہ قرینہ تخصیص موجود ہے۔ تو اسی طرح اگر کوئی مال کی مذمت کرے تو مطلب یہی ہوگا کہ حُب کے درجہ میں مذموم ہے۔

حقیقتِ حیاتِ دنیا

اسی طرح قرآن شریف سے اس کی تائید لیجئے وما الحیوۃ الدنیا الا لعب ولھو۔ (یعنے دنیاوی زندگی تو کچھ بھی نہیں بجز کھیل کود کے) اس آیت میں حیاتِ دنیا کی مذمت فرمائی ہے اور دوسری جگہ اس کی مدح بھی کی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے

اولم نعمرکم ما یتذکر فیہ — یعنی کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی کہ سمجھ سکتا اس میں وہ شخص جس کو سمجھنا ہوتا۔

تو مطلب یہ ہے کہ حیات دنیا جب بُرے کاموں میں صرف کی جاوے تو وہ لہو ولعب ہے۔ ورنہ اچھی چیز ہے بلکہ حیات تو وہ چیز ہے کہ اُس کی فضیلت کے متعلق خود حضورؐ کا فتویٰ ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ دو شخص ساتھ ایمان لائے۔ اُن میں سے ایک تو جہاد میں شہید ہو گیا۔ دوسرے کا اُس سے ایک ہفتہ بعد انتقال ہوا۔ صحابہ نے اُس کے لئے دُعا کی کہ اے اللہ! اس کو اس کے ساتھی کے ساتھ لاحق کر دیجئے۔ یعنی گو یہ اُس کے درجہ کا نہیں مگر اُس کے درجہ میں پہنچا دیجئے۔ حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو سُنا تو فرمایا کہ اُس کے اس ہفتہ کے عمل کہاں گئے۔ واللہ اُس کے اور اس کے درجہ میں اتنا فرق ہے جیسے زمین اور آسمان میں۔

تو دیکھئے کہ حیات دنیا ایسی چیز ہے کہ صرف ایک ہفتہ کی زیادہ زندگی سے اُس نے اتنی فضیلت حاصل کر لی۔ مگر باوجود اس کے پھر بھی اس زندگی کو لہو ولعب فرمایا۔ تو یہ اسی حالت کے اعتبار سے جب کہ اس کو بُرے کاموں میں صرف کیا جاوے۔ تو دیکھئے حیات کی مذمت ایک خاص حالت کے اعتبار سے ہے۔ حالانکہ وہاں اس قید کی تصریح نہیں ہے۔ پس قرآن سے بھی اس کی تائید ہو گئی کہ بعض اوقات لفظوں میں ایک قید نہیں ہوتی اور ارادہ میں ہوتی ہے۔

ہاں یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت چونکہ لوگ بہت بے خبر ہو گئے ہیں اس لئے بہتر یہی ہے کہ مذمت کرتے وقت حُبّ کا لفظ بڑھا دیا

کریں۔ اور یہاں سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ حضورؐ نے

حب الدنیا راس کل خطیئتہ — یعنی دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے۔

کیوں فرمایا اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ جہاں مطلق دنیا کو فرمایا ہے وہاں بھی یہی مراد ہے۔ ورنہ ارشاد ہے۔

کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ — حلال کمائی فرض ہے، بعد فرائض کے۔

ہاں یہ قید ہے کہ وہ فرض ہے بعد فرض کے۔ دیکھئے کسب الدنیا کو اس جگہ فرض فرما رہے ہیں۔ پس اب سمجھ میں آگیا ہو گا کہ دنیا کو جو ملعون کہا جاتا ہے، اُس سے مراد حُبِ دنیا ہے۔

مقامِ بزرگاں

اب لوگ چونکہ اس کا مطلب نہیں سمجھتے اس لئے کہتے ہیں کہ تو دنیا ہی کو ملعون کہتے ہیں۔ آپ اُن سے خفا ہوتے ہیں لیکن خود دنیا اُن سے خفا نہیں ہوتی کیوں کہ دنیا خود اُن کے پاس آتی ہے۔ تو خفگی میں کیسے آتی اور وہ دنیا طلب کرنے کے لئے کسی کے پاس نہیں جاتے۔ کیا آپ نے کسی بزرگ کو بھی کسی بادشاہ کے دروازے پر دیکھا ہے کہ مانگنے گئے ہوں۔

اگر کہئے کہ گئے ہیں تو وہ ایسے ہی بزرگ ہوں گے جیسے کہ میری تفسیر لکھنے کے زمانہ میں ایک شاہ صاحب بھیک مانگنے آئے تھے۔ بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ کہ ایک جبّہ پہنے ہوئے تھے۔ تسبیح ہاتھ میں تھی اور گلے میں بھی دوازہ

پر کھڑے ہو کر آپ نے سوال کیا۔ مکان سے کوئی چیز بھیج دی گئی۔ آپ نے اُس کو واپس کر دیا کہ میں کوئی معمولی فقیر نہیں ہوں۔ یہ لوں گا وہ لوں گا۔ غرضیکہ وہ جھگڑا کرنے لگے۔ حتیٰ کہ اُن کی آواز مجھ تک پہنچی۔ میں کوٹھے پر بیٹھا ہوا تفسیر لکھ رہا تھا۔ طبیعت پریشان ہونے لگی۔ آخر میں اُدھر سے اتر آیا اور میں نے کہا کہ شاہ صاحب! آپ جھگڑا کیوں کرتے ہیں، جو توفیق ہوئی وہ پیش کر دیا۔ آپ دھمکا کر کہنے لگے ؎

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست   شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

ہر جنگل میں یہ گمان نہ کرو کہ خالی ہے ممکن ہے چیتا سویا ہوا ہو یعنی ہر شخص کی نسبت یہ گمان نہ کرنا چاہیئے کہ یوں حقیر و معمولی شخص ہے۔

میں نے کہا حضرت میں بھی یہی شعر پڑھتا ہوں کہ ؏

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست

آپ کو بھی میری نسبت یہی گمان کرنا چاہیئے۔ اس پر وہ بہت جھلائے اور چلے گئے اور پڑوس سے ایک رزائی یا ایک دری لے گئے۔

تو ان کو یا ایسے لوگوں کو اگر کوئی بزرگ سمجھے تو اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔ بزرگ تو یہ ہیں کہ حضرت غوث پاک صاحبؒ کے پاس ملک سنجر نے لکھا تھا کہ میں ملک نیمروز کا ایک جزو آپ کے لئے مقرر کرنا چاہتا ہوں آپ نے اُس کو نامنظور کیا اور لکھ دیا ؎

چوں چتر سنجری رُخِ بختم سیاہ باد   در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم

چتر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو اگر میرے دل میں ملک سنجر کا وسوسہ بھی ہو۔

زانکہ یافتم خبر از ملک نیم شب — من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

مجھے جب سے ملک نیم شب کی سلطنت حاصل ہے نیمروز کی سلطنت میری نظر میں ایک جو کے برابر بھی نہیں۔

نیم شب اور نیم روز کا کیا اچھا مقابلہ ہے۔ پس بزرگ تو دنیا داروں کے دروازے پر کبھی نہ آئے ہوں گے اور دنیا دار اپنی دنیاوی حاجتیں لے کر پچاس دفعہ اُن کے دروازے پر گئے ہوں گے۔ اب بتلائیے کہ ترک دنیا کیسی چیز ہے کہ تارکین دنیا تو طالبین دنیا کے در پر نہیں جاتے اور طالبین دنیا کو اُن کے در پر جانا پڑتا ہے۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بزبان حال دنیا دار خود اقرار کر رہے ہیں کہ ترک دنیا اچھی چیز ہے۔ اور

اتتہ الدنیا وھی راغمہ — اُن کے پاس دنیا خاک ملتی اور ناک رگڑتی آتی ہے۔

کے یہی معنی ہیں کہ دنیا دار اُن کے پاس آتے ہیں۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ جو شخص دنیا کا طالب ہو اور اس کو حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ تارک دنیا ہو جائے۔ خیر یہ اس پر یاد آ گیا تھا کہ لوگ دنیا کو ملعون کہنے سے بُرا مانتے ہیں۔

احبیت اور محبوبیت کا فرق

اصل مقصود یہ بیان کرنا تھا کہ دنیا مذمت نہیں ہے بلکہ حب د[nia]

کی مذمت ہے۔ دیکھئے اس میں بھی شریعت کا کتنا بڑا احسان ہے کہ حُبِّ دنیا کی قید لگادی اور اُسی کی ممانعت کی اور مطلق دنیا کی ممانعت نہیں کی۔ اس سے زیادہ اور کیا رعایت ہو گی کہ اوّل تو یہیں سے آنسو پونچھ دیئے پھر اور بھی وسعت کی کہ حُب میں بھی تفصیل کر دی یعنی حُب کے دو درجے قرار دیئے۔ اس میں سے صرف ایک درجہ کی ممانعت کی اور دوسرے درجہ کی ممانعت نہیں کی۔ اور یہ ایک آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔

قل ان کان آباؤکم وابناؤکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومسٰکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ۔

یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں تو تم منتظر رہو کہ اللہ تعالےٰ اپنا عذاب بھیج دیں۔

حاصل یہ ہے کہ اگر دنیا کی چیزیں اللہ رسول اور اُن کے احکام سے زیادہ محبوب ہوں تو عذاب کے لئے تیار ہو جاؤ۔ پس اس آیت میں حق تعالےٰ نے ان چیزوں کی احب ہونے پر وعید فرمائی اور محبوب ہونے پر نہیں فرمائی

پس اس سے معلوم ہوا کہ نفس محبوبیت بھی مذموم نہیں ہے اور اس سے اُس حُبِ دنیا کی بھی تفسیر کر دی جس کی حدیث

حب الدنیا راس کل خطیئۃ — یعنی دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے۔

وغیرہ میں مذمت فرمائی ہے کہ اُس سے مراد احبیت (زیادہ محبوب ہونا) کا درجہ ہے۔ اس آیت میں تو یہ بات مصرح ہے کہ نفس حُب مذموم نہیں اور ایک دوسری آیت سے بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو استنباط کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

زین للناس حب الشہوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث ذلک متاع الحیوۃ الدنیا واللہ عندہ حسن المآب۔
یعنی خوشنما معلوم ہوتی ہے لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی عورتیں ہوئیں، بیٹے ہوئے، لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے چاندی کے نشان لگے ہوئے گھوڑے ہوئے، مویشی ہوئے اور زراعت ہوئی۔ یہ دنیاوی زندگی کی استعمالی چیزیں ہیں اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے۔

حضرت عمرؓ کے پاس جب سامان کسریٰ کا آیا تو کروڑوں روپے کا سامان تھا۔ آپ نے دیکھ کر یہ آیت پڑھی جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں ان چیزوں کی محبت مزین کر دی گئی ہے یعنی محبت ان کی طبعی امر ہے اور

یہ سب حیات دنیا کا سامان ہے۔ سو دنیا کی محبت کو امر طبعی فرمایا۔ پس حضرت عمرؓ نے اس آیت کو پڑھ کر یہ دعا کی کہ اے اللہ! اس پر تو ہم قادر نہیں کہ دنیا کی محبت نہ رہے کیونکہ وہ امر طبعی ہے لیکن اے اللہ! ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ یہ محبت آپ کی محبت کی معین ہو جاوے مزاحم نہ ہو۔ پس اس میں فیصلہ کر دیا ہے کہ احبیت (زیادہ محبوب ہونا) مذموم ہے نہ کہ نفس محبوبیت۔ اور احبیت کی تفسیر بھی کر دی کہ جو تیری محبت کے معارض ہو۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ مال بھی اچھا، اس کا کمانا بھی اچھا، اس کی محبت بھی اچھی۔ اسی طرح جاہ بھی مگر ان کی احبیت بُری ہے۔ یعنی دنیا کو خدا اور رسولؐ سے زیادہ محبوب نہ سمجھو

محبت کی علامت

اس کی علامت یہ ہے کہ دین پر دنیا کو ترجیح نہ دو۔ اگر کسی صورت میں دنیا کے حاصل کرنے سے دین کا کوئی حرج ہوتا ہو اور خدا و رسولؐ کے حکم کے خلاف ہوتا ہو تو اس صورت کو چھوڑ دو چاہے دنیا کا کتنا ہی نقصان ہو کیونکہ خدا و رسولؐ کی محبت کی حقیقت کیا ہے۔ یہی تو ہے کہ ہر فعل و ہر قول میں اس کی خوشی کو مقدم اور مطلوب سمجھیں اور اس کا نام محبت نہیں ہے کہ کسی مضمون کو سن کر رونے لگے صرف رونے سے کیا ہوتا ہے ؎

عرفی اگر بگریہ میسر شدی وصال　　صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

یعنی اگر رونے سے وصال محبوب ہو جایا کرے تو سو برس اس کی آرزو میں رو سکتے ہیں۔

سو یہ محبت نہیں ہے کہ مضمون سن کر تو رو دیتے ہیں لیکن نہ اتباع ہے نہ

عمل ہے۔ ہاں یہ بھی محبت کا ایک درجہ ہے ۔ مگر یہ درجہ مطلوب نہیں۔

تعصی الرسول وانت تظہر حبہ ھذا لعمری فی الفعال بدایع لوکان حبک صادقا لاطعتہ ان المحب لمن یحب یطیع۔

یعنی تم رسولؐ کی محبت تو ظاہر کرتے ہو اور پھر اُن کی مخالفت بھی کرتے ہو۔ یہ عجیب بات ہے۔ ایسا کب ہو سکتا ہے اگر تم کو واقعی محبت ہوتی تو تم ضرور اُن کی اطاعت کرتے ۔ کیونکہ جو محب ہوتا ہے وہ محبوب کی اطاعت ہی کیا کرتا ہے۔

سو محبت مامور بہا (جس کا حکم کیا گیا ہو) یہ ہے اور جس کو آپ محبت سمجھ رہے ہیں وہ تو فطری محبت ہے۔ ایسی محبت تو خدا و رسول کے ساتھ ہر شخص کو ہے حتیٰ کہ کفار کو بھی۔ اور یہ خدا کے ساتھ ہونا تو ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کو پہچانے گا اُس کو خدا تعالیٰ کے ساتھ فطری محبت ہو گی۔ باقی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونا، سو وہ اس لئے کہ جو لوگ دشمن ہیں وہ آپ کے اخلاق وغیرہ سے واقف نہیں۔ اُن کو حضورؐ کی سوانح عمری صحیح طور پر نہیں پہنچی۔ تو حضورؐ کو بھی جو پہچانے گا اُس کو آپ کے ساتھ محبت ضرور ہو گی۔ کیونکہ جو محبت کا منشاء ہے یعنے اخلاق حسنہ وہ حضورؐ میں اکمل اور اتم درجہ میں موجود ہیں۔ اس لئے خواہ مخواہ ایک قسم کی محبت ہو جائے گی۔

مثلاً رستم سے ہم کو کیا تعلق ہے کچھ بھی نہیں۔ مگر بچپن میں جو ہم شاہنامہ پڑھا کرتے تھے، اُس میں اُس کی شجاعت و بہادری کا قصہ دیکھ کر دل میں بے اختیار

محبت پیدا ہو گئی۔

سو کافر بھی اگر منصف ہو تو ضرور حضورؐ سے محبت کرے گا۔ پس اگر مسلمان نے بھی ایسی ہی محبت کی جیسی کافر بھی کرتے ہیں تو کیا کمال کیا۔ مسلمان کی تو یہ حالت ہونی چاہیئے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ۔۔۔ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی فدائے تو

یعنی اگر زندہ رکھیں یہ آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر قربان ہوں۔ دل آپ پر فریفتہ ہو گیا ہے جو کچھ کریں آپ سے راضی ہوں۔

پس محبت ایسی ہونی چاہیئے لیکن آج کل یہ بات کہاں ہے۔ جب ہم اقوال و افعال میں حضورؐ کی مخالفت کرتے ہیں تو پھر ہم کو محبت کہاں ہوئی۔ صاحبو! اگر کسی پر عاشق ہو جاویں تو پھر دیکھئے کہ کیا حال ہوتا ہے۔ جو کچھ وہ کہے کرنے کے لئے تیار، نہ مال کا خیال نہ عزت کی پروا۔ تو کسی کے عشق میں تو یہ حال ہے ؎

ترا عشق ہمچوں خودی زآب و گل ۔۔۔ رُباید ہمی صبر و آرام دل

یعنی تمہارا عشق اپنے جیسے پانی اور مٹی سے بنے ہوئے کے ساتھ دل سے آرام و صبر کو دُور کر دیتا ہے۔

اُس پر ایسے دیوانے ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ اپنے ہاتھ سے پیٹ بھی لے تو گوارا ہے۔ اور کچھ رنج نہیں ہوتا۔ کیونکہ ؎

نہ سازد عشق را کنجِ سلامت ۔۔۔ خوشا رسوائی کوئے ملامت

عشق گوشۂ سلامتی کی موافقت نہیں کرتا بلکہ کوئے ملامت کو چاہتا

ہے۔ سو محبوب کے کوچہ کی رسوائی بہت اچھی چیز ہے۔

سو یہاں تو یہ حال ہے اور خدا اور رسولؐ کی محبت میں یہ حالت ہے کہ زبان سے تو محبت کا دعوےٰ ہے مگر اتباع نبویؐ میں ہزاروں خدشے کہ اگر ایسا کریں گے تو یوں طعن ہوگا۔ سو یہ کیسی محبت ہے۔

اگر واقعی محبت ہوتی تو مخالفت ترک کرنے کے لئے اتنی ہی بات کافی تھی کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ ہر ہفتہ میں حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دوبار امت کے اعمال پیش ہوتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امت دعوت سے بھی بہت تعلق تھا تو بھلا امت اجابت سے تو کتنا ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جتنا تعلق ہوتا ہے ویسا ہی اس کی تباہی سے صدمہ ہوتا ہے اور دل دکھتا ہے۔ تو اگر ہم کو حضورؐ کے ساتھ واقعی محبت ہوتی تو ہم محض اس خیال سے کہ جب حضورؐ کے سامنے ہماری نافرمانیاں پیش ہوں گی تو حضورؐ کا دل دکھے گا، اپنی ان حرکات سے باز آجاتے۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ و رسولؐ کی محبت مامور بہا یہ ہے کہ عمل اور اطاعت کی محبت ہو۔ پس جب یہ بات معلوم ہو گئی۔

احبیت کی علامت

تو اب یہ سمجھنا چاہیے کہ احبیت جو کہ مطلوب ہے اس کی علامت کیا ہے۔ تو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ دو حالتیں ہیں۔ ایک تو وہ کہ جہاں دونوں کا اجماع ہو سکتا ہے یعنی دین و دنیا دونوں حاصل ہو سکتے ہیں۔ تو اس حالت میں تو معلوم نہیں ہوگا کہ

ان میں زیادہ محبوب اُن کے نزدیک کون سی شے ہے۔ اور دوسری حالت یہ ہے کہ دین و دنیا میں تعارض ہو اور دونوں کا اجتماع نہ ہو سکتا ہو۔ تو اس حالت میں معلوم ہو جاوے گا کہ یہ کس کو زیادہ محبوب رکھتا ہے۔

دیکھئے اگر آپ کو دو دوستوں سے محبت ہو اور آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ ان دونوں میں سے کس کی محبت زیادہ ہے تو یہ اُس وقت معلوم ہو گی جب کہ ان دونوں میں لڑائی ہو جاوے۔ جس سے زیادہ محبت ہو گی آپ اُسی کے ساتھ ہو جاویں گے۔

اسی طرح دین و دنیا میں جب تعارض ہوا کہ اگر دین کی رعایت کرتے ہیں تو دنیاوی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اور اگر دنیا کی طرف جاتے ہیں، تو دین کے خلاف ہوتا ہے۔ تو اس صورت میں اب جس کا اتباع کرو گے اُسی کا محب ہونا متعین ہو جاوے گا۔ پس اگر اس صورت میں دین کو ترجیح دی تو ظاہر ہو جاوے گا کہ اس کو دین زیادہ محبوب ہے۔ اور اگر دنیا کو ترجیح دی، تو ظاہر ہو جاوے گا کہ اس کو دنیا زیادہ محبوب ہے۔ جس کی حق تعالیٰ نے ممانعت فرمائی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہر شخص پر یہی واجب ہے کہ ایسی صورت میں دین ہی کو ترجیح دے۔

لیکن اب ایک جماعت اس کے خلاف فیصلہ کرتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ دنیا کو لو اور دین کو چھوڑ دو۔ مسلمان کے قلم سے یہ فیصلہ نہایت ظلم کا فیصلہ ہے۔ اس پر شاید کوئی صاحب یہ شبہ کریں کہ نہیں، یہ تو کون کہہ سکتا ہے کہ دنیا کے مقابلے میں دین کو چھوڑ دینا چاہیئے مگر بعض مرتبہ مجبوراً چھوڑنا پڑتا ہے مثلاً

ایک نوکری ہے سو روپے کی اور ایک ہے پانچ سو روپے کی۔ مگر سو والی حلال ہے اور پانچ سو والی حرام۔ تو اب یہاں بوجہ اس کے کہ سو روپے میں اخراجات پورے نہیں ہوتے ہیں مجبوراً دین کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ تو یہ اس وجہ سے نہیں کہ دنیا دین سے زیادہ محبوب ہے بلکہ ضرورتوں سے مجبور ہو کر چھوڑتے ہیں۔ گو چھوڑتے ہوئے دل بہت دکھتا ہے۔ تو علماء سے جو اس کے متعلق کہتے ہیں سو وہ ایک فریاد ہے فیصلہ نہیں ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو یہ فریاد عام نہیں بلکہ زیادہ تر وہ جماعت ہے کہ دین کے چھوڑ دینے سے ان کا دل نہیں دکھتا اور نہ حسرت ہوتی ہے، نہ ندامت، نہ اپنے کو خطاوار سمجھتے ہیں بلکہ نہایت کوشش اور شوق سے یہ رائے پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اور یوں کہتے ہیں کہ اب معاملات کو وسعت ہو گئی ہے لہٰذا اب احکام کو بھی بدل دینا چاہیئے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ اب اخباروں میں بھی اس قسم کے مضمون شائع ہونے لگے چنانچہ مصر سے ایک اخبار آتا ہے اس میں بھی ایک سرخی تھی۔

رعایۃ الاصلح فی الشرع شرع میں اصلح کی رعایت

اور اس سرخی کے ذیل میں ایک مضمون اسی قسم کا لکھا ہوا تھا اور اس کی عبارت عربی تھی تاکہ لوگ یہ خیال کریں کہ جب یہ عربی میں ہے تو ضرور صحیح ہوگا۔ مگر کیا عربی عبارت میں جو مضمون ہو وہ صحیح ہوتا ہے۔

اس پر مجھے یاد آیا کہ ایک ہمارے دوست تھے قاری مغیث الدین انہوں نے مجھ سے اپنا قصہ بیان کیا کہ جب منیۃ المصلی پڑھتے تھے اس وقت

اُنہوں نے یہ مسئلہ پڑھا کہ کلام ناس سے نماز ٹوٹ جاتی ہے پس آپ نے کیا کیا کہ ایک مرتبہ مغرب کی نماز ہو رہی تھی۔ امام کو سہو ہوا کہ پہلے قعدہ کو اخیر قعدہ سمجھ کر بہت دیر تک جلوس کیا۔ آپ نے سوچا کہ اُردو میں تبلانے سے تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ لاؤ عربی میں کہہ دو۔ پس آپ نے کہا قسم دکھڑے ہو جاؤ۔ خیر اُن کے کہنے سے امام کو بھی یاد آگیا کہ یہ پہلا قعدہ ہے اس لئے وہ کھڑا ہو گیا اور سلام پھیرنے کے بعد کہا کہ یہ قسم والے کون تھے۔ آپ بولے میں تھا۔ اُنہوں نے کہا تم نے نماز میں کلام کیوں کیا۔ آپ فرمانے کیا ہیں کہ میں نے تو عربی میں کہا تھا یہ کوئی کلام ناس تھوڑا ہی ہے جس سے نماز فاسد ہو جاوے۔ تب اُن کو کلام ناس کا مطلب سمجھایا گیا۔

سو بہت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جو عربی میں ہو وہ سب ٹھیک ہے اجی عربی زبان میں تو گالیاں بھی ہیں تو گالیاں بھی ٹھیک ہیں۔ تو مضمون چاہے عربی میں ہو چاہے انگریزی میں اس میں سب یکساں ہیں کہ جو حق ہے حق ہے اور جو باطل ہے باطل ہے پس اس قسم کے پرچے نکلنے لگے ہیں۔

میں نے ایک زمانہ میں اخبار کے متعلق کچھ لکھا تھا کہ اخبار ہرگز نہ دیکھنا چاہیئے۔ اس پر اعتراض ہونے لگے کہ لو صاحب اخبار کو بھی منع کرتے ہیں اور واقع میں میں اخبار کو منع نہیں کرتا بلکہ اُن انشادات کو جو ایڈیٹر صاحب کی مثلاً خاص الخاص تحقیقات ہوتی ہیں۔ جو اکثر مذہب کے خلاف ہوتی ہیں چنانچہ میں نے ایک اخبار میں دیکھا کہ یہ رائے دی تھی کہ مذاہب کے اختلاف کو تو بالکل اُٹھا دینا چاہیئے۔ اس طرح کہ ایک مذہب بیچ بیچ میں تجویز کیا جائے

جس میں ہر مذہب کی رعایت ہو اور اس کو تجویز بھی کر دیا کہ شاید اگلی نسلیں مان لیں۔ اُس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو یہ چاہیئے کہ صرف توحید لیں اور رسالت کو جزو مذہب نہ بنائیں اور دوسرے مذہب والوں کو چاہیئے کہ کم از کم توحید کو ضرور مان لیں۔ اور لکھا تھا کہ اگر یہ مذہب عام ہو جائے تو یہ روز روز کی لڑائی کٹائی نہ ہو۔ سو ایسے لوگ بھی ہیں میں تو ان کی نسبت کہا کرتا ہوں ؎

گربہ میر و سگ وزیر و موش را دیواں کنند

ایں چنیں ارکانِ دولت ملک را ویراں کنند

یعنی اگر بلی حاکم، کتا وزیر اور چوہا دیوان کر دیا جائے تو یہ ارکان دولت ملک کو ویران کر دیں گے۔ یعنی نا اہلوں کو اگر دین کے کام سونپے جاویں تو وہ دین کو برباد کریں گے۔

پس میں جو اخبار دیکھنے کو منع کرتا ہوں تو ایسے اخباروں کو۔ اور ان کو دیکھنا واقعی مذموم ہے۔ اگر اخبار دیکھنے کا شوق ہو تو اُن کے علمی مضامین جن میں ایڈیٹر صاحبان کی تحقیقات اور مذاہب کے متعلق رائیں ہوتی ہیں، چھوڑ دیا کرو۔ خیر اس کا ذکر تو استطراداً ہو گیا۔

اصل مقصود میرا یہ تھا کہ زیادہ لوگ اسی قسم کے ہیں کہ وہ شوق سے ایسا کرتے ہیں۔ اُن کا دل نہیں دکھتا۔ پس اُن کے دل میں تو دنیا کی محبت ظاہر ہے۔ پس اُس کا یہ کہنا تو فریاد ہو بھی نہیں سکتا۔ مگر کچھ لوگ پرانی وضع کے بھی ہیں وہ البتہ اس کو ناجائز ہی سمجھتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں کہ اگر اس صورت میں دنیا کو چھوڑیں تو گاڑی اٹکتی ہے لیکن ان میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ کچھ تو ایسے ہیں

کہ جتنے اخراجات درحقیقت ضروری ہیں اُن کے موافق تو آمدنی ہے، مگر فضول اخراجات بڑھا رکھے ہیں اور اُن کی ضرورت گھڑلی گئی ہے۔ اس کا اندازہ یوں ہوگا کہ گھر میں جا کر دیکھو کہ کتنی چیزیں جمع ہیں اور اُن میں کس قدر چیزیں کام کی آتی ہیں۔ عاقل شخص کو عرف کا پابند نہ ہونا چاہیئے کہ آج کل مونڈھے کرسیاں وغیرہ بھی ضروری ہوگئی ہیں۔ پس جب آپ اس نظر سے چیزوں کو دیکھیں گے تو آدھی سے زیادہ چیزیں آپ کے گھر میں ایسی نکلیں گی کہ اُن کے ہونے کی خبر بھی آپ کو نہ ہوگی۔ تو اب آپ ہی بتلایئے کہ کیا یہ چیزیں بھی ضروری ہیں۔ ضروری تو وہ چیزیں ہوتی ہیں جن کے نہ ہونے سے تکلیف ہو اور اُن کا معیار آسانی کے لئے بتلاتا ہوں کہ جتنی چیزیں سفر میں انسان ساتھ لیتا ہے بس وہ ہیں ضروری۔ سفر میں کیا کوئی ضروری چیز کم ہو جاتی ہے۔ نہیں بلکہ بعض چیزیں اس میں بھی ضرورت سے زاید اور فضول ہو جاتی ہیں۔ پس یہ ہے ضروری سامان۔ سو ظاہر ہے کہ ہر شخص کے گھر میں اتنا سامان نکلے گا جو اس مقدار سے بہت زیادہ ہوگا۔ اسی کو صائب کہتا ہے ؎

حرص قانع نیست صائبؔ ورنہ اسبابِ معاش
آنچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست

یعنی حرص کی وجہ سے قناعت نہیں ہے ورنہ اسباب معاش جو ہمارے پاس موجود ہیں ان میں اکثر ایسے ہیں جن کی ضرورت نہیں ہے

پس ضروری اخراجات تو معلوم ہو گئے۔ اب ان سے زائد جو کچھ ہو وہ بیکار ہے۔ سو جن کو اتنا ملتا ہے، تو یہ سوال کرہی نہیں سکتے۔ اب وہ رہ

گئے جن کو اتنا بھی نہیں ملتا۔ اُن کی فریاد البتہ سُنی جاوے گی۔ اور کہا جائے گا کہ میں آپ سے فی الحال اُس نوکری کے چھوڑنے کو نہیں کہتا مگر اتنا تو کیجئے کہ اپنے کو گنہگار سمجھئے اور استغفار کیجئے اور یہ دُعا کیجئے کہ اللہ مجھے اس سے نجات دیجئے اور حلال نوکری کی تلاش میں رہئے۔ اگر آپ حلال نوکری نہ ملنے کی وجہ سے پھر بھی اس میں مبتلا رہیں گے تو بھی کم سے کم اتنا تو فائدہ ہے کہ آپ دنیا کو ترجیح دینے والے تو نہ ہوں گے اور آپ کے اندر دنیا کی احبیت تو نہ ہوگی اب اس کے بعد ترجیح کا کیا عذر رہا۔ اب تو سارے عذر ختم ہو گئے اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ دنیا کو ترجیح دینا کسی وقت بھی جائز نہیں۔

رعونت کی علامت

ایسے لوگ جن کو اتنا ضروری سامان بھی نہ ملتا ہو واقع میں بہت ہی کم ہیں ورنہ زیادہ تو ایسے ہی لوگ ہیں کہ اُن کو ضرورت نہیں۔

میں نے ایک منصرم کو دیکھا ہے جن کی پچاس روپیہ تنخواہ لیکن کچہری ہمیشہ پیادہ جاتے اور لوگ فٹن میں جاتے تھے اور مدرسوں میں چندے اور رشتہ داروں کی تنخواہیں مقرر کر رکھی تھیں اور جب اُن کی پنشن ہوئی تو اخراجات بھی آدھے کر دیئے اور جتنا مدرسوں اور رشتہ داروں کو دیتے تھے اُس کو بھی آدھا کر دیا۔ آخر یہ بھی تو اپنی ضروریات تھوڑے میں انجام دیتے ہی تھے۔ باقی رہا فٹن وغیرہ پر سوار ہونا تو یہ کون سے ضروریات سے ہے۔

میں تو فٹن کو فتن (فتنوں) میں داخل سمجھتا ہوں اور اس قسم کی جتنی بھی چیزیں ہیں ان میں کوٹ کوٹ کر کبر اور رعونت بھری ہے۔ وضع بھی ایسی، سواری بھی

ایسی، غرض ہر سامان میں سے رعونت ٹپکتی ہے اور جو شخص چاہے اس کا احساس کر سکتا ہے۔ جو لوگ ان کا استعمال کرتے ہیں اُن کی حالت دیکھ لیجئے کہ اُن کے اندر کیسی رعونت آجاتی ہے۔

اس رعونت پر ایک قصہ یاد آگیا۔ ایک شخص ولایت سے پڑھ کر آئے تھے۔ وہ جب اپنے آبا جان سے ملے تو کہتے ہیں ویل بڈھا تم اچھا ہے۔ پھر ایک تیسری بات اور بھی ہے کہ یہ فعل ہمدردی کے بھی خلاف ہے۔ نئے فیشن کی جتنی چیزیں ہیں اکثر اسی قسم کی ہیں کہ اُن سے خود ہی منتفع ہو سکتا ہے۔ دوسرے کو اس کا نفع نہیں ہوتا۔ چارپائی اور کرسی ہی کا فرق دیکھ لیجئے کہ چارپائی تو ایسی چیز ہے کہ اُس پر اگر ایک جماعت بیٹھی ہو اور ایک آدمی اور آجائے اُس میں اُن کی بھی گنجائش نکل آئے گی اور ایک کرسی ہے کہ اُس میں اپنے ساتھ ایک کو بھی نہیں بٹھا سکتے۔ اسی طرح عمامہ کہ اگر ہم چاہیں تو پھاڑ کر ایک حصہ اُس میں سے اپنے بھائی کو دے دیں مگر آپ گلوبند میں سے تو پھاڑ کر دے دیجئے غرض نئے فیشن کی اکثر چیزیں وہ ہیں کہ اُن میں سراسر خود غرضی ہے۔ تو خلاف ہمدردی ہی سمجھ کر چھوڑ دیجئے۔ یا اگر بالکل نہ چھوڑیں تو کم ہی کر دیجئے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم بُرا ہی سمجھ لیجئے۔

غرض کہ ان چیزوں میں بہت سے مفاسد ہیں اور سب سے بڑا مفسدہ یہ ہے کہ اخراجات بڑھتے ہیں۔ پس یہ تو اُن کا بیان تھا کہ دنیا و دین میں تعارض ہونے کے وقت کیا برتاؤ کرنا چاہیئے اور اسی طرح جاہ میں بھی معمول رکھنا چاہیئے کہ جو صورتیں جاہ کی خلاف شریعت ہیں اُن سے بچنا چاہیئے۔

ضرورت کی چیزیں

بس اب شکایت یہ ہے کہ بچنا تو درکنار اس کو بُرا بھی نہیں سمجھتے۔ تو اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ ایک تو علم کی کیونکہ جب تک اُن کی بُرائی کا علم نہ ہوگا۔ تو اس وقت اُن کو بُرا کیسے سمجھے گا۔ پس علم دین سیکھنا چاہیئے خواہ اردو ہی میں ہی ہو اور ایک عمل اور ہمّت کی۔ اس پر تو عقلاً موقوف ہے۔ اور ایک تیسری چیز کی ضرورت ہوگی۔ اور وہ ضرورت عادی ہے۔ گو عقلاً وہ موقوف علیہ نہیں ہے اور وہ اہل اللہ کی صحبت ہے کیونکہ جس ہمّت کی ضرورت مذکور ہوئی ہے۔ وہ ہمّت اہل اللہ کی صحبت ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ تو ضرورت اس کی بھی ہے کہ اہل اللہ کی صحبت میں جاوے۔ پس علم دین بھی حاصل کیجئے اور اہل اللہ کی صحبت بھی اختیار کیجئے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ سب ابو حنیفہؒ اور جنید بغدادیؒ ہو جاویں مگر ضروری علم دین تو حاصل کریں اور جب موقع ملتا جاوے اہل اللہ کی صحبت میں رہا کریں اس سے جذبات روحانیہ میں ایک قسم کی قوت پیدا ہوگی۔ اس سے آپ اپنی پُرانی حالت پر آنسو بہائیں گے اور اُس کے جاتے رہنے سے آپ کو تاسف ہوگا۔ اور اصلاح کی فکر ہوگی اور یہ بھی اللہ ورسولؐ کی احبیت ہے۔

غرض جاہ ہو یا مال ہو ان کی احبیت نہ ہوتی چاہیئے۔ اسی پر وعید فرماتے ہیں فتربصوا کہ منتظر رہو یہاں تک کہ کوئی وبال نازل ہو اور اس کا وبال دنیا میں تو یہ نازل ہوا کہ دنیا ہی سب سے اوّل برباد ہو رہی ہے چنانچہ دنیا کو جس قدر طلب کرتے ہیں مگر وہی دنیا ہم سے چلی جا رہی ہے اور ہم تو کیا ہماری

سلطنتوں کی بھی یہی حالت ہے کہ دین کے چھوڑنے کی وجہ سے برباد ہو رہی ہیں اور وہ خود بھی اس کو سمجھ رہے ہیں کہ یہ تباہی دین چھوڑنے کی بدولت ہے اور کیوں نہ ہو دین چیز ہی ایسی ہے کہ اس سے آخرت بھی درست ہوتی ہے اور دنیا میں بھی ترقی ہوتی ہے۔

دیکھئے شیخ سنوسی ایک افریقی بدو تھے جو دین کی حمایت کے لئے آئے تھے۔ اب اُن کی بدولت صاحب سلطنت ہو گئے اور ایک وہ اسلامی قاہر سلطنت ہے کہ دین کے چھوڑنے کی وجہ سے دبتی چلی جا رہی ہے اور دین کا چھوڑنا اس سے زیادہ اور کیا ہو گا کہ میں نے سُنا ہے کہ اُن کی پارلیمنٹ میں ایک مرتبہ یہ گفتگو ہوئی کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہر فرقہ سے ہونے چاہئیں تاکہ رعایا میں مساوات رہے۔ پس جب کہ پارلیمنٹ کے اجزاء غیر مذہب کے لوگوں کو بنایا کہ جن پر خیر خواہی کا اطمینان بھی نہیں محض مساوات کے دعویٰ میں تو پھر ایسی سلطنت کو کیا عروج ہو سکتا ہے۔ بے شک شریعت مساوات سکھلاتی ہے مگر مطلق مساوات نہیں بلکہ اس کی ایک حد مقرر ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری کا میر منشی ایک نصرانی تھا جب وہ حضرت عمر فاروقؓ سے ملنے آئے تو آپ نے فرمایا کہ تم نے یہ آیت نہیں پڑھی۔

لا تتخذوا بطانۃ من دونکم لا یألونکم خبالا

یعنی غیر مذہب کے شخص کو اپنا ہمراز مت بناؤ۔ وہ تم کو ضرر پہنچانے میں کمی نہیں کریں گے۔

اُنہوں نے کہا کہ وہ حساب خوب جانتا ہے اس لئے ایسا کیا حضرت

عمرؓ نے فرمایا کہ کیا کام اُن پر منحصر ہے۔ اگر وہ مر جائے تو پھر کیا کرو گے
آنجمہ میں جا کر دیکھا کہ وہ مر گیا تھا۔ کیوں نہ ہو کوئی ایسی ویسی زبان تھوڑا ہی
تھی۔ وہ زبان تھی جس کی شان میں ہے۔

الحق ینطق علی لسان عمر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان
پر حق بات جاری ہوتی تھی۔

غرض کہ غیر مسلم کو ہمراز بنانے کی حق تعالیٰ نے ممانعت فرمائی ہے اور
خود عقل بھی تو اس کی اجازت نہیں دیتی۔ چنانچہ دیکھئے کہ روزمرہ کے معاملات
میں کیا ہم پسند کرتے ہیں کہ اپنے راز پر غیر کو مطلع کریں، ہرگز نہیں بعض اوقات
اپنے اسرار سے بیوی کو بھی مطلع نہیں کرتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اُنہوں نے دین کو چھوڑا اور اس کی ایسی برکت ہوئی
کہ مدتوں بھی اس کا خمیازہ نہ بھولیں گے۔ واللہ لوگ سمجھتے تو یہ ہیں کہ دین کو
چھوڑ کر ترقی ہوگی مگر خدا تعالیٰ دکھلا دیتے ہیں کہ وہ بھی حاصل نہ ہوا جس کے
لئے اُنہوں نے دین کو چھوڑا۔ سو اس قاہر سلطنت کی تو دین کے چھوڑنے
سے ایسی تباہی ہوئی اور ان بدوی کو دیکھئے جو دین کی حمایت کو آئے تھے
کہ وہ صاحب سلطنت ہو گئے اور یہ زندہ نظیریں ہیں اس امر کی کہ طالب دین
ہر طرح کی ترقی کر سکتا ہے۔ اور الحمد للہ کہ اب اس کو عقلاً مان بھی گئے ہیں
لہذا تطویل کی ضرورت نہیں۔

پس اعبدیت دین کی اعتقاداً تو ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور اگر
ممکن ہو تو عقلاً بھی ورنہ تاسفاً ہی سہی۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کو چھوڑیئے اور اگر

مجبوری کے سبب نہ چھوڑ سکیں تو برا تو کہئے۔ یہ ہے فیصلہ اس کا۔ اب میں اصل مقصود تو عرض کر چکا ہوں صرف آیت کے بعض اجزا کا حل رہ گیا ہے وہ بھی عرض کرتا ہوں۔

تفسیری نکات کہ مال کے قصہ میں تو منافقین کے اس قول کے جواب کے ختم میں۔

لا تنفقوا علیٰ من عند رسول اللہ حتّٰی ینفضّوا۔ — یعنی جو لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہیں ان پر مت خرچ کرو یہاں تک کہ وہ آپ منتشر ہو جائیں گے

لا یفقھون (وہ سمجھتے نہیں ہیں) فرمایا اور آگے جاہ کے قصہ میں اُن کے جواب کے خاتمہ میں لا یعلمون (وہ جانتے نہیں ہیں) فرمایا۔ اس میں ایک نکتہ ہے کہ فقہ خاص ہے علم سے۔ فقہ تو خاص ہے امور خفیہ کے ساتھ اور علم عام ہے جلی کے لئے بھی پس اب اس کی وجہ سمجھ میں آگئی ہوگی۔ کیونکہ مال کے قصہ میں ارشاد فرمایا ہے۔

وللہ خزائن السمٰوات والارض — یعنی آسمان اور زمین کے تمام خزانے خدا تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں۔

سو اس کے لئے تو سمجھ کی ضرورت ہے کیونکہ بظاہر تو وہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ پس یہاں تامل کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر ہمارے ہاتھوں میں ہونے کے اسباب کس کے ہاتھ میں ہیں۔ پس چونکہ یہ ذرا خفی اور استدلالی

کا محتاج تھا۔ اس لئے یہاں لا یفقھون فرمایا اور جاہ کے قصہ میں ارشاد فرمایا ہے۔

وللہ العزۃ ولرسولہ و للمؤمنین — یعنی عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنین ہی کیلئے ہے

اور یہ بالکل ظاہر تھا۔ خدا تعالیٰ کے لئے عزت ہونا تو اس لئے کہ عالم کے اندر جو تصرفات ہوتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ہمارے اختیار میں نہیں۔ مثلاً زلزلہ ہے اور بارش ہے۔ اب اگر کہئے کہ یہ سب کچھ صورت نوعیہ کی وجہ سے ہوتا ہے تو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ اس بات کو تو وہ خود ہی تسلیم کرتے ہیں کہ طبیعت اور نیچر ذی شعور نہیں تو میں کہتا ہوں کہ طبیعت کو فاعل قرار دینے کی مثال ایسی ہوگی جیسے کہ دو شخصوں نے ایک خوبصورت گھڑی دیکھی۔ اس پر تو دونوں کو اتفاق ہوا کہ اس کو کسی نے بنایا ہے لیکن اس میں اختلاف ہوا کہ کس نے بنایا ہے۔ ایک نے تو یہ کہا کہ بالکل اندھے، لنجے، لنگڑے بے شعور نے بنایا ہے اور ایک نے یہ کہا کہ کسی بڑے عقلمند اور کامل گھڑی ساز نے بنایا ہے۔ تو ظاہر بات ہے کہ یہ دوسرا شخص حق کہتا ہے تو جیسا ان دونوں میں فرق ہے ایسا ہی مسلمان اور اہل [illegible] میں فرق ہے کہ اہل اسلام تو ان تمام مصنوعات عجیبہ کا اللہ تعالیٰ کو فاعل کہتے ہیں اور اہل [illegible] طبیعت کو جس کو کچھ شعور تک بھی نہیں۔ وہ خدا کے قائل نہیں اور اگر وہ یہ کہیں، کہئے کہ ہم خدا کے بھی قائل ہیں اور طبیعت کے بھی۔ تو میں کہتا ہوں کہ جب خدا تعالیٰ کو فاعل مانتے ہیں تو اس کے ساتھ طبیعت کے فاعل ماننے کی ضرورت ہی نہیں

ورنہ اس کی مثال ایسی ہو گی کہ کوئی کہے کہ اس گھڑی کو ایک کامل اور ایک اندھے نے مل کر بنایا ہے۔ تو اس احمق سے کہا جاوے گا کہ کامل کے ساتھ اس اندھے کے ماننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ پس ایک شخص جمع نہیں کر سکتا خدا اور سائنس کو۔ پس خدا کا غلبہ تو اس سے ثابت ہو گیا۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا غلبہ حضورؐ کے واقعات سے ظاہر ہے۔ باقی وللمومنین یعنی مومنین کا غلبہ، تو اس کو جب چاہے تجربہ کر لیجئے کہ جتنا ایمان ہو گا اتنی ہی عزت بھی ہو گی۔ چنانچہ صحابہ کرام اس کا نمونہ ہیں۔ ان کے ایمان کی حالت یہ تھی کہ حق تعالیٰ اُن کے حق میں ارشاد فرماتے ہیں۔

الذین ان مکنا ھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ — یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں۔

اور ان کے غلبہ کی یہ حالت تھی کہ تمام قومیں اس کی قائل ہیں کہ ان کے برابر کوئی قوم ترقی یافتہ نہیں ہوئی۔ اور اگر آپ یہ کہیں کہ یہ نمونے بہت پُرانے ہو گئے ہیں تو اب بھی دیکھ لیجئے کہ جو مسلمان اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں اُن کی کتنی عزت ہے خیر خواہانِ ترقی کی نگاہ میں بھی وہ مخفی نہیں ہے اور وجہ یہ ہے کہ اصل تو خدا کی عزت ہے۔ پھر جو لوگ اُن کے ساتھ وابستہ ہوں گے، اُن کی بھی عزت ضرور ہو گی۔ اگر کسی کو خدا ہی کی عزت کی خبر نہ ہو، تو دوسری بات ہے۔

تو خلاصہ یہ ہوا کہ مالک الاموال ہونا چونکہ کسی قدر مخفی تھا اس لئے

وہاں لا یفقھون (وہ سمجھتے نہیں) فرمایا اور صاحب عزت ہونا ظاہر تھا۔ اس لئے وہاں لا یعلمون (وہ جانتے نہیں) فرمایا۔

نیز اس سے ایک اور مسئلہ ثابت ہوا کہ مال تو اس واسطے ہے کہ اُس سے انتفاع حاصل کیا جاوے اور جاہ اس واسطے ہے کہ اُس کے ذریعہ سے اپنے کو ضرر سے بچایا جاوے نہ اس لئے کہ اُس کے ذریعہ سے لوگوں پر دباؤ ڈال کر انتفاع حاصل کیا جاوے

اوّل کی تو یہ دلیل ہے کہ جب منافقین نے کہا کہ مسلمانوں پر خرچ مت کرو تاکہ جب کھانے کو نہ ملے گا خود منتشر ہو جاویں گے۔ تو اس پر اللہ تعالےٰ نے یہ رد فرمایا کہ خزائن کے مالک تو ہم ہیں تم اپنے مالوں سے اُن کو منتفع نہ کرو گے تو ہم اپنے خزائن سے اُن کو دیں گے تاکہ وہ اس سے منتفع ہوں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ مال انتفاع کے لئے ہے۔

دوسری جزو کی یہ دلیل ہے کہ منافقین نے اپنے جاہ سے مسلمانوں کو ضرر پہنچانا چاہا تھا تو حق تعالیٰ نے اُس پر رد فرمایا کہ عزت تو اللہ اور رسولؐ اور مومنین کے لئے ہے یعنی چونکہ ہم نے اُن کو جاہ عنایت کی ہے اس لئے تم ان کو ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ مومنین اس جاہ سے تمہارے ضرر کو دفع کر دیں گے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ جاہ دفع ضرر کے لئے ہے۔

اب میں بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے جو مضمون بیان سے مقصود تھا اُس کا اعادہ پھر کئے دیتا ہوں کہ اس آیت میں یہ بات بتلائی گئی ہے کہ مال اور جاہ تو مذموم نہیں لیکن اگر ناجائز طور پر اُن کا استعمال ہو، تو مذموم

ہیں۔ پس جو لوگ مال اور جاہ کو علی الاطلاق مذموم کہتے ہیں۔ اُن کو چاہیے کہ اس میں یہ قید لگا دیں۔ جو لوگ علی الاطلاق اچھا کہتے ہیں وہ سوءِ استعمال کی صورت کو مستثنیٰ کریں یہ تو تحقیق علمی تھی۔

مگر چونکہ مقصود عمل ہے اس لئے اب طرزِ عمل سننا چاہیے کہ جہاں دین و دنیا میں تعارض نہ ہو وہاں خوب کمائے اور جہاں تعارض ہو وہاں قدر ضرورت سے زیادہ کو چھوڑے اور جہاں یہ بھی نہ ہو سکے وہاں تاسف کرے۔ پس اب آپس میں اختلاف بھی نہ رہے گا نہ گناہوں کے پوٹ جمع ہوں گے۔

اب میں اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ سے دُعا فرمایئے کہ عمل کی توفیق اور دین کی اہمیت عطا فرمائے۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

تتمہ:۔ اور فرمایا کہ اوّل آیت میں

للہ خزائن السمٰوات — اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں خزانے آسمانوں کے۔

فرما کر اموال کو اپنے ساتھ خاص فرمایا اور آیت ثانی میں عزت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے لئے بھی ثابت فرمایا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کا مالدار ہونا تو لازمی امر نہیں گو اتنا مال ہر ایک کو ملے گا جس سے اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ اور اس قدر ملنا یہ بھی خود اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ مقصود رد کا یہ ہے کہ انفضاض (منتشر ہونا) نہ ہوگا۔ اور یہ اس وقت ممکن ہے کہ حاجات مرتفع ہوتی رہیں، ورنہ اُن منافقین کا مقصود حاصل ہو جاتا۔ اور

صاحب عزت ہونا کامل مسلمان کا لازمی امر ہے۔ فقط!

اشرف علی!

احکام المال

مال کی آمد و خرچ کے احکام کے متعلق یہ وعظ ۱۴ ر رجب ۱۳۳۷ھ
کو بھوپال ہاؤس لکھنؤ میں کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا۔ ۵۰۰ کی حاضری
تھی۔ پونے پانچ گھنٹے میں ختم ہوا محمد یوسف ولد مرداں علی ساکنہ محلہ
قاضیاں بجنور نے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا فریقاً من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون ۝

معاملات میں معصیت

یہ ایک آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے معاملات مالیہ کی حفاظت اور اُس کی تصحیح کے متعلق مضمون ارشاد فرمایا ہے۔ ضرورت اس وقت اس کے اختیار کرنے کی یہ ہوئی کہ کم وبیش دنیا ہر شخص کے پاس موجود ہے اور اُس کو معاملہ کرنے کی ضرورت بھی واقع ہوتی ہے اور حق تعالیٰ نے معاملات مالیہ کی تصحیح کا اہتمام فرمایا ہے پس ہر شخص کو تصحیح معاملات کی ضرورت ہے۔ مگر باستثناء شاذ کے کوئی اس کو ضروری نہیں سمجھتا اور یہ نہیں خیال کرتا کہ معاملات مالیہ کی رعایت نہ کرنے سے بھی معصیت ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں جو معاصی پیدا ہوتے ہیں اُن کا ظاہر میں کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا اور اُن کے علاوہ جو معاصی ہیں اُن کا اثر ظاہر میں بھی محسوس ہوتا ہے پس اگر کسی کی حقائق پر نظر ہے تو وہ ان معاصی کا اثر اور اُن کے قبائح دیکھ

کر متنبہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک غیبت ہی ہے کہ اُس کا اثر ہے نا اتفاقی ہو جانا آپس میں مناقشات پیش آ جانا۔ اُس کی وجہ سے پریشانی ہونا۔ اس لئے اس میں معصیت کا رنگ صاف نظر آتا ہے یا مثلاً ڈاکہ ہے کہ اس میں سزائیں ہوتی ہیں۔ یہ خرابیاں اس میں آنکھوں سے نظر آتی ہیں جو باعث ہو جاتی ہیں اُن کے قبیح سمجھنے کا۔ اس لئے انسان اُن کو چھوڑ دیتا ہے اور معاملات مالیہ میں یہ صورت پیش نہیں آتی۔ اس لئے اُن کے معاصی ہونے پر متنبہ نہیں ہوتا۔ اگر حقوق مالیہ کے تلف ہونے پر بھی آثار ظاہر ہوتے اور رسوائی وغیرہ ہوتی تو اُن کے قبح پر بھی تنبہ ہو جاتا جو محرک ہوتا اُن کے ترک پر۔ اگر دینی مصلحت کی وجہ سے ان سے محترز نہ ہوتا تو خیر دنیا ہی کی حفاظت کی غرض سے ہوتا مگر یہاں یہ بھی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ اور جتنے معاصی ہیں اُن پر تنبہ ہوتے کے اسباب مجتمع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اکثر اُن پر تنبہ ہو جاتا ہے اور یہاں یہ سبب نہیں اس لئے اُن کی ذرّہ برابر بھی پروا نہیں کی جاتی۔

ریلوے کی حق تلفی

عوام الناس کا تو فتویٰ ہی ہے کہ کفار کا مال جس طرح بھی ملے لے لیا جائے سب روا ہے۔ چنانچہ ریل میں سب بے احتیاطیوں کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس طرف توجہ ہی نہیں کہ تعداد سے زیادہ اسباب ریل میں لے جانا چاہئے یا نہیں؟ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ کفار کا قانون ماننا ضروری تھوڑا ہی ہے مگر خوب سمجھ لیجئے کہ یہ کوئی قانون ملکی نہیں ہے جو یہ عذر کیا جائے۔ بلکہ یہ قانون اجازت کے متعلق ہے۔ اگر من حیث السلطنت اس کا ماننا ضروری نہ بھی ہو تو من حیث الاستیجار تو ماننا ضروری ہے۔ شرائط اجازہ

ہیں سلطنت اور غیر سلطنت برابر ہیں جن شروط پر اجارہ قرار پائے۔ اُن کا پورا کرنا واجب ہوتا ہے تو اُن کا قانون بحیثیت اجارہ تو واجب الامتثال ہے۔ جب اُنہوں نے قانون مقرر کر دیا ہے کہ پندرہ سیر سے زیادہ کسی کو اسباب بلا کرایہ لے جانے کی اجازت نہیں تو اگر تھوڑا بھی اس سے زیادہ ہوگا تو بوجہ اس کے کہ غیر کی حق تلفی ہے اس کا لے جانا ہرگز جائز نہ ہوگا۔ بہت لوگ، یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ کفار کا مال ہے چاہے جس طرح تصرف کرو۔ یہ اُن کی غلطی ہے۔

بعض لوگوں نے اس کی یہ وجہ گھڑی ہے کہ بہت سے حقوق ہمارے گورنمنٹ کے ذمہ رہ گئے ہیں۔ ہمیں جائز ہے کہ ہم خفیہ طور سے وصول کریں۔ اوّل تو اس میں یہ بات ہے کہ ساری ریلیں گورنمنٹ کی نہیں ہیں۔ بہت سی ریلیں کمپنی کی ہیں۔ دوسرے اگر ساری ریلیں گورنمنٹ ہی کی ہوں تو کیا ہر شخص کا حق گورنمنٹ کے ذمہ رہ گیا ہے اور پھر جن کے حقوق گورنمنٹ کے ذمہ ہوں بھی تو کیا اس کا حساب اُن کے پاس ہے کہ کتنے حق اُن کے گورنمنٹ کے ذمہ ہیں اور کتنے گورنمنٹ کے اُن کے ذمہ ہیں۔ یہ سب نفس کی تاویلیں ہیں بلکہ اگر ثابت بھی ہو جاوے کہ اُس کا حق گورنمنٹ کے ذمہ رہ گیا ہے تب بھی حفاظت نفس کا مقتضی یہی ہے کہ ایسا نہ کیا جاوے۔

راز اس کا یہ ہے کہ نفس کو جیسی عادت ڈالی جاتی ہے ویسی ہی پڑ جاتی ہے۔ اگر اس کی عادت ڈالی گئی تو اس کا خوگر ہو جاوے گا اور آئندہ حد سے تجاوز کرے گا۔ جہاں قطعاً جائز نہ ہوگا وہاں بھی اس عادت پر کاربند ہوگا نفس کو تو ذرا سا بہانہ چاہیے۔

ہاتھ کاٹنے کی سزا

حدیث میں ہے۔ لعن اللہ السارق یسرق البیضۃ فتقطع یدہ ویسرق الحبل فتقطع یدہ۔ یعنی اللہ چور پر لعنت کرے کہ وہ ایک انڈا چراتا ہے اور اس پر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور ایک رسی چراتا ہے اور اس پر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔

اس حدیث میں اشکال یہ ہوتا ہے کہ ایک انڈا چرانے سے یا رسی چرانے سے ہاتھ کہاں کاٹا جاتا ہے۔ ہاتھ کاٹنے کا نصاب تو اس سے زیادہ ہے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم ایک انڈے اور ایک رسی پر ہاتھ کاٹنے پر فرما رہے ہیں۔ ہمارے (یعنی حنفیہ کے) نزدیک قطع ید کا نصاب دس درہم ہیں۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک اس کی اور مقدار ہے۔ بہر حال اہل مذاہب متبوعہ میں کوئی ایسا نہیں کہ جس کے نزدیک اس کا کوئی نصاب نہ ہو۔ اور انڈے اور رسی چرانے پر اہل مذاہب متبوعہ میں سے کسی کے نزدیک بھی قطع ید نہیں آتا۔ اس لیے اس حدیث کا تاول کرنا واجب ہوا کہ اس کو ظاہر سے منصرف کیا جاوے۔ پس بعض نے کہا کہ بیضہ سونے کا مراد ہے جس کی قیمت نصاب سے بھی زائد ہے اور بعض نے کہا کہ بیضہ سے مراد خود ہے۔ خود لوہے کی ٹوپی ہوتی ہے جس کو سر پر پہن لیتے ہیں تاکہ تلوار اثر نہ کرے۔ وہ اتنی قیمت کی ہو سکتی ہے جس پر قطع ید آوے۔ اسی طرح بعض نے حبل سے مراد حبل سفینہ لیا ہے کہ وہ اتنی قیمت کی ہو سکتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اتنی حقیر چیز پر قطع ید ابتدائے اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ یہ سب بعید تاویلیں ہیں۔ ہمارے استادؒ نے جو تاویل فرمائی ہے وہ جی کو لگتی ہے اور ظاہر حدیث سے کچھ بعید بھی نہیں۔ تو جب

تک کہ متبادر معنی بن سکیں غیر متبادر کی طرف کیوں جائیں۔

میرے استاد فرماتے ہیں کہ حدیث میں بیضہ اور حبل کے وہی معنی مراد ہیں جو متعارف ہیں یعنی انڈا اور رسی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس سے معصیت کی عادت ہوتی ہے اور بڑی معصیتوں کا باب کھلتا ہے۔ جو چور بدمعاش ہوتے ہیں وہ اول چوری پیسہ پیسہ سے شروع کرتے ہیں۔ جب وہ کھپ گیا آگے جرأت ہوئی۔ پھر اور آگے چلے یہاں تک کہ ایک روز اس کی نوبت پہنچی کہ ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ یعنی کسی زمانہ میں انڈا یا رسی چرائی تھی آج یہاں تک نوبت پہنچی کہ اتنا مال چرایا کہ جس پر قطع ید کا حکم آگیا۔ یہ مطلب ہے اس حدیث کا۔

استعداد نفس اور نور فراست

اسی وجہ سے مشائخ بعض کو روکا کرتے ہیں بعض مباحات سے اور مباحات کی تقلیل کراتے ہیں کہ کہیں نفس مباحات سے گزر کر آگے نہ چلنے لگے۔ گو بعض موقع پر توسع بھی کرتے ہیں۔ وہ تو طبیب ہیں کہیں زیادہ وسعت کرنے سے تزکیہ ہوگا نفس کا رذائل سے اور کہیں تنگی کرنے سے۔ اس لئے جہاں وسعت کا موقع ہوتا ہے وہاں وسعت کرتے ہیں اور جہاں تنگی کا موقع ہوتا ہے، وہاں تنگی کرتے ہیں۔ وہ ماہر فن ہیں۔ باقی دو چار لفظ کے جاننے سے کہیں دین کا فن تھوڑا ہی آسکتا ہے۔ اس کا موقع ہر ایک کو نہیں معلوم ہو سکتا کہ کہاں وسعت کی حاجت ہے اور کہاں تنگی کی۔ مشائخ کی صحبت میں رہ کر خود اس کا مشاہدہ کرو گے اور ان کے یہاں مختلف واقعات دیکھو گے مثلاً کسی کو دیکھو گے کہ وسعت

دی جارہی ہے اور دوسرے شخص کو دیکھو گے کہ اُس کو ممانعت کی جا رہی ہے
اس کی وجہ یہی ہے کہ جو ان سے اصلاح کا طالب ہوتا ہے وہ اُس کے استعداد
نفس کو سمجھتے ہیں۔ اُن کو خدا تعالیٰ نے اس کی ایسی فراست عطا فرمائی ہے کہ
اس فراست میں اُن کا کوئی شریک نہیں۔ تمام عقلاء جمع ہو جاویں مگر وہ نور فراست
کہاں سے لائیں گے جو اُن کو عطا ہوا ہے۔ اُن کو یہ فضیلت ہے اوروں سے۔
جس کی وجہ سے وہ تجویز کرتے ہیں کہ اس کے لیئے یہ مناسب ہے اور اُس
کے لیئے یہ۔

وسعت ایسی جگہ کرتے ہیں جیسے حکایت ہے کہ کسی چور نے ایک بزرگ
سے بیعت کی۔ اور چوری سے توبہ کر لی۔ اُن بزرگ نے اُس کو اجازت دے
دی خانقاہ میں رہنے کی۔ مرید صاحب روز رات کو کیا کرتے کہ لوگوں کے
جوتے لوٹ پوٹ کیا کرتے۔ کسی کا جوتا کہیں رکھ دیتے اور کسی کا کہیں۔ اب لوگ
حیران کہ یہ کون جوتوں کو ادل بدل کر جاتا ہے۔ آخر ایک روز اُن کو اُلٹ پلٹ
کرتے ہوئے دیکھ لیا اور پکڑ کر صبح کو شیخ کے سامنے لا حاضر کیا اور کہا کہ جوتوں کو
اُلٹ پلٹ کرنے والے یہ مرید ہیں آپ کے۔ شیخ نے اُن سے کہا کہ یہ کیا
حرکت ہے۔ مرید صاحب نے کہا کہ بات یہ ہے کہ مجھ کو چوری کی عادت
تھی۔ میں نے آپ کے ہاتھ پر توبہ کر لی۔ جب رات آتی ہے تو طبیعت میں
تقاضا ہوتا ہے کہ چوری کروں۔ بے حد تقاضا ہوتا ہے۔ ہر چند چاہتا ہوں کہ
جی سے بھلا دوں مگر نہیں جاتا۔ اور چوری سے کر چکا ہوں توبہ۔ اس لیئے میں
چوری کی نقل بنا کر جی کو بہلا دیتا ہوں کہ جوتے اِدھر کے اُدھر اور اُدھر کے

اِدھر کر دیتا ہوں اور کہا کہ لوگوں کو اس سے تکلیف تو ہوتی ہے مگر اس سے میرے دین کی حفاظت رہتی ہے۔ یہ اندیشہ ہے کہ اگر ایسا نہ کروں تو شاید پھر چوری کرنے لگوں۔ شیخ نے اُن کو اجازت دے دی کہ اچھا تم کر لیا کرو اگر کوئی دوسرا شخص اس حرکت کو کرنے لگے تو اُس کو روکا جائے گا۔

اسی واسطے شیخ کے ساتھ مزاحمت نہیں چاہئیے۔ وہ ماہر اور تجربہ کار ہے جو بھی فیصلہ کرتا ہے بصیرت سے کرتا ہے۔ ہر شخص اُس کو سمجھ نہیں سکتا اُس سے اُلجھنا کہ یہاں ایسا کیوں کیا اور وہاں ایسا نہ کیا۔ یہ مناسب نہیں شیخ کہیں تنگی کرتا ہے اور کہیں وسعت اور وہی اُس کو سمجھتا ہے کہ یہاں موقع تنگی کا ہے اور یہاں وسعت کا۔ دوسرا شخص نہیں سمجھ سکتا۔

بہر حال اگر ثابت بھی ہو گیا کہ گورنمنٹ کے ذمہ ہمارا حق رہ گیا ہے جب بھی زیادہ اسباب نہ لے جانا چاہئیے کیونکہ ایسا کرنے سے نفس کو اس کی عادت پڑتی ہے اور عادت ہونے سے اپنا حق وصول ہو جانے پر بھی نہیں چھوڑے گا۔ پس مقتضا معالجہ کا یہی ہے کہ گو ہمارے حقوق بھی گورنمنٹ کے ذمہ ہوں تب بھی ایسا نہ کریں۔

کیدِ نفس میرے پاس کثرت سے ایسے خطوط آتے ہیں کہ جن پر یا تو ڈاکخانہ کی مہر ہی نہیں ہوتی یا ہوتی بھی ہے تو ٹکٹ سے بچی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر میری بُری نیت ہو تو میں ان ٹکٹوں سے منتفع ہو سکتا ہوں کہ دوسرے خطوط پر لگا کر بھیج دوں مگر شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی۔ کیونکہ جو دو پیسے لفافہ کے دیئے گئے ہیں وہ اُجرت کے طور پر ہیں اور وہ لفافہ کی شکل اصل

میں رسید ہے اُن دو پیسے کی۔ پس جب ڈاک پہنچی تو وہ دو پیسے وصول ہو گئے اب اس رسید سے دوسری بار وصول کرنا حرام ہے۔ پس میں ایسے ٹکٹوں کو چاک کر کے پھینک دیتا ہوں۔ باوجودیکہ مجھ کو اس کی عادت ہو گئی ہے مگر پھر بھی وسوسہ ہوتا ہے کہ شاید تقوے ظاہر کرنے کو ایسا نہ کرتا ہوں۔ حضرت نفس کی کیفیت یہ ہے ؎

نفس اژدرہاست او کے مردہ است　　　از غم بے آلتی افسردہ است

نفس کے کید سے کبھی غافل نہ رہنا چاہیئے۔ ہر وقت ہوشیار رہے۔

حضرت حاجی صاحبؒ اس قول کے کہ الحزم سوء الظن یعنی ہوشیاری یہ ہے کہ اپنے نفس سے بدگمان رہے عجیب معنی ارشاد فرماتے تھے کہ سوء ظن سے مراد سوء ظن بنفسہ ہے یعنی یہ مطلب نہیں کہ دوسروں سے سوء ظن رکھے بلکہ اپنے ساتھ تو یہ معاملہ ہو کہ ہر بات میں بدگمان رہے کہ کہیں اس میں نفس کی شرارت نہ ہو اور دوسروں کے ساتھ یہ کہ ہر شخص کو اپنے سے اچھا سمجھے۔ باقی شیخ سعدی علیہ الرحمتہ نے بوستان میں جو فرمایا ہے ؎

نگہ دارد آں شوخ در کیسہ دُر　　　کہ داند ہمہ خلق را کیسہ بر

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سوء ظن پر آمادہ کر رہے ہیں بظاہر اُن کا کلام قرآن و حدیث کے معارض معلوم ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے ان بعض الظن اثم اور حدیث میں ہے ظنوا المؤمنین خیرًا اور پھر اُن کے کلام کے بھی معارض ہے کیونکہ گلستان میں فرماتے ہیں ؎

ہر کرا جامہ پارسا بینی　　　پارسا داں و نیک مرد انگار

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کا ظاہر اچھا ہو اُس کو اچھا سمجھے اور بوستان کے کلام سے یہ پایا جاتا ہے کہ سب کو بُرا جانے۔ گلستاں کی اور تعلیم اور بوستاں کی اور۔ یہ کیا بات ہے؟

جواب یہ ہے کہ شیخ کا مطلب یہ نہیں جو تم سمجھے۔ بدگمانی کے دو درجے ہیں۔ ایک بدگمانی ہے اعتقاد کے درجہ میں کہ دوسرے کو بُرا سمجھے اور ایک بدگمانی ہے عمل کے درجہ میں یعنی معاملہ ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی کرے جیسے بدگمانی کی صورت میں کرتا تو ممانعت تو ہے بدگمانی کی باعتبار اعتقاد کے اور مشورہ ہے بدگمانی کا باعتبار معاملہ کے۔ سو بوستان کے اس مصرعہ کے معنی کہ ع

داند ہمہ خلق را کینہ ور

یہ ہیں کہ معاملہ سب کے ساتھ ایسا ہی کرے جیسا کہ بدگمانی میں کیا کرتے ہیں

دروغ مصلحت آمیز کے معنی

داند اعتقاد کی رو سے نہیں بلکہ معاملہ کے اعتبار سے ہے۔ مثلاً ایک شخص سو روپیہ قرض لینے آیا مگر ہمیں تجربہ نہیں اس کا کہ یہ شخص معاملہ کا کیسا ہے تو ہمیں اس گمان کرنے میں کچھ حرج نہیں کہ نہ معلوم یہ شخص کیسا نہیں کیسا ہے۔ دین دار ہے یا نادہندہ۔ اگر ہم جھوٹ بھی بول دیں کہ روپیہ ہمارے پاس نہیں ہے تو بھی گناہ نہ ہوگا کیونکہ یہ شخص اپنے کو ضرر سے بچا رہا ہے۔ دوسرے کو ضرر نہیں نہیں دے رہا۔ اس جھوٹ سے گناہ نہیں ہوتا۔ یہی معنی ہیں۔ ع

دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز

کے اور یہ عام نہیں ہے کہ ہر مصلحت میں جھوٹ بول دیا کرے مصلحت سے

مطلق مصلحت مراد نہیں بلکہ جس دروغ میں دوسرے کا ضرر نہ ہو اور اپنا یا کسی اور کا اُس سے ضرر دفع ہوتا ہو شیخ نے اس کو مصلحت سے تعبیر کیا ہے۔

مثلاً کوئی شخص کسی ظالم کے خوف سے چھپا ہوا ہے اور اُس کو معلوم ہے اور وہ ظالم تلاش کرنے آیا اور اُس سے پوچھا۔ اُس نے کہہ دیا کہ مجھ کو خبر نہیں تو یہ جائز بلکہ واجب ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دوسروں سے بدگمانی معاملہ کے اعتبار سے ہو نہ اعتقاداً۔ ہاں اپنے نفس سے ہر حالت میں بدگمان رہے۔

نفس کی نگرانی

ہمارے حضرت فرماتے تھے کہ کوئی کتنا ہی شیخ کامل کیوں نہ ہو جاوے مگر جب بھی مامون نہ رہے نفس پر۔ اُس کی طرف سے ہمیشہ بدگمان ہی رہے۔ نفس کی حالت یہ ہے کہ نسبت راسخ ہو جانے کے بعد بھی وساوس گھیرتے ہیں اور وساوس کی مقاومت نہ کی جائے تو ان پر عمل ہو جاتا ہے۔ پس نفس کو وسعت ہرگز نہ دینی چاہیے۔ وسعت دینے سے عادت ہو جاتی ہے آگے بڑھنے کی۔ نفس کی روک تھام نہایت ضروری ہے اس لئے اگر پندرہ سیر سے زیادہ اسباب لے جانے میں گنجائش بھی ہو تو بھی اس مصلحت سے بچنا چاہیے کہ کہیں نفس کو عادت نہ ہو جاوے۔ عادت کے بعد نفس کو روکنا مشکل ہے۔ پھر اگر کہیں گنجائش نہ ہو گی تب بھی نفس نہ رکے گا۔ یہ نفس بڑا ہی شریر ہے۔ اس سے تو کبھی غافل ہونا ہی نہ چاہیے۔ اسی واسطے حضرات اہل اللہ باوجود نسبت راسخ ہو جانے کے بھی ہمیشہ نفس کی نگرانی کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے کون زیادہ ہو گا جن کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فی الجنۃ فرماتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بالکل سچا

ہے۔ آپ سے سن لینے کے بعد میں ظاہر ہے کہ اُن کو اس کی صحت کا یقین ہو گیا ہوگا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ اگر ہمارے لئے ایسی بشارت ہو تو ایسے بے فکر ہو جاویں کہ کوئی گناہ نہ چھوڑیں۔ سمجھ لیں کہ جنت کے تو مستحق ہو ہی گئے۔ بس خوب مزے اڑائیں اور خیال کریں کہ اب ڈر کس بات کا ہے۔ دوزخ سے بچ گئے جنت مل گئی۔ گناہوں سے ضرر ہی کیا ہے۔ مگر اُن حضرات کی شان دیکھئے کہ باوجود ایسی قطعی بشارت کے سُن لینے کے اُن کی یہ کیفیت تھی کہ حضرت عمرؓ نے مدح سے نفس میں ذرا سا تغیر دیکھا تو اُس کا علاج کرنے کے لئے پانی عوام کے گھروں میں بھرتے پھرتے تھے۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر عرض کیا کہ آپ نفس کو اتنی مشقت میں کیوں ڈالتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ آج روم سے دو قاصد آئے تھے انہوں نے میری تعریفیں کیں کہ ہم نے آپ کے عدل کی بڑی شہرت سنی ہے۔ اس سے مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں میرے نفس میں عجب نہ پیدا ہو جائے تو نفس کے علاج کے لئے میں پانی بھر کر پلا رہا ہوں نفس مجھ پر ظلم کرتا ہے میں نے اُس کی یہ سزا تجویز کی تاکہ اترانے نہ پاوے۔

اب حضرت علیؓ کا قصہ سنیئے۔ آپ نے ایک دفعہ کرتا پہنا۔ اُس کے پہننے سے نفس میں کچھ تغیر ہوا۔ نظر میں بھلا معلوم ہوا۔ بس قینچی منگا کر آدھی آستینیں کاٹ ڈالیں۔ اُس کو بدشکل کر دیا۔ تاکہ نظر میں پسندیدہ نہ رہے۔ ان حضرات کی نفس کی نگرانی میں یہ حالت تھی اور یہ احتیاط تھی کہ ذرا سا بھی تغیر پاتے تھے تو بے چین ہو جاتے اور اُس کا علاج کرتے۔ یہاں تو دہ در دہ کا سا معاملہ ہے کہ جو آوے کھپ جاوے۔ جیسے دہ در دہ میں نجاست کھپ جاتی ہے

خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کی تاویلیں کر کے کفار کا مال جائز کر لیتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں سہارنپور سے کانپور جاتا تھا میں نے سہارنپور سے پونڈے ساتھ لے جانے کو خریدے۔ وہ کچھ وزن میں زیادہ میں نے ان کو تلوانا چاہا تا کہ محصول دے کر لے جاؤں۔ ریل کے بابو نے کہا، تھوڑے سے ہیں لے بھی جاؤ۔ میں نے کہا کہ یوں تو آپ کی اجازت معتبر نہیں اور پھر یہ کہ اگر راستہ میں کوئی تولنے لگے۔ وہ بولے کہ میں گارڈ سے کہہ دونگا میں نے کہا یہ گارڈ کہاں تک جائے گا۔ کہنے لگے کہ غازی آباد تک۔ میں نے کہا کہ آگے کیا ہوگا۔ کہا کہ یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا اور وہ کلکتہ تک جائے گا اور کانپور راستہ میں پڑے گا۔ میں نے کہا کہ کانپور کے بعد کیا ہوگا۔ اس نے کہا کہ آگے تو آپ کو جانا نہیں۔ میں نے کہا کہ ابھی سفر ختم نہیں ہوا آخرت کا سفر باقی ہے اگر وہاں پکڑ ہوئی تو کیا ہوگا۔ اگر کوئی اللہ تعالیٰ سے کہہ دے تو خیر لے جاؤں غرض میں محصول دے کر گنوں کو لے گیا۔

میں یہ واقعہ بیان نہ کرتا کبھی کوئی کہنے لگے کہ اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں۔ اپنی تعریف کرتے ہیں مگر میری غرض یہ ہے کہ واقعات کے سننے سے قلوب میں اثر خوب ہوتا ہے۔ اس لئے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اس کام کو کرنے والا میں ہی نہیں۔ اللہ کے بندے بہت کثرت سے ایسے بھی موجود ہیں میں تو ادنیٰ سے بھی ادنیٰ شخص ہوں۔ مگر الحمد للہ مجھ کو اس کا خیال ہے۔ تو جو متقی اور پرہیزگار ہیں وہ کیوں نہ خیال کریں۔

اہل علم کی بے احتیاطی

اکثر کا یہ حال ہے کہ وہ بالکل ان امور میں احتیاط نہیں کرتے۔ عوام الناس تو غفلت سے کرتے ہیں کہ ان کو خبر نہیں کہ یہ ناجائز ہیں اور اہل علم اس کو جائز کر کے کرتے ہیں۔ چنانچہ میں اس کا ایک قصہ سناتا ہوں۔

وہ یہ ہے کہ میں اور ایک معقولی طالب علم ریل میں سفر کر رہے تھے۔ ایک شخص نے سنا کہ وہ اس ریل میں سوار ہیں۔ ہم تو درمیانہ درجہ میں تھے اور وہ تیسرے درجہ میں۔ یہ شخص محبت سے ہمارے پاس آ بیٹھے۔ دو ایک اسٹیشن تک بیٹھے رہے۔ اس کے بعد اتر کر اپنے درجہ میں جانے لگے۔ میں نے ان سے کہا کہ تم نے اتنی مسافت درمیانہ درجہ میں قطع کی ہے اور تمہارے پاس ٹکٹ ہے سوم کا۔ اتنی مقدار محصول کی تمہارے ذمہ دین ہے۔ تم اس کو ادا کر دینا اور آسان ترکیب بتلا دی کہ اتنی مسافت کا جس قدر محصول درمیانہ درجہ کا سوم سے زائد ہے اس کا ٹکٹ اسی لائن کا خرید کر چاک کر دینا۔ بس ادا ہو جائے گا۔ اس پر وہ معقولی طالب علم صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

فقہ اور اہل علم

فقہ کا مسئلہ ہے کہ منافع غصب مضمون نہیں ہوتے مثلاً کوئی کسی کے گھوڑے پر زبردستی سوار ہو کر چل دے تو اس کا کرایہ نہ دینا پڑے گا۔ ہاں اگر مغصوب عین ہو اور اس کو تلف کر دے تو ضمان لازم آتا ہے۔

انہوں نے جو یہ بات کہی مجھ کو سن کر حیرت ہوئی کہ جب اہل علم ہی ایسے

فتوے دیں گے تو پھر عوام کی کیا حالت ہوگی۔ ایسے ہی لوگ بدنام کرتے ہیں فقہ کو۔ اب جو شخص فقہ ہی کا قائل نہ ہو اُس سے تو ہماری گفتگو ہی نہیں اور جو فقہ کا قائل ہے تو وہ فقہ کی کتابیں کھول کر دیکھے کہ فقہا کا کیا مقصود ہے اصل یہ ہے کہ اس موقع پر دو مسئلے جُدا جُدا ہیں۔ ایک یہ کہ منافع مغصوب کو تلف کرنے سے گناہ ہوگا یا نہیں۔ اور ایک یہ کہ اُس پر ضمان لازم آئے گا یا نہیں۔ تو فقہاء گناہ کی نفی نہیں کرتے صرف ضمان کی نفی کرتے ہیں یعنی یہ نہیں کہتے کہ گناہ نہ ہوگا۔ گناہ ضرور ہوگا لیکن ضمان لازم نہیں آئے گا۔

فقہاء کے پاس اس کی دلیل موجود ہے جس کو اہل علم سمجھ سکتے ہیں۔ وہ یوں کہتے ہیں کہ عقد اجارہ ایک عقد ہے اور عقد کا عقلی مقتضا یہ ہے کہ بدلین میں تناسب ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی چیز خریدیں تو اُس چیز میں اور اُس میں جو اُس کے عوض میں دی گئی ہو تناسب ہو اور جہاں بدلین میں تناسب نہ ہو، تو قیاس کے مقتضا سے وہ مبادلہ صحیح نہ ہوگا۔

جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب سنیئے کہ منافع کا مبادلہ ثمن سے قیاس کے بالکل خلاف ہے کیونکہ ایک طرف تو عین ہے یعنی ثمن اور ایک طرف عرض یعنی منافع کسی چیز کے اور اعیان واعراض میں تماثل نہیں ہے۔ اس لئے ایک دوسرے کا بدل نہیں ہو سکتا۔ تو قیاس تو یہ چاہتا تھا کہ منافع کا مبادلہ ثمن سے کسی صورت میں بھی جائز نہ ہو مگر چونکہ عقد اجارہ میں اس مبادلہ کو نص جائز بتلا رہی ہے اس لئے فقہائے نے عقد اجارہ کے اندر قیاس کو چھوڑا اور حدیث کو اختیار کیا کیونکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے سامنے

ہمارا قیاس کوئی چیز نہیں اور جہاں عقد نہ ہو جیسے کہ منافع کے غضب کی صورت میں اُس کے اندر کوئی نص نہیں ہے جواز کی جو قیاس کے چھوڑنے پر مجبور کرے یعنی بغیر عقد میں نص ہی نہیں اس لئے وہاں بمقتضائے قیاس اس مبادلہ کی عدم صحت کے قائل ہوئے اور منافع مغصوب کو مضمون نہ ٹھہرایا۔ یہ تحقیق ہے اس مسئلہ کی کہ منافع مغصوب مضمون نہیں۔

اُن مولوی صاحب نے اس مسئلہ سے کام لیا مگر اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ گناہ بھی نہ ہوگا۔ اس پر تو اُنہوں نے نظر کی کہ ضمان نہیں آتا اور اس پر نظر نہ کی کہ گناہ ہوتا ہے اور اُس گناہ کی تلافی یہی ہے کہ اُس کا بدل ادا کر دے کیونکہ یہ گناہ حقوق العباد سے ہے جو مال کے متعلق ہے۔ اسی واسطے علم ہر ایک کے لئے نافع نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ اس پر نظر کرتے ہیں کہ کسی کے واسطے علم مضر ہوگا جس کو مضر ہوتا ہے اُس کو درسیات سے محروم رکھتے ہیں زبانی تعلیم بقدر فرض عین کے اُس کے لئے تجویز کرتے ہیں۔ اسی کے بارہ میں تو مولانا فرماتے ہیں ؎

بدگہر را علم و فن آموختن دادن تیغ ست دست رہزن

یہ تو قاعدہ کلیہ فرمایا۔

منصور اور علماء

اس کے بعد تفریع کے طور پر کہتے ہیں ؎

چوں قلم در دست غدارے فتاد لاجرم منصور بر دارے فتاد

یعنی دیکھو، بدگہر کی تعلیم کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک غدار کو جب حکومت

کے اختیارات ملے تو اُس نے منصور کو دار پر چڑھوا ہی دیا۔ اس شعر میں مولانا ؒ نے صرف ایک شخص کو غدار کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس سے علماء اہل فتوے مراد نہیں ہیں۔ ورنہ وہ تو متعدد علماء تھے۔ اس لئے ورد ستاں غداراں کہنا چاہیئے تھا۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس شعر میں غدار سے مراد خاص ایک وزیر ہے کیونکہ منصور کو صرف اسی نے قتل کرایا تھا۔ علماء اُن کے قتل میں شریک نہ تھے

یہ تو ایک تاریخی بات ہے۔ کتب تواریخ میں ان کی شہادت کا قصہ اسی طرح لکھا ہے کہ وزیر کو منصور سے عداوت تھی۔ چونکہ وہ بھی عالم تھا گو معتقد نہ سمجھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے اُس نے اپنی عداوت نکالنے کے لئے اس طور پر استفتاء تیار کیا کہ علماء کو قتل ہی کا فتویٰ دینا پڑا۔ مثلاً یہ کہ زید نے ایک کلمہ کفر کا کہا اور اُس کی کوئی عذر کی بھی حالت نہیں اور اس پر مصر ہے تو اُس شخص کا کیا حکم ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کا جواب یہی ہے کہ وہ مرتد ہے اور واجب القتل ہے۔ اس لئے علماء پر الزام نہیں۔ کیونکہ اُن سے تو جیسا سوال کیا جاوے گا اسی کے مطابق وہ جواب دیں گے یہ تو سائل کے ذمہ ہے کہ سوال کے اندر کوئی بات واقعہ کے خلاف نہ لکھے تو چونکہ علماء بے قصور تھے اور قصور وار صرف وزیر تھا اس لئے غدار کہا۔

یہ میں نے اس لئے کہا تاکہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ مولانا علماء کی طرف سے بدگمان ہیں اور اُن کو غدار کہہ رہے ہیں۔ خوب سمجھ لو کہ مولٰنا وزیر کو غدار کہہ رہے ہیں علماء کو نہیں کہہ رہے۔

بہر حال میرا مقصود پہلا شعر ہے کہ بد گہر کو علم نہ سکھانا چاہیے کیونکہ اس سے بڑا ضرر پہنچتا ہے۔ ان معقولی طالب علم صاحب ہی کو دیکھئے کہ فقہ پڑھ کر انہوں نے اس سے یہ استفادہ حاصل کیا کہ تمہارے ذمہ محصول نہیں چاہئے اور ضرورت نہیں کرایہ دینے کی۔ میں نے کہا حفظت شیئا وغابت عنك اشیاء تو مسئلہ یاد کر لیا کہ منافع مضمون نہیں ہوتے اتلاف سے اور دوسری بات یاد نہیں رہی کہ گناہ ہوتا ہے۔ آخر اس گناہ کا تدارک بھی ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو اس کا سوائے اس کے اور کیا طریقہ ہے کہ کرایہ دے کر صاحب حق کو راضی کیا جاوے۔ بس اس کو سن کر وہ چپکے رہ گئے حضرت جب اہل علم کی طرف سے یہ گنجائش ملے تو پھر عام لوگوں کی کیا شکایت ہے۔

علماء اور امراء

زیادہ تر ایسی گنجائشیں امراء کی خاطر نکالی جاتی ہیں اسی واسطے حدیث میں بڑی مذمت آئی ہے اس عالم کی جو امراء میں گھسا رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تساہل ہو جاتا ہے مسائل کے اظہار سے۔ جہاں پلاؤ قورمہ اور عمدہ مال کھانے کو ملے تو وہاں کیا پروا رہ سکتی ہے دین کی۔ وہاں تو یہ ڈر ہوگا کہ اگر حق بات کہیں گے تو پلاؤ قورمے جاتے رہیں گے۔ ایسی جگہ امید

---

[1] نیز یہ حکم کہ منافع مغصوب مضمون نہیں ہوتے ہیں اس وقت ہے جب کہ وہ شے معد الاستغلال نہ ہو۔ اور اگر وہ شے معد الاستغلال ہو تو اس وقت ضمان لازم ہے۔

ہی نہیں ہے کہ صاف بات کہیں بلکہ یہ کیفیت ہو گی کہ اگر امراء ناجائز فعل کو پوچھیں گے تو تاویل کر کے جائز بتلا دیں گے۔

چنانچہ امراء کے یہاں شطرنج کا مشغلہ عموماً ہوتا ہے۔ اب جو اُن کے ہاں حاضر باش علماء ہیں وہ تاویل کر کے جائز بتلا دیتے ہیں۔ مثلاً یہی کہہ دیتے ہیں کہ شافعی کے نزدیک جائز ہے اور اُن کے نزدیک بھی جو شرطیں ہیں اُن کا نام تک نہیں لیتے۔ سو امراء کی مخالطت سے یہ حالت ہو جاتی ہے علماء کی اس واسطے حدیث میں ہے۔

العلماء امناء الدین مالم یخالطوا الامراء فاذا خالطوا الامراء فھم لصوص الدین فاحذروھم۔

یعنی علماء امین ہیں دین کے جب تک کہ وہ امراء سے مخالطت نہ کریں اور جب امراء میں گھسنے لگیں تو وہ دین کے ڈاکو ہیں۔ ان سے لوگوں کو بچنا چاہیے۔

چنانچہ دیکھ لیجئے کہ جو علماء امیروں سے مخالطت رکھتے ہیں اُن کی کیسی خراب حالت ہے اور راز اس کا یہ ہے کہ طبائع میں عموماً طمع غالب ہے۔ اس لئے امراء سے جب مخالطت ہوتی ہے تو طمع مانع ہو جاتی ہے اظہار حق سے۔ سو یہ ساری خرابی طمع کی ہے۔ اسی واسطے کہتے ہیں ؎

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد　　　صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

اور علماء کو اس سے دنیوی ضرر بھی پہنچتا ہے کہ اُن کی عظمت امراء کے قلب میں بالکل نہیں رہتی۔ دل میں وہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہماری خاطر سے ایسا فتویٰ

دے رہے ہیں۔ پس وہ ایک آڑ بنا لیتے ہیں اُن کو ورنہ حقیقت وہ بھی جانتے ہیں۔ سو جب حالت یہ ہے تو پھر کیا امید ہے ان علماء سے اصلاح کی۔

بہر حال لوگ مال کے بارہ میں زیادہ گنجائش نکالتے ہیں۔ عوام اپنے لئے اور علماء اُن کے لئے اس میں بالکل احتیاط نہیں کرتے اور امور میں تو خیر کچھ احتیاط کرتے بھی ہیں جن میں احتیاط کرنے سے بظاہر کوئی ضرر نہیں ہوتا اور خالی مفت گرم داشتن ہے وہاں احتیاط سے کچھ کام لے لیتے ہیں بخلاف مال کے کہ اس میں احتیاط کرنے سے دس کے پانچ ہی رہ جاتے ہیں۔ یہاں احتیاط کرنا ذرا مشکل ہے اور نفس پر شاق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے کم ہیں جو اس میں احتیاط کرتے ہوں ورنہ نفس تو گنجائش ہی کی طرف بلاتا ہے۔ اور عام طور پر ایسے ہی لوگ ہیں جو ان معاملات میں ذرا احتیاط نہیں کرتے۔ اس واسطے میں مطلع کرتا ہوں کہ مال کے بھی حقوق ہیں جن کی رعایت نہیں کی جاتی۔ چونکہ حقوق مالیہ میں بے احتیاطی زیادہ کی جاتی ہے اس لئے میں اس وقت اس کا بیان کرتا ہوں۔

مال کے حقوق

شروع میں جو میں نے آیت تلاوت کی ہے اُس سے پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے روزہ کا مسئلہ ارشاد فرمایا ہے جس کا شروع یہاں سے ہے۔ احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسائکم اکثر لوگوں کو یہ گمان ہوگا کہ قرآن شریف کی اس آیت اور پہلی آیت میں ربط نہیں ہے کیونکہ اوپر کی آیت میں تو احکام روزہ کے بیان ہوئے ہیں۔ اور اس آیت میں فرماتے ہیں ولا تاکلوا اموالکم۔ کہاں تو روزہ کا بیان اور

کہاں یہ کہ حرام مال سے بچو۔ اس میں جوڑ کیا ہے۔ لیکن اگر غور کیجئے تو آپس میں بڑا جوڑ ہے۔ روزہ میں فرماتے ہیں۔

وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر ط ثم اتموا الصیام الی اللیل۔

یعنی جب تک صبح صادق نہ ہو اُس وقت تک کھاؤ پیو۔ اور جب صبح صادق نکل آوے تو اُس وقت کھانا پینا چھوڑ دو پھر جب کہ سورج غروب ہو جائے اُس وقت روزہ کو ختم کر دو۔

سو روزہ تو موقت ہے کہ اس میں جو چیزیں چھڑائی گئی ہیں، وہ ایک وقت خاص تک کے لئے چھڑائی گئی ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں خاص وقت سے خاص وقت تک حرام کر دی گئیں۔ مگر حرام مال سے بچنے کا روزہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ گویا ایک روزہ کے ساتھ دوسرے روزہ کا ذکر فرمایا۔ خیال تو فرمائیے کہ کتنا لطیف ربط ہے۔

غرض اس آیت میں حق تعالیٰ ہم کو نصیحت کرتے ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق مت کھاؤ اور اس آیت میں خدا تعالیٰ نے لا تاکلوا اموالکم کہ اپنا مال مت کھاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ لا تاکلوا اموال اخوانکم کہ اپنے بھائیوں کا مال مت کھاؤ۔ حالانکہ مطلب یہی ہے۔ قرآن شریف کی تعلیم بھی حکمت اور عقل پر اس قدر منطبق ہے کہ کسی کی تعلیم ہو ہی نہیں سکتی اس کی تعلیم ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسے کا کلام ہے جو بڑا حکیم ہے اور شفیقانہ کلام ہے نرا ضابطہ کا کلام نہیں۔ یہ ایسا ہی کلام ہے جیسے باپ

اپنے بیٹے کو خطاب کرتا ہے کہ اس میں ہر پہلو سے شفقت کی رعایت ہوتی ہے اور ایک نرا ضابطہ کا کلام ہوتا ہے جیسے کوئی منادی کرنے والا حاکم کی طرف سے اعلان کرتا ہے اس میں نرے ضابطہ کے الفاظ ہوتے ہیں۔ اس میں اس کی کوشش نہیں ہوتی کہ مؤثر الفاظ ہوں اور بلیغ عنوان جو قلب پر اثر کریں۔ ضابطہ کی منادی میں اس کا اہتمام کہاں ہوتا ہے۔ اور شفیقانہ کلام میں ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کے سننے سے دشوار کام بھی آسان ہو جاوے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اسی طرح نصیحت فرمائی ہے جیسے باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے۔ اگر یہ خدا تعالیٰ کا کلام نہ ہوتا تو یوں ہوتا ولا تاکلوا اموال غیرکم۔ یہ کلام ہوتا تو درست مگر اس کا وہ اثر نہ ہوتا جو آیت کے الفاظ کا ہے۔

خدا تعالیٰ نے اموالکم اس واسطے فرمایا کہ انسان کو اپنا مال زیادہ محبوب ہوتا ہے دوسرے کے مال سے۔ اگر اپنا مال زیادہ محبوب نہ ہوتا تو پرائے مال کو اپنا مال بنانے کی کیوں کوشش کرتا۔ تو چونکہ انسان کو غیر مال سے چنداں محبت نہ تھی اس لئے ضرورت اس امر کی تھی کہ ایسے عنوان سے کہا جاوے جو داعی ہو حفاظت کا اور اس کی حفاظت کا داعی بجز اس کے اور کوئی لفظ نہ تھا کہ اس کو اموالکم سے تعبیر فرمائیں یعنی غیر کا مال بھی ایسا ہی سمجھو جیسے اپنا ہی ہے۔ اس کی ایسی ہی حفاظت کرو جیسے اپنے مال کی کیا کرتے ہو۔

اگر کوئی اعتراض کرے کہ یہ تو شاعری ہے کہ غیر کے مال کو اپنا سمجھو

غیر کے مال کو تو غیر ہی سمجھا جاوے گا۔ اُس کو اپنا کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

مکافاتِ عمل

جواب یہ ہے کہ غیر کا مال تو غیر ہی کا ہے۔ واقعی اپنا نہیں مگر لا تاکلوا اموالکم فرمانے سے اشارہ اس طرف ہے کہ جب کسی کا مال تلف کرو گے تو تمہارا مال تلف ہو گا۔ خواہ دنیا میں یا آخرت میں۔ اس معنی کر بھی دوسرے کا مال تلف کرنا اپنا ہی مال تلف کرنا ہے۔ اکثر تو یہ دنیا ہی میں ہو جاتا ہے کہ جو کوئی دوسرے کا مال تلف کرتا ہے تو اپنا بھی تلف ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا میں نہ ہوا تو آخرت میں تو ضرور ہی ہو گا۔ حضرت یہ تجربہ ہوا ہے کہ جو لوگ مال وجوہ باطلہ سے حاصل کرتے ہیں دنیا میں بھی اُن کا بھلا نہیں ہوتا۔

چنانچہ کانپور کا قصہ ہے کہ مسجد میں مدرسہ تھا۔ اُس کے لئے کچھ زمین کی ضرورت تھی۔ مسجد کے پاس ایک شخص رہتے تھے جو کہ چنداں مالدار تو نہ تھے مگر تھے خاندانی شخص۔ اُن کا بہت بڑا مکان تھا۔ اُن سے تھوڑی زمین مسجد کے لئے لینی چاہی۔ اُنہوں نے انکار کر دیا بلکہ کچھ اور مسجد کی زمین دبالی ایک مرتبہ وہاں ایک بزرگ تشریف لائے۔ اُن سے اس کا ذکر کیا گیا۔ تو اُنہوں نے فرمایا کہ وہ زمین اُن کی زمین کو لینے گئی ہے۔ اُن کی زمین کو اپنے ساتھ لے کر آوے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اُس شخص پر بہت غربت آگئی حتیٰ کہ اُس کو ساری زمین فروخت کرنی پڑی۔ جس کو مسجد والوں نے خرید لیا اور خرید کر مدرسہ بنا دیا۔

حضرت یہ کہیں نہیں ہے کہ آپ کسی کو نقصان پہنچائیں اور آپ کا

نقصان نہ ہو۔ تو اس لیے بھی احوالکم فرمایا۔

سودی مال اور محق کی حقیقت

اب وجوہ باطلہ کی کچھ مثالیں سنیئے سو اس میں سے ایک سودی معاملہ ہے جس کے بارہ میں ہے یمحق اللہ الربوا۔ سودی مال جمع ہوتا ہے اور ایک دن مٹ کر رہتا ہے۔ اور حقیقتاً تو مٹتا ہی ہے مگر صورۃً بھی مٹتا ہے یا ایک دن بے طرح مارے جاتے ہیں اور اگر اتفاقاً کبھی نہ بھی مٹے تب بھی اس سے کلام الٰہی پر اعتراض نہیں آتا۔ کیونکہ یمحق اللہ الربوا قضیہ مہملہ ہے جو قوت میں جزئیہ کے ہوتا ہے۔ اگر ایک دفعہ بھی مٹ جائے تو وہ صادق آجائیگا معنی یہ ہیں کہ سود والے اکثر مٹتے ہیں۔ اور اس کے بہت سے واقعات ہیں جن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اگر کہیں ظاہراً نہ مٹے تو اور طریقہ سے مٹتا ہے۔

محق کی قسمیں مختلف ہیں۔ ایک یہ ہے کہ مال جاتا رہے چوری وغیرہ ہو جائے۔ یہ تو ظاہری محق ہے اور ایک محق ہے معنوی۔ وہ یہ کہ سود والا مال سے خود منتفع نہیں ہوتا۔ فاقہ بھر بھر کر عمر ختم ہو جاتی ہے۔ سود لینے کا سبب بخل ہے۔ جتنا سود لیتا ہے اتنا ہی بخل بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے تن پر بھی خرچ نہیں کرتا۔ یہ حالت ہوتی ہے ؎

سخیاں ز اموال بر می خورند — بخیلاں غم سیم و زر می خورند

ایک ماسٹر تھے۔ سو روپے ان کی تنخواہ تھی۔ اور پانچ روپے ان کا خرچ تھا۔ لوگوں نے کہا میاں تمہاری اتنی بڑی تنخواہ ہے، تم تکلیف کے

ساتھ کس لئے گزر کرتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ مجھ کو اس تصور میں کہ میرے پاس اتنا روپیہ ہے ایسا حظ آتا ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ وہ اسی میں مست تھے۔

غرض کہیں اس طرح بھی سود میں محق ہوتا ہے کہ اپنے اوپر خرچ نہیں ہوتا تو یہ محق برکت اور انتفاع کا ہوا۔

رشوت کا حشر ایک وجوہ باطلہ میں سے رشوت ہے کہ لوگ رشوت لے لے کر مال جمع کرتے ہیں۔ پھر دیکھئے اس کا کیا حشر ہوتا ہے۔ میرے ایک عزیز پولیس میں ملازم تھے۔ انہوں نے خوب رشوتیں لے لے کر روپیہ جمع کیا تھا۔ اتفاق سے سرکار کی طرف سے کسی معاملہ میں مقدمہ قائم ہو گیا تھا۔ جتنا کمایا تھا سب اس میں لگ گیا حتیٰ کہ گھر کا زیور بھی نہ رہا۔ بالکل خالی رہ گئے۔ جب خدا خدا کر کے اس مقدمہ سے جان بچی۔ اس کے بعد پھر اسی طرح روپیہ جمع کیا اور اس روپیہ کے نوٹ خریدے اور ایک پرانے تکیہ میں سی دیئے۔ اس خیال سے کہ اسے چور کیا لیں گے۔ ایک روز اتفاق سے وہ تحقیقات میں گئے تھے۔ ان کے مکان میں آگ لگ گئی۔ گھر والوں نے قیمتی اسباب اٹھا اٹھا کر گھر سے باہر پھینکا۔ اس تکیہ کا کسی نے خیال بھی نہ کیا۔ وہ جب تحقیقات کر کے آئے تو معلوم ہوا کہ گھر میں آگ لگ گئی تھی۔ پوچھا کہ میرا تکیہ کہاں ہے گھر والوں نے کہا کہ جو قیمتی چیزیں تھیں وہ مشکل سے بچائی ہیں۔ وہ پرانا تکیہ بھی کوئی حفاظت کے قابل تھا۔ کہنے لگے میرے تو اس میں نوٹ تھے اور نوٹوں

کے غیر محفوظ تھے نہیں اس لئے سب کمائی جاتی رہی اور اس میں سے کچھ جائداد خریدلی تھی۔ اس میں اس طرح کسر نکلی کہ کسی کاشتکار پر نالش کی تھی اس مقدمہ میں اس کاشتکار نے ان حضرت کو قتل کر دیا۔

یہ انجام ہوتا ہے ایسے مال والوں کا۔ دن رات ایسے لوگ فکر دن میں مبتلا رہتے ہیں اور ایک شخص ہے جس کی یہ حالت ہے۔ ننگے زیر ننگے بالا جس کی آمدنی بھی کم ہے بس معمولی سا کھا پہن لیتا ہے۔ اور مزے سے پاؤں پھیلا کر رات کو سوتا ہے۔ وہ اچھا ہے یا ایسے لوگ اچھے ہیں۔ یہ رشوت کے انجام ہیں۔

اسی طرح سے قمار ہے۔ نہ معلوم اس میں جیتنے والے کہاں جاتے ہیں جس کو سنو گے کہ ہار گئے۔ یہ کسی کو نہ سنو گے کہ جیت گئے۔ اس کے متعلق کھلے ہوئے واقعات ہیں۔ سینکڑوں کے اس میں گھر بار تباہ ہو گئے۔ ایسے مالوں میں ذرا برکت نہیں ہوتی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ رشوت والے ہزاروں جمع کر لیتے ہیں مگر ایک دو پشت کے بعد کچھ بھی نہیں رہتا بالکل محتاج ہو جاتے ہیں آج ایک شخص نوکر تو پچیس روپیہ کا ہے مگر حرام مال خوب سمیٹتا ہے اور اس کے یہاں اولاد بھی ہے۔ مہمان بھی ہیں، دوست احباب بھی ہیں، تندرستی بھی ہے مکان کی تعمیر بھی ہو رہی ہے۔ یہ اپنی حالت پر نہایت خوش ہیں۔ پھر تھوڑے دنوں میں کچھ نہیں رہتا۔ یہ کیا بات ہے؟ اصل یہ ہے کہ ایسے مالوں میں برکت نہیں ہوتی ہے۔

برکت کی حقیقت

لوگ برکت کی حقیقت یہ سمجھتے ہیں کہ تھوڑا پونجی بہت سا ہو جائے۔ حالانکہ یہ اس کی حقیقت نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ ہر چیز ایک خاص کام کے لئے موضوع ہوتی ہے اُس کا اُس کام میں آنا تو برکت ہے اور اگر اُس کام میں نہ آسکے تو بے برکتی ہے۔

مثلاً روپیہ اس واسطے ہے کہ اُس کے ذریعہ سے کھائیں پہنیں، دنیا کی راحت حاصل کریں۔ تو اگر وہ کھانے پہننے کے کام میں آئے اور اپنے تن کو لگے تو برکت ہے اور اگر اس کام میں نہ لگے بلکہ فضول اڑ جائے تو بے برکتی ہے۔ تو ایسے مال اکثر اپنے تن پر صرف نہیں ہوتے۔ کہیں عطاروں کے یہاں جاتے ہیں کہیں ڈاکٹروں کی فیس میں خرچ ہوتے ہیں کہیں یار دوست کھا جاتے ہیں۔ اپنے تن کو کچھ بھی نہیں لگتا۔

ایک شخص تھے اسی قسم کے اُن کی بیوی ہمیشہ بیمار رہتی تھی۔ اُن کے صاحبزادے پلنگ پر سوار تھے۔ صدہا روپیہ دواؤں اور ڈاکٹروں اور طبیبوں میں صرف ہوتا تھا۔ اور پھر نوکر خوب کھاتے اڑاتے تھے۔ چاروں طرف سے لوٹ ہو رہی تھی۔ یہ حالت تھی کہ مہینہ میں پانچ سو روپے آتے ہیں، وہ تھوڑے اور ہزار آتے ہیں وہ تھوڑے۔ یہ اس قسم کے مال اتنی بڑی نحوست کی چیز ہیں۔

دیکھئے ہر شخص کے لئے تعطیل راحت کی چیز ہے مگر اُن کے لئے مصیبت ہے کیونکہ اُس روز لوٹ گھسوٹ کرنے کی گنجائش نہیں ملتی۔ ایک رشوت خور

نے فوٹو میں اپنی تصویر کھنچوائی تھی جس کی شکل یہ تھی کہ دونوں جیبوں میں ہاتھ دیئے
کھڑا تھا۔ لوگوں نے جا کر اس تصویر کو دیکھا تو بہت تعریف کی کہ بالکل اصل
کے مطابق ہے۔ ایک گنوار نے جو تصویر دیکھی اور کہا کہ یہ تصویر تو بالکل غلط
ہے۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو آپ فرماتے ہیں کہ تصویر میں ہاتھ اپنی جیب
میں داخل کئے گئے ہیں حالانکہ ان کے ہاتھ تو دوسروں کی جیب میں رہتے
ہیں۔ دیہات کے لوگوں کا دماغ بڑا عمدہ ہوتا ہے اسی واسطے بڑے
بڑے محقق دیہاتی ہوتے ہیں۔ ماشاء اللہ! کیسی گہری بات کہی کہ ان کے
ہاتھ تو پرائی جیب میں رہتے ہیں۔

سو تعطیل کے دن پرائی جیب ملتی نہیں اس لئے وہ ان کے لئے یوم ماتم ہے۔ انہیں انتظار لگا رہتا ہے کہ کب تعطیل کا دن ختم ہو۔ یہ کتنی بڑی نحوست ہے اس رشوت کی۔

رشوت کی خرابی

پھر اس میں ایک اور خرابی ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں بڑی چیز جاہ ہے حتیٰ کہ مال بھی ایسا عزیز نہیں ہے دیکھئے مال کو جاہ کے واسطے صرف کر دیتے ہیں اور جتنی فضول خرچیاں کرتے ہیں اکثر اسی کے واسطے کرتے ہیں۔ سب اخراجات کی تو حد بھی ہے اور مواقع جاہ میں خرچ کرنے کی کوئی حد ہی نہیں۔ غرض زیادہ حصہ مال کا تفاخر اور ناموری میں صرف ہوتا ہے۔ تو جاہ اتنی بڑی چیز ہے کہ اس کے مقابلہ میں مال کی بھی کچھ پروا نہیں کی جاتی اور وہ اس رشوت میں بری طرح برباد ہو جاتی ہے۔ سو اتنی بڑی نحوست عقلیہ ہے اس رشوت میں۔ چنانچہ واللہ! آدمی رشوت

لینے سے رشوت دینے والے کی نظر سے بالکل ہی گر جاتا ہے۔ وہ اُس کو ایسا سمجھنے لگتا ہے جیسے خانساماں اور بلدار کہ اب ہمارا سارا بوجھ یہ اٹھائیگا پھر کیا وقعت ہوئی ایسے شخص کی بعض لوگ آٹھ آنہ تک بھی نہیں چھوڑتے ایسے بدنیت ہوتے ہیں۔

ایک شخص ڈپٹی تھے اور قوم کے تھے برہمن۔ دورہ میں ایک زمیندار اُن کے پاس آیا اور نذر دینے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اُس کی جیب میں ایک روپیہ تھا اور ایک ادھنا۔ ڈپٹی صاحب چونکہ گھوڑے پر سوار ہو چکے تھے۔ اس وجہ سے اُس نے جلدی سے ہاتھ اونچا کر کے نذر پیش کر دی اور یہ دیکھا نہیں کہ میں کیا دے رہا ہوں۔ جب گھر آئے تو دیکھا کہ جیب میں روپیہ موجود ہے۔ اب یہ بڑے شرمندہ ہوئے کہ میں نے اُس کو ادھنا دیدیا وہ اپنے جی میں کیا کہتا ہوگا۔ اب یہ دوسرے پڑاؤ پر پہنچا اور روپیہ پیش کیا اور عذر کیا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی تھی میرا وہ ادھنا دے دیجئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم برہمن ہیں ہمارا کام ایسا ہی ہے یہ کہہ کر ادھنا بھی رکھ لیا۔

یہ اوقات ہے ان لوگوں کی خیال فرمایئے۔ بعض لوگ تاویل کرتے ہیں کہ لوگ خوشی سے دے جاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے بھی کبھی خوشی سے رشوت دی ہے۔ اپنے اوپر قیاس کر لیں اور اگر فرض کر لیا جاوے کہ خوشی ہی سے دیتے ہیں تو آخر ہمدردی بھی کوئی چیز ہے۔ اسی کی رو سے ایسی رشوت سے انکار کر دیا ہوتا۔

حضورؐ اور چندہ

دیکھئے رعایت وہ چیز ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چندہ آتا تھا۔ آپ بعض مواقع پر واپس کر دیتے تھے۔ ہر ایک کا چندہ آپ نہ لیتے تھے۔ کسی چندہ جمع کرنے والے کو ایسا دیکھا ہے۔ حضرت آج کل تو مال حرام تک واپس نہیں کرتے اور حضورؐ کے واپس کرنے کی یہ وجہ ہوتی تھی کہ اس شخص کو دینے کی گنجائش نہ ہوتی تھی۔ اس لئے وہاں اس بات کا اندیشہ ہوتا تھا کہ شاید اس شخص کو فی الحال گرانی ہو یا بعد میں دینے سے پچھتاوے یا تکلیف اٹھاوے۔ اور حضرت ابوبکرؓ کا سارا گھر لے لیا کیونکہ وہ صدیق اکبر بھی تھے۔ وہاں نہ طبیعت پر ناگواری کا شائبہ تھا نہ تکلیف سے متاثر ہونے کا۔ اس لئے لے لیا۔ کیونکہ وہ تو آپؐ کے اندر فنا ہو گئے تھے۔ غیریت بالکل اٹھ گئی تھی۔ پھر ان میں یہ احتمالات کس طرح ہو سکتے تھے۔

مقام ابوبکرؓ و عمرؓ

یہی راز ہے اس کا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے۔ تو اس پر ظاہراً یہ شبہ ہوتا ہے کہ حضورؐ نے اپنے بعد نبوت کا مستحق حضرت عمرؓ کو فرمایا حالانکہ حضرت ابوبکرؓ ان سے افضل تھے اس لئے ان کا استحقاق زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ تو اس کا راز ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ تو حضورؐ کے اندر فنا ہو گئے تھے وہ من بعدی میں داخل ہی نہ تھے۔ وہ آپ کے غیر تھوڑا ہی تھے۔ وہ تو عین ہو گئے تھے۔ یہ وجہ ہے کہ آپؐ نے اپنے بعد ان کو مستحق نہیں کیا کیونکہ وہ تو معی تھے ان کو من بعدی کیسے کہا جا سکتا

ہے۔

یہی راز ہے اس کا کہ حضرت صدیق اکبرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اتنے پریشان نہیں ہوئے جتنے حضرت عمرؓ پریشان ہوئے۔ پریشانی تو بُعد سے ہوتی ہے۔ جو فانی ہو چکتا ہے وہ بعید نہیں ہوتا۔ وہ تو ہر وقت مشاہدہ کر رہے تھے پھر کیسی پریشانی۔ حضرت ابو بکرؓ کی تو بڑی شان ہے ادنیٰ اولیاء اللہ کی حکایات لکھی ہیں کہ اُن کے احباب کے انتقال پر بالکل رنج نہیں ہوا۔

چنانچہ ایک عورت تھیں اُن کی چند اولاد کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ روئیں تک نہیں اور کہا کہ میں روؤں کیوں خدائے تعالیٰ کی قسم میں تو اُن کو دیکھتی ہوں میرا دل خوش ہے پھر میں کس لئے روؤں۔

تو جیسے اُن کو اپنے عزیز کا مشاہدہ تھا حضرت ابو بکرؓ کو اُس سے بڑھ کر حضورؐ کا مشاہدہ تھا۔ گو اُن کو ظاہراً بُعد ہو گیا تھا مگر بُعد باطنی نام کو نہ تھا وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جزو کی مثل تھے۔

چندہ میں بے احتیاطی

حاصل یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کا سارا مال لے لیا کیونکہ وہ فانی ہو چکے تھے اور ایک غریب شخص مال لایا تو آپ نے واپس کر دیا اور فرما دیا کہ جاؤ اپنا مال اٹھا لو۔ آج ایسے شخص کا چندہ فخر کے ساتھ لیا جاتا ہے جو یوں کہے کہ میں نے اپنے پاس کچھ نہیں چھوڑا۔ اور اس پر کہتے ہیں کہ ان میں ایسی حمیت قومی ہے کہ سارا گھر لا کر رکھ دیا۔ ایسے اور ایسے ہیں۔

میں تو ایسے چندہ دینے والوں کو کہا کرتا ہوں کہ کام ہوش سے کرو

جوش سے مت کرو۔ (جوش میں سارا گھر لا دیا اور بعد میں جب ضرورت واقع ہوئی تو ہوئے پشیمان) اگر جوش کو فضیلت ہوتی تو انبیاء علیہم السلام کا زیادہ حصہ مجذوب ہوتا۔ اُن میں عقل نہ ہوتی۔ حالانکہ وہ اس قدر ذی ہوش اور صاحب عقل بخشے کہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ جب یہ بات ہے کہ لوگ جوش میں آکر ایسا کر گزرتے ہیں تو اگر کوئی شخص لکچر دے یا وعظ کہے اور کسی کے پاس صرف دس ہی روپیہ ہیں اور اس نے جوش میں آکر دس کے دس ہی فوراً دیئے تو اس کا چندہ لینا درست نہیں اُس کو ہوش ہونے دو۔ اُس کے بعد اُس سے کہو کہ تمہاری آمدنی ایک مہینہ کی دس روپے ہیں۔ ابھی ایک مہینہ پڑا ہے تمہارے اہل وعیال ہیں اُن کے خرچ کو چاہیئے۔ وہ اس سے مقدم ہیں۔ اگر بڑا ہی شوق ہے چندہ دینے کا تو ایک روپیہ مہینہ کر دو۔

غرض تمہارے ہی مذاق پر قومی ہمدردی بھی کوئی چیز ہے آج کل قومی ہمدردی کو ذبح کیا جاتا ہے۔ چکی پیسنے والے تک چندہ سے نہیں چھوڑے جاتے۔ بعض نے سل بٹہ بیچ کر چندہ دیا۔ ایسی بے چارقموں میں کیا برکت ہوگی نیز چندہ میں بعض ناجائز صورتیں تجارت کی کر رکھی ہیں جو شریعت میں حرام ہیں۔

مثلاً کسی غریب سے ترکیب ہی کی نیت سے کہا، ایک روپیہ چندہ میں دے دینا۔ جب اس نے ایک روپیہ دیا اب اس روپیہ کی بولی لولی گئی کہ اس متبرک روپیہ کو جو کہ نہایت جوش و خلوص سے اپنی حیثیت سے زیادہ دیا گیا ہے اور اس لئے متبرک ہے کون خریدتا ہے۔ اب کسی نے اس کے دس لگائے اور کسی نے سو اور کسی نے ہزار۔ لوگ جوش میں آکر بڑی بڑی رقمیں

لیتے ہیں۔ تو یہ ربوا ہونے کی وجہ سے بالکل حرام ہے۔

نیز اس لئے بھی کہ یہ پالیسی ہے۔ چندہ وصول کرنے والے کسی عزیز کو خود کھڑا کر دیتے ہیں اور اس پالیسی سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے ہیں شریعت پالیسی کو جائز نہیں کہتی۔ شریعت گندہ سمجھتی ہے ان حرکتوں کو۔ وہاں تو دار و مدار صدق و خلوص و سادگی پر ہے کہ بات سچی ہو اور یہ چندہ خلوص سے نہیں دیا جاتا بلکہ محض نمائش و سازش سے دیا جاتا ہے۔ لوگ جوش میں آکر ایک روپیہ کو ہزار روپیہ سے خریدتے ہیں۔

خوب سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی خلوص سے دے رہا ہے تو وہ ایک روپیہ ہی برکت کا ہے۔ ایسی برکت کی چیز ہاتھ سے دے کر ہزار روپیہ لے لئے تو وہ اس کے مصداق ہیں۔ اتستبدلون الذی ھو ادنیٰ بالذی ھو خیر۔ غرض جب حقائق پہ نظر ہو تو اس کی برائیاں محسوس ہو سکتی ہیں۔ حضرت چندہ میں یہ بے احتیاطیاں ہو رہی ہیں۔ یاد رکھو کہ ایسے جوش کی حالت میں جس میں آدمی مغلوب العقل ہو جائے اور بعد میں پچھتائے خود چندہ لینا ہی ناجائز ہے۔ جوش سے جب کوئی دے تو مت لو۔ ہاں جب ہوش درست ہو جاوے اس وقت لو۔

پیروں کی حالت

اسی طرح آج کل کے پیروں کی حالت دیکھو۔ تو عجیب ہے۔ اُن کو تحصیل مال میں بالکل احتیاط نہیں۔ نذرانے متعین ہیں۔ تقاضے کر کر کے وصول کرتے ہیں خواہ کسی کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ اور دل تنگ ہو کر قرض ادھار کر کے لایا ہو اور دل میں چاہے

کو سنا ہی ہو مگر انہیں لینے سے کام معمولی دعوت بھی منظور نہیں کرتے۔ دعوت میں کم از کم مرغ تو ہو بلکہ خود فرمائش کرتے ہیں۔ اگر کسی کو مسی روٹی کی استطاعت ہو تو شاہ صاحب کے منہ میں نہ چلے۔ اس طرح خلق اللہ کے گلے گھونٹتے ہیں۔ حدیث میں ہے۔ لایحل مال امرء مسلم الا بطیب نفس غرض شاہ صاحب مریدین میں جا کر کچھ اور بن جاتے ہیں۔ انسان تھوڑا ہی رہتے ہیں۔ لوگ ان کو جوتا تک اٹھانے نہیں دیتے کیونکہ ان کے ہاتھوں کو اتنا متبرک سمجھتے ہیں کہ جوتے کا ان کے ہاتھوں کو مس ہونا ان کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اگر یہی ہے تو پاؤں سے بھی نکال لینا چاہیئے۔ کوئی جوتا ان کے پاؤں میں نہ چھوڑنا چاہیئے یعنی جب جوڑا بدل کر آویں پاؤں میں سے نکال لینا چاہیئے کیونکہ جیسے ہاتھ متبرک ہیں پاؤں بھی متبرک ہیں۔ لہذا جوتے کو ان کے پاؤں کے ساتھ بھی مس نہ ہونے دینا چاہیئے۔

یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ پیر اپنے کو ہر بات میں ممتاز رکھتے ہیں جس کی وجہ سے عوام کا ان کے ساتھ ایسا خیال ہو گیا ہے۔ جب وہ ہر چیز میں اپنے کو ممتاز رکھتے ہیں۔ ان کا کھانا اور پہننا اور ہر چیز ممتاز ہے تو ان کی جنت بھی اور ہی ہونی چاہیئے۔ اگر کہیں جولاہے تیلی کے ساتھ جنت میں رہے تو قیامت ہی قائم ہو جائے گی۔ غور کرنے کی بات ہے کہ آج کل شاہ صاحبوں کی تو یہ حالت کہ سب سے ممتاز ہو کر رہتے ہیں۔

معاشرتِ رسول ؐ

اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت کہ اس طرح رہتے تھے کہ پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ صدر کون

ہیں۔ چنانچہ باہر کے ناواقف لوگ آتے تو اُن کو پوچھنے کی ضرورت ہوتی اور وہ پوچھتے من محمد فیکم۔ صحابہ فرماتے۔ ھذا الابیض المتکئ کہ یہ جو گورے چٹے تکیہ لگائے بیٹھے ہیں یہ ہیں محمدؐ۔ صحابہؓ کے تبلانے سے پتہ چلتا ہے یہ ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ ویسے پتہ نہ چلتا تھا۔ بیٹھنے میں تو آپ کی یہ حالت تھی۔

چلنے میں یہ حالت تھی کہ کچھ صحابہؓ آگے کر دیئے اور کچھ پیچھے کر دیئے کبھی کوئی آگے ہو گیا کبھی پیچھے ہو گیا۔ ملے جلے چلتے تھے۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں۔ سو آپ کی تو یہ حالت اور آج بزرگی کے یہ معنی ہو گئے کہ سب سے ممتاز ہو۔

بہر حال یہ ہماری ہمدردی اور یہ ہماری محبت ہے کہ ایک شخص نے ہمارے سامنے سارا گھر لا کر رکھ دیا اور ہم نے اُس پر قبضہ کر لیا۔ کیا یہی ہمدردی ہے کہ سب منگوا لو اور اُس کو مفلس کر دو۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ ہوش سے کام لو جوش سے مت لو۔ چندہ دینے والے کو بھی نہ چاہیئے کہ جوش میں آکر اپنے کو بالکل خالی کر دے اور چندہ لینے والوں کو بھی اس کا خیال چاہیئے کہ ایسا چندہ نہ لیں۔ تجربہ سے دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ جوش میں آکر ایسا کر گزرتے ہیں اور بعد کو پشیمان ہوتے ہیں۔ جوش میں اکثر عقل مغلوب ہوتی ہے اس لئے جلدی نہ کرے۔ جب جوش کا خاتمہ ہو جاوے اُس وقت جو کام مناسب سمجھے کرے۔

قابل قدر عقل

عقل ایسی چیز ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اے عمرؓ اُس وقت کیا حال ہوگا جب قبر میں رکھے جاؤ گے اور فرشتے کڑکتے ہوئے گرجتے ہوئے تمہارے پاس آویں گے اور تم سے پوچھیں گے من ربك ما دینك اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ بتلا دیجئے کہ عقل بھی اُس وقت رہے گی یا نہیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عقل تو دنیا سے بھی زیادہ ہوگی۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب عقل ہمارے پاس ہوگی تو پھر کیا اندیشہ ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ عقل سے کام لیں گے اور جواب صحیح دیں گے۔

تو عقل اتنی بڑی نعمت ہے خدا تعالیٰ کی۔ آج کل لوگ عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں بے عقلی کی قدر کرتے ہیں۔ بزرگوں میں بھی لوگوں کو مجذوب ہی پسند ہیں جس میں عقل نہ ہو۔ اور جو عقل سے کام لیتے ہیں اُن کو بزرگ نہیں سمجھتے بلکہ اُن کو عقل پرست کہتے ہیں۔ اے صاحبو! عقل بڑی نعمت ہے خدا تعالیٰ کی۔ اسی وجہ سے تمام انبیاء عقل میں کامل ہوئے ہیں بتلائیے تو سہی انبیاء علیہم السلام میں کوئی مجذوب بھی ہوئے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ چندہ دینے والے بھی عقل سے کام لیں اور چندہ لینے والے بھی یہ انہماک جو چندہ میں ہوتا ہے جس کے پیچھے عقل ہوش سے بھی گذر جاتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ کام زیادہ پھیلا دیتے ہیں۔ سب سے پہلے اس کی اصلاح کرو یعنی کام جتنا ہو سکے اور جتنی وسعت ہو اتنا کریں۔ جو نہ ہو سکے

نہ کریں۔ بہر حال چندہ میں اس کی ضرور احتیاط رہنی چاہیئے کہ ناجائز طریقہ سے وصول نہ کیا جاوے۔

اہل چندہ مسجد اور مدرسہ کے لئے بھی تو اس کی احتیاط نہیں کرتے انہیں اس سے غرض ہوتی ہے کہ چندہ ملے۔ چاہے جس طرح بھی ملے۔ اگر اُن سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح چندہ کرنا جائز نہیں۔ تو یوں کہتے ہیں کہ ہم اپنی ذات کے لئے تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ ہم تو خدا کے لئے کرتے ہیں۔ اور بعض چندہ وصول کرنے والوں کی یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ انہوں نے غیرت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے اور آدمیت سے بھی گزر گئے ہیں۔

چنانچہ جب علی گڑھ یونیورسٹی کا چندہ ہوا ہے۔ اُس زمانے میں ہمارے یہاں سے ایک برات قصبہ جھنجانہ گئی تھی۔ ایک لیڈر صاحب چندہ وصول کرنے والے اُس برات میں تھے۔ دستور یہ ہے کہ جب دُلہن کو ڈولے میں سوار کرتے ہیں تو ڈولے پر بکھیر ہوتی ہے اور بھنگی اُس کو لوٹتے ہیں اور عرفاً انہیں کا حق سمجھا جاتا ہے۔ جس وقت پیسوں کی بکھیر ہوئی تو لیڈر صاحب پیسے لوٹنے کے لئے بھنگیوں کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور تین آنے کے پیسے اکٹھے کئے۔ تعجب ہے کہ اگر کوئی مولوی ایسا کرے تو اُس کو وحشی اور دون ہمت شمار کریں۔ اور ان کا ہر فعل تمدن و ترقی سمجھا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ انہوں نے بھنگیوں کے ساتھ شامل ہو کر پیسے لوٹے۔ پرانے لوگوں کو اُن کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی۔ اتفاق سے نماز کا وقت آگیا۔ نماز کے لئے یہ مسجد میں گئے اور جماعت کے ساتھ کھڑے ہونے لگے۔ جماعت میں ایک

ظریف بھی تھے۔ انہوں نے کہا کہ ذرا ہٹ کر کھڑے ہو۔ اس لئے کہ جس وقت آپ پلیسے لوٹ رہے تھے تو بھنگیوں کا بدن آپ سے ملتا تھا اور پسینہ آپ کو بھی آ رہا تھا اور اُن کو بھی ہٹو الگ کھڑے ہو۔ یہ تو کیفیت تھی اُن کی کہ لوگ اپنے پاس بھی کھڑا نہ ہونے دیتے تھے اور اُن کو اس پر بڑا فخر تھا۔ اگر ایسی ہی بے حسی ہے تو ایسے موقع پر بھنگی ہی کیوں نہ بن جائے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُن کے یہ افعال کون سے اصول پر مبنی ہیں۔ یہ ساری خرابیاں اس کی ہیں کہ علماء کی تقلید کو تو چھوڑ رکھا ہے اور دوسری قوموں کی تقلید کورانہ اختیار کر لی ہے۔

کورانہ تقلید کورانہ تقلید پر مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک صوفی سیاح تھے۔ وہ کسی خانقاہ میں آکر ٹھہرے۔ وہاں اہل توکل اور اہل تاکل دونوں قسم کے لوگ تھے۔ اُن شاہ صاحب کی سواری میں گدھا تھا۔ اُس کو تھان پر باندھ دیا۔ سائیس کو حفاظت کے لئے وہاں چھوڑ دیا اُس پر جو نیند کا غلبہ ہوا تو وہ پڑ کر سو رہا۔ اہل خانقاہ نے کیا کیا کہ اُس گدھے کو وہاں سے کھولا اور بازار میں لے جا کر بیچ ڈالا اور اُس کی قیمت سے کھانا تیار کیا کھانے کے بعد سماع شروع ہوا اور سماع میں اُن لوگوں نے یہ شرارت کی کہ حال لانا شروع کیا اور اُس میں کہنے لگے۔ ع

خر برفت و خر برفت و خر برفت

شاہ صاحب اُس کا مطلب خاک نہ سمجھے اور اُن کے دیکھا دیکھی آپ نے بھی یہی کہنا شروع کیا کہ خر برفت و خر برفت و خر برفت۔ اب سائیس کی

ہوا آنکھ کھلی تو دیکھتا کیا ہے کہ گدھا ندارد۔ وہ گھبرایا ہوا شاہ صاحب کو خبر کرنے دوڑا تو انہیں یہ کہتا ہوا پایا۔ خر برفت وخر برفت وخر برفت۔ وہ سمجھا کہ انہیں گدھے کے چلے جانے کی پہلے ہی سے خبر ہے۔ وہ یہ سمجھ کر اپنی جگہ جاکر سو رہا۔ اب صبح کو جو شاہ صاحب نے تھان پر اپنا گدھا نہ پایا تو غل مچایا کہ میرا گدھا کہاں گیا۔ اہل خانقاہ نے کہا کہ ہم کو کیا خبر۔ شاہ صاحب بولے کہ مجھ کو کیا خبر تھی۔ پھر سائیس پر خفگی شروع کی کہ تو نے کس واسطے خبر نہیں کی اس نے کہا کہ میں تو خبر کرنے کے لئے آیا تھا۔ یہاں آکر دیکھا تو آپ خود ہی فرما رہے تھے کہ ؎

خر برفت وخر برفت وخر برفت

میں سمجھا کہ آپ کو پہلے ہی خبر ہو گئی۔ پھر میں کیا خبر کرتا۔ رونے لگے مجھ کو تو کچھ بھی خبر نہ تھی۔ سب کہہ رہے تھے میں بھی کہنے لگا۔

بہر حال ایک تو کورانہ تقلید ہوتی ہے جس کے یہ نتائج ہیں اور ایک تقلید علماء کی ہے جس پر مدار ہے دین کا۔ تو ان لوگوں کو علماء کی تقلید سے تو عار آتی ہے اور دوسری قوموں کی تقلید کورانہ کرتے ہیں اور یہی جڑ ہے تمام خرابیوں کی پس اس قسم کے لوگ جس طرح چندہ میں غیر قوموں کی تقلید کرتے ہیں، اسی طرح قومی ہمدردی میں بھی غیر قوم کے مقلد ہیں۔

جس زمانہ میں جنگ طرابلس اور اٹلی ہو رہی تھی ان حضرات نے طرابلس کے ساتھ ہمدردی کرنی چاہی تو اس میں بھی غیر قوموں کے مقلد بنے د غیر قوموں کا یہ طریقہ ہے کہ جب اپنے طرف دار کے ساتھ کوئی لڑتا ہے تو مخالف کا

مال جو اُن کے ملک میں آتا ہو اُس کو خرید نا موقوف کر دیتے ہیں تاکہ اُس کو ضرر پہنچے تو انہوں نے بھی ایسا ہی کیا، کہ لنکا شائر کی ٹوپی جو اٹلی سے آتی تھی اُس کی خریداری بند کر دی تاکہ اُس کی تجارت میں کمی واقع ہو اور اس سے اُس کو ضرر پہنچے اور جو ٹوپیاں پہلے کی خریداری ہوئی تھیں اُن کو آگ میں جلا دیا مگر یہ خوب بات ہے کہ غصہ تو اٹلی پر اور اس میں ناس کریں اپنا نیز اُن کی خریداری بند کر لینے سے اُس کو کیا ضرر پہنچ سکتا ہے۔ یہ یوں ہی کیا۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔

ہم میں اور اُن غیر قوموں میں بڑا فرق ہے۔ اور قوموں میں اتفاق ہے۔ وہ جب خریداری چھوڑتے ہیں تو ایک دم سے سب چھوڑتے ہیں اور ہمارے اندر اتفاق نہیں ہم اگر خریداری چھوڑیں گے تو خاص ہی خاص لوگ ہوں گے جو اس میں ساتھ دیں۔ لہٰذا وہ قومیں جو ایسا کرتی ہیں تو اُن کا فعل مؤثر ہے اور ہمارا فعل کچھ بھی مؤثر نہیں بلکہ ہمیں الٹا ضرر پہنچتا ہے۔ یہ لوگ عقل کے مدعی ہیں اور پھر ایسی حماقتیں کرتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ عقل کے کیا معنی ہیں۔ بس آج کل کی عقل دیکھ کر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ جیسے مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

ایسے لوگوں نے چندہ میں بھی وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو غیر قوموں کا ہے اور معاشرت میں بھی وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو غیر قوموں کا ہے۔ ہر بات میں غیر قوموں کے مقلد ہیں۔ اب ایسے جوش کے چندہ کے متعلق ایک

مسئلہ سنو۔ خوب یاد رکھو کہ جو شخص جوش میں آکر اپنی حیثیت سے زیادہ چندہ دیتا ہے وہ مغلوب العقل کے حکم میں ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اُس سے چندہ لینا اور اُس کو خالی کر کے چھوڑ دینا دین کے تو خلاف ہے ہی عقل کے بھی خلاف ہے، ہمدردی کے بھی خلاف ہے۔ کیوں کہ یہ اُس کو فقیر کر دینا ہے۔

ناجائز آمدنی

میں رشوت کے متعلق عرض کر رہا تھا۔ درمیان میں چندہ کا بھی ذکر آگیا۔ ذکر یہ تھا کہ رشوت ایسی ذلیل چیز ہے کہ اس سے آدمی نظر سے گر جاتا ہے۔ یہ تو ستِ عقلی ہے اس میں۔ اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ قومی ہمدردی کے بھی بالکل خلاف ہے۔ اگر شریعت کے حکم کو نہ دیکھا جائے تو خود عقل بھی اُس کو ناجائز بتلاتی ہے۔ اور یہ بالکل غلط بات ہے کہ لوگ خوشی سے دیتے ہیں۔ جو لوگ رشوت دیتے ہیں تو نقصان پہنچنے کے خیال سے دیتے ہیں خوشی سے کوئی نہیں دیتا۔ جو دیتا ہے مجبور ہو کر دیتا ہے۔ اس لئے یہ ہمدردی کے بھی خلاف ہے۔

اسی طرح بیرسٹری کی آمدنی ہے کہ قطع نظر اس کے کہ شریعت کے نزدیک یہ کیسی ہے خود ہمدردی کے بھی خلاف ہے۔ اس کی تو یہاں تک کیفیت ہو گئی ہے کہ یہ بھی ایک قسم کی دکانداری ہو گئی۔ کسی پر مقدمہ ہو جاوے اور وہ اُن کو وکیل بنانا چاہے تو کہتے ہیں کہ ہر پیشی پر پہلے اتنا لے لوں گا جب کام کروں گا۔ اس کا مطلق خیال ہی نہیں ہوتا کہ اس بیچارے کو اتنی مقدار دینے کی گنجائش بھی ہے یا نہیں بلکہ اگر وہ کہتا ہے کہ کچھ کم لے

لیجئے۔ تو بیرسٹر صاحب کہتے ہیں کہ نرخ بگڑتا ہے۔ یہ تو ہمدردی ہے۔ پھر مذہبی حالت ان حضرات کی قابل دید ہے۔

میرٹھ کا واقعہ ہے کہ ایک بیرسٹر صاحب کے پاس کچھ لوگ عید کے دن ملنے گئے تو آپ کہتے ہیں کہ ڈیل آج آپ لوگوں کا عید ہے مطلب یہ ہے ہماری عید نہیں۔ ہم اسلام ہی میں داخل نہیں۔ یہ ان لوگوں کی مذہبی حالت ہے۔

پھر مقتدء کی پیروی پر تو لیتے ہی ہیں اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ذرا رائے دے دی اور پانچ سو روپیہ لے لئے۔ شریعت میں رائے پر حقانہ لینا جائز بھی نہیں۔ یہ رشوت محضہ ہے۔ اس بارہ میں میرا ایک رسالہ بھی ہے اس کا خلاصہ عرض کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ شریعت نے جس چیز کو متقوم نہیں قرار دیا اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں۔ مثلاً آپ کا حق شفعہ تھا۔ آپ نے سو روپیہ لے کر اس کو چھوڑ دیا تو یہ سو روپیہ واجب الرد ہیں اور حق شفعہ بھی نہیں رہا۔ کیونکہ شریعت نے شفعہ کی کوئی قیمت مقرر نہیں کی یا مثلاً کسی نے حاکم سے سفارش کر دی اور پچاس روپیہ لے لئے۔ یہ پچاس روپیہ حرام ہیں۔ اکثر لوگ رشوت متعارفات میں کچھ لینے کو کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب بھی رشوت میں داخل ہیں۔ حاکم سے سفارش کرنا بھی ایسا ہی فعل ہے کہ شریعت نے اس کی کوئی قیمت مقرر نہیں کی۔ اور اگر یہ سب متقوم ہیں تو اس پیر کا مذاق بھی معتبر ہونا چاہئے جن کا قصہ عرض کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ میں بنگالہ میں تھا۔ وہاں ایک شاہ صاحب کی دعوت کی گئی اور کھانے کے بعد اُن کو پچاس روپے دیئے گئے۔ وہ اس پر راضی نہ ہوئے آخر مشکل سے دوسو روپیہ پر صلح ہوئی۔ بس دعوت کھانا بھی ایسی محنت و مشقت کا کام ہے جس کے کھلانے والوں کو اُجرت دینی پڑتی ہے۔

ایک شخص تھے وہ مولود شریف پڑھا کرتے تھے اور پانچ روپیہ اُن کا نذرانہ تھا۔ ایک مرتبہ کہیں مولود شریف پڑھنے گئے اور کرتہ اُن کا بہت پرانا ہو گیا تھا۔ اُنہوں نے سوچا کہ کسی طرح نیا کرتہ لینا چاہیے۔ بس اُنہوں نے یہ ترکیب کی کہ ایک شعر پڑھا اور اُس پر حال طاری کیا اور جھر سے اپنا کرتہ پھاڑ ڈالا میزبان کو شرم معلوم ہوئی کہ بلا کرتے کے رخصت کیسے۔ اس لئے اُن کو نیا کرتہ بنا کر دینا پڑا۔ اُن حضرت نے پانچ روپے تو الگ لئے اور کرتہ الگ لیا۔ نقصان اپنا اس لئے کیا تھا کہ آمدنی ہو جائے گی۔ بجائے پرانے کرتے کے نیا مل جائے گا۔ یہ ترکیب ہے وصول کرنے کی۔

تو جیسے اُنہوں نے کرتہ پھاڑنے کا عوض لیا۔ اسی طرح اُن شاہ صاحب نے دعوت کھانے کا عوض لیا۔ خوب سمجھ لو کہ ایسے اعمال کی قیمت لینا رشوت میں داخل ہے۔

رائے اور مسئلہ کی قیمت

اسی طرح سے رائے دینا بھی ہے کہ اُس کی قیمت لینا جائز نہیں۔ اگر رائے کی قیمت ہے تو جو بھی کوئی رائے دے دے قیمت لے لیا کرے۔ اگر کہو کہ اوروں کی رائے میں اور ہماری رائے میں فرق ہے کہ ہم قانون دان ہیں۔ ہماری رائے

سے لوگوں کا کام چلتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر کسی کو کوئی رائے دے دی تو اس میں کون سی محنت پڑی اور اگر کہو کہ اس میں محنت یہ ہے کہ سوچنا پڑتا ہے۔ یہ دماغ خرچ کرنے کی قیمت ہے تو میں کہوں گا کہ اگر محنت اس کا نام ہے تو پھر روُمال میں روپے باندھنے پڑیں گے اور پھر گھر تک لانے پڑینگے، پھر اُن کو صندوق میں رکھنا پڑے گا۔ ان سب باتوں کی بھی قیمت ہونی چاہیئے کیونکہ ایسی محنت اُن کے اندر بھی ہے۔ بس اُس کا سارا گھر لے لو۔

اسی طرح مسئلہ بتلانے کی قیمت لینا جائز نہیں کیونکہ اس میں دین فروشی ہے اور وہ حرام ہے۔ البتہ تعلیم دین بطرز تدریس پر اُجرت لینا جائز ہے کیونکہ اس میں مشقت ہے لیکن مسئلہ بتلانے کی کیا اُجرت۔ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ پانچ روپے لاو بموجب مسئلہ بتلائیں گے۔ یہ جائز نہیں۔ ایک شخص نے تو کمال ہی کر دیا کہ ایک فتویٰ دیا اور ہزار روپیہ لے لیا۔ فتوے میں عجیب تماشا یہ کیا کہ ہیر پھار کے ایسی صورت نکالی کہ ساس سے نکاح کرنا جائز کر دیا۔

قصہ یہ تھا کہ ایک شخص ساس پر فریفتہ ہو گیا تھا اور وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر اُس سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ ایسی مشہور بات تھی کہ عامی تک جانتا ہے کہ ساس سے نکاح حرام ہے۔ اس لئے اُس کی جرائت نہ ہوئی۔ وہ شخص ایک دکاندار مولوی کے پاس جو کہ اتفاق سے غیر مقلد بھی تھے، پہنچا۔ اور اُن سے کہا کہ کوئی ترکیب ایسی بتلائیے کہ ساس حلال ہو جاوے اور ایک ہزار روپیہ سامنے رکھ دیا۔ شیطان تو بڑا اُستاد ہے اپنے فن کا بڑا عالم ہے۔ اُس نے ایک ترکیب سجھائی۔ آپ نے فتوے لکھا کہ ساس وہ ہوتی ہے جو منکوحہ

کی ماں ہو تو اُن کی بیٹی اگر منکوحہ ہو تو یہ ساس ہو گی ورنہ ساس نہ ہو گی لیکن اکثر جاہل عورتیں بعض اوقات کلمات کفریہ بک دیا کرتی ہیں۔ اسی طرح اس کی بیوی نے بھی نکاح سے پہلے کلمات کفریہ ضرور کہے ہوں گے۔ اور نکاح کے وقت تجدید ایمان کرائی نہ تھی پس اس عورت کا نکاح صحیح نہیں ہوا۔ اس لئے یہ منکوحہ نہیں ہوئی۔ جب یہ منکوحہ نہیں ہوئی تو وہ ساس نہ ہوئی۔ بس نکاح جائز رہی یہ بات کہ زنا اور مس بالشہوت سے حرمت مصاہرت تو ثابت ہو جاتی ہے۔ تو یہ صرف حضرت ابو حنیفہؒ کی رائے ہے جس کو ہم نہیں مانتے۔ کیا ترکیب ہے۔ واللہ! یہود نے بھی ایسی تحریف نہ کی ہو گی۔

یہ ہے دین فروشی۔ رشوت بھی لی تو کتنے بُرے طریقہ سے۔ سچا مسئلہ بتلا کر بھی رشوت لینا جائز نہیں چہ جائیکہ دین میں تحریف کر کے۔ ہاں کتابت کی اُجرت لینا جیسے فرائض لکھتے ہیں، یہ جائز ہے۔ مگر اس کے اثر پر بھی اگر نظر کیجئے تو یہ بھی بُرائی سے خالی نہیں۔ وہ اثر یہ ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ لوگ مفتی سے فرمائش کرتے ہیں کہ مولانا فلاں وارث کا نام نہ لکھئے گا۔ ایسی فرمائش اس لئے کرتے ہیں کہ کچھ دیتے ہیں ورنہ کیوں ہمت ہو۔

ایک شخص نے میرے سامنے فرائض پیش کی اور یہ کہا کہ جلدی مل جائے اور ایک روپیہ دُور سے میرے سامنے پھینکا اور کہا کہ یہ اس کا حق المحنت ہے۔ میں نے کہا کہ اپنا کاغذ اٹھا لیجئے اور جائیے۔ وہ جلدی اس لئے مچا رہے تھے کہ ایک روپیہ بھی دیا تھا ورنہ کیوں جلدی مچاتے۔ مجھ کو اُن کے جلدی مچانے پر رنج نہیں ہوا بلکہ اپنے بھائیوں پر رنج ہوا کہ نہ وہ لینے نہ

لوگوں کو ایسی جرأت ہوتی۔

ایک صاحب رئیس بطور مہمان میرے یہاں تشریف لائے۔ انہوں نے ایسی حماقت کی کہ مجھ کو حیرت ہو گئی جب معمولی بات کی بھی سمجھ نہیں، تو ریاست کیا کرتے ہوں گے۔ تو ان حضرت نے حرکت یہ کی کہ جب کھانا کھا چکے تو کھانے کے بعد ایک روپیہ نکال کر میری طرف پھینکا کہ لیجئے۔ جیسے بھٹیارے کے یہاں پھینک دیتے ہیں۔ اس وقت ایک بزرگ مولوی صاحب بھی مہمان تھے۔ ان کو اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے ان سے کہا کہ بس میں ہی نمٹ لوں گا۔ آپ خاموش رہیئے۔ میں نے وہ روپیہ ان ہی پر کھینچ مارا اور میں نے کہا کہ جناب تہذیب سیکھئے۔ آپ کو اتنی تمیز نہیں۔ مجھے ان سے زیادہ اپنے ہم طبقہ لوگوں پر افسوس ہوا کہ ان کے لینے ہی کی وجہ سے یہاں تک نوبت پہنچی ہے۔

مشائخ کی حالت

آج کل کے مشائخ نے ناس کر رکھا ہے۔ یہ حالت ہے کہ ایک درویش میرے یہاں آئے۔ ان کے ایک خلیفہ بھی ان کے ساتھ تھے جو کہ اہل علم میں سے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھ پر قرضہ ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کیسے ہو گیا۔ وہ بولے کہ مرید کھا گئے۔ دو دو مہینے پڑے رہے اور وصول ان سے کچھ ہوا نہیں۔ میں نے اس توقع پر قرض لے کر کھلا دیا کہ نذرانہ دیں گے۔ نذرانہ دیا نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے یہ بھی سوچا تھا کہ دوں گا کہاں سے۔ کہنے لگے کہ نذرانے کی امید پر لیا کرتا رہا۔ اس کے بعد کہا کہ آپ پریذیڈنٹ بہاولپور کو سفارشی خط

لکھ دیجئے کہ وہ مجھ کو چھ ہزار روپیہ قرض دے دیں۔ میں نے کہا کہ آپ ادا کہاں سے کریں گے۔ کہنے لگے کہ مریدوں سے جو ملے گا اُس سے ادا کروں گا۔ میں نے کہا کہ اللہ! ابھی آپ مریدوں کو نہیں بھولے۔ اُن کی وجہ سے تو یہ نوبت پہنچی۔ پھر جب اُنہوں نے میرے عذر کرنے پر بھی اصرار کیا تو میں نے اُن کی وجاہت کی وجہ سے خط لکھ دیا اور اُن کو دے دیا۔ پھر میں نے دوسرا خط بذریعہ ڈاک پریذیڈنٹ کے پاس بھیج دیا کہ ایسا ایسا خط لے کر ایک صاحب آپ کی خدمت میں آئیں گے۔ اس پر عمل نہ کیجئے گا بلکہ جیسی آپ کی مصلحت ہو ویسا کیجئے گا۔ چنانچہ اُن کے پاس سے میرے ہاں جواب آگیا کہ آپ اطمینان رکھیں جو مناسب ہوگا وہی کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں مشائخ کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ مجھے ایک بزرگ کا قول پسند آیا۔ ایک شخص اُن کے پاس روپیہ لایا اور کہا یہ میرے بھائی نے بھیجا ہے اور رسید لینے کو لکھا ہے سو رسید دے دیجئے۔ اور بات یہ تھی کہ بھیجنے والے کو اپنے بھائی پر اعتماد نہ تھا۔ اُن بزرگ نے کہا کہ لو اپنا روپیہ۔ کہیں رشوت کی بھی رسید ہوتی ہے۔

جیسے لوگ سررشتہ دار کو دیتے ہیں کہ کچھ کہہ دیں گے ایسے ہی ہمیں سمجھتے ہیں کہ اگر انہیں دیں گے تو یہ اللہ تعالیٰ سے کچھ کہہ دیں گے۔ ہے تو یہ ایک لطیفہ مگر ایک نتیجہ خیز بات ہے۔ سو نذرانہ کی یہ حالت ہو گئی ہے۔

بعض لوگ اس خیال سے دیتے ہیں کہ پیر یوں کہیں گے کہ کیسا مرید ہے نذرانہ ہی نہیں دیا۔ اب تو پیروں کے چہیتے اور فضلائے اور شناہی معتین ہیں۔ بڑے

بڑے ثقہ لوگ کہتے ہیں کہ پیر کے یہاں خالی جاوے خالی آوے۔ یہ ایک جملہ بنایا ہے۔ معنی تو اس کے صحیح تھے مگر بے محل اس کا استعمال کرتے ہیں۔ صحیح معنی اس کے یہ ہیں کہ جو خالی جاوے خلوص سے تو وہ خالی آوے گا فیوض سے۔ اور یہ معنی نہیں کہ جو خالی جاوے فلوس سے۔ بلکہ ایسا قصداً کرنا چاہیئے کہ شیخ کو کبھی دو اور کبھی نہ دو۔ اگر ایسا کرو گے تو اُن کی نیت بھی نہ بگڑے گی۔ ورنہ یہ حالت ہوتی ہے کہ مرید کی صورت دیکھی اور خیال ہوا کہ اب کچھ دیگا۔ مرید کے ذمہ بھی یہ امر ضروری ہے کہ ایسا کام نہ کرے جس سے شیخ کے اخلاق خراب ہوں۔ اگر پیر میں حرص پیدا ہو گئی مرید کے عمل سے تو اُس نے پیر کا ناس کر دیا۔

پھر تو وہ ایسی پیری مریدی ہو گی جیسے کسی مرید نے اپنے پیر سے کہا تھا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ آپ کی انگلیاں تو شہد میں بھری ہوئی ہیں اور میری نجاست سے۔ پیر نے کہا کہ تم تم ہی ہو اور ہم ہم ہی ہیں مرید نے کہا کہ ابھی خواب ختم نہیں ہوا آگے بھی تو سنیئے۔ پھر میں نے یہ دیکھا کہ آپ میری انگلیاں چاٹ رہے ہیں اور میں آپ کی چاٹ رہا ہوں۔ اس پر پیر صاحب بہت بگڑے اور مرید کو بہت بُرا بھلا کہا۔ مرید نے کہا کہ حضرت آپ بُرا مانیں یا بھلا مگر دیکھا تو اسی طرح ہے۔

اب اس میں دو احتمال ہیں یا تو دل لگی کے طور پر اُس نے یہ بات گھڑی تھی یا واقعی خواب تھا اگر خواب تھا تو اُس کی تعبیر یہ ہے کہ مرید نے تو پیر سے دین کے لئے تعلق رکھا تھا اور پیر نے مرید سے دنیا کی غرض سے تعلق رکھا

تھا اور اگر یہ خواب گھڑا ہوا ہے تو یہ ایک تمثیل ہے ، ایسے شیخ اور مرید کے تعلق کی۔ اور تمثیل بھی نہایت غضب کی ہے۔ واقعی نئے زمانہ کی پیری مریدی کی بالکل یہی حالت ہوتی ہے۔ ایسے پیروں سے بڑا ضرر پہنچتا ہے مرید نذرانہ دے کر دین سے بالکل سبکدوش ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بس ہم نے سب حق ادا کر دیا۔ یہ لوگ ڈاکو ہیں دین کے اور اس دین کے ڈاکو سے وہ ڈاکو اچھے ہیں جو جرأت کر کے بندوق و تلوار سے لوٹ مار کرتے ہیں کیونکہ وہ لوگ اپنے آپ کو مجرم سمجھتے ہیں اور یہ اپنے کو بے جرم جانتے ہیں اور وہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیتے ہیں اور یہ بالکل بے خطر ہوتے ہیں اس لئے وہ اچھے ہوں گے اور شاید قیامت میں ایسا ہی معاملہ ہو تو کچھ بعید نہیں جیسا کہ جامی ؒ کا ارشاد ہے ۔

گنہ آمرزِ رندانِ قدح خوار بطاعت گیر پیرانِ ریا کار

خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں آمدنی کے یہ ابواب ہیں جن کو میں نے بیان کیا اور یہ بے احتیاطیاں ہو رہی ہیں۔

حلال و حرام کی تمیز

اموال کے حاصل کرنے میں حرام و حلال کی بالکل تمیز نہیں رہی یہی وجہ ہے کہ قلب میں نور نہیں ہوتا۔ نماز پڑھتے ہوئے مدتیں ہو گئیں مگر قلب میں نورانیت نہیں۔ ان میں سے بعض کو یہ غلطی واقع ہو گئی ہے اور ان کے ذہن میں یہ بات جم گئی ہے کہ حلال دنیا میں مفقود ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ حلال کی فکر ہی نہیں کرتے۔ شیطان نے ان کو یہ پٹی پڑھائی ہے اور اپنے نزدیک بڑے متقی

ہیں کہ کسی چیز کو حلال ہی نہیں سمجھتے۔ مگر اس کا انجام یہ ہے کہ پھر ایسے لوگ بالکل احتیاط نہ کریں گے۔ جو چیزیں صریح حرام ہیں ان سے بھی پرہیز نہ کرینگے سمجھ لیں گے کہ حلال کا تو وجود ہی نہیں اور حرام حرام سب برابر۔ اس لئے کسی چیز کو بھی نہ چھوڑیں گے۔ بقول لیکہ ؎

چوآب از سر گذشت چہ یک نیزہ چہ یکدست

شیطان کی پٹی پڑھانے کا یہ نتیجہ ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ محض غلط ہے کہ حلال کا وجود دنیا میں نہیں اور یہ صرف شیطانی دھوکا ہے کہ وہ اس طریقہ سے حرام میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ میں حرام و حلال کا معیار بتلاتا ہوں۔ اس کو سمجھ لینا چاہیئے۔ معیار یہ ہے کہ فتوٰی فقہی جس چیز کو کہہ دے کہ یہ حلال ہے تو وہ حلال ہے اور جسے کہے کہ یہ حرام ہے تو وہ حرام۔ یہ وہ وقت ہے کہ آج کل مشتبہ چیز کو بھی حلال کہا جاتا ہے نہ کہ حلال کو بھی اس میں شبہات نکال کر حرام کر دیا جائے۔ بس یہ معیار یاد رکھو کہ جس کو فتوٰی فقہی حلال کہہ دے بس وہ حلال ہے۔ اصل میں بعض واعظین نے ایسی ایسی حکایات بیان کر کے لوگوں کو دھوکے میں ڈالا ہے۔

ایک حکایت یہ بیان کیا کرتے ہیں کہ ایک بزرگ تھے۔ ان کا کھیت تھا۔ اتفاق سے ان کا بیل دوسرے کے کھیت میں گھس گیا اور اس کے کھر میں اس کھیت کی مٹی لگ گئی۔ پھر وہ ان کے کھیت میں آگیا اور وہ مٹی ان کے کھیت میں مل گئی۔ تو انہوں نے اس کھیت کا غلہ کھانا

چھوڑ دیا۔

بس لوگ اس قسم کی حکایت کو سن کر سمجھ لیتے ہیں کہ جب یہ حالت ہے تو حلال کا وجود ہی نہیں نہ ہم سے ایسا ہو سکے گا نہ حلال نصیب ہو گا پھر خوب حرام پر ہاتھ مارتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اول تو یہ حکایت صحیح نہیں اور اگر صحیح بھی ہو تو وہ بزرگ مغلوب الحال تھے اور مغلوب الحال مجنون کے حکم میں ہوتا ہے۔ اس کا فعل قابل تقلید نہیں ہوتا۔

دین میں غلو میں اس بات کا دعویٰ کرتا ہوں کہ شریعت کے برابر کسی قانون میں وسعت نہیں دیکھئے، شریعت دین میں غلو کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ چنانچہ ارشاد ہے یا اھل الکتاب لا تغلوا فی دینکم اور ارشاد ہے لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم اور دیکھئے حدیث میں ہے کہ تین شخص حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے دولت خانہ پر حاضر ہوئے اور بعض ازواج مطہرات سے حضورؐ کے معمولات دریافت کیے اور جب انہیں بتلائے گئے تو انہوں نے اس کو کم سمجھا اور کہا کہ ہم اپنے کو حضورؐ پر کیسے قیاس کر سکتے ہیں۔ حضورؐ کے تو اگلے پچھلے سب زلات معاف ہو چکے ہیں۔ ہمیں یہ بات کب نصیب ہے۔ اس لئے ہم کو بہت زیادہ مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ پس ایک نے ان میں سے کہا کہ میں اتنی عبادت کروں گا کہ سوؤں گا نہیں۔ ایک نے کہا میں نکاح ہی نہ کروں گا۔ ایک نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ ہی سے رہوں گا افطار نہ کروں گا۔

حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مکان پر تشریف لائے تو آپ

کو اُن تینوں کی باتیں معلوم ہوئیں۔ آپؐ کو ناگوار ہوا اور فرمایا، یاد رکھو میں سوتا بھی ہوں، جاگتا بھی ہوں، نکاح بھی کرتا ہوں، کھاتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں خوب سمجھ لو۔ یہ میرا طریقہ ہے اور جو شخص میرے طریقہ کو چھوڑے گا اُس سے مجھے کوئی علاقہ نہیں۔

دیکھئے ان لوگوں پر آپؐ نے غلو فی الدین کی وجہ سے کتنا بڑا تشدد فرمایا کہ ایسے شخص کا مجھ سے کوئی علاقہ نہیں۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ ہے کہ آپؐ ایک دفعہ مسجد میں تشریف لائے دیکھا کہ دو ستونوں کے درمیان میں ایک رسی بندھی ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ رسی کیسی ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ رسی زینبؓ نے باندھی ہے جس وقت اُن کو نوافل پڑھتے پڑھتے نیند ستاتی ہے تو کسل رفع کرنے کے لئے، اس پر سہارا لگالیتی ہیں۔ آپؐ نے یہ سُن کر فوراً اُس کو توڑ ڈالا اور فرمایا کہ نفس پر اتنا تشدد نہ چاہیئے اور فرمایا کہ جب نیند آئے سو رہو۔ جب کسل رفع ہو جاوے پھر مشغول ہو جاؤ ۔۔۔ شریعت تو یہ ہے۔

ان آیتوں اور احادیث کو فقہاء نے خوب سمجھا ہے۔ ان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تقویٰ طہارت اختیار مت کرو بلکہ تقویٰ طہارت میں تو خوب کوشش کرو مگر حد سے آگے مت بڑھو۔ اہل ادب نے تو یہاں تک کیا ہے کہ بعض افعال کو اس لئے نہیں کیا تاکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مساوات کا دعویٰ نہ ہو جائے۔ مگر ہر شخص اس کو نہیں جان سکتا کہ کس بات سے مساوات ہوتی ہے اور کس بات سے نہیں ہوتی۔ یہ کام علماء باطن کا ہے اس

کو وہی سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت شیخ بہاؤالدین نقشبندیؒ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ کی نظر سے یہ حدیث گزری کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں چھلنی نہ تھی آٹا چھانا نہ جاتا تھا۔ بس یہ کرتے تھے کہ جو کا آٹا پیسا اور پھونک ماری، بھوسی اڑ گئی اور روٹی پکالی۔ یہ طریقہ تھا۔ آپ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے خدام سے فرمایا کہ اب سے اس سنت کے موافق عملدرآمد ہونا چاہیئے کہ آٹا جو کا ہو اور چھانا نہ جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور روٹی پکائی گئی اور سب نے کھائی۔ اس کے کھانے سے سب کے پیٹ میں درد ہوا۔ سوئیاں سی چبھنے لگیں حضرت کے پیٹ میں بھی درد ہوا۔ اگر ہمیں یہ صورت پیش آتی، تو یوں کہتے کہ سنت پر عمل کیا تھا اس سے یہ ہوا۔ اگر ادب کی وجہ سے بولتے نہیں تو دل میں تو یہی خیال ہوتا اور یہی کہتے کہ اب کبھی سنت کا اتباع نہ کریں گے مگر اہل ادب کے قلب میں نورانیت ہوتی ہے۔ ان حضرات کا ادب دیکھئے آپ نے فرمایا کہ ہم نے بے ادبی کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مساوات کا دعویٰ کیا۔ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ کو کیسے پہنچ سکتے ہیں ہم ضعیف کمزور ناتواں ہیں۔ آپ سے نیچے ہی درجہ میں رہنا چاہیئے پھر خدام سے فرمایا کہ کھائیں گے تو جو مگر چھان کر۔ ادب دیکھئے کہ سنت میں کوئی نقص نہیں نکالا بلکہ اپنے کو سنت کے قابل نہ سمجھا۔

شریعت میں چیزوں کی اقسام

اب میں اس مسئلہ کا حل عقلی طور سے کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ

شریعت میں دو قسم کی چیزیں ہیں۔ ایک تو وہ چیزیں ہیں جو مقصود ہیں اور ایک وہ ہیں جو مقصود نہیں ہیں زائد ہیں مگر محمود ہیں لیکن یہاں مجتہد کی ضرورت ہو گی کہ وہ تمیز کرے کہ کون مقصود ہے اور کون مقصود نہیں۔ یہ ہر شخص کا کام نہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ طبیب نے ایک مریض کو اجازت دی کہ شلجم کھاؤ اُس نے مع پتوں کے پکا کر کھائے اور اُس کو نفع ہوا۔ اب اس کا فیصلہ کرنا کہ شلغوں سے نفع ہوا یا پتوں سے یا دونوں کے مجموعہ سے۔ یہ طبیب کا کام ہے۔ یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک شلجم اور ایک پتے۔ ممکن ہے کہ مقصود شلجم ہوں اور مریض پتوں کو مقصود سمجھ لے یا مقصود پتے ہوں اور مریض شلغوں کو مقصود سمجھ لے۔ اس لئے اس میں فیصلہ کرنا مریض کا کام نہیں بلکہ یہ کام طبیب کا ہے۔

اسی طرح سنن میں امتیاز کرنا کہ شارع کے نزدیک مقصود کون ہے، اور غیر مقصود کون ہے۔ یہ کام مجتہدین کا ہے۔ ہر شخص کا کام نہیں۔ اور کبھی اجتہاد میں اختلاف بھی ہوتا ہے

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں رفع یدین ثابت ہے، اور عدم رفع بھی ثابت ہے۔ اب یہاں مجتہدین کا اختلاف ہوا۔ ایک مجتہد سمجھے کہ رفع مقصود ہے اور ترک رفع جو فرمایا تو بیان جواز کے لئے ہے مقصود نہیں۔ اور ایک مجتہد عدم رفع کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نماز میں سکون چاہئے چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم نماز میں ہاتھ اٹھاتے ہو (یعنی سلام کے وقت)، نماز میں سکون اختیار کرو پس

مقصود عدم رفع ہے اور رفع بیان جواز کے لئے فرمایا۔ اب جنہوں نے رفع کو مقصود سمجھا ہے تو وہ اس میں یوں کہتے ہیں کہ یہ رفع جس سے منع فرمایا یہ وہ نہیں ہے جو رکوع میں جانے اور اس سے اٹھنے کے وقت کیا جاتا ہے بلکہ یہ وہ رفع ہے جو کہ سلام پھیرتے وقت کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ بعض حدیثوں میں اس کی تصریح ہے کہ صحابہ جب نماز کا سلام پھیرتے تو ہاتھ اٹھا کر کہتے السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ یہ ممانعت حضورؐ نے اس پر فرمائی۔ ہم اس بارہ میں یوں کہتے ہیں کہ مانا اس سے وہی رفع مراد ہے مگر اس سے ایک بات تو ضرور نکلی کہ اصل مطلوب نماز میں سکون ہے اور رفع اس کے خلاف ہے۔ پس مواقع مختلف فیہا میں بھی رفع مقصود نہ ہوگا کیونکہ وہ نماز کی حالت اصلی یعنے سکون کے خلاف ہے اور عدم رفع چونکہ سکون کے موافق ہے، اس لئے وہ مقصود ہوگا۔

اسی طرح اور جہاں کہیں اختلاف ہوا ہے اسی وجہ سے ہوا ہے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور ایک نے دوسری چیز کو۔

مثلاً آمین کہنا، ایک مجتہد کی رائے یہ ہے کہ مقصود آمین پکار کر کہنا ہے اور اخفاء جو ہوا ہے تو وہ بیان جواز کے لئے۔ اور ایک مجتہد کی رائے ہے کہ مقصود اخفا ہے کیونکہ یہ دعا ہے اور دعا میں اخفاء مقصود ہے۔ اگر پکار کر کبھی کہہ دیا ہے تو وہ اس لئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ آپؐ آمین بھی کہا کرتے ہیں۔ اگر کبھی پکار کر نہ کہتے تو خبر نہ ہوتی کہ آمین بھی آپؐ کہا کرتے ہیں۔ جیسے کبھی کبھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اسی حکمت کے لئے سرّی نماز

یں ایک آیت پکار کر پڑھ دی ہے تعلیم کی غرض سے۔

ایک مجتہد کی رائے یہ ہے اور ایک کی وہ رائے۔ یہ اختلاف کا ہے سے ہوا۔ اسی وجہ سے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور دوسرے نے دوسری چیز کو۔ اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو آپس میں لڑائی جھگڑے ہی کا خاتمہ ہو جائے۔ بس یہ راز ہے اختلاف مجتہدین کا۔ اسی بناء پر تمام افعال میں اختلاف ہوا ہے۔

یہ بیان استطراداً ہو گیا۔ غرض یہ کہہ رہا تھا کہ شریعت میں دو چیزیں ہیں مقصود اور غیر مقصود اور یہ مجتہد کا کام ہے کہ وہ یہ بتلائے کہ مقصود کیا ہے اور غیر مقصود کیا ہے۔

مجتہد کا کام

بس سمجھ لیجئے کہ جو کی روٹی کھانا مقصود نہیں ہے۔ کوئی شرعی مصلحت اس کے ساتھ وابستہ نہیں۔ ہاں بعض موقع پر معین ہوتی ہے مقصود میں۔ اس لئے جہاں ایسا موقع ہوتا ہے وہاں بتلائی جاتی ہے اور بعض طبائع ہیں ضعیف، وہ اس کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے انہیں یہ مفید نہیں ہوتی بلکہ مقصود میں مشغول ہونے سے مانع ہو جاتی ہے ایسے موقع پر اس سے منع کیا جاتا ہے۔

مثلاً ہم نے جو کی روٹی کھائی اور کھا کر پیٹ میں ہوا درد۔ تو جو ہم کو محبت تھی جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شفقت سے وہ اس حالت میں باقی نہ رہے گی بلکہ وحشت ہوگی اور خطرہ آئے گا کہ اچھا سنت پر عمل کیا کہ پیٹ میں درد ہو گیا۔ آج متشددین ہی کی بدولت شریعت سے لوگوں کو نفرت

ہو گئی۔ لیکن مشائخ ہر شخص کی قابلیت دیکھ کر اُس کے مناسب تعلیم کرتے ہیں چنانچہ ایسے مقام پر کہتے ہیں کہ جو کی روٹی مت کھاؤ۔ اور پہلے چور کی حکایت ایسی ہی گزر چکی ہے کہ شیخ نے اُس کو خانقاہ کے جوتے الٹ پلٹ کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اُس کے مناسب حال وہی بات تھی۔ دوسرے شخص کو اُس کی اجازت تھوڑا ہی دی جائے گی۔

ایک رئیس تھے۔ اُنہوں نے میرے پاس آنے اور قیام کرنے کا ارادہ کیا اور یہ بھی لکھا کہ میرا جی گاڑھے کے کپڑے پہننے کو چاہتا ہے۔ اس لئے میرے واسطے وہ بھی تجویز کئے جائیں۔ میں نے اُن کو لکھا کہ آپ کو مریض ہونے کی حیثیت سے حق نہیں فرمائش کا۔ میں جس طرح چلاؤں ویسے چلنا پڑے گا۔ اور اس میں ایک راز تھا۔ وہ یہ کہ شریعت میں یہ اصلی مقصود تو ہے نہیں۔ پھر اُن رئیس کے گاڑھے کے کپڑے پہننے سے ایک بڑا ضرر ہوتا۔ وہ یہ کہ اگر ایسا شخص گاڑھے کے کپڑے پہنے گا تو دل میں عجب پیدا ہوگا کہ ہم کتنے متواضع ہیں کہ رئیس ہو کر ایسے کپڑے پہنتے ہیں۔ ہم ایسے اچھے ہیں۔ ہم میں ایسی مسکنت ہے اور مقصود ہے عجب کا ازالہ اور یہاں وہ پیدا ہوگا۔ اس لئے ایسے موقع پر گاڑھے کے کپڑے پہننے کی ہرگز اجازت نہ ہوگی۔ یہ ہے حقیقت اس کی۔

ایسے شخص سے زیب و زینت چھڑائی جائے گی جو زیب و زینت میں مشغول رہتا ہو اور کام نہ کرتا ہو۔ بناؤ سنگار میں وقت گزارتا ہو۔ اُس سے کہا جائے گا کہ لوگ جہاں راستہ چلتے ہوں وہاں جا کر جھاڑو دیا کرو تا کہ کپڑوں پر اور جسم پر گرد پڑے اور زیب و زینت کو چھوڑے اور کام میں لگے تو ایسے

شخص سے اس طرح زیب و زینت چھڑا دی جاتی ہے۔

غرض سادے کپڑے اور جو کی روٹی یا اس کی مثل سنن عادیہ میں سے ہیں اگر کہیں اُن کی وجہ سے مقصود فوت ہونے لگتا ہے تو اُن کو چھڑا دیا جاتا ہے کیونکہ سنن عادیہ کوئی مقصود نہیں ہیں بلکہ بعض موقع پر سنن عبادت تک چھڑا دی جاتی ہیں اگر اُن سے ضرر ہوتا ہو۔

مثلاً یہ سنت ہے کہ تہجد کی آٹھ رکعت پڑھے۔ اب کسی کو نیند زیادہ آتی ہے اور وہ تہجد کے واسطے زیادہ دیر جاگا اور پھر ایسا سویا کہ صبح کی جماعت فوت ہو گئی تو اُس سے کہا جائے گا کہ تم دو رکعت پڑھ کر جلد سو رہو تاکہ صبح کی جماعت نہ جائے۔ اگرچہ آٹھ رکعت سنن عبادت میں سے ہیں مگر جب اس سے بڑھ کر مقصود فوت ہوتا ہے تو اُن کو چھڑا دیں گے۔ غرض یہ کام مجتہدین کا ہے کہ وہ مقصود اور غیر مقصود کو جان سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ترجمہ قرآن کا دیکھ کر اور مشکوٰۃ پڑھ کر اجتہاد کرنے لگیں۔

نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند　　نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند

سو یہ راز ہے اس حکایت میں کہ جب شیخ نے دیکھا کہ جو کا آٹا بے چھنا کھانے سے سب کے پیٹ میں درد ہوا تو فوراً اس سے منع کر دیا اس خیال سے کہ یہ کوئی سنن عبادت تو ہے نہیں اور اس سے اندیشہ ہے دینی ضرر کا کہ کہیں سنت سے وحشت نہ ہو جائے اس لئے ہمارے لئے اس کا ترک ہی مناسب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شخص کی بابت اُس کے مجموعی حالات سے ثابت

ہوجاوے کہ حج کے راستہ میں اس سے نماز کی پابندی نہ ہوسکے گی تو اس حج نفل سے منع کیا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص کو ایک نماز کے بھی قضا ہونے کا گمان غالب ہو تو اس کو حج نفل کرنا جائز نہیں۔ اسی کے بارہ میں عارف مسعود بک کہتے ہیں ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید　　معشوق درینجاست بیائید بیائید

یعنی تم کہاں چلے حج کرنے تمہارا محبوب یعنی اللہ میاں تو یہاں ہیں۔

اس شعر میں مطلق حج مراد نہیں جس سے شبہ پڑے کہ حج سے روکتے ہیں بلکہ حج نفل جس سے کوئی فرض چھوٹتا ہو وہ مراد ہے۔ جنہوں نے اس کو مطلق سمجھ لیا وہ اعتراض کرنے لگے کہ لو حج ہی سے منع کرتے ہیں، جو ایک بڑی عبادت ہے۔ تو سمجھ لو کہ وہ اُن لوگوں کو کہہ رہے ہیں جنہیں حج سے دینی ضرر پہنچتا ہے کہ نفل کو تو ادا کرتے ہیں اور فرض کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ سو ظاہر ہے کہ ایسوں کو حج سے قرب نہیں بڑھتا بلکہ اور بُعد ہو جاتا ہے۔ اسی واسطے کہتے ہیں ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید　　معشوق درینجاست بیائید بیائید

یعنی تم کہاں چلے تمہارا محبوب تو یہیں ہے۔ تمہیں محبوب کا قرب یہیں رہ کر حاصل ہو سکتا ہے وہاں نہیں حاصل ہوگا۔ غرض یہ کہ سنن عادیہ اور سنن عبادت ایسے شخص کے واسطے ناجائز ہیں جس کا یہ نتیجہ ہو کہ کوئی دینی ضرر پہنچ جاوے۔ اسی واسطے حضرات مشائخ کسی کو کچھ بتاتے ہیں اور کسی کو کچھ بتاتے ہیں

جو جس کے مناسب ہوتا ہے اس کو وہی بتلاتے ہیں۔ یہ کام ہر شخص کا نہیں اس کام کے وہی حضرات ہیں۔ مطلب میرا یہ ہے کہ لوگوں کو ایسی حکایات (جیسے بیل کے کھر میں مٹی لگ جانے کی حکایت سابق میں گزری) نہ سنانی چاہئیں۔

شریعت میں وسعت

بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ شریعت میں وسعت ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر کسی مسئلہ میں مجتہدین کا اختلاف بھی ہو مگر آج کل کے مجتہدین کا اختلاف نہیں اور اس میں ابتلا عام ہو تو اس کو بھی جائز کہنا چاہیئے۔

وجہ یہ ہے کہ معاملات بہت گندے ہو رہے ہیں۔ اگر مختلف فیہ امور کو حرام بتلایا جاوے گا تو اگر اس پر کوئی کرے گا تو اس کو تنگی ہوگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شریعت کو تنگ سمجھنے لگے گا۔ اور اگر عمل نہ کرے گا تو وہ اس کو اور محرمات اجماعیہ کو برابر سمجھے گا۔ اور دونوں میں مبتلا ہو جائے گا اس لئے غلو نہیں چاہیئے تنگی میں بلکہ وسعت کرنی چاہیئے۔ فائدہ اس کا یہ ہوگا کہ وسعت ہونے سے اعتقاد درست ہوگا کہ شریعت کیسی اچھی چیز ہے اور کیسی رحمت ہے۔ لوگوں کا تو گمان یہ ہو گیا ہے کہ شریعت میں تو سوائے لایجوز کے اور کچھ ہے ہی نہیں حالانکہ شریعت میں لایجوز بہت کم ہے، یجوز کثرت سے ہے۔ جو فقہ سے واقف ہے وہ اس کو خوب جانتا ہے غرض یہ کہ وسعت دینے میں ایک تو شریعت سے محبت ہوگی دوسرے جو اس سے منتفع ہوگا، آرام سے رہے گا۔ اس سے حق تعالیٰ کی محبت

غالب ہوگی۔

حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ عاشق احسانی ہیں ہم لوگوں کو جو خدا تعالیٰ سے محبت ہے وہ احسانات کی وجہ سے ہے اسی واسطے ہمارے حضرت کا مسلک یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے آرام سے رہو مگر حد سے نہ نکلو۔ ساری دنیا کے مشائخ گھی دودھ چھڑاتے ہیں اور حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ نفس کو خوب کھلاؤ پلاؤ اور اس سے کام لو۔ اس صورت میں خوب کام کرے گا۔ ع

کہ مزدور خوش دل کند کار بیش!

ورنہ کہے گا کہ میاں کس برتہ پر کام کریں۔

حضرت حاجی صاحبؒ ایک دفعہ میرا نام لے کر فرمانے لگے کہ میاں اشرف علی پانی خوب ٹھنڈا پیا کرو۔ ٹھنڈا پانی پیوگے تو ہر بُن مُو سے الحمد للہ نکلے گا اور اگر گرم پیوگے تو الحمد للہ دل سے نہ نکلے گا بلکہ زبان ہی تک رہے گا۔

میں تو حضرتؒ کے یہاں دن رات دیکھتا تھا کہ حضرت کا قصد یہی تھا کہ ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جن سے حق تعالیٰ کی محبت بڑھے اس واسطے کہ بعض کو جب خوف غالب ہوتا ہے تو طاعت کم ہوتی ہے۔ خوف کی صورت میں صرف ضابطہ کی طاعت ہوتی ہے۔ اسی کو تو عراقیؒ کہتے ہیں ؎

صنما رہِ قلندر سزد ار بمن نمائی ... کہ دراز و دور دیدم رہ رسم پارسائی

رہِ قلندر محبت کی راہ ہے اور رہ و رسم پارسائی ضابطہ کی طاعت ہے

محبت ایسی چیز ہے کہ اس میں آدمی ہر قسم کی تکلیف برداشت کر لیتا ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　دل فدائے یار دل رنجان من

محب کی روح کو راحت ہوتی ہے گو جسم کو تکلیف ہو۔ اور یہ حالت ہوتی ہے جیسے ایک عارف کہتے ہیں ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو

جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

جب محبت ہوتی ہے تو پھر کوئی چیز گراں نہیں ہوتی۔ بعض لوگ رات بھر تو جاگتے ہیں اور محنتیں اٹھاتے ہیں اور پھر بشاش رہتے ہیں۔ تو کیا بات ہے؟ یہی محبت ہے اس کی کچھ گرانی نہیں ہوتی۔ میں تو کہتا ہوں کہ کہ جس کو محبت کامل ہو گی اس سے معاصی ہرگز نہ ہوں گے۔ بس جب کسی کو دودھ گھی میسر ہو تو خوب کھائے پیئے بشرطیکہ معاصی کی حد تک نہ پہنچے۔ حد کے اندر رہ کر جتنی چاہے وسعت کرے۔ اس سے محبت بڑھے گی، تو معاصی آپ ہی چھوٹ جائیں گے۔

اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ فتویٰ میں تنگی نہ کرنی چاہیے۔ جائز تک رکھئے تو غنیمت ہے۔ اولیٰ پر تو کہاں پابندی ہو سکتی ہے۔ اختلافی مسئلہ میں اگر ابتلائے عام ہو تو اس کو بھی جائز ہی بتلائیے۔ مگر یہ معاملات میں ہے نہ کہ شطرنج وغیرہ میں۔ کیونکہ معاملات میں تنگی کرنے سے تو تکلیف ہوتی ہے اور شطرنج وغیرہ سے روکنے میں کیا تکلیف ہے۔ اس تقریر سے معلوم

ہو گیا ہوگا کہ حلال کے ابواب کثرت سے موجود ہیں۔

اہلِ خصوصیت کا تقویٰ

مگر افراط تفریط نہ کرنی چاہیئے مشکل یہ ہے کہ لوگ افراط تفریط کرنے لگتے ہیں۔ اہل حال کی حکایات دیکھ کر اپنے کو اُن پر قیاس مت کرو۔ وہ ہوتے ہیں مصاحبین اُن سے ذراسی بات میں گرفت ہو جاتی ہے۔ اور ہم لوگ ایسے ہیں، جیسے رئیسوں کے کاشتکار۔ مصاحب اگر دربار میں بلند آواز سے بھی بولے تو آنکھیں نکال لی جاویں اور کاشتکار اگر باہم گالیاں بھی بکیں، تو چشم پوشی کی جاتی ہے ہر ایک کا معاملہ جُدا ہے۔ اہل خصوصیت کی باتیں ہی الگ ہیں۔ ان کا تقویٰ بھی جُدا ہے۔

ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک طالب علم تھے۔ وہ کہیں پڑھتے تھے۔ اُن کے والد اُن سے ملنے آئے۔ بیٹے تو اُس وقت موجود نہ تھے، ایک اور طالب علم تھے جو اُس حجرہ میں اُن کے بیٹے کے ساتھ رہتے تھے۔ اُن سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ یہ وہاں بیٹھ گئے۔ اتفاق سے حجرہ میں بازار کی روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اُنہوں نے جو دیکھا کہ بازار کی روٹیاں رکھی ہیں تو بہت ہی برہم ہوئے۔ اتنے میں وہ طالب علم بھی آگئے اور اپنے والد کو سلام کیا۔ اُنہوں نے منہ پھیر لیا اور کہا کہ تم بازار کی روٹی کھاتے ہو۔ علم دین کا نور اور اُس کی برکت تمہیں کیسے حاصل ہوگی۔ بازار کی روٹی منظر عام پر رکھی جاتی ہے اور ہر قسم کے لوگ اُس کو دیکھتے ہیں۔ اُن میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی یہ حالت ہوتی ہے۔

کہ بازار چیت رانکہ آگندہ تر   تہی دست را دل پراگندہ تر

روٹی کو دیکھ دیکھ کر اُن کا دل للچاتا ہے اور پاس کچھ ہوتا نہیں۔ اس لئے پریشان ہوتے ہیں اور بعض قحط زدہ ہوتے ہیں کہ ان کا دل روٹی کو دیکھ کر لوٹ پوٹ ہوتا ہے اور خالی ہاتھ ہونے سے کھا نہیں سکتے۔ بس دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ تو یہ بازار کی روٹی سبب ہے بعض مسلمانوں کے دل پریشان ہونے کا اور اس سے مسلمانوں کا دل دُکھا ہے۔ وہی روٹی جس نے دل دکھایا ہے مسلمانوں کا اس کو تم کھاتے ہو۔ اس طالب علم نے عرض کیا کہ یہ روٹیاں میری نہیں ہیں بلکہ میرے شریک حجرہ کی ہیں۔ اس پر اُن کے والد نے کہا کہ تم ایسے حجرہ میں کیوں رہتے ہو جس میں بازار کی روٹیاں کھانے والا رہتا ہو۔

دیکھئے، یہ ہے اہل خصوصیت کا تقویٰ۔ آج کل بتلائیے ایسا کون ہے جو بازار کی روٹی نہ کھاتا ہو۔ جس سے مسلمانوں کا دل دکھا ہوتا ہے ہمدرد قوم کے اصل میں یہ حضرات ہیں۔ آج جو ہمدرد قوم کہلاتے ہیں اب اُن کی حالت دیکھئے۔ اُن کو ہمدرد کیا ہمہ درد کہنا چاہئے۔

ایک جنٹلمین صاحب کا قصہ ہے کہ اُنہوں نے اسباب اٹھانے کے لئے اسٹیشن پر ایک قلی کیا اور مزدوری میں اُس کو دوّنی دی۔ وہ تھی کھوٹی۔ قلی نے کہا کہ اس کو بدل دیجئے نہیں چلے گی۔ اُنہوں نے کہا کہ چلے گی کیوں نہیں۔ اُس نے کہا کہ صاحب کیسے چلے گی۔ یہ تو بہت کھوٹی ہے۔ اس کا اُنہوں نے کیسا ظالمانہ جواب دیا کہ جیسے ہم نے چلا دی تم بھی چلا دینا

تم نے تو ظلم اور زبردستی سے چلادی اُسے کون سا شخص ایسا ملے گا جس پر ظلم اور زبردستی کر سکے۔ بس وہ روتا ہوا چلا گیا اور یہ فرعون کی طرح بیٹھے رہے پروا بھی نہیں کی۔ خدا جانے یہ کیسی ہمدردی ہے۔ بس ان لوگوں میں ہمدردی کے الفاظ الفاظ ہی ہیں۔ ظاہر کچھ ہے باطن کچھ ہے ؎

وجایدۃ دعوی المحبۃ فی الھوی

ولکن لا یخفی کلام المنافق

یہ لوگ تقلید کرتے ہیں یورپ کی مگر اہل یورپ اتنے بے درد نہیں ہیں جیسے یہ لوگ ہیں۔ ایک عادت ان کی یہ بھی ہے کہ یہ لوگ عموماً ہر بات کے اندر مسلمانوں کے مقابلہ میں غیر اقوام کے طریقہ کو ترجیح دے کر اُن کی تقلید کرتے ہیں مگر فضول باتوں میں۔ جیسے کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ حضرت جو اہل کمال ہیں وہ ان فیشنوں کے مقید تھوڑا ہی ہیں اور جن لوگوں کے اندر کچھ کمال نہیں وہ ظاہر کی لیپ پوت کرتے ہیں۔

غرض بازار کی روٹی کھانے کا قصہ تھا کہ اُن طالب علم کے والد صاحب نے ایسے حجرہ میں رہنے کی بھی تو اجازت نہیں دی جس میں بازار کی روٹی کھائی جاتی تھی۔ یہ بھی ایسی ہی حکایت ہے جیسے پہلے گزری۔ مگر یہ خوب سمجھ لیجیے کہ ہم اس حکایت کے مخاطب نہیں ہیں۔

ہمارا تقویٰ

ہمارا تقویٰ فتویٰ ہے۔ فتوے پر عمل کر لیں بس یہی ہمارا تقویٰ ہے۔ فتوے سے جو چیز حلال ہو اُس کو حلال سمجھو لیکن اتنی وسعت بھی نہیں کہ ہر چیز جائز ہو۔ نہ سود کی پروا ہو نہ رشوت کی

پروا ہو۔

مال کے متعلق ایک امر پر اور مطلع کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ لوگ میراث میں بہت زیادہ بے احتیاطی کرتے ہیں کیونکہ خود مالک تو اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتا نہیں اس لیئے بے تک قبضہ میں آتا ہے۔ مرنے والا تو مر گیا اب جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ بس جس کے ہاتھ میں کنجی ہوئی وہ مالک بن بیٹھا۔ مال میراث میں لوگوں کو ذرا احتیاط نہیں۔ اکثر تو مخفی کر لیتے ہیں دوسرے وارثوں کو پتہ بھی نہیں دیتے۔ اکثر زبردست ہونے کی وجہ سے قابض ہو جاتے ہیں اور زیادہ بے فکری وہاں ہوتی ہے کہ جہاں قانون سے بھی انہیں کو ملتا ہے۔ جیسے کہ اودھ میں قانون ہے کہ میراث کا مالک فرزند اکبر ہے اور دوسرے وظیفہ خوار۔

خوب سمجھ لو کہ یہ مطلق حرام ہے۔ شریعت نے میراث کے احکام خود مقرر کیئے ہیں۔ کوئی قانون شریعت کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ شریعت نے جس جس کا حق رکھا ہے اُس کو پہنچانا واجب ہے۔ دوسرے کے حق سے خود منتفع ہونا یا کسی اور کو دینا حلال نہیں ہے۔ سلف کو دیکھئے ایسے اموال میں کتنی احتیاط کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ آپ چراغ کی روشنی میں مال وقف کا حساب لکھ رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے اُن کو آتے ہوئے دیکھ کر آپ نے چراغ گل کر دیا۔ انہوں نے دریافت کیا کہ اس میں کیا مصلحت تھی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ چراغ بیت المال کے

تیل کا ہے۔ اگر روشن رہنے دیتا اور آپ سے باتیں کرتا تو باتوں میں اس کا صرف کرنا درست نہ تھا اور اگر آپ سے باتیں نہ کرتا تو مروّت کے خلاف تھا۔

اسی طرح میراث میں سلف سخت احتیاط کرتے تھے۔ ایک بزرگ ایک دوست کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں گئے تو اُن کو نزع کی حالت میں پایا۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ وہاں چراغ جل رہا تھا۔ آپ نے فوراً اُسے گل کر دیا اور اپنے پاس سے پیسے دے کر تیل منگایا اور اُس سے چراغ روشن کیا اور فرمایا کہ وہ تیل مرحوم کی ملک اسی وقت تک تھا جب تک کہ وہ زندہ تھے اور انتقال کرتے ہی تمام ورثاء کی ملک ہو گیا۔ جس میں بعض ورثاء یتیم ہیں بعض غائب ہیں۔ اس لئے اس کا استعمال جائز نہیں۔

سو یہ تھی اُن حضرات کی احتیاط۔ اب تو تیل کیا ہاتھی کے ہاتھی نگل جائیں اور خبر نہ ہو۔ زیادہ افسوس یہ ہے کہ اہل علم بھی اس کی پروا نہیں کرتے مدارس تک میں اس کی احتیاط نہیں۔ مدارس میں قیمتی قیمتی اسباب اس قسم کے ہوتے ہیں مجھ کو یاد نہیں کوئی خط کسی مدرسہ کی طرف سے اس مضمون کا گیا ہو کہ یہ اسباب جو بھیجا ہے تو سب ورثاء کی اجازت سے بھیجا ہے یا نہیں یا اگر کوئی بچہ میت کا نابالغ ہے تو اُس کا حصہ نکالا ہے یا نہیں۔ بس یہ خیال ہے کہ مال آیا اور رکھ لیا۔

سو جب خواص کی یہ حالت ہے تو عوام الناس کو کیا کہا جائے۔

عوام الناس سے کہو بھی تو کہتے ہیں کہ جب اہل علم ایسا کرتے ہیں تو بھلا ہم کس شمار میں ہیں۔ اہل مدارس دل کو یوں سمجھا لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے واسطے دینے میں کون انکار کرتا ہے۔ اس لئے سب ورثاء کی طرف سے اجازت ہی ہے اور اگر کوئی نابالغ بھی ہے تو وہ پھر بڑا ہو کر معاف کر دے گا۔ بعض کی بلکہ اکثر کی یہ حالت ہے کہ میت کی فاتحہ اور کھانا وغیرہ مشترک مال سے کرتے ہیں جس کے اندر نابالغ بچوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ جو شخص اس مغصوب مال کو کھائے گا وہ مغضوب ہوگا۔ جی کو یوں سمجھا لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیتے ہیں پھر اس میں ہم پر الزام کیا ہے۔

بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ کوئی شخص مر گیا۔ بس سارا مال بیوہ کو دے دیا بلّی کے بھاگوں چھیکا ٹوٹا۔ اب وہ مالک الملک ہے۔ یتیم بچوں کا مال خوب لٹا رہی ہے کہیں شادی میں کہیں نیوتہ میں۔

نیوتہ کے مفاسد

اوّل تو نیوتہ کی رسم[۱] ایک رسم ہے بیہودہ۔ اس میں اگر خالص اپنا مال ہو تب بھی نہ لگانا چاہیئے اور پھر یہ تو مشترکہ مال ہے اگر کوئی کہے کہ صاحب نیوتہ تو نہایت عمدہ رسم ہے

---

[۱] رسم نیوتہ کبھی پہلے بطریق ہمدردی و امداد برادرانہ تھی اب وہ عام طور سے بصورت قرضہ ہو گیا ہے۔ دور کا کیا ذکر قریبی تعلقات اور واسطہ داریوں میں بھی اسی نیت سے اس کا لین دین ہے کہ آج ہم اُن کے دیں گے تو کل کسی تقریب میں ہمارے یہاں واپس آجائے گا۔ اور خصوصاً تقریبات

(بقیہ حاشیہ بر صـ۱۵۲)

تھوڑا تھوڑا دینے میں شادی والے کا کام ہو جاتا ہے اور دینے والوں میں سے کسی پر بار نہیں ہوتا، تو مستحسن کو قبیح کیسے کہہ دیا۔ غریب کو دیا اس کی شادی ہو گئی۔ یہ تھوڑی بات ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں نے ایک فائدہ کو تو دیکھ لیا اور دوسرے مفاسد جو اس کے اندر ہیں ان کو چھوڑ دیا۔ اس میں اگر ایک فائدہ ہے، تو مفاسد کتنے ہیں۔ ان مفاسد کو بھی تو دیکھنا چاہیئے۔ اور اول تو جو فائدہ اس میں سوچا گیا ہے وہ بھی حاصل نہیں ہوتا کیونکہ آج کل کی شادیوں میں خرچ اتنا کیا جاتا ہے کہ نیوتہ اس کے لیے کافی نہیں ہوتا اور مفاسد اس کے اندر بہت ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک مفسدہ یہ ہے کہ جب لوگ کسی کے

(بقیہ حاشیہ از صلا۱۵) میں قصداً وہی لوگ مدعو کیے جاتے ہیں کہ جن کے ذمہ اپنا نیوتہ واجب ہے۔ کسی تقریب کا تخمینۂ خرچ کرتے ہوئے یہ بھی اندازہ کیا جاتا ہے کہ اتنا روپیہ اپنے نیوتہ کا بھی آجائے گا اور پھر جب دوسری جانب سے وصول میں توقف وتساہل ہوتا ہے تو برملا دوسروں کے سامنے اس کا تذکرہ اور اظہار کیا جاتا ہے کہ فلاں کے ذمہ اتنا نیوتہ چاہیئے تھا نہ تو خود آئے نہ ہمارے نیوتہ کا روپیہ بھیجا۔ اور بعض جگہ تو آئندہ تقریب تک انتظار بھی نہیں کرتے درمیان میں ہی پیام آجاتا ہے کہ ہمارے نیوتہ والے روپے بھیج دو ہمیں ضرورت ہے۔ پس ایسے صریح ومسلمہ قرضہ کی حالت میں انتظام ادائیگی قطعی نہیں۔ اکثر جگہ تو نانک خانہ کی زبانی

(بقیہ حاشیہ بر صلا۱۵۳)

یہاں نیوتہ دیتے ہیں تو نیوتہ لینے والا اتنے لوگوں کا مقروض بنتا ہے۔ حدیث میں صاف موجود ہے کہ مقروض جنت میں نہ جائے گا۔ تاوقتیکہ اہل حق کا حق ادا نہ ہو جائے۔

دوسرا مفسدہ تو بالکل لاعلاج ہی ہے۔ اُس کا علاج ہی نہیں سوائے اس کے کہ اس رسم کو چھوڑا جائے اور وہ میراث کے ایک مسئلہ پر متفرع ہے۔ اسے اس طرح سمجھئے کہ ایک شخص مرا۔ اُس نے دو بیٹے چھوڑے اور اُس نے مثلاً پانچ روپے نیوتہ میں دیئے تھے تو پانچ روپے بھی مردہ کی میراث میں جب وصول ہوں گے تو اُن کا ورثا پر تقسیم کرنا واجب ہو گا۔ اب وہ آئیں گے کس طریقہ سے۔ اس کی صورت یہی ہے کہ جب اُن کے یہاں

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۱۵۲) یادداشت پر حساب کتاب ہے۔ خود کو بھی سہو ممکن ہے اور پھر اپنے بعد اپنے ورثا کو اس کی بابت کوئی ہدایت یا وصیت نہیں۔ پسماندگان میں سے جس کسی کو جس قدر یاد آیا یا دوسری جانب سے اُن پر تقاضا ہوا تو خیر کچھ ادائیگی ہو گئی اور اگر دوسری جانب بھی اصل خواہندہ کا انتقال ہو گیا اور اُس کے چند وارث ہیں تو ایسی صورت میں اوّل تو خبر ہے نہ باشد اور اگر دیا بھی تو کسی ایک وارث کو دے کر باقی ورثا کا مطالبہ یا حق بالکل سوخت۔ نہ اُن کی تلاش کہ وہ کہاں کہاں ہیں اور ہر ایک کا کیا حصّہ ہوا۔ جہاں کہیں اس نیوتہ کا انتظام تحریری ہے وہ بھی لینے کے واسطے ہے دینے کے واسطے کبھی اُن کی میزان بھی نہیں دیتے کسی ساہوکار

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۵۴)

کوئی شادی ہوگی تو وہ بطور نیوتہ کے دیئے جائیں گے۔ اب ایک بیٹے کی شادی ہوئی اور وہ پانچ روپے آئے تو وہ پورے پانچ روپے اس کے نہیں بلکہ صرف اڑھائی روپے کا مستحق ہے اور باقی اڑھائی روپے دوسرے بھائی کا حصّہ ہے لہٰذا وہ اس کو دینے لازم ہیں مگر وہ اس کو نہیں دیئے جاتے۔ اس لئے دینے والے کے ذمہ سے پانچوں روپیہ ادا نہ ہوئے بلکہ صرف اڑھائی روپے ادا ہوئے اور دوسرے بیٹے کے اڑھائی روپے رہ گئے۔ پھر وہ مرگیا۔ تو اب ان اڑھائی روپے کی میراث چلے گئے۔ اسی طرح آگے اولاد ہوگی اور یہی سلسلہ چلے گا۔ تو اس اڑھائی روپیہ کے ہزاروں آدمی مستحق ہوگئے قیامت میں اس شخص کی جان پر بنے گی۔ اس لئے ایک ایک پیسہ اور کوڑی

(بقیہ حاشیہ از ص ۱۵۳) مہاجن کا یا کسی دوسری قسم کا قرضہ ہوگا تو اس کا شمار بھی کریں گے کہ ہم کو اس قدر دینا ہے لیکن اس کے ذیل میں کبھی نیوتہ کا قرضہ نہیں گنا جاتا۔ ایسی حالت میں اس نیوتہ کا لینا دینا مذموم اور باعث ہلاکت ہے کہ ایک زمانہ اس میں مبتلا ہے۔ اور مقروض اور پھر بے فکر اور حساب آخرت سے نڈر۔ اگر لیتے دیتے وقت قرض حسنہ کا اظہار اور اقرار ہو، تو بھی اس کا عملدر آمد چند خواص تک محدود ہوگا۔ عوام میں اس کا اہتمام نہ دارد سب میں بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس رسم کو قطعی بند کر دیا جائے اور جس کے ذمہ جس کسی کا اب تک باقی ہے اپنی حیات میں بلا انتظار کسی تقریب کے ادا کر دیا جائے۔ چہ دانے نہ فرصت بے خبر دہر چہ باشی زود باشی ۔۔ نیوتہ میں

(بقیہ حاشیہ بر ص ۱۵۵)

کا دعویٰ ہوگا۔ آخر اس کا علاج کیا سوچا ہے؟ اس نیوتہ سے تو نا نیوتہ اچھا۔ یہ مفاسد ہیں اس نیوتہ خبیث میں۔ مگر چونکہ لوگوں کو شریعت کا علم نہیں، اس واسطے ان خرابیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔

میراث کی خرابیاں

غرض یہ کہ میراث میں بڑی خرابی ہو رہی ہے بیوہ کو اگر سارا مال مل جاتا ہے تو وہ اس کو اس طرح لٹاتی ہے اور یتیم بچوں کا بھی حصہ نہیں چھوڑتی ہے۔ اور اگر کسی اور کا قبضہ ہو جاتا ہے تو وہ مالک بن بیٹھتا ہے۔ دوسرے وارثوں کو نہیں دیتا۔ رہیں گھر کے برتنے کی چیزیں سو وہ تو مشترک ہی رہتی ہیں۔ کبھی تقسیم ہی

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۱۵۴) نقد روپیہ کے علاوہ پارچہ کا بھی لین دین ہے اور یہ اس نقد سے بدتر ہے۔ بیشتر یہ باعث بے لطفی جانبین ہوتا ہے کہ ہماری بری کا کیسا اچھا تھا اور ہمیں کیسا ذلیل دیا۔ اس حجت کی بنا پر بعض گھروں میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اس بری آنے والی کو بدستور رکھ چھوڑتے ہیں اور جب دینے والے کی کوئی تقریب ہوتی ہے خواہ کسی مدت میں ہو وہی بری پوشیدہ رکھی ہوئی دیتے ہیں۔ اس صورت میں یہ بری جانبین میں سے کسی کے مصرف کی نہ ہوئی اور رکھے رکھے بیکار ہوگئی۔ کیسا اسراف اور نازیبا عمل ہے۔ اس کو بھی بالکل مسدود کیا جاوے اور جس کسی کی جو چیز ہو فوراً دے دی جاوے۔ فقط ۱۲۔ جامع۔

نہیں کی جاتیں۔ یہ گڑبڑ ہو رہی ہے میراث میں۔

بس ان سے بچنے کی آسان صورت یہ ہے کہ جب کسی کا انتقال ہو جائے تو جتنا مال اور اسباب ہو سب تقسیم کر لو اور دیر بالکل نہ کرو۔ دیر کرنے میں بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بطور نمونہ کے چند واقعات سناتا ہوں۔

میرے والد صاحب کے پاس ایک قلمدان تھا۔ بعد ان کے انتقال کے میں نے لے لیا کیونکہ سارے ورثا بالغ تھے اور میرے لینے سے سب خوش تھے۔ مگر پھر مجھے کھٹکا ہوا کہ میرے فعل سے دوسروں کو سند ہو گی بس میں نے قیمت کر کے ورثا کو تقسیم کی اور میں نے کہہ دیا کہ چاہے قلمدان لے لو چاہے پیسے لے لو اور وجہ یہ تھی کہ مجھے اس کو مفت لیتے ہوئے غیرت آئی کہ کیوں ورثاء کی منت لوں کہ ان سے معاف کراؤں ؎

ہر کہ نان از عمل خویش خورد　　　منتِ حاتم طائی نہ برد

دوسرے مجھے سبق سکھانا تھا کہ یوں کیا کرتے ہیں۔

میرے والد کے اسباب میں چکن کے دو چوغے تھے جو لکھنؤ سے لائے تھے۔ ایک میرے لئے اور ایک بھائی کے لئے۔ مگر دینے نہ پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اگر میں لے لیتا تو الحمدللہ! کوئی ان کا مطالبہ کرنے والا نہ تھا اور ان کے کس کام کے تھے۔ خوشی سے سب مجھ کو دے دیتے مگر میں نے کہا کہ ان میں بھی میراث جاری ہو گی۔ یہ میں نے اس وجہ سے کہا کہ اس سے اوروں کو سبق ملے گا۔ برتن وغیرہ سب کی تقسیم شرع کے موافق کی گئی اور تھوڑی ہی دیر میں تمام ترکہ تقسیم ہو گیا اور ذرا نزاع نہیں ہوا۔ اس لئے میری رائے

ہے کہ ترکہ مرتے ہی تقسیم ہو جاوے۔ بعد میں بڑے قصے پھیلتے ہیں۔ اب ا
تقسیم برسوں کے بعد ہوتی ہے۔ بڑی خرابیاں پڑتی ہیں۔ بس خدا سے ڈرنا چاہئے
ران معاملات کو درست کرنا چاہئے۔

آمد و خرچ کے معاملات

خلاصہ یہ کہ لوگوں نے آمد مال کے ابواب میں سخت بے احتیاطیاں کر رکھی ہیں یہ
سمجھتے ہیں کہ بس شریعت کا تعلق صرف نماز روزہ سے ہے۔ حالانکہ شریعت
معاملات اور اموال سے بھی پورا تعلق ہے۔ قیامت کے روز ایک
دانگ[1] کے عوض میں سات سو مقبول نمازیں لے جائیں گے۔ پھر حضرت اگر ایسا
ا تو بتلائیے ہمارے پاس کیا بچے گا۔ خدا کے لئے معاملات درست کرو
جائز آمدنی کو چھوڑو۔ رشوت بھی حقوق عباد سے ہے۔ سود بھی حق عباد ہے
ان سب سے احتیاط رکھو اور حقوق الٰہی کا بھی خیال رکھو۔

رشوت کے بارہ میں یہ کہنا کہ اُس نے تو خوشی سے دیا، یہ محض غلط ہے
ئی اپنا مال خوشی سے نہیں دیتا۔ اپنے اوپر قیاس کر کے دیکھئے کہ اگر آپ کو کبھی
تفاق پڑے تو کیا آپ خوشی سے دیں گے؟ ہرگز نہیں بلکہ اگر معلوم ہو جائے
کام ویسے بھی ہو جائے گا تو کبھی نہ دیں۔

یہاں تک جو کچھ بیان ہوا وہ تحصیل مال کے متعلق تھا جس کو میں نے
فصیل سے عرض کر دیا۔ اب دوسری شق مال کے خرچ کرنے کی باقی رہ گئی

---

[1] غالباً ایک دانگ تین پیسے کا ہوتا ہے۔

کہ اس میں بھی لوگ بے احتیاطی کرتے ہیں۔ اور مال میں دو ہی تصرف ہیں ایک اس کا حاصل کرنا دوسرے اس کا صرف کرنا۔ ایک جزو کا تو بیان ہو چکا۔ اب دوسرے جزو کو بیان کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ خرچ میں بے احتیاطی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ کھلے معاصی میں مال خرچ کیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کھلی معصیت میں تو مال خرچ نہیں کیا مگر خرچ حد سے زیادہ کیا۔ شہوات میں منہمک ہو گئے۔ تنعم اور تفاخر میں اڑانا شروع کر دیا۔

خوب سمجھ لو کہ تنعم اور تفاخر کا انجام ذلت ہے۔ کیونکہ اموال غیر متناہی تو ہیں نہیں کہ کتنا ہی خرچ کرو اور وہ کم نہ ہوں۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ مکان تک بکنے کی نوبت آجاتی ہے۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ مسجد کا سقاوہ بھرا کرتے تھے اور لوگ اُن کو نواب کہہ کر پکارتے تھے۔ میں نے کہا، یہ نواب کیسے ہیں معلوم ہوا کہ واقعی نواب تھے۔ اپنے آپ کو تباہ کر کے اس اوقات پر آ گئے ہیں میں نے کہا، شاباش! یہ انجام ہے مسلمانوں کا۔ صدہا امراء اور رؤسا فضول خرچی کی بدولت تباہ ہو رہے ہیں۔ جائیدادیں ہندوؤں کے قبضہ میں جا رہی ہیں۔

کانپور میں ایک رئیس کا انتقال ہوا۔ ساری جائیداد اُن کے بیٹے کے ہاتھ آئی۔ اُس نے اڑانا شروع کی۔ اُس کے والد کے ایک دوست نصیحت کرنے کے لئے آئے اور اس کو بٹھا کر بہت دیر تک سمجھایا۔ وہ چپکا گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ اُس کی یہ حالت دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ اُس پر میری نصیحت کارگر ہوئی۔ جب یہ سمجھا چکے تو اُس نے کہا کہ

آپ کہہ چکے یا ابھی کچھ اور کہنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بس جو مجھے کہنا تھا وہ کہہ چکا۔ وہ اٹھا اور طاق میں سے ایک لنگوٹی اٹھالایا اور کہا کہ سنئے فضول خرچی کا زیادہ سے زیادہ انجام یہ ہے۔ میں نے جس روز سے فضول خرچی شروع کی اسی روز سے میں اس کے لئے آمادہ ہوگیا ہوں اور یہ بنوا کر رکھ چھوڑی ہے وہ بیچارے اُس کا منہ دیکھتے رہ گئے کہ کم بخت نے بیکار ہی میرا دماغ خالی کرایا۔

غرض یہ کہ بعض فضول خرچ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ لنگوٹی سے آگے تو اور کچھ نہیں۔ لنگوٹی باندھ لیں گے۔ سو ایسے باہمت لوگ بھی ہیں۔

مسلمانوں کی تباہی کا راز

میں سچ کہتا ہوں کہ مسلمان دوسری قوم کے ہاتھ سے کبھی تباہ نہیں ہوتے۔ جب تباہ ہوتے ہیں اپنے ہاتھ سے ہوتے ہیں۔ اسلام ایک قلعہ ہے۔ آہنی دیوار ہے۔ اُس میں مسلمانوں کو بسایا ہے۔ اس دیوار کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ اب اس کا کیا علاج کہ کوئی خود ہی دشمن کے لئے پھاٹک کھول دے۔ اگر یہ طریقہ سے رہیں تو کسی سے مغلوب ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ تو حزب اللہ ہیں جن کے بارہ میں ہے فان حزب اللہ ھم الغالبون۔ یہ تو غالب ہی رہیں گے مگر خود ہی اپنا ناس کرلیں تو اور بات ہے۔ مسلمانوں پر جب تباہی آتی ہے اپنے ہاتھوں آتی ہے۔ کسی دوسرے کے ہاتھوں نہیں آتی۔ چنانچہ رؤساء کی عموماً یہ حالت ہے کہ چانڈو اور گانجہ اور عیاشی میں اپنی جائیدادوں کو ختم کردیتے ہیں اور پھر فقیر ہوجاتے ہیں۔

ہمارے یہاں ایک نواب تھے۔ کسی ملک کے نواب نہیں تھے بلکہ فضول خرچی سے نواب مشہور تھے۔ یہ حالت تھی فضول خرچی کی کہ نوچندی کا میلہ ہے اور مصاحبوں نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا کہ ہمارے پاس کچھ ہوتا تو ہم بھی جاتے۔ بس یہ سُن کر سو سو روپیہ سب کو دے دیا۔ اور یہ کیفیت تھی کہ جلیبیاں منگائی ہیں مصاحبین میں سے کسی نے کہہ دیا کہ تیل کی ہیں۔ بس بیلوں کو ڈلوا دیں۔ وہ جلیبیاں بیل کھا رہے ہیں۔ اور صدہا قسم کی فضولیات اُن کے یہاں رہتی تھیں۔

انجام یہ ہوا کہ مفلس قلاش ہو گئے۔ ایک حالت تو وہ تھی پھر دوسری حالت فاقہ کی ہوئی۔ اُس میں یہ کیفیت تھی کہ میرے پاس، تمہارے پاس پہنچتے ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ آٹھ آنے پیسے دے دیجئے۔ بہت ضرورت ہے۔ جو لوگ پردیس سے آتے اُن کے پاس پہنچ جاتے میرے والد کے پاس بھی اکثر آتے۔ میں اُس زمانہ میں پڑھا کرتا تھا۔ میں اُن کی یہ حالت دیکھتا۔ مگر لوگ کہاں تک دیں۔ اُنہوں نے تو پیشہ ہی یہ کر لیا تھا آخر انکار کر دیتے۔

جس وقت اُن کے پاس جائداد تھی اُس وقت اگر کوئی اُن کو نصیحت کرتا کہ اس طرح فضول خرچیاں مت کرو۔ جائداد کو بیچ بیچ کر مت اڑائے ڈالو۔ دیکھو تمہارے باپ نے کس طرح یہ جائداد خریدی تھی۔ تو آپ فرماتے ہمارے باپ بیوقوف تھے کہ چاندی دے کر مٹی لیتے تھے (یعنی روپیہ دے کر زمین خریدتے تھے)، ہم مٹی دے رہے ہیں اور چاندی خرید رہے ہیں

پاس (یعنی زمین بیچ رہے ہیں اور روپیہ لے رہے ہیں۔) مگر اُنہوں نے اپنی حماقت سے یہ نہ سمجھا کہ مٹی تو چاندی کی بھی ماں ہے۔ جس کے پاس زمین ہے اُس کے پاس سب کچھ ہے۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس جائداد ہو اور اُس کو کسی مصلحت سے بیچ دے تو فوراً دوسری خرید لے کیونکہ روپے میں برکت نہیں ہوتی (یعنی وہ رہنے والی چیز نہیں) اور واقعی ہے بھی یہی کہ روپیہ رہتا نہیں۔ سو اس حدیث میں تو جائداد کی حفاظت کی رغبت دلائی جا رہی ہے اور ایک اور حدیث ہے اُس میں جائداد خریدنے سے حضرت عائشہ کو ممانعت فرمائی ہے۔ وہ پیغمبر ایک جگہ رغبت دلا رہے ہیں جائداد رکھنے کی اور وہی حضرت عائشہ رضؓ سے فرما رہے ہیں کہ اے عائشہؓ جائداد مت خریدنا۔ تو مطلب یہ ہے کہ نہ ہو تو مت اور ہو تو دو مت۔ بجز نبیؑ کے کوئی پیشوا ایسا ہے جس کی ایسی تعلیم ہو۔ بس دوسرے پیشوا دو قسم کے ہیں یا تو دنیا کو چھڑائیں گے یا اُس میں مبتلا کر دیں گے اور یہاں یہ کیفیت ہے ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندانِ عشق

ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

اور خاص اس تعلیم میں ایک راز ہے وہ یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت کو ذلت سے بچاتے ہیں اور یہ امر شاہد ہے کہ جس کے پاس جائداد ہو اُس کی عزت تو جائداد سے ہوتی ہے۔ وہ اگر جائداد بیچ دے گا تو اُس کی وہ عزت ہرگز نہ رہے گی۔ اس لئے اُس کو رکھنے کے

واسطے فرمایا۔ یہاں تک کہ اگر کسی مصلحت سے فروخت کرے تو پھر دوسری فوراً لے لے اور جس کے پاس جائداد نہ ہو تو اس کی جو عزت ہوگی وہ ویسے ہی ہوگی۔ پھر جائداد خرید کر کے کیوں جھگڑے میں پڑے۔ یہ خوبی ہے اس قانون میں۔ کوئی قانون ہے شریعت کے سوائے جو عقل سلیم اور فطرتِ صحیح کے موافق ہو۔

خلاصہ یہ کہ جائداد ایسی چیز ہے کہ حضورؐ اس کے بیچنے سے منع فرما رہے ہیں۔ دیکھا آپ نے زمین کتنی قدر کی چیز ہے۔ اس سے عزت اور جاہ کی حفاظت ہوتی ہے۔ اور اس کی برکت دیکھئے کہ جس کے پاس یہ ہے اس کے پاس سب کچھ ہے اور خوبی یہ کہ آمدنی کھاتے رہو اور ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔ اس میں سے کچھ کم نہیں ہوتا۔

تو ایسی چیز کے لئے ان شرچیلے نواب نے کہا کہ مٹی دے کر ہم چاندی خریدتے ہیں۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ اب میں اس کی تائید میں ایک حدیث کی شرح کرنا چاہتا ہوں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ زمین کیسی چیز ہے۔

زمین کی حقیقت

وہ حدیث یہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جنت میں سب سے پہلی غذا زمین کی روٹی ہوگی۔ حق تعالیٰ زمین کی روٹی بنا کر جنت والوں کو کھلادیں گے۔ ظاہراً اس حدیث پر کوئی ہنسے گا کہ اچھے جنت میں گئے کہ ڈھیلے اور پتھر کھانے کو ملے اس سے تو دنیا ہی میں اچھے تھے۔ وہاں تو روٹی کھاتے تھے اور یہاں ڈھیلے ا

پتھر نصیب ہوئے۔ کسی کے حصہ میں کوہ منصوری کا پتھر اور کسی کے حصہ میں کوہ شملہ کا۔ اچھے جنت میں آئے کہ ایسی چیزیں کھانی پڑیں۔ اس حدیث کی شرح بجز اہل اسرار اور اہل اللہ کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کی شرح سن کر آپ کو اہل اللہ کی قدر معلوم ہوگی کہ حق تعالیٰ نے اُن کو کیسا فہم دیا ہے۔ حقیقت میں ظل اللہ فی الارض کا لقب پورا ان ہی حضرات پر صادق ہے سو وہ حضرات یوں کہتے ہیں کہ دنیا میں جتنی چیزیں اچھی سے اچھی کھا رہے ہیں اور اچھے سے اچھے کپڑے پہن رہے ہیں۔ یہ کہاں سے آئے۔ زمین ہی سے تو نکلے ہیں۔ اگر اُونی کپڑے ہیں تو اُون ہوتی ہے حیوانات سے اور حیوانات نے زمین ہی کے تو اجزا کھائے ہیں جن سے وہ اُون پیدا ہوئی ہے۔ غرض جس چیز کو بھی لیجئے گا اجزائے زمین ہی اس کی حقیقت نکلے گی۔ زمین میں پانچ سیر گیہوں ڈالے تھے اور پیدا ہوئے پانچ من۔ تو وہ پانچ سیر سے زیادہ جو پیدا ہوئے وہ زمین ہی کے تو اجزا ہیں۔ اُنہی کی تو صورت بدل گئی ہے۔ یا آم کا درخت نکلا اور اس میں ہزاروں آم پیدا ہوئے یا غلہ پیدا ہوا یا کسی قسم کا پھل اترا سب زمین ہی کے تو اجزا ہیں، عناصر سے مرکب ہو کر جس میں جزو غالب ارضی ہے، اس شکل سے نمودار ہو گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے اندر سب چیز موجود ہے۔ پس یہ کہنا غلط ہو گیا کہ زمین میں بس ڈھیلے اور پتھر ہی ہیں۔ زمین میں انار بھی ہیں، آم بھی ہیں، انگور بھی ہیں، کھٹائی بھی مٹھائی بھی۔ سب چیزیں زمین کے اندر موجود ہیں۔ ہر طرح کا مادہ اس میں رکھا ہوا ہے۔ یہ وہی مادہ ہے جو ان رنگ برنگ صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے

ایک مقدمہ تو یہ ہوا کہ زمین کے اندر سب کچھ ہے۔
دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب کوئی کسی کے یہاں مہمان ہو کر جاتا ہے تو اُس کو بے چھنا آٹا تک نہیں کھلاتے۔ اور لوگ جائیں گے خدا کے مہمان ہو کر۔ تو اللہ تعالیٰ پر یہ گمان کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ زمین کو بے چھانے کھلادینگے بس وہ اپنی قدرت کی مشین سے شملہ اور منصوری کے پتھر سے جو فضلہ ہے وہ الگ کر دیں گے اور اُن میں جو اجزا قابل کھانے کے ہیں وہ رہنے دینگے۔
اب اس تقریر سے کچھ بھی شبہ نہیں رہتا دیں کہتا ہوں کہ زمین کی روٹی کے برابر کوئی چیز مزیدار ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ دنیا میں جتنے بھی مزے ہیں، سب زمین ہی کا طفیل ہے۔ خوشبوئیں جس قدر بھی ہیں زمین ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس سے جو روٹی تیار ہو گی ظاہر ہے کہ اُس میں ہزاروں قسم کے تو مزے اور ہزاروں قسم کی خوشبوئیں ہوں گی۔ لہٰذا اس کی روٹی سے کون سی چیز مزہ دار ہو سکتی ہے۔ جامع)
اب ایک بات اور رہ گئی۔ وہ یہ ہے کہ اس تکلف کی ضرورت کیا تھی کہ اس زمین کی روٹی بنائی جائے۔ یہ جنّت کی نعمتوں کے برابر تو ہو گی نہیں پھر جنت ہی کی چیز کھلا دیتے۔
اس کا راز بھی حضرات اہل اللہ ہی نے بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ اہل اللہ میں سے بعض ایسے ہوئے ہیں کہ انہوں نے دنیا کی لذت چکھی تک نہیں یا تو قصداً یا میسر نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ موازنہ نہ کر سکتے تھے جنت اور دنیا کی نعمت میں۔ اور جب کہ دونوں کا تفاوت معلوم نہ ہوتا تو جنت کی نعمتوں کی قدر بھی

پوری نہ ہوتی۔ اس لئے حق تعالیٰ نے پہلے دنیا کی چیز کو کھلادیا کہ سب سے زیادہ لطیف غذا دنیا کی یہ ہے اب ہمارے یہاں کی غذا کھاؤ۔

اگر کوئی کہے کہ پھر ایسے ہی لوگوں کو کھلادیا ہوتا جن کو دنیا کی لذات نہیں ملیں۔ سب کو کیوں کھلایا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ کریم کی یہ عادت نہیں ہوتی کہ بعض کو کھلائیں اور بعض کو محروم رکھیں۔ اس لئے ہم سوالیوں کو بھی اُن کے ساتھ شامل کر دیا یہ راز ہے اس حدیث کا۔ اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ زمین کیا چیز ہے کھانے اس میں، میوے اس میں، کپڑے اس میں، سب چیزیں زمین ہی میں ہیں اسی لئے یہ بڑی قدر کی چیز ہے۔

اسراف وتبذیر

اگر کسی مسلمان کی زمین کسی کافر کے پاس دیکھتا ہوں تو میرا دل بہت دُکھتا ہے۔ کسی کے اچھے مکان کو دیکھتا ہوں تو پوچھتا ہوں کہ کس کا ہے۔ اگر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کا ہے تو خوش ہوتا ہوں۔ اگر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کا نہیں تو قلق ہوتا ہے۔

میں ایک ضرورت سے نظام آباد گیا تھا۔ وہاں سے حیدرآباد قریب تھا۔ میں نے سنا تھا کہ وہاں مسلمانوں کو بہت ثروت ہے۔ غیر قوموں سے بھی ثروت میں بڑھے ہوئے ہیں۔ اس لئے میں وہاں سے حیدرآباد بھی گیا تاکہ مسلمانوں کو عزت کی حالت میں دیکھوں۔

میں گو مسلمانوں کے لئے فی نفسہٖ مالدار ہونا پسند نہیں کرتا مگر اوروں کے مقابلہ میں اس کو پسند کرتا ہوں۔ بشرطیکہ وہ احتیاط کریں۔ اسی لئے جس کو بھی

مال اڑاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو یوں کہتا ہوں کہ اس کو کیا ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کی نعمت کی قدر نہیں کرتا۔ بلکہ میں تو علاوہ معصیت ہونے کے دنیا کی مصلحت سے بھی اسراف کو پسند نہیں کرتا۔ دنیا کے مصالح بھی تو اسی میں ہیں کہ اس کو بے جا صرف نہ کیا جائے

میں سفیان ثوریؒ کا قول عرض کرتا ہوں جو انہوں نے مال کے بارہ میں فرمایا ہے ـــــ اور یہ بزرگ وہ ہیں جو دنیا اور دنیا داروں سے انتہا درجہ کی نفرت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ہارون رشید تخت پر بیٹھے تو اُن کی تخت نشینی کا جلسہ ہوا جس میں علماء اور فقراء کو بہت کچھ ہدایا دیئے گئے مگر آپ ملنے کو بھی نہیں گئے۔ حالانکہ آپ کی ہارون الرشید کے ساتھ بچپن کی دوستی تھی۔ دونوں ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے۔ اگر ہم سوال ہوتے تو یوں کہتے کہ اس میں حرج کیا ہے۔ ہارون رشید ایسے نہیں ہیں کہ اُن سے ملنے نہ جائیں، دیندار بادشاہ ہیں۔ مگر وہ جا کر بھی نہ پھر ے۔

ہارون رشید جب تخت نشینی کے قصوں سے فارغ ہوئے تو سفیان ثوریؒ کی خدمت میں بڑے ادب سے خط لکھا کہ بھائی سفیان کو یاد ہو گا جو مجھ میں اور تم میں علاقہ تھا۔ تم میرے بھائی ہو۔ میری تخت نشینی سے تمہارا جی خوش ہونا چاہیئے تھا مگر تم ملنے بھی نہیں آئے۔ تم آتے تو مجھے خدمت کرنے کا بھی موقع ملتا۔ غرض انہوں نے بڑے ادب سے خط لکھا۔ مگر جس وقت سفیان ثوریؒ کے پاس خط گیا ہے تو انہوں نے اس کو ہاتھ بھی نہیں لگایا بلکہ اس کو ایک لکڑی سے کھولا اور اسی کی پشت پر جواب لکھوا دیا۔ جس کے شروع میں

یہ مضمون تھا کہ ظالم ہارون رشید کو واضح ہو جس نے مسلمانوں کے حق پر قبضہ کیا ـــــــ جس وقت قاصد نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا کہ بادشاہ کے خط کی ان کے یہاں یہ قدر ہے تو اُس پر بے حد اثر ہوا اور وہ دربار میں پہنچا اور خط ہارون رشید کے سامنے ڈال دیا اور کہا کہ میرا استعفاد منظور ہو۔ ہارون رشید اُس خط کو دیکھ کر رو پڑے اور کہا کہ افسوس پیام لے جانے والا تو کامیاب ہوگیا اور پیام بھیجنے والا محروم رہ گیا۔

سو جن کو اتنی بڑی نفرت تھی دنیا اور اہل دنیا سے، وہ کہتے ہیں کہ جس کے پاس پیسہ ہو تو اُسے چاہئے کہ اُس کی قدر کرے اڑائے نہیں۔ یہ حضرات مربی تھے۔ حدود کے سمجھنے والے تھے۔ آپ فرماتے ہیں الحلال لایحتمل السرف یعنی مال حلال میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی کہ اُس کو فضول خرچ کیا جاوے۔ اور آپ اُس کی مصلحت بھی بیان کرتے ہیں۔ لولا ھذہ الدراھم لتمندل بنا ھؤلاء الامراء۔ یعنی اگر دراہم نہ ہوتے، تو یہ حکام ہم کو دستمال اور پامال کر دیتے۔ واقعی جس کے پاس مال ہوتا ہے اُس پر حکام دست اندازی نہیں کر سکتے۔ مال والا آن بان کے ساتھ رہتا ہے۔ اُس کی وہ عزت ہوتی ہے جو بے پیسے والے کی نہیں ہو سکتی۔ اُس کو سر نیچا کرنا نہیں پڑتا۔ بھائی اسی واسطے مال بڑی قدر کی چیز ہے۔ سو آپ نے یہ اُس کی حکمت بیان فرمائی۔

اب آپ کو معلوم ہوا کہ مال کیسی چیز ہے۔ کیا یہ نعمت نہیں خداتعالےٰ کی کہ جیسے عرب سقہ بہشتی وغیرہ پر امراء دست اندازی کر سکتے ہیں، مال

والے پر نہیں کر سکتے۔ تمول ہی تو اس کا سبب ہے۔ پس ایسی چیز کو برباد کرنا کتنی بڑی حماقت ہے۔ اسی واسطے فرماتے ہیں ؎

اے لبا امساک کز انفاق بہ　　مال حق را جز بامر حق مدہ

خوب سمجھ لو کہ یہ مال تمہارا نہیں ہے خدا تعالیٰ کا ہے۔ پس ان کا مال جب دو ان کی اجازت سے دو۔ جب تک کہ ان کی اجازت نہ ہو ہرگز نہ دو نہ کسی مصاحب کو نہ اور کسی کو۔ اگر فضول خرچ کرنے سے تباہی آگئی تو کیا اس وقت کوئی تمہارا ساتھ دے گا۔ جو آج حضور حضور کرتے ہیں، وہی اُس وقت گالیاں دیں گے۔ پس اس کو بہت حفاظت سے رکھنا چاہیئے۔ ہاں جو واقعی موقع ہو خرچ کرنے کا وہاں خرچ بھی کرنا چاہیئے۔

حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس کہیں سے چھ ہزار روپیہ آیا تھا آپ کو ایک شریف آدمی کے متعلق معلوم تھا کہ ان کو حاجت ہے پس آپ نے ان کو بلا کر چپکے سے تمام روپیہ حوالے کر دیا۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ کے پاس ڈیڑھ سو روپیہ کا ایک پوستین ایک جگہ سے آیا۔ ایک نواب آپ کے یہاں آئے ہوئے تھے۔ آپ نے ان کو دے دیا اور فرمایا کہ یہ پوستین میرے کام کا تو ہے نہیں کیونکہ پوستین ایسا قیمتی ہو تو باقی لباس بھی ویسا ہی ہونا چاہیئے اور آپ کے کام آجائے گا۔ کیونکہ آپ کا سارا لباس ایسا ہی ہوتا ہے۔

مولانا اس طرح نہ رہتے تھے کہ کسی نواب یا امیر سے گردن نیچی کرنی پڑے بلکہ ایسا برتاؤ کرتے تھے کہ اوروں ہی کو گردن نیچی کرنی پڑتی تھی اور جب

کبھی آپ عمدہ قسم کا لباس پہنتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی والئی ملک اور نواب ہیں۔ بے محل ہزاروں روپیہ بھی نہ لیتے تھے اور ویسے روپیہ دو روپیہ بھی قبول فرما لیتے۔

ایک بادشاہ نے ایک دفعہ شاید دس ہزار روپے بھیجے۔ آپ نے واپس کر دیئے اور فرمایا کہ ضرورت کے لائق میرے پاس روپیہ بہت کچھ موجود ہے۔ میں اس قدر روپیہ لے کر کیا کروں گا۔ سو امیروں کے ساتھ یہ برتاؤ تھا اور غریبوں سے ایک دو روپیہ بھی لے لیتے تھے ـــــ ہم خود[1] تو ایسے نہیں ہیں مگر الحمد للہ ایسوں کو پسند تو کرتے ہیں۔

میں ایک اپنا قصہ بیان کرتا ہوں۔ ایک رئیس نے میرے پاس دو سو روپے مدرسہ کے لئے بھیجے اور لکھا کہ میرا ارادہ ہے کہ آپ کے یہاں بلانے کی تحریک کروں۔ اگر یہ جملہ نہ ہوتا تو میں لے لیتا۔ میں نے لکھ دیا کہ روپوں کے ساتھ بلانے کی درخواست کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روپے بھیجنے سے آپ کا مقصود یہ ہے کہ میں اُن سے متاثر ہو کر آپ کی درخواست کو منظور کر لوں۔ اس لئے میں نے وہ روپے نہیں لئے۔ ڈاک خانہ میں جمع کرا دیئے ہیں۔ اگر آپ کے جواب سے یہ شبہ رفع ہو گیا تو لے لوں گا ورنہ واپس کر دوں گا۔ آخر ان کا خط آیا کہ مجھ سے بے تمیزی ہوئی۔ اب میں آپ سے

---

[1] یہ حضرت کی تواضع ہے ورنہ حضرت اس امر میں تمام مشائخ زمانہ سے بڑھے ہوئے ہیں۔ کاتب

یہ درخواست نہیں کرتا۔

سو میرا یوں جی چاہتا ہے کہ کسی کا احسان رکھ کر نہ لیا جاوے۔ ہمارے بزرگوں کا مذہب یہ ہے کہ اپنی کسی بات سے دین کی عزت میں ذرہ برابر فتور نہ آوے۔ جو بات کی جاتی ہے اس میں نیت یہ ہوتی ہے کہ دین کی عزت ہر طرح محفوظ رہے۔

ایک قابلِ عمل بات

ایک بات یہ بھی قابل عمل ہے کہ اگر مسلمانوں کے ساتھ احسان کرنا ہو تو اس کی یہ صورت نہیں کہ دستر خوان بڑا وسیع ہو۔ آج بریانی پک رہی ہے۔ آج پلاؤ اور قورمہ تیار ہو رہے ہیں۔ ذرا سے کھانے میں ایک بڑی رقم لگ گئی۔ اس سے تو چار غریب مسلمانوں کا بھلا ہوتا تو اچھا تھا۔ یہ کیا کہ بے حاجت قورمہ بریانی پکائے جا رہے ہیں۔ اپنے عزیزوں کے ساتھ احسان کرنا ہو تو بس روپیہ نقد دے دیا۔ یہ نہیں کہ جوڑے عمدہ عمدہ دو۔

ایک ڈپٹی صاحب تھے۔ تین سو روپیہ ان کی تنخواہ تھی مگر وہ ان کو کافی نہ ہوتی تھی۔ ان کے یہاں یہ کیفیت تھی کہ کوئی عزیز دو مہینے سے پڑا ہے۔ پھر تنخواہ کس طرح سے کفایت کرتی۔ مجھے اس کی اطلاع ہوئی۔ میں نے ان سے کہا کہ تم نے یہ کیا بکھیڑا کر رکھا ہے۔ ان سب کو ترک کرو اگر ایسا ہی عزیزوں کے ساتھ احسان کرنا ہے تو سب کی تنخواہ کر دو۔ ان کے بعض عزیز چولہے میں شامل تھے۔ میں نے کہا سب کے چولہے الگ کرو سوائے میاں بی بی کے۔ اور میں نے یہ کہہ دیا کہ دیکھو میرا نام مت ظاہر کرنا

کہ یہ اُن کی رائے ہے۔ مگر اس پر عزیزوں نے اُن کا بہت پیچھا کیا۔ آخر مجبور ہو کر اُنہوں نے میرا نام لے دیا کہ یہ میں نے اُن کی رائے سے کیا ہے۔ تب کہیں وہ لوگ چپ ہوئے۔

خلاصہ یہ کہ اپنے اعزہ کے ساتھ سلوک کرنا چاہے تو نقد دے دے کھانے وغیرہ کا قصہ نہ پھیلائے۔ اس میں بڑی خرابیاں پیش آتی ہیں۔

ایک دوست نے مجھے لکھا۔ تیس روپے میری تنخواہ ہے اور مہمان بکثرت آتے ہیں۔ تنخواہ میں خرچ پورا نہیں ہوتا۔ میں بہت پریشان ہوں میں نے لکھا کہ عرف کو تو طاق میں رکھو جو تمہارا کھانا ہے وہ سب کے سامنے رکھ دیا کیو اور کہہ دیا کہ بس یہی کھانا ہے سب مل کے کھالو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ بس سب نے آنا چھوڑ دیا۔ اور میں نے لکھا کہ اہل اللہ کا مذہب رکھو۔ وضعدار لوگوں کا مت رکھو۔ اُن کی تو یہ حالت ہوتی ہے

؎ زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

اہل اللہ بالکل آزاد ہیں۔ رسم و رواج کے ذرا مقید نہیں۔ اُن کا بڑا اچھا مشرب ہے۔ ہر ادا اُن کی محبوب ہے ——— بس میں نے لکھ دیا کہ اپنا کھانا سب کے سامنے رکھ دیا، پیٹ بھرے چاہے نہ بھرے۔ آدمی ارادہ کر لے تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اس پر عمل کیا اور اس کے بعد لکھا کہ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے بڑی اچھی تدبیر بتلائی۔ میرا پیچھا چھوٹ گیا۔

ہم تو یہی تعلیم کریں گے کہ بلا ضرورت مقروض مت ہو۔ گو رسم و رواج

کے خلاف کرنا پڑے۔ مقروض ہونے سے بڑی پریشانی ہوتی ہے جس کا انجام بہت بُرا ہے۔ اہل اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس میں بڑی راحت ہے۔ ہر مسلمان کو وہی مذہب رکھنا چاہیے جو اہل اللہ کا ہے۔

امراء کو ایک بات یہ چاہیئے جس سے اسراف سے نجات ہو اور انتظام درست ہو کہ سب سے اوّل اپنے اسباب کا انتخاب کریں کہ کون سا ضروری ہے اور کون سا فضول ہے۔ امراء میں یہ آفت ہے کہ جو چیز پسند آئی خرید لی۔ اس سے بحث نہیں کہ اس کی حاجت بھی ہے یا نہیں؟ ہر چیز کے خریدار ہو جاتے ہیں۔ جب کسی دکان پر جاتے ہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور خریدتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ عار کی بات ہے کہ کوئی یوں کہے کہ دکان پر آئے اور لیا کچھ بھی نہیں۔ گھر میں بہت سی چیزیں ہوتی ہیں کہ بیکار رکھی رہتی ہیں۔ عمر بھر بھی کسی کام میں نہیں آتیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش

آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

پس سب سے پہلے انتخاب گھر کا کرو جتنی چیزیں کام میں آتی ہوں رہنے دو اور جتنی کام میں نہ آئیں خارج کر دو یا مساکین کو دے دو۔ نفلی صدقہ دینے کی ہمت نہ ہو تو زکوٰۃ ہی میں دے دو۔

میں ایک اور مفید ترکیب بتلاتا ہوں فضول خرچی نہ ہونے کی۔ وہ یہ کہ گھر کا معائنہ کیا کرو۔ گھر میں بہت سی چیزیں ایسی دیکھو گے جو سڑ رہی ہیں کسی کو دیمک لگ رہی ہے۔ پس ایسی چیزوں کو اپنی ملک سے الگ کردو

تاکہ گھر میں رونق ہو۔ ایک دفعہ ایسا کر دو گے تو آئندہ ایسی چیزیں کبھی نہ خریدو گے۔

ایک بات یہ ہے کہ روزمرہ کی معاشرت میں یہ مقرر کر لو کہ جو کام کرو سوچ کر کرو، بے تامل مت کر ڈالو۔ اور ایک بات یہ کہ کسی کے کہنے سے کوئی کام مت کرو۔ بس اپنی رائے پر عمل کرو۔ میرے ایک ماموں صاحب تھے۔ انہوں نے نظم گل بکاؤلی میں یہ شعر پسند کیا تھا ؎

سُن لاکھ کوئی تجھے سناوے
کیجو وہی جو سمجھ میں آوے

قرآن اور جمہوری نظام

قرآن شریف میں مشورہ کی تاکید ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ کرنا وہی جو اپنی سمجھ میں آجاوے۔ حضرت قرآن شریف میں سب کچھ ہے۔ اس کی شان ہے تبیانا لکل شیٔ۔ کوئی ضروری بات ایسی نہیں ہے جو اس کے اندر نہ ہو۔ چنانچہ دیکھئے قرآن شریف میں مشورہ کا بھی امر ہے وشاورھم فی الامر کہ آپ مشورہ کیجئے اور آگے یہ بھی ہے۔ فاذا عزمت فتوکل علی اللہ یعنی جب خود آپ کا قصد ہو جائے تو آپ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اس کام کو کر ڈالئے۔ یہ نہیں فرمایا فاذا عزموا کہ وہ جب عزم کریں یا فاذا عزم اکثرہم کہ ان میں سے اکثر عزم کریں۔ مطلب یہ ہے کہ مشورہ تو ان سے کیجئے اور عزم اپنا ہو کہ مشورہ کے بعد جس بات پر آپ کی رائے قرار پائے وہ کیجئے۔

یہاں سے سلطنت جمہوری کا قلع قمع ہوتا ہے جس کے معنی یہ ہیں

کہ جدھر کثرت رائے ہو اس جانب کو لیا جاوے۔ سو قرآن شریف کی تعلیم اس کے خلاف ہے ورنہ یوں ہوتا فاذا عزم اکثرھم۔ مگر یہ نہیں فرمایا بلکہ فاذا عزمت۔ فرمایا کہ جب آپ کا عزم ہو تب کیجئے۔

خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ مشورہ تو سب کا ہو اور عزم آپ کا ہو۔ مشورہ کے بعد جو آپ کی رائے ہو وہ کیجئے۔ دوسروں کی رائے پر عمل کرنا آپ کو لازم نہیں ہے اگرچہ وہ اہل ہی ہوں اور آج کل کے تو اہل الرائے ماشاء اللہ اہل بھی نہیں ہوتے۔

کانپور میں ایک صاحب نے ایک مہاجن سے کہا کہ فلاں بات کی ہم کمیٹی میں تحریک کریں گے تم اُس کی تائید کرنا۔ اُس نے کہا کہ میں کیسے تائید کروں گا۔ مجھ کو تو تائید کرنی آتی ہی نہیں۔ اُس نے کہا کہ جب میں کہہ چکوں تو بس تم کھڑے ہو کر اتنا کہہ دینا کہ میں تائید کرتا ہوں۔ اس کا خوب سبق یاد کرا دیا۔ کمیٹی میں پہنچے تو مہاجن صاحب کو سہم چڑھا۔ اُن لفظوں کو بیچارہ دل ہی دل میں گھونٹ رہا تھا کہ کہیں بھول نہ جاؤں۔ غرض اُن صاحب نے تحریک کی۔ اُس کے بعد مہاجن صاحب کھڑے ہوئے۔ گھبراہٹ میں وہ لفظ تو یاد رہا نہیں۔ آپ کہنے لگے، صاحبو! میں بھی تردید کرتا ہوں۔ اُن صاحب نے اُن کی طرف دیکھا، تو آپ کہتے ہیں کہ میں تردید کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے آہستہ سے بتلایا کہ یوں کہو میں تائید کرتا ہوں۔ تو آپ کہتے ہیں، صاحبو! میں تاکید کرتا ہوں۔ آج کل ایسے ایسے اہل الرائے ہوتے ہیں کمیٹیوں میں۔

ایسا ہی ایک اور قصہ ہے کہ ایک جاہل مجسٹریٹ ہو گیا اُسے کچھ آتا

جاتا تھا کہ نہ تھا۔ اس لئے آپ کو فکر ہوئی کہ میں فیصلے کس طرح کروں گا۔ آخر آپ فیصلہ دیکھنے کے لئے ایک اور مجسٹریٹ کے اجلاس میں پہنچے جو کہ ان کے برابر کا تھا۔ اتنے میں دو شخصوں نے عرضیاں پیش کیں۔ اتفاق سے اُس نے ایک کو منظور کر کے دائیں طرف دے دیا اور ایک کو نامنظور کر کے بائیں طرف دے دیا۔ اُنہوں نے دل میں یہ کہا کہ بس فیصلہ اسی طرح ہوتا ہے یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ میں بھی اسی طرح فیصلہ کر دیا کروں گا۔ پس آپ بھی فیصلہ کرنے کے لئے اجلاس پر جا بیٹھے۔ اب جو عرضیاں پیش ہوتی ہیں، تو آپ طاق نمبر میں تو کہہ دیتے ہیں منظور اور دائیں طرف رکھ دیتے ہیں۔ اور جفت میں نامنظور اور بائیں طرف رکھ دیتے ہیں۔ بس ایک کو منظور اور ایک کو نامنظور۔ عرضی پیش کرنے والوں کی کم بختی آئی۔

سو ایسی ایسی لیاقت کے لوگ پریذیڈنٹ ہوتے ہیں۔ بغرض کے قابل ہیں ایسے لوگ۔ کمیٹیوں میں ایسے ایسے ممبر ہوتے ہیں جن کو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہوتی۔ واقعات بتلا رہے ہیں کہ آج کل کی کثرت رائے تو بالکل ہی جہل ہے اور اس میں اتنا غلو ہوا ہے کہ اب تو امراء کے یہاں کھانا بھی کمیٹی ہو کر کھایا جاتا ہے۔ جب کھانا آتا ہے اور بھوک نہیں ہوتی تو مصاحبین سے پوچھتے ہیں کہ اس وقت کھانا چاہئے یا نہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ حضور تھوڑا سا تو کھا لیجئے۔ بالکل نہ کھائیے گا تو ضعف ہو جائے گا۔ اور اُن کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اگر یہ کھائیں گے تو ہمیں بھی مل جائے گا۔ بس وہ دوسروں کے ہاتھ میں پھنس گئے ہیں جیسے بچے ہوتے ہیں۔

مصاحبین کی یہ حالت ہے کہ ہر بات میں بجا اور درست کے سوا کچھ کہتے ہی نہیں خواہ بے جا ہی ہو۔ حتیٰ کہ اگر امیر صاحب کا وضو ٹوٹتا ہے جس کو محاورہ میں وضو ٹوٹنا کہتے ہیں۔ تو اس پہ بھی مبارک باد دی جاتی ہے۔ جہاں ایسے مصاحب ہوں پھر عقل کیسے ٹھکانے رہ سکتی ہے۔ بس سب سے مقدم کام یہ ہے کہ ایسے مصاحبوں کو بالکل حذف کرو۔

شیطان کا مکر میں صرف امراء کو ہی نہیں کہتا بلکہ یہی حالت مشائخ اور علماء کے یہاں بھی ہو رہی ہے۔ پیروں کی عقل تو مریدوں نے لے لی۔ اور علماء کی عقل شاگردوں نے۔ پیر صاحب بلا مریدوں کے کوئی کام نہیں کر سکتے اور مریدوں کی یہ حالت ہے کہ پیر صاحب کسی کی غیبت کرتے ہیں تو وہ آمنا وصدقنا کے سوا کچھ نہیں کہتے۔ مصاحبین نے پیروں کو خراب کر رکھا ہے۔ امراء کی ہم کیا شکایت کریں، پیروں اور علماء کے یہاں بھی ایسے ہی مصاحب ہوتے ہیں۔ بعض خدام کو اپنا مقرب بنا لیتے ہیں۔ پھر وہ مزاج میں ایسے دخیل ہو جاتے ہیں کہ جس سے چاہیں راضی کرا دیں اور جس سے چاہیں ناراض کرا دیں۔ بس پیر صاحب بالکل اُن کے قبضہ میں ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس تقریب کا نتیجہ خود ان مقربین کے لئے یہ ہوتا ہے کہ اور لوگ اُن سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ مقرب ہو کر کیا کرتے ہیں کسی کی تعریف کر دی۔ کسی کی بُرائی کر دی۔ اور پیر صاحب ایسے بھولے بھالے ہیں کہ جو انہوں نے کہہ دیا اُسی کو مان لیا۔

خوب سمجھ لو کہ بزرگوں میں زیادہ کامل وہ ہے جس کی حالت نبی؏ کے

زیادہ مشابہ ہو۔ سو نبی کوئی بھولا نہیں ہوا۔ جتنے بنی ہوئے ہیں سب نہایت ہوشیار اور بیدار مغز تھے۔ پس زیادہ کامل وہی ہوگا جو نہایت ہوشیار اور متیقظ ہو۔ بھولا ہونا کوئی کمال نہیں۔ بھولا آدمی بھی سمجھے گا کسی کے مکر کو۔ جب انسان ہی کے مکر کو نہ سمجھے گا تو شیطان کے مکر کو کیا خاک سمجھے گا۔ کیونکہ شیطان کا مکر تو انسان کے مکر سے زیادہ سخت ہے۔ یوں وظیفہ پڑھنا اور بات ہے۔ باقی تربیت جس کا نام ہے یہ بھولے شخص سے نہیں ہو سکتی۔ تربیت اور اصلاح دوسروں کی وہی کر سکتا ہے جو نہایت ہوشیار اور بیدار مغز ہو۔ لہٰذا بیعت بھی انتخاب کر کے ایسے ہی شخص سے کرنی چاہیئے۔

بعض لوگ بھولے پن سے ہر شخص کا نذرانہ قبول کر لیتے ہیں۔ اُن کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس میں کیا خرابی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نذرانہ خلوص سے نہیں دیا جاتا بلکہ اس میں دینے والے کی کوئی غرض فاسد ہوتی ہے، اس لئے بلا تامل ہر شخص کا نذرانہ نہ لینا چاہیئے۔

ایک تحصیلدار میرے پاس آئے۔ انہوں نے مجھ کو پچیس روپے دیئے ہیں نے اُن میں سے دس روپے تو لے لئے۔ باقی واپس کر دیئے۔ وہ تو چلے گئے اور بعض لوگ اُن کے ساتھ آئے تھے وہ رہ گئے۔ اُنہوں نے کہا کہ صاحب آپ نے دس روپے قبول کئے اور عجیب بات ہے کہ دس ہی روپے اوّل اُنہوں نے تجویز بھی کئے تھے مگر پھر کہنے لگے کہ اتنے روپے نہ میری شان کے لائق ہیں اور نہ اُن کی شان کے۔ اس لئے پندرہ اور نکالے۔ بس دس روپے تو اُنہوں نے خلوص سے نکالے تھے اور پندرہ وضع داری سے۔ اور

خدا تعالیٰ کی قدرت کہ جتنے اُنہوں نے خلوص سے نکالے تھے اتنے ہی میں نے لیئے۔

اس کی ظاہری وجہ یہ ہوئی کہ میں نے اس روز دس روپیہ کی لکڑیاں قرض لی تھیں اور خدا تعالیٰ سے دُعا کی تھی کہ ان کو ادا کر دیجئے۔ میرے ذہن میں اُن کے دینے کے وقت یہ بات آئی کہ تو نے دس روپے کے لیئے دُعا کی تھی اُس کا بندوبست خدا تعالیٰ نے کر دیا۔ اس سے کم لینا ناشکری ہے اس خیال سے میں نے دس لے لیئے باقی واپس کر دیئے۔ اُس میں یہ بات بھی نکل آئی کہ دس ہی اُنہوں نے خلوص سے دیئے بھی تھے۔

غرض نذرانہ قبول کرنے میں بہت ہوش سے کام لینا چاہیئے۔ اس وقت جو میں نے دس روپے لیئے تھے اور باقی واپس کر دیئے تھے اُس کی زیادہ وجہ تو وہ تھی جس کو میں نے بیان کیا۔ باقی میرا مذاق بھی یہی ہے کہ زیادہ نذرانہ نہ قبول کیا جاوے۔ چنانچہ میرا اکثر معمول ہے کہ ایک مہینہ کی آمدنی میں سے ایک روز کی پیش کرے تو خوشی سے لے لیتا ہوں اور پھر دوسری بار اگر نذرانہ دینے لگے تو اُس کے لیئے یہ شرط ہے کہ دونوں کے درمیان کم از کم ایک ماہ کا فصل ہو۔ یہ ہے میرا مذاق۔

اہل اللہ کی معاشرت مجھے امراء پر بہت رحم آتا ہے کیونکہ اُن کے اخراجات ایسے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں کہ اُن کی آمدنی اُن کے لیئے کافی نہیں ہوتی پھر اُن پر یہ مصیبت ہے کہ دعوت بھی کریں گے تو ایسی کہ بدون قرض لیئے نہ ہو سکے۔ بھلا گھر کا معمو

کھانا کس طرح کھلادیں تا وقتیکہ رنگ برنگ کے کھانے دسترخوانوں پہ نہ ہوں دعوت ہی نہیں کرتے۔ حالانکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ مختلف رنگ کے کھانوں سے سادا کھانا زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ مختلف رنگ کے کھانے عادت کے خلاف ہوتے ہیں۔ دوسرے متعدد کھانے طبیعت کو مشوش کر دیتے ہیں۔

موجز میں صراحۃً لکھا ہے کہ کثرۃ الالوان محیر للطبیعۃ یعنی کئی قسم کے کھانوں سے طبیعت کو حیرت ہوتی ہے۔ ہضم میں طبیعت حیران ہوتی ہے کہ پہلے کس میں عمل کروں۔ یہ حیرت تو کھانے کے بعد ہوتی ہے اور ایک حیرت کھانے سے قبل بھی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ہر کھانا کہتا ہے کہ اوّل مجھے کھاؤ۔ اس میں سوچنا پڑتا ہے اجتہاد کرکے متعین کرنا پڑتا ہے کہ کس کو پہلے کھائیں اور کسے بعد میں۔ بعض کھانوں میں طبعاً ترتیب ہوتی ہے اور ہر شخص اُس سے واقف نہیں ہوتا۔ اس لئے ترتیب کے خلاف کھائے جاتے ہیں۔ جو کہ مضر ہوتا ہے پس سب سے اچھی دعوت یہ ہے کہ جو گھر میں ہو وہ کھلا دیا۔

اہل اللہ کی معاشرت دیکھئے۔ مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی کا قصہ ہے کہ آپ دہلی میں ایک مدرسہ میں صدر مدرس تھے۔ اُن سے مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی نے فرمایا کہ مولانا آپ دہلی سے جب وطن جایا کریں تو راستہ میں مجھ سے مل کر جایا کریں (کیونکہ کاندھلہ راستہ ہی میں پڑتا ہے) اُنہوں نے منظور کیا مگر شرط یہ لگائی کہ میری منزل میں حرج نہ ہو۔ مولانا مظفر حسین صاحب نے اس کو منظور فرمایا۔ مولانا مملوک علی صاحب جب دہلی سے تشریف لاتے

تو مولانا مظفر حسین صاحب سے راستہ میں ضرور ملتے اور مل کر سوار ہو جاتے۔

ایک مرتبہ کا قصہ ہے کہ مولانا مملوک علی صاحب دہلی سے آ رہے تھے جب کاندھلہ پہنچے تو مولانا مظفر حسین صاحب سے ملنے کے لئے سواری ٹھہرا اور سواری وہیں چھوڑ کر مولانا سے ملنے گئے۔ مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلہ کے رئیس تھے۔ مگر آپ کی سادگی دیکھئے کہ آپ نے پوچھا کہ کھانا کھا چکے ہو یا کھاؤ گے۔ مولانا مملوک علی صاحب نے کہا کھائیں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ تازہ تیار کراؤں یا جو رکھا ہوا ہے وہی لے آؤں۔ مولانا مملوک علی صاحب نے فرمایا کہ جو موجود ہو وہی لے آیئے۔ بس آپ مٹی کی رکابی میں کھچڑی کی کھرچن لے آئے اور کہا رکھا ہوا تو یہ ہے۔ وہ بھی ایسے ہی تھے۔ بس انہوں نے اسی کو کھا لیا اور پانی پی کر رخصت ہو گئے۔ یہ حالت تھی ان حضرات کی کہ جو ہوا وہ سامنے رکھ دیا۔

ایک دفعہ مولانا مظفر حسین صاحب گنگوہ تشریف لے گئے۔ مولانا گنگوہیؒ کے مہمان ہوئے۔ صبح جب رخصت ہونے لگے تو مولانا گنگوہی نے کھانے کے لئے عرض کیا۔ مولانا مظفر حسین صاحب رام پور جانے والے تھے۔ فرمایا کہ میری منزل کھوٹی ہو گی کیونکہ کھانا تیار ہونے میں دیر لگے گی۔ ہاں اگر رات کا رکھا ہوا ہو تو لادو۔ مولانا نے ماش کی دال اور باسی روٹی لادی۔ آپ نے رکابی کی دال روٹی پر الٹ کر چلتے ہیں باندھ لی اور رخصت ہو گئے۔ حالانکہ آپ رئیس تھے۔ جب رام پور پہنچے تو حکیم ضیاء الدین صاحبؒ سے کہا کہ مولوی رشید احمد بڑے اچھے آدمی ہیں۔ حکیم صاحب نے کہا کہ ہاں واقعی بڑے بزرگ

ہیں۔ آپ فرمانے لگے کہ میں تو کہہ رہا ہوں کہ بڑے اچھے آدمی ہیں اور آپ کہتے ہیں بڑے بزرگ ہیں۔ میں اُن کے بزرگ ہونے کی تعریف نہیں کر رہا۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ اگر خود نہیں سمجھتے تو پوچھ ہی لو۔ اُنہوں نے کہا کہ اچھا حضرت فرمایئے۔ آپ نے کہا کہ دیکھو کیسے اچھے آدمی ہیں۔ اُنہوں نے مجھے کھانے کے لئے کہا۔ پھر میرے کہنے سے جو کھانا رکھا ہوا تھا بے تکلف لا دیا۔ میں اس واسطے کہہ رہا ہوں کہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔

افسوس ہے کہ آج ان افعال کو ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ صاحبو! اگر وقت پر باسی روٹی مل جاوے تو وہ پلاؤ اور زردہ اور قورمہ سے اچھی ہے۔ اکثر ہمارے قصبات کے رئیسوں میں بھی سادگی ہے۔ چائے تک کے عادی نہیں۔ بعض جگہ تو اس قدر تکلف ہے کہ ایک جگہ دعوت ہوئی۔ صبح کو چائے پلائی اُس میں اس قدر تکلف کیا کہ بیس روپے لگ گئے۔ پھر کھانے میں اتنا بکھیڑا کیا کہ عصر کے وقت کھانا ملا۔ بھلا کیا نفع ان باتوں سے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ وہاں کے چھوڑنے سے دنیا کی بھی تکلیف ہوتی ہے اور عقل بھی مسخ ہو جاتی ہے۔

ہر چیز میں تفاخر

میں یہ نہیں کہتا کہ خدا دے تو بُرا کھاؤ بُرا پہنو۔ نہیں اچھا کھاؤ اچھا پہنو مگر حد کے اندر رہو۔ حضرت اب تو ہر چیز میں تفاخر ہے۔ کپڑا تفاخر کے لئے پہنتے ہیں۔ کھانا ہے تو تفاخر کے لئے مکان ہے تفاخر کے واسطے۔ بعض نئے فیشن کے شیدائی ہیں۔ اُن کو کپڑے بھی نوکر ہی پہناتا ہے۔ بٹن تک اپنے ہاتھ سے نہیں لگتے۔ روزمرہ اُن کے قیمتی وقت کا ایک بڑا حصہ فیشن ہی میں گزرتا ہے۔

ایک شخص ہر وقت جوڑے ہی بدلا کرتے تھے۔ ہر وقت کے لئے ایک جوڑا الگ کر رکھا تھا۔ سواری کے وقت کا جوڑا اور دوستوں سے ملنے کا اور حتیٰ کہ پاخانہ میں جانے کا جوڑہ اور تھا۔ ایک مرتبہ میں بھائی کے پاس گیا اتفاق سے وہ بھی وہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں انہیں ہر وقت اسی مشغلہ میں لگا ہوا دیکھتا۔ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ پہنچا کہ نہ اور اس کے نیچے جانگیا پہنے ہوئے پاخانہ میں جارہے ہیں اور گھٹنے اور رانیں سب کھلی ہوئی ہیں۔ حالانکہ ویسے مہذب شخص تھے۔ ایک روز مجھ سے بھی ملنے آئے اور عذر کرنے لگے کہ مجھ کو فرصت نہیں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے آپ سے نہ مل سکا۔ میں نے کہا جی ہاں میں خود دیکھتا ہوں کہ آپ ہر وقت کام میں لگے رہتے ہیں۔ اس پر بہت شرمندہ ہوئے۔

آج کل یہ حالت ہے کہ لباس بھی دوسری قوم کا، کھانا بھی دوسرے ہی لوگوں کا۔ ہر بات میں دوسری قوموں کی تقلید کرتے ہیں۔ اے مسلمانو! آپ کے گھر میں سب کچھ ہے۔ دوسرے کے گھر سے لینے کی آپ کو مطلق ضرورت نہیں ہماری یہ حالت ہو رہی ہے ؎

یک سبد پرناں ترا بر فرق سر   تو ہمیں جوئی لب ناں در بدر

ایک اور نیا طرز نکلا ہے جو امراء میں بہت شائع ہو گیا کہ خالی برتن سامنے رکھ دیئے اور ایک ڈونگے میں کھانا لا کر بیچ میں رکھ دیا۔ اب وہ ایک ڈونگا ساری مجلس میں گھوم رہا ہے۔ جن کا یہ اصل میں طرز ہے ان کے یہاں خود کھانا پہنچاتے ہیں۔ یہاں یہ بے تمیزی کہ جو مانگے اسے دے دو اور جو نہ مانگے

اُسے مت دو۔ اس میں یہ توجیہہ گھڑی ہے کہ کھانا خراب نہیں جاتا۔ جس کو جتنی ضرورت ہوتی ہے لے لیتا ہے۔ جو ٹھا کھانا نہیں بچتا۔ حالانکہ یہ توجیہہ بالکل لغو ہے کیونکہ اُس کا دوسرا طریق ممکن ہے کہ تھوڑا تھوڑا کھانا رکھو اور جس کے سامنے نہ رہے اور دے دو۔ اسی طرح لباس میں توجیہات گھڑی ہیں۔ چھُری کانٹے میں یہ وجہ گھڑی ہے کہ انسان کے ناخن میں زہر ہوتا ہے اس لئے ہاتھ سے نہیں کھاتے۔

یورپ کی اندھی تقلید

میں کہتا ہوں کہ تاویلیں کیوں کی جاتی ہیں سیدھی بات کیوں نہیں کہتے کہ اہل یورپ کا جو طرز ہے وہ پسند ہے۔ اُسی کے مقلد ہیں۔ اگر آج اہل یورپ اس طرز کو بدلیں تو یہ بھی فوراً بدل دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جو فیشن وہ اختیار کرتے ہیں اُسی کو یہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ اگر کسی فیشن کا کوٹ وغیرہ سلوایا اور ابھی پہنا نہیں کہ فیشن بدل گیا تو وہ کوٹ بیکار ہو گیا اب دوسرے فیشن کا تیار کیا کے پہنا جائے گا۔ جوتے ہیں تو وہ چھچھے چھوڑے داڑھی صاف کرانے کا منشا اہل یورپ ہی کی تقلید ہے۔ اگر آج وہاں داڑھی رکھ لی جائے تو یہ بھی اپنے طرز کو بدل دیں۔

ایک مرتبہ یہ خبر سنی گئی تھی کہ داڑھی منڈانے کے نقصانات دیکھ کر اب اہل یورپ کی یہ رائے ہو رہی ہے کہ داڑھی رکھ لینی چاہیئے میں نے ایک وعظ میں کہا کہ ایسے لوگوں کو چاہیئے کہ داڑھی جلد رکھ لیں۔ کیونکہ لندن سے داڑھی رکھنے کا فتوے آنے والا ہے۔ اگر بعد میں رکھی تو طعن ہو گا کہ

خدا و رسول کے فتوے کو تو نہ مانا اور اہل یورپ کے فتوے پر عمل کیا۔ اس سے پہلے ہی رکھ لو تاکہ کسی کو طعن کی گنجائش نہ ملے۔

میں تو کہتا ہوں کہ غیر قوم کا طرز اختیار کرنے میں قطع نظر اس سے کہ کفار کے ساتھ تشبہ ہے جو حرام ہے دنیا کا بھی کتنا بڑا نقصان ہے۔ اس فیشن کی بدولت حالت یہ ہو رہی ہے کہ دو سو کی آمدنی ہو وہ خرچ کو کافی نہیں پانسو کی آمدنی ہو وہ کافی نہیں۔ اس فیشن میں بے طرح روپیہ برباد ہوتا ہے۔ کیا اسراف نہیں ہے۔ ہم نے بہت سے لوگ دیکھے کہ پانسو کے ملازم ہیں۔ مگر اس فیشن کی وجہ سے مقروض ہیں۔

ایک جنٹلمین صاحب تھے۔ وہ ہمیشہ بی بی کے بے طور سر رہتے کہ تم کپڑوں میں اتنا صرف کرتی ہو، زیور میں اتنا صرف کرتی ہو۔ تمہارے خرچ کی وجہ سے آمدنی کا پتہ ہی نہیں لگتا۔ بی بی کو سنتے ہوئے مدت ہو گئی۔ کہاں تک سُنے مکھی کو بھی پتنا ہوتا ہے۔ آخر ایک روز اُن کو بھی غصہ آگیا۔ اور اُس نے خوب سنایا کہ تم ہمیشہ میرے پیچھے تو پڑے رہتے ہو کہ یہ فضول خرچی کرتی ہے اور یوں کرتی ہے۔ ذرا اپنے گریبان میں تو منہ ڈال کر دیکھو کہ فیشن میں کتنا صرف ہوتا ہے۔ چھ جوڑے جوتے ولایتی کتنے کے ہوتے ہیں۔ کوٹ پتلون میں کیا لگتا ہے۔ مکان کی سجاوٹ کا انگریزی سامان کتنی قیمت میں آتا ہے۔ ایک ایک چیز اُس نے اُن حضرت کو گنائی۔ چونکہ جواب معقول تھا اُن کو خاموش ہونا پڑا۔ جب کہیں اُس بیچاری کا پیچھا چھوٹا۔

بس اُن کے مقتدا تو اہل یورپ ہیں۔ انہی کی تقلید میں انہوں نے اپنے

دین کا بھی ناس کیا ہے اور دنیا کا بھی۔

بعض عورتوں نے سایہ پہننا شروع کیا ہے۔ میم صاحب بننا چاہتی ہیں۔ ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں، کان ننگے، اُن میں بالیاں تک نہیں۔ جو طرز میموں کا ہے وہ اختیار کیا ہے۔ یہ نیا فیشن نکلا ہے عورتوں میں۔

میں کہتا ہوں کہ قطع نظر اس کے کہ تشبہ ناجائز ہے اخلاق پر اس کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ وہ یہ کہ اس سے تکبر پیدا ہوتا ہے۔ جو سبب ہو تکبر کا، وہ بھی ناجائز ہوگا۔ اور اس تشبہ میں کبر کی یہاں تک خاصیت ہے کہ حضرت پلنگ اور کرسی پر بیٹھنے تک میں تفاوت ہے۔ جو وجہ ان سے مدرک ہے۔

ایک ڈاکٹر کہتے تھے کہ جب ہم حاجی صاحب کی خدمت میں رہ کر واپس ہوئے تو اپنے دل میں ایک نور لے کر آئے تھے۔ مظفر نگر جب آئے تو ایک شخص فٹن لے کر آئے کہ ہمارے مریض کو چل کر دیکھ لیجئے۔ انہوں نے فٹن میں بیٹھنے سے بہت انکار کیا مگر اس کے اصرار کرنے پر آخر بیٹھنا پڑا۔ کہتے تھے کہ جس وقت فٹن میں قدم رکھا ہے تو یہ معلوم ہوا کہ وہ نور سلب ہو گیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان چیزوں کو نسبت ہے دوسری قوم سے۔ اس لئے ایسا ہوا۔ یہ دوسری قوم کی وضع سمجھی جاتی ہے، اس لئے اُس میں بیٹھنے سے وہ نور سلب ہو گیا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ غیر قوم کی ہر چیز ناجائز ہے بلکہ وہ ناجائز ہے جس کو خصوصیت ہے دوسری قوم کے ساتھ۔ اور جس کو خصوصیت نہیں دوسری قوم کے ساتھ وہ جائز ہے۔ مونڈھے کرسی میں امتیازی شکل نہیں رہی۔ وہ کسی

خاص قوم کی وضع نہیں سمجھی جاتی اس لئے جائز ہے اور سایہ وغیرہ میں امتیازی شکل باقی ہے اس لئے ناجائز ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ اگر دیکھ کر طبیعت کھٹک جائے کہ یہ تو فلاں قوم کا طرز ہے تو تشبہ ہے ورنہ تشبہ نہیں۔ چنانچہ سایہ وغیرہ دیکھ کر فوراً دیکھنے والے کا ذہن منتقل ہوتا ہے کہ یہ تو میموں کا طرز ہے اور کرسی مونڈھے میں ایسا نہیں ہے۔ اسی پر دوسری چیزوں کو قیاس کر لو۔

انگریزی طرزِ اخلاق

غرض یہ ہے کہ یہ طرز اخلاق کے اعتبار سے بھی جائز نہیں۔ کیونکہ اس کا اخلاق پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ خاص کر ملانوں کو، اُن کو تو ان لوگوں نے نیم وحشی کا خطاب دے رکھا ہے۔ حاصل یہ کہ یہ طرز اخلاقی لحاظ سے بھی اچھا نہیں مگر پھر بھی اس میں مصالح گھڑی جاتی ہیں۔

ایک شخص ریل میں تھے اور آپ کی وضع یہ تھی کہ کوٹ پتلون پہنے ہوئے اور کتا بغل میں۔ اسی گاڑی میں بقول اُن کے ایک نیم وحشی بھی آکر سوار ہوئے مگر انہوں نے اُن کو سلام نہیں کیا تو آپ کہتے ہیں مسلمان کو کم از کم سلام تو کر لینا چاہئے۔ اُنہوں نے کہا کہ میں آپ کو مسلمان ہی نہ سمجھا تھا، اس لئے سلام نہ کیا۔ جنٹلمین صاحب نے کہا کہ میرے اندر ایسی کون سی بات ہے جو آپ مجھ کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ اُنہوں نے کہا کہ تم نے ساری وضع تو کافروں کی سی بنا رکھی ہے پھر میں تمہیں مسلمان کیسے سمجھتا۔ اُنہوں نے کہا کہ کیا لباس سے مسلمان

ہوتا ہے۔ اس لباس میں تو مصلحت ہے اس لئے ہم نے اس کو اختیار کیا ہے
وہ یہ کہ ڈھیلے پاجامہ میں گر پڑنے کا خوف ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ اس
میں تو یہ مصلحت ہے اور کتا بغل کے اندر لینے میں کیا مصلحت ہے۔ جنٹلمین
صاحب کہنے لگے کہ اس میں بڑی مصلحت ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جہاں
کتا ہوتا ہے وہاں فرشتہ نہیں آتا۔ اس لئے ہم کتے کو ساتھ رکھتے ہیں تاکہ
عزرائیل سے بچے رہیں۔ ان صاحب نے اس کا خوب ہی جواب دیا۔ کہا
کہ آخر کوئی کتے کی جان بھی تو قبض کرتا ہوگا، وہی آپ کی قبض کرے گا۔ اس
پر بڑے جھلائے۔

رسم پرستی

میں لباس کے بارہ میں ایک فتویٰ عجیب نقل کرتا ہوں۔ حضرت
ابو حنیفہؒ وغیرہ کا فتویٰ نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ ابو حنیفہؒ کا فتویٰ
کا ہے کو ماننے لگے ہیں جب کہ اللہ و رسول ﷺ کا فتویٰ نہیں مانتے بلکہ وائسرائے
کا فتویٰ نقل کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ایک صاحب وائسرائے سے ملنے گئے اور
گئے اپنے ہی وضع میں۔ وائسرائے نے اثنائے گفتگو کہا کہ مولوی صاحب اس
لباس میں آپ شاہزادہ معلوم ہوتے ہیں۔ ہم اپنی قومی وضع سے مجبور ہیں۔ اس
لئے ایسا لباس نہیں پہن سکتے ورنہ ہم بھی اسی کو پہنتے۔ خوش نما بھی ہے اور
راحت بھی اس میں ہے۔ لیجئے جناب اب تو وائسرائے کا فتویٰ بھی ہوگیا
اللہ رسول ﷺ کا فتویٰ نہ مانو تو وائسرائے ہی کا مان لو۔

ایک اور عجیب بات ہے کہ یہ لوگ لباس وغیرہ میں تو غیر قوم کی
تقلید کرتے ہیں اور بعض باتیں جو غیر قوموں میں خوبی کی ہیں ان سے کوسوں

دُور ہیں۔ مثلاً ہمدردی قوم کی یا خروج کا ایک حد سے باہر نہ ہونا، معاملہ کا صاف ہونا۔ اس کے پاس بھی نہیں جاتے۔ بس آج فخر اس پر ہوتا ہے کہ ایک شخص کہتے تھے کہ چار روپیہ کا تو کوٹ کا کپڑا ہے اور سولہ روپیہ اُس کی سلائی دی۔ ایک یورپین نے اس کو سیا ہے۔ خواہ تکلیف ہو اور سراسر مالی کا نقصان ہو مگر انہیں نقل سے کام۔

ایک مولوی صاحب ریل میں سفر کر رہے تھے۔ اتفاق سے اس گاڑی میں ایک جنٹلمین صاحب بھی تھے اور چلتے کے جاڑے کا موسم تھا۔ ایک انگریز نے برف ڈال کر سوڈے کا پانی پیا۔ اُس کی ریس میں آکر آپ نے بھی پیا۔ اور کوئی گرم کپڑا آپ کے پاس تھا نہیں کیونکہ یہ بھی فیشن ہے کہ سفر میں بستر بچھونا ساتھ نہ لے جائیں اور وہ کپڑے بھی کچھ گرم نہ پہنے ہوئے تھے مگر ون کے کپڑے پہنے ہوئے تھے جو کچھ ایسے گرم نہیں ہوتے۔ بس پیتے ہی کانپنے لگے۔ بُری حالت ہوئی۔ مولوی صاحب کو رحم آیا اور اپنی رزائی اُن کو دی اور کہا کہ حد کے اندر رہئے۔ دوسروں کی ریس نہ کیجئے۔

وہی مثل ہے کہ کوا چلا تھا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ ریس تو کریں اہل یورپ کی اور مزاج اور قوت ویسی ہے نہیں۔ مگر کچھ بھی ہو، انہیں نقل سے کام وہ لوگ غذائیں بھی ایسی کھاتے ہیں کہ اُن پر ایسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ اور پھر شراب پیتے ہیں اور پھر اُن میں قوت اور اُن کے مزاج بھی ایسے ہی ہوتے ہیں ــــــ!

ایک قصہ اور سنیئے۔ ایک مولوی صاحب ریل میں سوار تھے۔ ایک

جنٹلمین صاحب بھی اسی درجہ میں تھے۔ مولوی صاحب کے پاس مٹی کی صراحی تھی۔ اس میں پانی تھا۔ جنٹلمین صاحب بولے کہ یہ کیا بھنگیوں کا سا برتن رکھ چھوڑا ہے۔ مولوی صاحب نے اس وقت کوئی جواب نہ دیا اس خیال سے کہ موقع پر جواب دوں گا۔ آگے چل کر ان جنٹلمین صاحب کو پیاس لگی۔ اتفاق سے اسٹیشن پر بھی پانی نہیں ملا۔ اب پیاس بڑھی۔ مولوی صاحب نے قرائن سے معلوم کر لیا کہ پیاس کا غلبہ ہے۔ چونکہ ان حضرات پر شان کرم غالب ہوتی ہے اس لئے انہیں ان پر ترس آیا اور یہ چاہا کہ کسی طرح یہ پانی پی لیں۔ انہوں نے یہ تدبیر کی کہ اپنے آپ کو سوتا بنا لیا۔ جنٹلمین صاحب اوپر تختہ پر سے اب ان کا عروج سے نزول ہوا اور مولوی صاحب کو جھک کر دیکھا کہ آنکھیں کھلی ہیں یا بند ہیں۔ انہوں نے قصداً بند کر رکھی تھیں۔ جب خوب اطمینان ہو گیا کہ سو رہے ہیں تو صراحی منہ سے لگا لی۔ یہ کچھ بولے نہیں اس خیال سے کہ پی لینے دو پیاسے نہ رہیں۔ جب صراحی رکھنے لگے تو فوراً ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ آپ نے بھنگیوں کے برتن میں کیوں پانی پیا اور پھر خوب لتاڑا۔

میں ایک دفعہ ریل میں تھا۔ ایک جنٹلمین صاحب کا ساتھ ہو گیا۔ میرے پاس لوٹا تھا میں نے اس میں پانی لے لیا۔ یہ لوگ تو اپنے ساتھ کچھ لیتے ہی نہیں۔ یہ بھی فیشن ہے۔ جب اسٹیشن قریب آیا تو آپ بولے کیا میں اس لوٹے کو لے سکتا ہوں؟ میں نے کہا کہ لے سکتے ہیں۔ آپ نے اسی وقت اس کو اٹھا کر اس کا پانی پھینک دیا۔ اس پر مجھے ہنسی آگئی اور میں نے دل میں کہا کہ پانی نہ ملے تو خوب تماشا ہو۔ اتفاق سے پانی کہیں نہیں ملا تو آپ کہتے ہیں

کہ بڑی غلطی ہوئی جو میں نے پانی گرا دیا۔

بس ان لوگوں میں رسم پرستی ہے اور کچھ نہیں۔ غیر قوم کی تقلید میں ان لوگوں کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ اگر وہ ناک کٹوانے لگیں تو یہ بھی کٹوا دیں گے داڑھی بھی غیر قوم کی تقلید میں ہی صاف کراتے ہیں حالانکہ داڑھی ایسی چیز ہے کہ جن کی تقلید میں یہ منڈاتے ہیں خود وہ اس کو پسند کرتے ہیں۔

ایک کوچوان کو ایک انگریز چار روپیہ ماہوار صرف داڑھی کے دیتا تھا کہ اس کو خوب بناؤ سنوارو۔ داڑھی بہت لمبی تھی، جب ہوا میں اڑتی، تو وہ انگریز دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ سے ایک دہری شخص نے کہا کہ داڑھی رکھنا فطرت کے خلاف ہے کیونکہ پیدائش کے وقت نہیں ہوتی۔ اگر فطرت کے موافق ہوتی تو پیدائشی ہوتی۔ مولانا نے فرمایا کہ اگر یہی ہے تو دانت بھی نکلوا دینے چاہئیں۔ وہ بھی تو پیدائشی نہیں ہیں۔ مولانا عبدالحی صاحب اس کو سن کر فرمانے لگے۔ واہ مولانا خوب دندان شکن جواب دیا۔

ایک صاحب کہنے لگے کہ داڑھی رکھنے میں کیا حکمت ہے۔ میں نے کہا کہ ہمیں عقلی حکمت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لئے یہی کافی ہے کہ اللہ و رسولؐ کا حکم ہے۔ ہمارا مذہب تو یہ ہے ؎

زبان تازہ کردن باقرار تو ۔۔۔ بنیگیختن علت از کار تو!

ایک حکمت انگریزی لباس سے منع کرنے میں یہ ہے کہ اس کو پہن کر جی یوں چاہتا ہے کہ دوسروں کو دکھاویں۔ اگر عورتیں ایسا لباس پہنیں گی تو

لازمی بات ہے کہ پردہ کم ہو جاوے گا۔ کیونکہ وہ چاہیں گی کہ دوسروں کو دکھائیں اور عورتوں کو دکھا کر اُن کے حظ ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ عیب سمجھتی ہیں، اس لئے لامحالہ مردوں کو دکھانا چاہیں گی اور بے پردگی اختیار کریں گی۔ یہ ساری خرابیاں تفاخر اور فضول خرچی سے پیدا ہوئی ہیں پس تفاخر اور فضول خرچی کے چھوڑ دینے سے ساری خرابیوں کی جڑ کٹ جائے گی۔

میں اسراف کا بیان کر رہا تھا کہ مسلمان سمجھے ہوئے ہیں کہ آمد و خرچ کے متعلق کوئی قانون نہیں۔ خوب سمجھ لو جیسے نماز روزہ کا قانون ہے اسی طرح اس کا بھی قانون ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اسی مسئلہ کو حق تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دوسرے کا مال آپس میں مت کھاؤ۔ اس سے حرام آمدنی کو روکتے ہیں ——!

اعتدال کی ضرورت

آگے فرماتے ہیں کہ مت لے جاؤ حکومت کی طرف یعنی مقدمات مت کرو۔ آج کل اس کی بھی بڑی کثرت ہے۔ ذرا سی کوئی بات ہوئی اور مقدمہ دائر۔ خوب سمجھ لو کہ اگر حاکم کسی کو دوسرے کا حق ثبوت ظاہری ہونے سے دلا بھی دے تو واقع میں وہ اس کا حق نہیں ہو جاتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر میں کسی کا حق کسی کو دلا دوں تو وہ خوب سمجھ لے کہ میں اس کو آگ کی چنگاری دلاتا ہوں۔ پس سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی حاکم کسی کا حق دوسرے کو دلا دے تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہو جائے گا۔ مالک ہونے نہ ہونے کی یہاں بحث نہیں دلاتا کھلوا اموالکم

بینکم بالباطل میں ناجائز آمدنی کو روکا ہے یہاں خرچ کا ذکر نہیں ہے۔ مگر یہ بھی یہیں سے سمجھ میں آتا ہے۔ کیونکہ ناجائز طور پر جو مال حاصل کیا جاتا ہے اکثر اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ خرچ اس قدر بڑھا لیتے ہیں کہ حلال آمدنی اس کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ پس جب کہ ناجائز طور پر مال حاصل کرنے سے روکا تو جو اس کا باعث ہے یعنی اسراف اس کی بھی ممانعت ہو گئی۔ پس اس آیت سے تو یہ اشارۃً معلوم ہوتا ہے اور دوسری آیات و احادیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔

حدیث میں ہے کہ بندہ کو حق تعالیٰ کھڑا کر کے دریافت فرمائیں گے کہ جوانی کاہے میں خرچ کی اور مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ اور راز اس کا یہ ہے کہ مال اپنا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا مال ہے۔ کسی نوکر کو اگر آپ خزانہ سپرد کر دیں تو کیا وہ مالک اور خود مختار ہو گیا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے اپنا مال آپ کو بطور خزانچی کے دے دیا ہے۔ پس جب تک کہ اجازت شرعی نہ ہو آپ کو دینے کا اختیار نہیں۔ اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے مال دیا ہے تو اس کی فہرست بھی دی ہے کہ اس موقع پر خرچ کرنے کی اجازت ہے اور اس موقع پر نہیں اور غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اصل حق ہمارا تو صرف اتنا تھا کہ ہم کو بقدر ضرورت ملتا۔ اب جو ضرورت سے زیادہ مل رہا ہے تو وہ حق اوروں کا ہے اور لوگوں کو پہنچانا منظور ہے۔ مگر وہ قواعد کے موافق ہونا چاہئے۔ یہ نہیں کہ جس کو چاہا دے دیا اور جہاں چاہا خرچ کر دیا۔ حد سے زیادہ خرچ کا کچھ اختیار نہیں۔ اس لئے ضرور ہے کہ آدمی اپنا خرچ شرع کے موافق منضبط

کرے۔

اخراجات کی حدود

شادی بیاہ میں لوگ آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ کچھ اس سے بحث نہیں ہوتی کہ اس موقع پر خرچ کرنا چاہیئے بھی ہے یا نہیں۔ سو سمجھ لو کہ خرچ کرنے کے بھی حدود ہیں جیسے نماز روزہ کے حدود ہیں۔ اگر کوئی نماز بجائے چار رکعت کے چھ پڑھنے لگے یا کوئی روزہ عشاء تک رکھنے لگے تو گنہگار ہوگا۔ اسی طرح مال کو حد سے زیادہ خرچ کرنے سے بھی گنہگار ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے ہر چیز کے حدود مقرر کئے ہیں پس حدود کو معلوم کرنا چاہیئے علماء سے پوچھو ——— ایک بات تو یہ یاد رکھو۔

دوسرے یہ یاد رکھو کہ جو کام کرو سوچ کر کرو۔ اگر ان دونوں باتوں پر عمل کرو گے تو حقوق ضائع نہ ہوں گے اور جن میں لوگوں سے زیادہ غلطیاں ہوتی ہیں وہ حقوق مالی ہیں اس کا بڑا خیال رکھنا چاہیئے۔

ایک خرابی مسلمانوں میں یہ ہے کہ قرض لے کر ادا نہیں کرتے۔ قرض ادا کرنے کی بالکل عادت ہی نہیں۔ اس لئے ان کا اعتبار نہیں رہا۔ اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ ہر ایک سے قرض مانگتے ہیں اور کوئی نہیں دیتا۔ حالانکہ قرض دینے کا بڑا ثواب ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے جنت کے دروازہ پر لکھا دیکھا کہ صدقہ دینے سے دس نیکیاں ملتی ہیں اور قرض دینے سے اٹھارہ۔ آپ نے حضرت جبرائیلؑ سے وجہ پوچھی تو انہوں

سنے فرمایا کہ قرض وہی مانگتا ہے جسے سخت حاجت ہوتی ہے (کیونکہ اُسے پھر واپس کرنا پڑتا ہے) بخلاف صدقہ کے۔ تو قرض دینے کا اتنا بڑا ثواب ہے ــــ!

مگر جب کوئی لے کر ادا ہی نہ کرے تو پھر کون دے۔ حالت یہ ہو گئی ہے کہ قرض دے کر وصول نہیں ہوتا حتیٰ کہ قرض دار سامنے آنا تک چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی واسطے مولانا جامیؒ فرماتے ہیں ؎

فان القرض مقراض المحبۃ ده شان قرض و مستان نیم حبہ

ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ کسی مقدمہ میں مظفر نگر آئے۔ اتفاق سے جتنا روپیہ پاس تھا سب ختم ہو گیا۔ اب بہت پریشان۔ آخر وہیں کے ایک صاحب کے پاس گئے اور اپنی پریشانی بیان کی اور کہا کہ دس روپیہ قرض دے دیجئے میں گھر پہنچتے ہی بھیج دوں گا۔ اُنہوں نے ترس کھا کر دے دیئے اُنہوں نے گھر پہنچ کر خبر بھی نہ دی۔ کچھ دنوں کے بعد پھر کہیں اُن سے ملاقات ہو گئی تو اُنہوں نے تقاضا کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ میں ابھی دو ایک روز میں ادا کر دوں گا اسی طرح مدتوں تک ٹال مٹول کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سال بھر گزر گیا۔ پھر جو تقاضا کیا تو کہتے ہیں کہ کیا آپ کے پاس کوئی رقعہ ہے۔ یہ حالت ہے مسلمانوں کی۔ اس کو ہلکی بات سمجھتے ہیں۔ اسی لئے اس میں بہت ہی تساہل ہو رہا ہے۔

ایک مانگی ہوئی چیز میں بڑا تساہل ہے۔ یہ حالت ہے کہ چیز منگائی اور کام بھی ہو گیا مگر یہ توفیق نہیں ہوتی کہ واپس کر دیں۔ جب دینے والا

خود طلب کرتا ہے تب دیتے ہیں اور اگر خود بھی دیں گے تو مدت کے بعد اس میں بہت چیزیں گم بھی ہو جاتی ہیں، خراب بھی ہو جاتی ہیں، بعض جگہ مہینے گذر جاتے ہیں واپس ہی نہیں ہوتیں۔ اگر کسی نے طلب کیا تو دے دی، ورنہ پروا بھی نہیں ہوتی۔ نیت مارنے کی نہ ہو مگر تساہل اس قدر ہے کہ حد سے زیادہ ہے!

ایک اس بارہ میں بے احتیاطی یہ ہے کہ کھانے کے ساتھ جو برتن چلے جاتے ہیں انہیں واپس کرنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی۔ بس اپنے یہاں اُن کا استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح مدت ہو جاتی ہے۔ جب خود منگاتے ہیں، تب ملتے ہیں۔ خود میرے گھر میں تساہل ہے۔ حالانکہ شرع نے اس میں اتنی احتیاط کی ہے کہ فقہاء لکھتے ہیں کہ کھانا کوئی بھیجے تو اُس برتن میں کھانا حرام ہے۔ اپنے برتن میں اُلٹ لو تب کھاؤ۔ ہاں ایک صورت میں جائز ہے کہ وہ کھانا ایسا ہو جو برتن بدلنے سے خراب ہو جاتا ہو یا اُس کی آب جاتی رہے۔ تو اگر ایسا کھانا ہو تب اُس برتن میں کھانا جائز ہے، ورنہ نہیں۔ ہاں اگر مالک استعمال کی اجازت دے دے تو جائز ہے۔

دلیل فقہاء کے اس قول کی یہ حدیث ہے کہ لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفس منہ۔ کھانا بھیجنے والوں کو اُن برتنوں کا استعمال ناگوار ہوتا ہے اور جب کہ کھانا ایسا ہو جو برتن بدلنے سے خراب ہوتا ہو یا اُس کی آب جاتی رہتی ہو تو وہاں دلالۃً اذن ہے، اُس برتن میں کھانے کا۔ پس خلاصہ فقہاء کے کلام کا یہ ہوا کہ جہاں اجازت ہو قرائن سے تو جائز اور اگر

قرائن سے اجازت نہ ہو تو جائز نہیں۔

غرض لوگ اموال کے بارہ میں بڑی بے احتیاطی کرتے ہیں۔ قرآن شریف میں کتنی سخت وعید ہے اس پر۔ میں پھر اصل مسئلہ کا اعادہ کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ناجائز آمدنی سے احتراز کریں۔ اور خرچ گھٹائیں۔ امراء اس میں بالکل احتیاط نہیں کرتے۔ اس پر عمل ہوگا تو زندگی بڑے عیش و آرام سے کٹے گی۔

نام اور کام کی اہمیت

روساء شادی وغیرہ میں بڑی بے احتیاطی کرتے ہیں۔ دیوبند میں ایک رئیس تھے انہوں نے شادی کی اور بے انتہا خرچ کیا۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ ان کے یہاں آئے اور کہا کہ ماشاء اللہ! آپ نے بہت ہی خرچ کیا۔ آپ کی عالی حوصلگی میں کچھ شبہ نہیں۔ مگر صرف اتنی کسر ہے کہ آپ نے اتنا خرچ کر کے ایسی چیز خریدی کہ اگر حاجت کے وقت اس کو فروخت کرنے لگیں تو اُسے کوئی پھوٹی کوڑی کو بھی نہ لے۔ وہ کیا: نام! باقی ویسے بڑا کام کیا بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جتنی نام کی کوشش کرتے ہیں اتنی ہی بدنامی ہوتی ہے۔

ایک مہاجن نے بڑی دھوم دھام سے شادی کی۔ بہت خرچ کیا منجملہ اس کے یہ بھی کیا کہ براتیوں کو فی کس ایک اشرفی بھی دی۔ جب برات واپس ہوئی تو آپ کو یہ خیال ہوا کہ ہر گاڑی میں میرا ہی تذکرہ اور تعریف ہو رہی ہوگی۔ اس کو کسی حیلہ سے سننا چاہیئے۔ چنانچہ وہ ایک موقع پر پوشیدہ کھڑے ہو گئے۔ برات وہیں کو گزری مگر کسی بہلی میں اپنا تذکرہ نہ پایا۔ آخر ایک بہلی میں انہوں نے دیکھا کہ دو شخص میرا تذکرہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے بڑے

شوق سے کان لگائے۔ ایک نے کہا کہ دیکھو تو کیسے نام کا کام کیا کہ ایک ایک اشرفی سب کو دی۔ یہ کام کسی نے نہیں کیا۔ دوسرے نے کہا کسسرے نے ایک ایک دی کون سا کمال کیا۔ اگر دو دو دیتا تو کیا مر جاتا۔

غرض یہ کہ نام کے لئے مال برباد کرتے ہیں مگر وہ بھی میسر نہیں ہوتا اور جن کے واسطے خرچ کرتے ہیں جس وقت مصیبت آتی ہے اُن میں سے کوئی پاس بھی کھڑا نہیں ہوتا بلکہ تباہی ہونے پر یوں کہہ دیتے ہیں کہ مال برباد کرنے کو کس نے کہا تھا۔ اپنے ہاتھوں برباد ہوئے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جو لوگ آسودگی میں یہ کہتے تھے کہ جہاں تمہارا پسینہ گرے وہاں ہم خون گرانے کو تیار ہیں۔ جس وقت تباہی آتی ہے اُن میں سے ایک بھی پاس کھڑا نہیں ہوتا سب آنکھیں بدل جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے حال پر بڑا افسوس ہے کہ وہ کچھ آگے پیچھے کا خیال نہیں کرتے بے طرح فضول خرچی کرتے ہیں یہاں تک کہ تباہ ہو جاتے ہیں بیغل کے لنگوٹی بندھ جاتی ہے۔ یہ حالت مسلمانوں کی اسی وجہ سے ہوئی کہ آہنی قلعہ (اسلام) کا پھاٹک خود کھول دیا ورنہ اسلامی اصولوں پر چلنے سے کبھی ذلت نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ حقوق مالیہ کی حفاظت نہایت ضروری ہے اور شرع نے اس سے بھی تعرض کیا ہے۔ اور اس کی تاکید کی ہے حفاظت نہ کرنے پر مواخذہ ہوگا۔

اب وقت بھی بہت جا چکا ہے اور بفضلہ تعالے بیان بھی بقدر

ضرورت کافی طور سے ہو گیا۔ دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیق عمل کی مرحمت فرمائیں آمین یارب العالمین!

اشرف علی!

احکام الجاہ

جاہ کے منافع ومفاسد کے متعلق یہ وعظ ۱۵ رجب ۱۳۳۷ھ کو
بارہ بنکی میں کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا۔ پونے چار گھنٹہ میں ختم ہوا
تخمیناً ایک ہزار کی حاضری تھی۔ حکیم محمد یوسف صاحب بجنوری
نے قلمبند فرمایا

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ و نتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

تمہید

یہ ایک بڑی حدیث کا ٹکڑا ہے جس میں ایک ضروری مضمون مذکور ہوا ہے جس کی ہر وقت ہر شخص کو کم و بیش ضرورت ہے۔ اوّل تو اس وجہ سے یہ مضمون ضروری ہے کہ ارشاد فرمودہ ہے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا۔ جس کی ہر فرد اور ہر فرد کا ہر جزو ضروری ہے۔ پھر حضورؐ کے فرمودہ مضامین میں بھی بعض وجوہ سے باہم تفاوت ہوتا ہے۔ پھر اوقات مختلفہ کے لحاظ سے بھی بعض مضامین کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ کسی وقت کسی مضمون کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور کسی وقت کسی مضمون کی۔ غرض ضرورت کے اسباب مختلف ہیں۔ اور جیسے اسباب ضرورت میں سے کسی مضمون کے منافع کا زیادہ ہونا یا مضرت سے زیادہ محافظ ہونا ہے ایسے ہی اسباب ضرورت میں سے ایک قوی سبب غفلت بھی ہے یعنی کوئی مضمون واقع میں تو ضروری ہے مگر پھر بھی اس سے غفلت ہے

اس سے بھی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں یہ وجہ بھی موجود ہے اس وقت اس عارض کی وجہ سے بھی اس مضمون کو اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ جو مضمون اس مقام پر اس حدیث کا مدلول ہے وہ ایسا ہی ہے کہ باوجود ضروری ہونے کے ہم لوگوں کو اس کی طرف التفات نہیں۔ اس وجہ سے بھی اس کا بیان کرنا زیادہ ضروری ہو گیا۔ یہ تو ضرورت کے اصل اسباب ہیں ــــــ!

ایک اہم کوتاہی

باقی اس وقت ایک اتفاقی نکتہ اور لطیفہ بھی ہو گیا۔ وہ لطیفہ یہ ہوا کہ اس سے قبل جو لکھنؤ میں بیان ہوا تھا اس میں میں نے حقوق مالیہ کو بیان کیا تھا یعنی یہ بتلایا تھا کہ مال کے حقوق کیا ہیں اور اس کے متعلق ضرورت کے موافق بیان ہو گیا تھا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ آج کل مسلمانوں کو مال کے حقوق سے اس حیثیت سے غفلت ہے کہ مال کہاں سے حاصل کرنا چاہیے اور کہاں استعمال کرنا چاہیے۔

علماء سے اگر احکام پوچھے جاتے ہیں تو نماز روزہ کے پوچھے جاتے ہیں۔ یہ نہیں پوچھا جاتا کہ ہماری آمدنی کا یہ ذریعہ ہے آیا یہ حلال ہے یا حرام۔ یا میں نوکری کرتا ہوں اور میرا فرض منصبی یہ ہے اور منصب کے علاوہ میں فلاں فلاں کام منافع حاصل کرنے کے لئے کرتا ہوں۔ یہ وسائل آمدنی کے ہیں آیا یہ حلال ہیں یا حرام۔ یا میں زراعت کرتا ہوں اور زمیندار سے یہ معاہدہ کرنا پڑتا ہے آیا یہ جائز ہے یا ناجائز۔ یا میں زمینداری کرتا ہوں اور میرا

کاشتکاروں سے یہ معاملہ ہے۔ فلاں فلاں صورتیں پیش آتی ہیں، آیا یہ صورتیں جائز ہیں یا ناجائز۔ ان امور کی طرف کسی کو التفات نہیں الا ماشاء اللہ!

بعض لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو دنیا کی کارروائی ہے؛ اس میں شریعت سے کیا واسطہ؟ شریعت نے تو صرف نماز روزہ سکھلایا ہے۔ اور بعض لوگوں کا یہ اعتقاد تو نہیں کہ شریعت کو ان امور سے تعلق نہیں مگر وہ یہ گمان پکائے ہوئے ہیں کہ پوچھنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ حکم تو ہمیں پہلے ہی سے معلوم ہے کہ لا یجوز کا فتویٰ ملے گا۔ (مطلب یہ ہے کہ اگر ہم علماء سے پوچھیں گے بھی تو وہ یہی بتلائیں گے کہ جائز نہیں۔ پھر پوچھنے سے کیا نتیجہ۔ یہ تو ہم پہلے ہی سے جانتے ہیں۔)

خیال تو فرمایئے کہ یہ کتنا بڑا غلط گمان ہے اور لوگوں نے شریعت کو کیسا دشوار سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ شریعت بہت آسان ہے۔ وہ تو سرتاسر رحمت ہی رحمت ہے خدا تعالیٰ کی۔

شریعت کی آسانی

چنانچہ ایک بزرگ نے لکھا ہے کہ یہ آیتیں یعنی یاایھا الذین اٰمنوا اذا تداینتم بدین الخ جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہیں، یہ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو ظاہر کرتی ہیں۔ جن کا حاصل یہ ہے کہ معاملہ کبھی نقداً نقدی ہوتا ہے کہ اس ہاتھ دیا اور اس ہاتھ لیا۔ اور کبھی تداین کے طور پر ہوتا ہے کہ نقد دام نہیں دیئے جاتے یا قرض لیا جاتا ہے۔ تو اس آیت میں دونوں کو ظاہر فرما دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں واشھدوا اذا تبایعتم کہ نقداً نقدی معاملہ میں گواہ

ضرور کر لیا کرو۔ کیونکہ اگر کسی وقت منازعت واقع ہو تو چار آدمی فیصلہ تو کر دینگے اور جو معاملہ دین کا ہو تو مزید ارشاد یہ ہے کہ اس کو لکھ بھی لیا کرو تاکہ غلطی سے امن ہو۔ خیال تو فرمایئے کہ جب حق تعالیٰ نے ایک پیسہ اور ایک روپیہ کا ضرر دنیوی اپنے بندوں کے لئے گوارا نہیں فرمایا حالانکہ ساری دنیا مچھر کے پر کے برابر بھی حقیقت نہیں رکھتی تو اپنے بندوں کے لئے بڑے سے بڑے ضرر اُن کو کیسے گوارا ہوں گے۔ پھر یہ کیا تھوڑی دلیل ہے رحمت کی۔

بات یہ ہے کہ لوگوں نے حق تعالیٰ کے احکام دیکھے ہی نہیں جو معلوم ہوتا کہ اُن میں کتنی سہولت اور کس قدر مصالح ہیں۔ ابواب فقہ کو نہیں دیکھا قرآن وحدیث کو نہیں دیکھا۔ قرآن شریف کا ترجمہ علماء سے پڑھیئے تو معلوم ہو کہ احکام میں کس قدر سہولت ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ صاف صاف ارشاد فرماتے ہیں۔

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ — کہ حق تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتے ہیں اور تنگی کرنا نہیں چاہتے

اور فرماتے ہیں۔

ما جعل علیکم فی الدین من حرج — کہ اللہ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی۔

اور حدیث میں ہے۔ الدین یسر کہ دین آسان ہے۔ اجمالاً یہ نصوص کافی ہیں۔ باقی اگر تفصیل کی ضرورت ہو تو تھوڑا سا وقت اس کی تحقیق میں صرف کیجئے۔ مگر آپ تو رات دن دنیا کی تحصیل میں منہمک ہیں۔ آپ کو اس طرف

توجہ ہی نہیں۔ اور توجہ اس واسطے نہیں کہ اس کے لئے آپ کو ایک دوسرے مجمع میں آنا پڑے گا یعنی مجمع علماء میں۔ ایسوں کے پاس اس کے لئے آپ کو جانا ہو گا جن سے آپ کو وحشت ہے جس کے اسباب مختلف ہیں۔

علماء سے وحشت چنانچہ بعض کو تو علماء سے اس لئے وحشت ہے کہ شاید کچھ چندہ مانگنے لگیں۔ اور بعض کو اس لئے کہ ہمارے اوپر کفر کا فتویٰ لگا دیں گے۔ اس لئے وہ اپنے گھر ہی میں بیٹھتے ہیں یا اپنی جماعت کے ساتھ رہتے ہیں۔ بعض کو اس لئے وحشت ہوتی ہے کہ وہ زراعت و تجارت حرام طریقہ سے کرتے ہیں۔ اس لئے کسی عالم کے پاس نہیں جاتے کہ وہ اس کو حرام بتلائے گا۔

صاحبو! میں کہتا ہوں کہ علماء کے ساتھ جو آپ کو بدگمانی ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ علماء مسائل کو نقل کرتے ہیں یا اختراع کرتے ہیں (یعنی گھڑتے ہیں) اختراع کا گمان تو غلط ہے کیونکہ اُن کے پاس ہر فتویٰ کی دلیل شرعی موجود ہے۔ اور اگر یہ گمان نہیں تو پھر اُن کی طرف سختی کا گمان کیسا۔ یہ گمان تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے (کیونکہ احکام تو حضورؐ کے بیان فرمائے ہوئے ہیں نہ کہ علماء کے) اور حضورؐ کی طرف اس گمان کا غلط ہونا صاف ظاہر ہے۔ آپؐ کا تو لقب رحمۃ العالمین ہے۔ آپ تو رحمت مجسمہ بنا کر بھیجے گئے ہیں تمام جہان کے واسطے۔ پھر یہ کیا غضب ہے کہ خدا تعالیٰ تو آپ کو رحمت فرمائیں اور یہ شخص آپؐ کو زحمت سمجھے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلو علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ

حق سبحانہ تعالیٰ اس آیت میں احسان جتلاتے ہیں کہ ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا جن کی یہ شان ہے کہ وہ اللہ کی آیتیں سناتے ہیں اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور تم کو پاکیزہ بناتے ہیں۔

پس اگر معاذ اللہ آپؐ کے احکام موجب زحمت ہیں۔ جیسا بعض لوگوں کا خیال ہے تو پھر حضورؐ کے ارسال میں کیا منت ہوئی جو من اللہ میں مذکور ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں حق تعالیٰ۔

یحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم۔

کہ ہم نے ایسا نبی بھیجا ہے جس کی شان یہ ہے کہ طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام کرتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ آپ گندی اور مضر چیزوں کو حرام کرنے آئے ہیں اور سختیوں کو موقوف کرتے ہیں۔ جب آپ کی یہ شان ہے تو پھر آپ پر سختی کا گمان کیسا؟

اس غلطی کے رفع ہونے کی سہل تدبیر یہ ہے کہ کسی متبحر عالم سے قرآن وحدیث پڑھئے۔ زیادہ نہیں تو ان سے اردو ہی کے رسالے دیکھ لیجئے مگر یہ سمجھ لیجئے کہ اس کام کے لئے آپ کو ایسوں کے پاس جانا پڑیگا۔

جن سے آپ کو وحشت ہے لیکن اگر اپنے دین کی حفاظت چاہتے ہو تو ایسے لوگوں کے پاس جاؤ، خواہ تھوڑے ہی زمانے کے لئے جاؤ پھر یہ حالت ہوگی کہ تمام عمر وہاں سے کسی اور جگہ جانا پسند نہ کرو گے اسی کو تو مولانا فرماتے ہیں ؎

خواب را بگذار امشب اے پسر یک شبے در کوئے بیخواباں گزر

ایک رات کے لئے ذرا سونا چھوڑ دو اور اللہ والوں کے پاس جا کر رہو تو معلوم ہوگا کہ وہ لوگ رات کو کیا کرتے ہیں۔ اُن کی شب بیداری کا لطف دیکھ کر اپنی نیند کا لطف بھول جاؤ گے اور غفلت بھی خواب ہی کے حکم میں ہے اور اعتقاد سے نہ آؤ تو امتحاناً ہی آکر دیکھ لو۔ ان حضرات کی صحبت میں رہ کر معلوم ہوگا کہ کتنی وسعت ہے شریعت میں۔

شریعت میں تنگی کا گمان

باقی آج کل جو بعض لوگوں کو شریعت میں تنگی کا گمان ہے۔ اُس کا بھی ایک منشا ہے۔ وہ یہ کہ اکثر لوگوں کو یہ بات پیش آتی ہے کہ وہ مولانا کے پاس مسئلہ پوچھنے گئے۔ مولانا نے جواب دیا کہ یہ جائز نہیں۔ کوئی تجارت یا زراعت کی صورت پیش کی تو انہوں نے لایجوز کہہ دیا۔ کسی نے چار مسئلے پوچھے تو انہوں نے ہر دفعہ لایجوز ہی فرمایا۔ اس سے اُنہوں نے سمجھا کہ بس شریعت میں لایجوز ہی ہے اور کچھ نہیں۔

اس واقعہ کی تکذیب کوئی نہیں کر سکتا مگر اس کی حقیقت سمجھنا چاہیئے کہ مولوی صاحب نے آپ کے سوالات کے جوابات میں جو لایجوز کہا

ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟ آیا اس کا سبب شریعت کی تنگی ہے یا آپ کے طرزِ معاشرت کی خرابی اور آپ کی آزادی و وارستگی ہے۔ سو حقیقت یہ ہے کہ آپ کے معاملات اکثر فاسد ہو گئے ہیں۔ آپ ایسے حال میں پھنسے ہوئے ہیں جس کو کوئی عاقل بھی پسند نہیں کر سکتا۔ اب شریعت اُن کو ناجائز نہ کہے تو کیا کرے۔ اب فرمائیے تنگی آپ کے اندر ہے یا شریعت میں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بیمار حکیم کے پاس آیا اور حکیم سے کہا کہ مجھے کھانے کو بتلا دیجئے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ بکری کا گوشت کھاؤ۔ مریض نے کہا کہ وہ تو ہمارے گاؤں میں ہوتا نہیں۔ حکیم نے کہا کہ کبوتر کھاؤ، فاختہ کھاؤ، کدو لکڑی کھاؤ، پالک کھاؤ۔ غرض جو چیز حکیم بتلاتا رہا اُس کے جواب میں مریض کہتا رہا کہ یہ چیز ہمارے گاؤں میں نہیں ہوتی اور ہمارے یہاں تو بینگن ہوتے ہیں، آلو ہوتے ہیں، بھینس کا گوشت ہوتا ہے۔ غرض تمام مضر چیزیں گنا ڈالیں۔ حکیم صاحب نے ان سب کے جواب میں بھی یہی کہا کہ تو توان چیزوں کے پاس تک نہ جاتا۔ اب اگر یہ مریض یوں کہنے لگے کہ طب یونانی اس قدر تنگ ہے کہ اس میں میرے واسطے ایک غذا بھی جائز نہیں۔ اس میں تو لا یجوز ہی ہے۔ ہم تو اب ڈاکٹری علاج کریں گے۔ تو کیا اُس کا یہ کہنا درست ہوگا۔ ہرگز نہیں! کیونکہ منشاء اُن کا قواعد طبیہ کی تنگی نہیں بلکہ اُس کے گاؤں کی پیداوار کی تنگی ہے۔ یقیناً اس شخص سے یوں ہی کہا جائے گا کہ قواعد طبیہ میں تو تنگی نہیں، اُس میں

تو صدہا قسم کی جائز غذائیں موجود ہیں۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اس ظالم کے گاؤں میں تمام مضر ہی مضر چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ تنگی کا الزام طب پر جب ہو سکتا ہے جب کہ طب کی کتابوں میں دیکھو کہ کوئی غذا اس کے مزاج کے موافق ملے ہی نہیں۔ جب یہ نہیں تو تنگی کا شبہ طب پر نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح شریعت کا قانون تنگ نہیں۔ کتابیں دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شریعت نے معاملات کی کتنی صدہا صورتیں جائز کی ہیں اور صرف دو چند چیزوں کو ناجائز کہا ہے۔ فقہ کی کتابوں میں معاملات کو دیکھئے۔ کتاب البیع دیکھئے۔ خیار شرط ملاحظہ کیجئے۔ کتاب الشرف پر نظر ڈالئے۔ کتاب الدعویٰ دیکھئے۔ کتاب المساقات مطالعہ کیجئے۔ ان سب کی تحقیق کر کے پھر شمار کیجئے کہ کتنے واقعات میں یجوز ہے اور کتنے میں لایجوز۔ یقین کیجئے اگر آپ سو معاملات دیکھیں گے تو ساٹھ میں یجوز اور چالیس میں لایجوز نکلے گا اگر ہم کتابوں سے دکھا دیں کہ شریعت نے اتنے ذرائع آمدنی کے جائز کئے ہیں اور چند کو ناجائز کیا ہے، تو پھر شریعت پر تنگی کا الزام کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ آپ کی معاشرت ہی خراب ہے۔ آپ نے حلال طریقے چھوڑ کر زیادہ تر حرام ہی ذرائع آمدنی کے اختیار کر رکھے ہیں۔ تو یقیناً شریعت یہی کہے گی کہ اگر کوئی کسی پر ظلم کرے، کسی کا مال زبردستی چھینے، سود لے، رشوت لے، تو یہ حرام ہے ناجائز ہے۔ مگر اس حالت میں یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ شریعت میں تنگی ہے بلکہ یہ تنگی تو ہماری طرف سے ہے۔ وہ یہ کہ سب نے مل کر آمدنی کے وسائل وہی اختیار کئے ہیں

جو کسی طرح جائز نہیں ہو سکتے ہم نے اُن کو اپنی طرزِ معاشرت کا جزو بنا رکھا ہے۔ اب جب اس کے خلاف شریعت میں نکلتا ہے تو کہتے ہیں کہ شریعت میں بڑی تنگی ہے۔ انصاف سے بتلائیے کہ تنگی کدھر سے ہوئی۔ افسوس ہے کہ تنگی ہمارے افعال بے جا سے ہوئی اور الزام ہے شریعت پر۔ ہماری وہ حالت ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں ؎

حملہ بر خود مے کنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

خرگوش کی دانائی

مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ کسی جنگل میں ایک شیر آگیا تھا اور اُس نے نخچیروں کو (یعنی شکار کے جانوروں کو) پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ جانور یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ اور جمع ہو کر اُس کے پاس پہنچے اور کہا کہ حضور کو تکلیف کرنے کی کوئی حاجت نہیں۔ ہمیں حضور کے واسطے ہم میں سے ایک جانور روزانہ بلا ناغہ نمبروار آجایا کرے گا۔ چنانچہ معاہدہ ہوگیا اور ایک جانور روزانہ آتا رہا۔ ایک دن ایک خرگوش کی نوبت آئی۔ یہ جاتا نہ تھا۔ دوسرے جانوروں نے کہا کہ خدا کے لئے تو چلا جا کہیں معاہدہ کے خلاف کرکے سب پر آفت نہ آجائے۔ بالآخر جبراً قہراً چل چل کر گیا چونکہ جانے میں بہت دیر ہوگئی تھی، شیر بھوک کے مارے غصہ ہو رہا تھا۔ اُس کو دیکھتے ہی کہنے لگا کہ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ تم سے عہد پورا نہ ہو سکے گا۔ اب میں سب کو تو پ ٹھیک کروں گا۔

خرگوش پہلے ہی سے شیر کی ہلاکت کی تدبیر سوچ کر گیا تھا۔ بولا حضور

پہلے قصہ تو سن لیجئے۔ آپ اپنے نخرہ ہی میں تل رہے ہیں۔ آپ کو خبر ہی نہیں کہ یہاں کیا سے کیا ہو گیا۔ آج ایک بڑا زبردست واقعہ ہو گیا ہے میں بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں۔ اسی واسطے دیر بھی ہو گئی۔ چلا تو تھا میں وقت ہی پر مگر اس جنگل میں ایک دوسرا شیر آگیا ہے۔ آج ہم حضور کے واسطے دو بھائی آئے تھے۔ راستہ میں حملہ کر کے اُس نے ایک کو تو پکڑ لیا اور میں بڑی مشکل سے جان بچا کر آپ تک پہنچا ہوں۔ میں نے حضور کا نام لے کر اُس کو ڈرایا بھی دھمکایا بھی مگر اُس نے ذرا پروا نہ کی اور کہا کل سے ہمیں راتب دیا کرو اُن کو نہ دیا کرو۔ بس پہلے آپ اُس کا انتظام کیجئے ورنہ کل سے آپ کا روزینہ بند ہے۔ وہ راستہ ہی میں آپ کا راتب چھین لیا کرے گا۔

شیر نے غصہ میں آکر کہا کہ اُس کو ہمیں بتلاؤ۔ خرگوش راستہ میں ایک کنواں دیکھ کر گیا تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ وہاں لے گیا اور کہا حضور! وہ شیر اس میں رہتا ہے۔ مجھ کو تو خوف معلوم ہوتا ہے۔ آپ مجھ کو اپنی آغوش میں لے لیں۔ تو میں اُس کو دکھا دوں۔ چنانچہ شیر نے ایسا ہی کیا۔ خرگوش نے کہا کہ کنوئیں میں جھانک کر دیکھئے۔ اُس خرگوش کو آغوش میں لئے ہوئے وہ کھڑا ہے۔ کنوئیں میں شیر نے جو جھانکا تو اُس کا عکس پڑا دیکھا کہ ایک شیر خرگوش کو آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ شیر شجاع تو ہوتا ہی ہے اُس کو پھینک کنوئیں میں کود پڑا۔ جب خرگوش نے دیکھا کہ اُس کا کام تمام ہو گیا ہے تو آپ کہتے ہیں تسلیمات، آداب عرض ہے۔ شیر پانی میں ڈوب

کر مر گیا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

حملہ بر خود مے کنی اے سادہ مرد　　ہم چو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

شیر نے اپنے نزدیک دوسرے پر حملہ کیا تھا مگر حقیقت میں وہ حملہ اپنے اوپر تھا۔

ہماری کم فہمی اور بے عقلی

جیسے ایک حبشی کی حکایت ہے کہ راستہ میں چلا جا رہا تھا۔ ایک آئینہ پڑا ہوا ملا اُسے اٹھا کر دیکھا تو اس میں اپنی شکل نظر آئی۔ سیاہ رنگ، موٹے موٹے ہونٹ آپ اپنی شکل کی زیارت سے تمام عمر میں اسی وقت مشرف ہوئے تھے خفا ہو کر آئینہ کو پتھر پر دے مارا اور کہا کہ کم بخت! جب تو ایسا بدشکل تھا جب ہی تو تجھ کو راستہ میں کوئی پھینک گیا۔

اسی طرح ایک احمق کی حکایت ہے کہ اُس کا لڑکا ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا لے رہا تھا۔ اتفاق سے وہ ٹکڑا اُس کے ہاتھ سے لوٹے میں گر پڑا جس میں پانی بھی تھا۔ اُس نے جھانک کر دیکھا تو اُس کو اپنی شکل نظر پڑی تو وہ کہتا ہے ابا ابا، اس نے میرا ٹکڑا چھین لیا۔ باپ نے جو اُس میں جھانک کر دیکھا تو اُس کو اپنی شکل نظر پڑی۔ دیکھا کہ ایک شخص ہے بڑی سی داڑھی والا۔ آپ کہتے ہیں کہ اتنی بڑی داڑھی لگا کر بچے کا ٹکڑا چھینتے ہوئے شرم تو نہ آئی۔

ایک اور حکایت ایسی ہی یاد آ گئی۔ متعدد مثالوں سے مضمون خوب واضح ہو جاتا ہے۔ اس لئے بیان کی جاتی ہیں۔ وہ یہ کہ ایک دفعہ لوگ چاند

دیکھ رہے تھے اور اس وقت ایک عورت بچہ کو پاخانہ کرا رہی تھی۔ جلدی جلدی اُس سے فارغ ہو کر بچہ کو پونچھ پانچھ کر وہ بھی چاند دیکھنے لگی۔ اتفاق سے اُس کی انگلی میں پاخانہ لگا رہ گیا تھا۔ عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ ناک پر انگلی رکھ کر بات کرتی ہیں۔ تو وہ عورت چاند دیکھتے ہوئے ناک پر انگلی رکھ کر کہتی ہے "اے ہے! آج ایسا سڑا ہوا چاند کیوں نکلا۔ یہ خبر نہیں کہ وہ خود ہی سڑی ہوئی تھی۔

صاحبو! اسی طرح شریعت میں جسے تنگی نظر آتی ہے وہ خود تنگ ہے پھر میں اخیر بات کہتا ہوں کہ اگر فرض کر لو شریعت میں تنگی ہوتی بھی تو سوال یہ ہے کہ آپ کو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے تھا۔ میں کہتا ہوں کہ ہم لوگ جس گورنمنٹ کی عملداری میں رہتے ہیں اگر وہ گورنمنٹ کوئی سخت قانون مقرر کر دے تو آپ کیا کریں گے۔ اس صورت میں تین شکلیں ہیں یا تو اس قانون کو تسلیم کرو یا گورنمنٹ سے لڑو یا اُس کا ملک چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ تینوں شکلوں میں سلامتی کی بات یہ ہے کہ تسلیم کر لو۔

اسی طرح خدا تعالیٰ کے احکام اگر کسی کو سخت یا تنگ نظر آتے ہیں تو یا تو حق تعالیٰ سے لڑے یا خدا کا ملک چھوڑ کر کہیں چلا جاوے۔ مگر یہ بتلاؤ کہ لڑو تو کیسے لڑو اور وہ کون سا ملک ہے جہاں چلے جاؤ گے۔ تو یہ دونوں شکلیں یہاں محال ہیں۔ بس تیسری ہی شکل رہ گئی کہ تسلیم کر لو۔ باقی آپ نے جو تجویز کر رکھا ہے کہ جو قانون سمجھ میں نہ آیا اُسے چھوڑ دیا۔ یہ تو بالکل ہی بے عقلی ہے۔

آج کل کے محققین

آج کل بعض لوگوں نے کمال کیا ہے کہ انگریزی کے بی اے، ایم اے ہو کر شریعت مقدسہ کے محقق بنتے ہیں۔ ان لوگوں کو اتنی بھی عقل نہیں کہ جس نے پچاس برس دین کی خدمت میں صرف کر دیئے ہوں اور چراغ کا دھواں برسوں اُس کے دماغ میں سما گیا ہو تو وہ محقق نہ ہوا اور یہ حضرت تھوڑی سی انگریزی پڑھ کر محقق ہو گئے۔

آج کل کے محققین اور مدققین کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص گلستان دیکھ کر اُس کا محقق ہو گیا تھا۔ اتفاق سے دو شخصوں میں لڑائی ہو گئی۔ ایک اُن میں سے ان حضرت کے دوست تھے۔ وہ پٹ بھی رہے تھے اور پیٹ بھی رہے تھے۔ آپ نے یہ دیکھ کر دوست کے دونوں ہاتھ پکڑ لیئے۔ انجام یہ ہوا کہ اُن کے دوست صاحب خوب پٹے اور آپ اپنی اس حرکت پر بڑے خوش ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے گلستان میں جو پڑھا تھا سہ

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست ۔۔۔ در پریشاں حالی و درماندگی

آج اُس پر عمل کرنے کا اچھا موقع ملا اور اپنے نزدیک دوست کا پورا حق ادا کر دیا۔ تو جیسے وہ گلستان کے محقق تھے، ایسے ہی یہ لوگ آج کل قرآن و حدیث کے محقق ہیں۔

ان ہی میں سے ایک شخص کا واقعہ ہے کہ اُنہوں نے امام مقیم کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب امام دو رکعت پڑھ چکا آپ دونوں طرف سلام پھیر کر بیٹھ گئے۔ امام نمازیں ہے اور مقتدی پہلے ہی فارغ ہو گیا۔ میں دیکھ کر سمجھا تیام

سے کوئی عذر ہو گا جو بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں مگر میں نے دیکھا ہر رکن میں بیٹھے ہی نظر آتے ہیں۔ اب میں سمجھا کہ آپ نے امام مقیم کے ساتھ بھی قصر کیا ہے نماز سے فارغ ہو کر میں نے اُن سے کہا کہ آپ نے پوری نماز کیوں نہیں پڑھی تو آپ فرماتے ہیں کہ میں مسافر تھا۔ آج کل کے ایسے محققین ہیں جنہیں اتنی بھی خبر نہیں کہ اگر امام مقیم ہو تو مقتدی مسافر کو بھی امام کے ساتھ چار ہی رکعت پڑھنی چاہئیں۔

اسی طرح ایک اور واقعہ ہے ایک بڑے لیڈر کا۔ مگر آج کل کے لیڈر کیا ہیں، گیدڑ ہیں۔ وہ سفر میں تھے، پانی ملا نہیں تیمم کا ارادہ کیا مگر کبھی تیمم کرتے ہوئے کسی کو دیکھا تھا نہیں۔ اجتہاد شروع کیا۔ تقدم تو اس جماعت کے لوازم سے ہے۔ ہر بات میں سب سے پہلے ٹانگ اڑاتے ہیں۔ آپ نے کیا کیا کہ مٹی لے کر پہلے ہاتھ کو ملی۔ پھر چلو میں مٹی لے کر منہ میں دی۔ غرض وضو کی طرح تیمم کیا۔ وہ اب بھی زندہ ہیں سلمہ اللہ تعالیٰ۔ اور مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ اُن کا اقتدا کرنے کو تیار ہیں۔

افسوس ان لوگوں کو دین کی تو خبر نہیں اور پھر لیڈران قوم بنے ہوئے ہیں۔ ایسوں ہی پر یہ شعر صادق آتا ہے ؂

اذا کان الغراب دلیل قوم
سیھدیھم طریق الھالکینا

اور دین سے واقفیت کا ذریعہ صرف یہی تھا کہ علماء سے سبق حاصل کیا جائے مگر اس سے ان کو عار ہے۔

تعلق باللہ

میں عرض کر رہا تھا کہ جب کوئی قانون نافذ ہوتا ہے، تو تین حالتیں ہوتی ہیں۔ جیسا اوپر بیان ہوا۔ تینوں میں سلامتی کی بات یہی ہے کہ اس کو تسلیم کر لو۔ خاص کر جب کہ حاکم سے دوسرا تعلق بھی ہو۔ اور ہمیں اتنا بڑا تعلق ہے خدا تعالیٰ کے ساتھ کہ اگر وہ منکشف ہو جائے تو خدا کی قسم کھاتا ہوں اور پھر قسم کھاتا ہوں اور پھر قسم کھاتا ہوں کہ ہم احکام الٰہیہ سے ایسے منصبغ اور رنگین ہو جاویں کہ دوسرا رنگ ہی نہ رہے۔

وہ تعلق کون سا ہے۔ وہ تعلق محبت اور محبوبیت کا ہے۔ کیا خدا تعالیٰ کے ساتھ آپ کو محبت کرنا لازم نہیں؟ کوئی مسلمان ہے جو یہ کہہ سکتا ہو کہ ہاں لازم نہیں ہے۔ اگر کسی کو ایسی ہمت ہو تو میں کہتا ہوں کہ اس کو دنیا میں کسی سے بھی محبت ہے یا نہیں۔ بی بی سے، بچوں سے، مکان سے، معشوق سے، عورت سے، لڑکے سے، یقیناً کسی ایک چیز سے تو محبت ضرور ہو گی۔

اب یہ سوچو کہ بناء کیا ہے اس محبت کی سو بنائے محبت کی کبھی فضل و کمال ہوتا ہے جیسے امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ میں فضل و کمال کی شان ہے کہ وہ ان سے محبت کا باعث ہوا ہے۔ اسی طرح حضرات شیخین سے محبت ہے یا اہل بیت سے محبت ہے۔ تو ان کے ساتھ بھی فضل و کمال کی وجہ سے محبت ہے۔ کبھی محبت ہوتی ہے عطا و نوال کی وجہ سے۔ جیسے محسن سے محبت ہوتی ہے کبھی حسن و جمال کی وجہ سے محبت ہوتی ہے

جیسے کسی لڑکے یا عورت سے محبت ہو اور ایسی محبت ہوتی ہے کہ عشق کے مرتبہ کو پہنچ جائے۔ بس یہ اسباب ہیں محبت کے۔

ایک فضل و کمال ——— ایک عطا و نوال ——— ایک حسن و جمال

اب اگر کہیں یہ تینوں اسباب جمع ہوں تو پھر محبت نہ ہونے کے کیا معنی؟ اب بتلائیے اللہ تعالیٰ میں کس چیز کی کسر ہے۔ کیا اُن میں فضل و کمال نہیں یا عطا و نوال نہیں یا حُسن و جمال نہیں۔ اُن میں تو سب چیزیں موجود ہیں۔ عطا کی تو یہ کیفیت ہے کہ آپ کو دل دیا، عقل دی، زبان دی، آنکھ ناک دی۔ اگر خدا تعالیٰ قلب نہ دیں، زبان نہ دیں تو کوئی آپ کو یہ چیزیں کیونکر دے سکتا ہے معطی حقیقت میں وہی ہیں۔ اگر کسی میں فضل و کمال علم کا ہے تو وہ بھی انہی کا دیا ہوا ہے۔ اُنہی کا دیا ہوا حسن و جمال بھی ہے۔ جب اُن کے بنائے ہوئے ایسے ہیں تو وہ خود کیسے ہوں گے۔ اُن کی تو یہ شان ہے ؎

حُسنِ خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ
پس بہ چشمِ عاشقاں خود را تماشا کردۂ

واقع میں ہماری ایسی مثال ہے، جیسے آفتاب نکلا اور دیوار پر دھوپ پڑی مگر ایک احمق کو آفتاب کی خبر نہیں۔ اُس کی نظر دیوار پر ہی ہے اور اُس کو دیکھ دیکھ خوش ہو رہا ہے۔ یہ شیخی بگھار رہا ہے کہ میرے گھر کی دیوار کیسی چمک رہی ہے۔ مگر شام ہونا تھی کہ دھوپ سمٹنا شروع ہوتی ہے اور آفتاب اپنے ساتھ اس کو لے جاتا ہے تو دیوار تاریک کی تاریک رہ جاتی ہے۔ نور صفت اصلی آفتاب کی ہے دیوار کی نہیں۔ اگر وہ حسن و جمال دیوار کی اصلی صفت

ہوتی تو اس سے زائل کیوں ہوتی ۔ ایسی ہی چیزوں کے بارہ میں کہ جن کا حسن وجمال اُن کی اصلی صفت نہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق با مُردہ نباشد پائیدار ۔۔۔ عشق را با حی ۔ با قیوم دار

عاشقی با مُردگاں پائندہ نیست ۔۔۔ زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست

عشق ہائے کز پئے رنگے بود ۔۔۔ عشق نبود عاقبت ننگے بود

آگے فرماتے ہیں ؎

غرق عشقے شو کہ غرق ست اندریں ۔۔۔ عشق ہائے اوّلین و آخریں

پس عشق حق تعالیٰ ہی کا حق ہے ۔ اُن سے ہی عشق کرنا چاہیئے ۔ مگر اس میں بعض اوقات یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ محب ومحبوب میں مناسبت ہونی چاہیئے اور ہم میں اور حق تعالیٰ میں مناسبت ہی کیا ۔ پھر وہاں تک ہماری رسائی کیونکر ہوگی ۔ مولانا آگے اسی شبہ کو رفع فرماتے ہیں ؎

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست ۔۔۔ بر کریماں کارہا دشوار نیست

یعنی یہ مت سمجھ کہ اس شاہنشاہ کی بارگاہ میں تیرا کیونکر دخل ہوگا ۔ اس لئے کہ

ع بر کریماں کارہا دشوار نیست

یعنی کریموں پر یہ کام دشوار نہیں ۔ جواب کا حاصل یہ ہوا کہ رسائی کی دو صورتیں ہیں ۔ ایک یہ کہ تم خود وہاں پہنچو اور ایک یہ کہ وہ تم کو پہنچا دیں سو کہتے ہیں کہ گو تم خود وہاں تک نہیں پہنچ سکتے مگر انہیں تو پہنچانا مشکل نہیں ہے ۔ جب یہ ہے تو پھر مایوسی کیسی ؟

تقرب الی اللہ

چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔ من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعا ومن تقرب الی ذراعاً تقربت الیہ باعا۔ الخ کہ جو میری طرف ایک بالشت آتا ہے میں اس کی طرف ایک ذراع جاتا ہوں اور جو میری طرف ایک ذراع آتا ہے میں اس کی طرف ایک باع آتا ہوں اور جو میری طرف آہستہ چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ راستہ تو غیر متناہی ہے کہ کسی کے قطع کرنے سے قطع ہی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

یہ ہمارے چلنے سے قطع نہیں ہوتا بلکہ اُدھر ہی سے عنایت ہوتی ہے تو قطع ہوتا ہے۔ اسی کی نسبت حدیث میں بشارت ہے من تقرب الی شبرا۔۔۔ الخ کہ جو ایک ذراع ہماری طرف آتا ہے ہم اس کی طرف ایک باع جاتے ہیں۔ خیال تو فرمائیے کیسی عنایت ہے کیسا کرم ہے؟ مگر طلب شرط ہے۔ جس کی خاصیت مولانا فرماتے ہیں ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالا و پست

مطلب یہ کہ بدون پیاس پانی نہیں ملتا۔ پیاسے بنو تو پانی تم تک خود ہی آجائے گا۔ راز اس کا کیا ہے۔ راز یہ ہے ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بہ عالم تشنگاں

یعنی پیاسا ڈھونڈتا پھرتا ہے پانی کو۔ اسی طرح پانی بھی ڈھونڈتا

ہے پیاسے کو۔

یعنی حق تعالیٰ خود تم کو اپنی طرف بلاتے ہیں اور بلانے کے ساتھ پہنچاتے بھی ہیں۔ کوئی محبوب ایسا ہے کہ محب کو خود بلائے اور خود پہنچائے۔ غور کیجئے کہ عاشق کو محبوب خود بلا رہے ہیں۔ یہ عنایت نہیں تو اور کیا ہے۔ ایسی عنایت پر شبہ ہی نہیں ہو سکتا کہ ہماری رسائی خدا تک کیسے ہو گی۔

ایک بزرگ تھے۔ اُن کو بادشاہ نے کچھ دریافت کرنے کی غرض سے بلانا چاہا۔ بادشاہ محل کے اُوپر تھے اور یہ نیچے سے گزر رہے تھے۔ بادشاہ نے اوپر سے کمند پھینک دی۔ اُس کے ذریعہ سے محل پر پہنچ گئے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ بندہ کی رسائی خدا تک کیسے ہو سکتی ہے۔ کہاں خدا کہاں بندہ۔ اُنہوں نے برجستہ فرمایا کہ ایسے ہو سکتی ہے جیسے میری رسائی آپ تک ہو گئی۔ اگر میں دروازہ سے آتا تو کتنے مرحلے طے کرنے پڑتے۔ کہیں دربانوں سے واسطہ پڑتا۔ کہیں مصاحبین سے کہنا ہوتا۔ کتنے درجے طے کرنے پڑتے۔ اس کے بعد کہیں آپ تک رسائی ہوتی اور شاید نہ بھی ہوتی اگر دربان روک دیتا۔ غرض ایک صورت تو آپ تک پہنچنے کی یہ تھی کہ میں آپ کو تلاش کرتا اور سو دقتیں اٹھا کر کہیں آپ تک پہنچتا۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ خود آپ نے مجھے کھینچ لیا۔ پس جیسا اس وقت آپ نے کیا اسی طرح خدا تک رسائی ہو سکتی ہے۔

شرطِ طلب و تقاضا

مگر طلب شرط ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کھینچتے اُسی کو ہیں جو کھنچنا چاہے اور جو اعراض کرتا ہے

ن سے وہ بھی اعراض کرتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

انلزمکموھا وانتم لھا کارھون — یعنی تم کراہت کرو تو ہمیں کیا غرض پڑی ہے جو خواہ مخواہ اپنی رحمت کو تم پر لادیں۔

ن اگر کوئی طلب کرے تو اس کی طرف نہایت توجہ اور رحمت فرماتے

ں ——— !

اس کی ایسی مثال ہے، جیسے بچہ ماں کی آغوش میں دوڑ کر آنا چاہتا ہے گھٹنوں سے چلا نہیں جاتا۔ وہ ہمت کر کے کھڑا ہوا اور گر پڑا۔ اس کا نا تھا کہ ماں نے دوڑ کر خود اٹھا لیا۔ بس اُس کا کام تو اتنا ہی ہے کہ اپنی ہمت کے موافق چلے اور گر پڑے۔ جب وہ اپنا کام کر چکتا ہے تو فوراً ں آغوش میں اٹھا لیا جاتا ہے۔ اگر بچہ ایسا نہ کرے تو اُس کی طرف ماں ا ایسا تقاضا نہیں ہوتا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید — خیرہ یوسف وار می باید دوید

تا نہ گرید طفل کے جوشد لبن — تا نگرید ابر کے خندد چمن

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب زلیخا مکان میں لے گئیں تو سات فل سات دروازوں میں ڈال دیئے تھے تاکہ نکلنے نہ پائیں۔ جب انہوں نے یہ کیفیت دیکھی تو سوچا کہ اپنا کام مجھے کرنا چاہیئے پھر حق تعالیٰ اپنا کام کریں گے۔ دروازہ کھلنا نہ کھلنا میرا کام نہیں۔ بس خدا پر توکل کر کے دروازہ کی طرف بھاگے۔ دروازہ کے پاس پہنچنے نہ پائے تھے کہ سب

دروازے کھلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ساتوں دروازوں سے باہر نکل گئے۔ اُنہوں نے خیال کیا کہ گو بھاگنے کا راستہ تو نہیں ہے لیکن بھاگنا تو قبضہ میں ہے۔ چنانچہ اس قصد سے بھاگے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ باہر نکل گئے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید خیرہ یوسف وار می باید دوید

غرض یہ تو مسلّم ہے کہ انسان کی کوشش سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے مگر پھر بھی کوشش شرط ہے۔ جیسے وضو نماز کے لئے شرط ہے گو تنہا وضو سے کچھ نہیں ہوتا جب تک نماز نہ پڑھے۔ لیکن بدون وضو کے نماز بھی نہیں ہوتی۔ ایسے ہی خدا تعالیٰ محض اس کی کوشش سے نہیں ملتے وہ اپنی مرضی سے ملتے ہیں۔ مگر کوشش شرط ہے۔

ان ہی دو مثالوں کو بیان کر کے میں کہتا ہوں کہ قرآن میں اسی لئے ارشاد فرمایا ہے۔

جزاء بما کانوا یعملون اور جزاء بما کانوا یعملون۔ کہ عمل کرنے والے اپنے عمل کا بدلہ دیئے جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عمل ضروری ہے اور یہ جو حدیث میں ہے کہ بدون رحمت کے کوئی جنت میں نہ جائے گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عمل علّت تامہ نہیں ہے مگر شرط ہے۔ اس کے بعد میں قرآن شریف ہی سے یہ مسئلہ ثابت کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ تک رسائی ممکن ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ان رحمت اللہ قریب من کہ اللہ کی رحمت محسنین سے

المحسنین 					قریب ہے۔

پس اتنی طلب تو چاہیئے کہ عمل میں مشغول ہو جاتے اور خلوص کے ساتھ مشغول ہو جاوے۔ جس سے محسنین کا مصداق ہو جائے۔ اس کے بعد یہ مشاہد ہو جائے گا۔ ع

با کریماں کارہا دشوار نیست

تمہارے عمل کرنے پر خدا تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہو گی۔ پس کامیاب ہو جاؤ گے۔ اب تو معلوم ہو گیا کہ خدا تعالیٰ تک رسائی ممکن ہے۔ جب رسائی ممکن ہے تو پھر خدا تعالیٰ سے کیوں نہ محبت کی جائے بلکہ اُن سے محبت کرنا واجب اور فرض ہے اور میں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی محبوب ہے ہی نہیں۔ تعجب ہے کہ عشق مجازی کو دین وایمان سمجھا جائے اور خدا تعالیٰ کے عشق کی طرف ذرا دھیان بھی نہ ہو۔

تعلق بالمخلوق

بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کو خدا سے پوری محبت ہی نہیں۔ اس لیئے اس کے احکام کے تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ جو خدا کا عاشق ہوگا وہ تو ہر حکم کو سر اور آنکھوں پر رکھے گا۔ اور جو حالت بھی اُس کو خدا کی طرف سے پیش آئے گی اُس میں خوش ہوگا۔ اُس کی تو یہ کیفیت ہو گی ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو 		دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اور اس کا یہ مذہب ہوگا ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من 		دل فدائے یار دل رنجان من

بلکہ یہ حالت ہو گی ؎

بجرم عشق توام می کشند و غوغائیست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

یہ ہوتا ہے اثر تعلق عشق کا مگر افسوس ہے ہمارے حال پر کہ محبت کا تو دعویٰ اور اتنا بھی تعلق نہیں کہ اگر احکام سخت نازل ہوں تو اُن کو دل سے مان لیا جائے۔ معلوم ہوا کہ برائے نام ہی محبت ہے۔ پھر اگر ہم یہ دیکھتے کہ آپ سخت احکام کے نہ ماننے میں ایسے پختہ ہیں کہ دنیا میں کسی کے ہی سخت احکام نہیں مانتے، تو ہم بھی سمجھتے کہ یہ لوگ اصول کے بڑے پابند ہیں۔ اس لئے ان پر الزام نہیں۔ مگر ہم تو دیکھتے ہیں کہ مخلوق کے تعلق ہی میں یہ لوگ ان اصول کو توڑ دیتے ہیں۔

چنانچہ طبیب کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نبض دیکھ کر نسخہ لکھ دیجئے اُس نے ایسا کڑوا نسخہ لکھا کہ جس کا منہ تک جانا بھی دشوار ہے تو اس سے یہ نہیں کہتے کہ ایسا کڑوا نسخہ کیوں لکھا۔ علی ہذا۔ کتنا ہی قیمتی لکھا ہو، یہ کبھی نہیں کہتے کہ اتنا قیمتی کس واسطے لکھا ہے بلکہ بعض اوقات اُس سے فرمائش ہوتی ہے کہ اچھا نسخہ لکھئے گا۔ قیمت کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ اور باوجود ان سارے قصوں کے پھر بھی تندرستی کے بعد کہتے ہیں کہ آپ کا بڑا احسان ہوا جس کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اور کڑوے نسخہ کو غٹ غٹ پی جاتے ہیں۔ سب طرح کی مشقت گوارا کرتے ہیں۔ اگر حکیم کہے کہ عصر کے وقت کھچڑی کھانا تو اُسی کو خوشی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ غرض وہ جو بھی بتلائے خواہ نفس پر کیسا ہی گراں ہو، سب

بول کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اُس وقت آپ کے یہ اصول کہ سخت احکام نہ مانا جائے وغیرہ وغیرہ کہاں گئے۔ طبیب کے ساتھ یہ معاملہ نہ کیا، جو خدا کے ساتھ کرتے ہو۔ معلوم ہوا کہ صرف بہانہ ہے نفس کا اور کچھ نہیں۔ بس آپ کا مذہب یہ ہے کہ جس طرح دنیا کا کام بنا اسی طرح کر لیا۔ اصول کے اختیار کرنے سے کام چلا یوں کر لیا اور جو اصول کے چھوڑنے سے کام چلا تو ایسے کر لیا۔ یہ نہیں سوچتے کہ اس بے ڈھنگے پن کا انجام کیا ہوگا۔

بہرحال اول تو احکام شرعیہ سخت نہیں اور اگر سخت ہوئے بھی تو اُن کو برداشت کیجئے۔ آپ کا فرض ہے کہ اُن کو بجا لائیں۔ جیسے دنیا کے احکام اور آفاؤں کے سخت احکام برداشت کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح احکام خداوندی کے ساتھ معاملہ کیجئے۔ پس اگر شریعت میں حقوق مالیہ سخت بھی ہوں تب بھی اُن پر عمل کرنا چاہئے مگر اس کی طرف کسی کو التفات ہی نہیں۔ نماز روزہ کے مسائل تو کبھی پوچھ بھی لیتے ہیں حقوق مالیہ کو کوئی پوچھتا ہی نہیں کہ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز۔ اس سے پہلے بیان میں ان حقوق مالیہ کا بیان بقدر ضرورت ہوا تھا۔ دیکھئے اس پر عمل ہوتا ہے یا نہیں۔

اثر وجاہت

اب اسی کے ساتھ اس کا ایک قرین ہے جس کا نام جاہ ہے یا اثر وجاہت۔ اور یہ اس کا قرین اس لئے ہے کہ جیسے مال حوائج کے پورا ہونے کا ذریعہ ہے اسی طرح جاہ بھی حوائج کے پورا ہونے کا ذریعہ ہے اور اصل غرض حوائج کا پورا ہونا ہے اور چونکہ یہ دونوں چیزیں اس کا ذریعہ ہیں۔ اس لئے لوگ رات دن انہی کی طلب

میں سرگرم رہتے ہیں۔ غرض یہ کہ حوائج کے پورا ہونے میں مال وجاہ دونوں کو دخل ہے۔ بعض کام مال سے چلتے ہیں اور بعض جاہ سے اور بعض اعتبار سے بلکہ غور کیا جائے تو جاہ اثر میں مال سے بھی بڑھی ہوئی ہے کیونکہ بعض اوقات جاہ سے بلا مال کے ہی کام چل جاتا ہے۔ بعض کام جاہ کی وجہ سے ایسے ہو جاتے ہیں جو مال سے ہو ہی نہیں سکتے۔ بعض لوگوں کی مالی حیثیت زیادہ نہیں ہوتی مگر اُن کی جاہ زیادہ ہوتی ہے۔

قصبات میں بعض رئیس ہوتے ہیں کہ اُن کا قصبہ میں اثر ہوتا ہے کہ چارپائی پر بیٹھے ہیں، حقہ سامنے رکھا ہے، تکیہ لگائے ہوئے ہیں۔ کسی شخص کو ڈولے سے بلاتا ہے۔ مزدور بھیجتے ہیں پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ بس کوئی اُن کے سامنے سے سر پر گٹھڑی لئے ہوئے نکلا۔ اُس کو کہا گٹھڑی کو تو یہاں رکھ دے اور فلانے کو بلا لا۔ اگر مزدور بھیجتے تو دو آنے خرچ ہوتے۔ بس اُن کا کام مفت میں ہی چل گیا۔ تو یہ کیا ہے، جاہ کا اثر ہے کہ اس سے بدون پیسہ خرچ کئے ہوئے کام چل رہا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ مثلاً اہل کمال ہوتے ہیں۔ لوگ اُن کی خدمت کرتے ہیں۔ اُن کو عیش و آرام ہوتا ہے۔ لوگوں کو اُن پر حسد بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ اُن کے پاس مال کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تو یہ کیا ہے جاہ ہی کا تو اثر ہے۔ ان حضرات کی جاہ پہلے عنداللہ ہوتی ہے اور پھر عندالخلق ہوتی ہے۔

مجھ کو اس وقت اس سے بحث نہیں کہ جاہ کیسی چیز ہے اور اس کا کیا حکم ہے بلکہ یہ بیان کرنا ہے کہ جاہ بھی ایک ذریعہ ہے حوائج کے پورا

ہونے کا جیسے مال ایک ذریعہ ہے اور جو اثر دو قسم ہیں جلب منفعت و دفع مضرت اور مال کے یہ دونوں اثر ہیں اسی طرح جاہ کے بھی یہ دونوں اثر ہیں گو غالب اور زیادہ مال میں جلب منفعت ہے اور جاہ میں دفع مضرت۔ مگر ایک امر مشترک تو دونوں میں ہے پس ثابت ہو گیا کہ مال و جاہ دونوں میں تقارن ہے۔

چونکہ پہلے مال کے متعلق بیان ہو چکا ہے تو جی یوں چاہا کہ اس کی قرین کا ذکر بھی ہو جائے تاکہ اس مضمون کی تکمیل ہو جائے۔ اس جلسہ میں بعض لوگ تو وہ ہیں جو پہلے بیان کو سن چکے ہیں۔ اس لئے ان کے تو اذہان میں دونوں مضمونوں کا اقتران اسی وقت ہو جائے گا۔ اور جو لوگ ایسے نہیں تب بھی چونکہ مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، دونوں کا اشاعت کے بعد دیکھنے وقت ان کا اقتران ہو جائے گا۔ اور چونکہ یہ حدیث (جو شروع وعظ میں پڑھی گئی ہے) اس کے لئے کافی تھی اس لئے اس حدیث کو اس وقت اختیار کیا گیا۔

سو سنیئے! جاہ کے معنی ہیں قدر و منزلت (کمافی القاموس) جس کا حاصل اور لازم ہے اثر۔ چونکہ صاحب جاہ کا قلوب میں اثر ہوتا ہے اسی لئے صوفیہ نے اس کی حقیقت ملک القلوب بتائی ہے۔ چونکہ اثر کا لفظ مشہور ہے، اس لئے جاہ کو لفظ اثر سے تعبیر کرنا سمجھنے کے لئے زیادہ سہل اور مناسب ہوگا۔ پس میں کہتا ہوں کہ اس حدیث میں اسی اثر مذکور کے متعلق بحث ہے۔ تو اب سمجھ لیجئے کہ مال کے جیسے دو حق ہیں ایک مال کا حاصل کرنا، ایک مال کا صرف کرنا، اور شریعت میں دونوں کے جدا جدا احکام ہیں یعنی احکام تحصیل

مال کے متعلق ہیں اور بعض استعمال مال کے متعلق ہیں، اسی طرح اس اثر کے متعلق دو چیزیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اثر کے حاصل کرنے کا کیا حکم ہے۔ ایک یہ کہ اس کے استعمال کا کیا حکم ہے۔ مگر باوجود اس کے کہ اس کے متعلق بھی احکام ہیں پھر بھی آج کل اکثر دیکھا جاتا ہے کہ لوگوں میں اس جاہ کے احکام سے زیادہ غفلت ہے۔ بلکہ عجب نہیں کہ بعض لوگ جو شریعت کو صرف نماز روزہ ہی پر منحصر سمجھ رہے ہیں، دل میں یوں کہتے ہوں گے کہ کیا شریعت میں اس کے بھی کچھ احکام ہیں۔

ترقی کی حقیقت

صاحبو! مصیبت یہ ہے کہ ہمارے گھر میں سب کچھ ہے مگر ہمیں خبر نہیں۔ اس لئے کثرت سے احکام کی خبر نہیں۔ اسی باب میں ہماری وہ مثال ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں :

یک سبد پُر ناں ترا بر فرق سر   تو ہمی جوئی لب ناں در بدر

ایک شخص روٹیوں کا ٹوکرا سر پر رکھے ہوئے ہے اور در بدر یوں کہتا پھرتا ہے کہ خدا کے واسطے ایک ٹکڑا دے دو۔ میں بھوکا ہوں حالانکہ ٹوکرے میں اتنی روٹیاں ہیں کہ اگر یہ شخص سارے محلہ میں تقسیم کر دے جب بھی بچی رہ جاویں مگر اس کو خبر نہیں۔

بس ایسی ہماری حالت ہے کہ ہمارے قانون شرع میں سب ہی کچھ موجود ہے یعنی ضروریات دین مگر ہمیں خبر نہیں۔ اور یہ قید ضروریات کی اس لئے لگائی کہ شاید سب ہی کچھ کا لفظ سن کر کسی کو یہ خیال ہو کہ پھر شریعت کے علم سے ہم کو ریل چلانا بھی آجائے گا۔ اس میں اس کی ترکیب بھی لکھی ہوگی کہ

اس طرح اوزار ڈھالو اور ایسے انجن بناؤ، گاڑیاں تیار کرو۔ اس قید سے یہ چیزیں خارج ہوگئیں (مطلب یہ کہ دین کے متعلق جتنی باتیں ہیں وہ شریعت میں سب موجود ہیں) باقی یہ گمان جو بعض لوگوں کا ہے کہ شریعت میں تجارت کے طریقے بتلائے گئے ہیں کہ اس طرح کماؤ، کارخانے جاری کرو، محض غلط ہے ــــــ!

چنانچہ اس مذاق کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن شریف نے دنیا کمانے کے متعلق بھی سب کچھ سکھایا ہے۔ ان میں ایک قوم وہ بھی ہے جس کو قرآن شریف میں صرف یہی حکم پسند آیا ہے احل اللہ البیع کہ اللہ نے بیع یعنے تجارت کو حلال کیا ہے جس میں سب ذرائع تجارت کے آگئے۔ بھلے مانسوں نے یہ نہ دیکھا کہ جیسے احل اللہ البیع فرمایا اسی طرح وحرم الربوا بھی تو قرآن ہی میں موجود ہے اور اسی جگہ موجود ہے۔

ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک حریص سے کسی نے پوچھا تھا کہ بھائی تمہیں قرآن شریف میں کون سا حکم پسند ہے تو اس نے کہا کلوا واشربوا کہ کھاؤ اور پیو۔ پھر پوچھا کہ دعا کون سی پسند ہے تو کہا، ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء کہ اے ہمارے رب ہمارے اوپر آسمان سے خوان نازل فرما۔

تو جیسے اس حریص کو تمام احکام میں سے کھانے اور پینے ہی کا حکم پسند آیا تھا اور تمام دعاؤں میں سے کھانے پینے ہی کی دعا پسند آئی تھی اسی طرح ان کو صرف احل اللہ البیع ہی پسند آیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں ترقی کی

اجازت دی ہے۔ یہ حاشیہ چڑھایا ہے قرآن شریف پر۔ اور ترقی کے معنی بھی وہ لئے جو انہوں نے خود ہی سمجھے ہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ شریعت نے ترقی کی اجازت دی ہے مگر سوال یہ ہے کہ ترقی کے معنی کیا ہیں۔ آیا وہ جو انہوں نے سمجھے ہیں یا کچھ اور۔ اگر ترقی کے صحیح معنی بیان کئے جائیں گے تو ہم تسلیم کریں گے کہ شریعت نے اس کی اجازت دی ہے۔ لیکن کسی چیز کا نام ترقی رکھ لینے سے اس کی حقیقت تھوڑا ہی پائی جائے گی۔ کوئی شراب کا نام شراب الصالحین رکھ لے تو اس سے وہ حلال تھوڑا ہی ہو جائے گی۔ آج کل جس چیز کا نام ترقی رکھا گیا ہے اُس کی حقیقت ہے حرص، طول امل، خود غرضی اور قطع نظر شریعت سے یہ چیزیں تو عقلاً بھی ناجائز ہیں۔ مگر لوگوں نے حرص وغیرہ کا ایک خوبصورت نام ترقی رکھ لیا مگر صرف نام رکھ لینے سے کیا ہوتا ہے اس سے حقیقت تو نہ بدلے گی۔

میں اس کو مفصل بیان کرتا مگر یہ جلسہ اس کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے خاص طور پر مستقل جلسہ کی ضرورت ہے لیکن میں اجمالاً ایک مختصر بات کہتا ہوں وہ یہ کہ عقلاء اوّل اس کا فیصلہ کر لیں کہ ترقی کی حقیقت کیا ہے۔ پس خوب سمجھ لو کہ ترقی کی حقیقت وہی ہے جس کی قرآن شریف اجازت دیتا ہے یعنی حلال طریقہ سے بڑھنا کیونکہ دو حال سے خالی نہیں کہ جائز ترقی محدود ہے یا غیر محدود ہے۔ اگر محدود ہے تو اس کی حدود بیان کیجئے اور انشاءاللہ شریعت سے بہتر اس کی حدود کوئی بھی نہ بیان کر سکے گا۔ اور اگر غیر محدود ہے یعنی اس میں کوئی قید نہیں ہے۔ اگر اُس میں مضرتیں بھی ہوں تو اُس کی بھی اجازت دی جاوے

تو کیا خدا تعالیٰ سے جو کہ بوجہ علیم و خبیر و رحیم و حکیم ہونے کے سب سے زیادہ نصائح عباد کی رعایت فرماتے ہیں اس ترقی غیر محدود کی اباحت کی توقع رکھ سکتے ہو حالانکہ گورنمنٹ سے بھی جس کی نظر نصائح کو اس قدر محیط نہیں تم اس کی توقع نہیں کر سکتے۔ دنیا کی ہر گورنمنٹ صرف محدود ترقی کی اجازت دیتی ہے اور آپ کو مقید بناتی ہے ترقی غیر محدود کی کوئی گورنمنٹ اجازت نہیں دے سکتی تو خدا تعالیٰ کو یہ حق نہیں کہ وہ آپ کو مقید کریں اور اگر کوئی عدم احاطہ واقعات کے سبب یہ کہے کہ گورنمنٹ تو غیر محدود ترقی کی اجازت دیتی ہے۔ چنانچہ بہت سے ذرائع غیر مشروع کی قانون میں اجازت ہے تو چاہیے آج سے ڈکیتی کیجئے، دوسروں کے مال چھین چھین کر خوب اپنا مال بڑھائیے۔ اس کے بعد اگر آپ عدالت میں پکڑے ہوئے جاویں تو صاف کہہ دیں کہ ہم تو ترقی کرتے ہیں میں پوچھتا ہوں کیا عدالت اس کو قبول کر لے گی۔ اگر نہیں قبول کرے گی، تو پھر ثابت ہو گیا کہ گورنمنٹ نے ترقی کی یہ حد قائم کی ہے کہ ڈکیتی نہ ہو، چوری نہ ہو غصب نہ ہو۔

پس جب گورنمنٹ ترقی کے لئے حدود قائم کر سکتی ہے تو کیا خدا تعالیٰ حدود قائم نہیں کر سکتے۔ افسوس ہے کہ گورنمنٹ سے تو غیر محدود ترقی کی امید نہ رکھیں اور حق تعالیٰ کی طرف سے یہ امید ہو کہ ترقی غیر محدود کی اجازت دیں اور اگر ترقی غیر محدود مطلوب ہے تو اجازت دیجئے کہ میں آپ کا کرتہ اتار لوں اور آپ کا مکان اور جائداد چھین لوں۔ کیونکہ آپ کے نزدیک ترقی کے لئے کوئی حد تو ہے ہی نہیں۔ اگر آپ کو یہ گوارا ہو تو میں ادب سے عرض کروں گا

کہ آپ میرے خطاب کے قابل نہیں۔ ایسا شخص تو مجنون ہے جس کو ڈاکٹر سے جنون کا سرٹیفکیٹ لینا چاہیے۔ غرض یہ کہ ترقی اور تمدن کی حقیقت اتنی ہی ہے جتنی شریعت نے اجازت دی ہے۔ اور اس میں شریعت نے تنگی نہیں کی شریعت نے اجازت دی ہے ترقی کی مگر اس کے حدود ہیں۔

قرآن فہمی

میں اس کو عرض کر رہا تھا کہ شریعت میں ضروریات دین سب مذکور ہیں۔ ان ضروریات میں خصوص جاہ کے متعلق بھی تھا۔ اس کے لئے بھی شریعت کے احکام ہیں۔ اس پر ایک سوال کرتے ہیں کہ کیا جاہ کے متعلق بھی احکام ہیں، یہ گفتگو درمیان میں آ گئی تھی کہ ہاں احکام سب چیزوں کے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ ہمیں خبر نہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن شریف کو ہم نے اس نظر سے دیکھا ہی نہیں کہ اس میں کس کس چیز کی تعلیم ہے۔ پس اس میں سرسری نظر سے یہی دیکھ لیا کہ نماز روزہ ہے۔ جنت دوزخ کا بیان ہے۔ لوگوں نے ساری شریعت کا یہی حاصل سمجھ لیا اور یہی خلاصہ نکال لیا۔ حالانکہ قرآن میں ضروریات میں سے سب کچھ موجود ہے مگر قرآن کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔

نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند ۔۔۔ نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند

یہ کافی نہیں کہ ترجمہ دیکھ لیا اور قرآن کو سمجھ لیا۔ قرآن کا سمجھنا خاص درجہ کے علماء کا کام ہے۔ وہ درجہ حاصل کرو تو معلوم ہو کہ اس میں سب کچھ ہے مگر فہم کی ضرورت ہے ورنہ بد فہم لوگوں نے محض ترجمہ دیکھ کر تو بہت سی آیتوں کا مدلول غلط سمجھ لیا ہے۔

مثلاً ایک آیت ہے۔
فلیضحکوا قلیلاً ولیبکوا کثیراً کہ ہنسنا کم چاہیے اور رونا بہت چاہیئے۔
اس سے ہنسنے اور رونے کا حکم ثابت کیا ہے کہ رونا افضل ہے ہنسنے سے حالانکہ اس آیت کا یہ مدلول نہیں۔ یہ آیت منافقین کے بارہ میں ہے انہی کے متعلق پہلے سے بیان چلا آرہا ہے۔ فلیضحکوا میں ھم کی ضمیر منافقین کی طرف ہے اور یہ خبر ہے بصورت انشاء اور حاصل ترجمہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں تھوڑے دنوں ہنسنے رہیں۔ پھر قیامت میں زیادہ روئیں گے۔ اس آیت میں منافقین کی اخروی حالت بیان کی گئی ہے کہ یہ لوگ دنیا میں کچھ دنوں کو ہنس لیں پھر آخرت میں رونا ہی رونا ہے۔ یہ مطلب تھا آیت کا، نہ یہ کہ رونے کی فضیلت اور ہنسنے کی مذمت۔ جیسا آج کل کے مدعی سمجھے ہیں اور قلیلاً سے دنیا کی زندگی مراد ہے اور اس کے مقابل کثیراً سے آخرت کی زندگی مراد ہے مطلب یہ ہے کہ آخرت میں خوب دل کھول کر روئیں گے اور ہنسنا کبھی نصیب نہ ہوگا جزاء بما کانوا یعملون خود اس کا قرینہ ہے۔ غرض یہ آیت آخرت کے متعلق ہے فلیضحکوا ولیبکوا امر ہے لفظاً اور خبر ہے معنیً۔
مگر مصیبت تو یہ ہے کہ لوگوں نے ذرا سی آیت دیکھ لی اور نتیجہ نکالنا شروع کر دیا۔ نہ ماقبل کی خبر ہے نہ مابعد کی۔ اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ قرآن کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں۔
اسی طرح ایک اور آیت ہے ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین

سبیلا۔ بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ کافر مسلمانوں پر کبھی غالب نہ آئیں گے۔ پھر اس پر بڑا اشکال کہ قرآن شریف میں تو یہ ہے اور واقعہ اس کے خلاف ہے۔ وہ یہ کہ کفار کو بہت دفعہ دنیا میں مسلمانوں پر غلبہ ہوا ہے، جس کا انکار نہیں ہو سکتا۔ مشاہدہ کا کیا انکار۔ مگر حقیقت میں آیت کا یہ مطلب ہی نہیں جو سمجھا گیا ہے۔ یہ آیت دنیا کے متعلق ہے ہی نہیں، یہ تو آخرت کے متعلق ہے کیونکہ اوپر ذکر منافقین کا ہے۔ ان کا ذکر کر کے فرماتے ہیں۔ فاللہ یحکم بینکم یوم القیمۃ ط ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت میں فیصلہ کے وقت ڈگری مومنین کی ہوگی اور منافقین ہاریں گے خود فاللہ یحکم بینکم یوم القیمۃ ط بتلا رہا ہے کہ یہ حکم آخرت کے متعلق ہے یعنی قیامت میں جب مقدمہ پیش ہوگا تو اس میں مسلمان مغلوب نہ ہوں گے۔ اب کوئی اشکال نہیں۔

جاہ کی حدود

اب میں اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ شریعت میں جاہ کے احکام بھی ہیں اور اس میں دو درجے ہیں ایک تحصیل جاہ یعنی جاہ کا حاصل کرنا اور ایک بذل جاہ یعنی اس کا صرف کرنا۔ جیسے مال میں دو درجے تھے۔ ایک اس کا حاصل کرنا اور ایک اس کا صرف کرنا اور اس کا جامع فیصلہ یہ ہے کہ جاہ کے چند مراتب ہیں۔

ایک مرتبہ یہ ہے کہ جاہ بدون حاصل کئے حاصل ہو گئی ہے وہ تو خالص نعمت ہے خدا تعالیٰ کی۔ جیسے حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کی جاہ ہوتی ہے کہ وہ خود گرتے چلے جاتے ہیں اور پستی اختیار کرتے ہیں مگر وہ بڑھتے جاتے

میں اُتنے ہی بلند ہوتے ہیں۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے۔

من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ۔ کہ جو شخص اللہ کے واسطے تواضع اختیار کرے گا، اللہ اُس کو بلند کرے گا۔

اس کو جو جاہ ملی ہے اُس نے خود حاصل نہیں کی بلکہ اللہ کی طرف سے ملی ہے۔ اس جاہ کے خالص نعمت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

ایک یہ صورت ہے کہ جاہ اُس نے تو حاصل کی نہیں یعنی اس کے اسباب کا استعمال خود اُس نے نہیں کیا مگر دوسروں نے کیا ہے اور اُس سے اس کو جاہ حاصل ہو گئی۔ مثلاً چار آدمیوں نے مل کر اس کو بادشاہ بنا دیا۔ اب یہاں جاہ تو حاصل ہوئی اسباب سے مگر اُس نے وہ اسباب جمع نہیں کئے بلکہ اور لوگوں نے اسباب جمع کر کے اس کو بادشاہ بنا دیا ہے۔

پہلی صورت اور اس صورت میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں تو اسباب ظاہری جمع ہی نہیں کئے گئے نہ اس کی طرف سے نہ اوروں کی طرف سے بلکہ محض وہبی طور سے جاہ مل گئی۔ اور یہاں گو اُس نے اسباب کو جمع نہیں کیا مگر دوسروں نے تو جمع کیا ہے

دوسرا فرق یہ ہے کہ اس صورت میں صاحب جاہ انکار کرنے سے جاہ سے بچ سکتا ہے بخلاف پہلی صورت کے کہ وہاں بچ نہیں سکتا کیونکہ وہ غیر اختیاری ہے اور یہاں قبول کرنا نہ کرنا اختیار میں ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو اس جاہ سے متمتع ہونا جائز ہے مگر دو باتوں کا دیکھ لینا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ دوسروں کو راحت پہنچا سکے گا یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ اپنا دین تو

کسی حال میں برباد اور تباہ نہ ہوگا۔ ان دونوں باتوں پر نظر کر کے اس جاہ کا قبول کرنا اور اس سے متنفع ہونا جائز ہے۔ اور اگر یہ شرطیں نہ پائی جاویں تو قبول کرنا حرام ہے۔

تیسری قسم جاہ کی یہ ہے کہ نہ کسی نے بادشاہ بنایا ہے نہ قدرتی طور پر جاہ ملی ہے بلکہ خود کوشش کرتا ہے جاہ کے حاصل ہونے کی۔ جیسے عالمگیر نے حصول سلطنت کی کوشش کی تھی۔ اس کا حکم یہ ہے کہ بجز خاص خاص حالات کے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

حکومت اور شریعت

بلکہ اصل قانون تو یہ ہے کہ اپنے لئے خود کوئی منصب تجویز کرنا اور اس کی خواہش کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی میں سب عہدے حکومت کے داخل ہیں درحالیکہ وہ فی نفسہٖ شرعاً جائز بھی ہوں۔ سو جائز ہونے کی صورت میں بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی خواہش کی جائے۔ کیونکہ حکومت کی درخواست اور خواہش کرنا جائز نہیں ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو حکومت کی درخواست کرے ہم اس کو کبھی حکومت نہ دیں گے۔ راز اس میں یہ ہے کہ حکومت بڑی ذمہ داری کی چیز ہے اور بڑا بوجھ اٹھانا ہے۔ اگر دس پر حاکم ہے تو دس کا بوجھ اٹھانا اور پچاس پر حاکم ہے تو پچاس کا بوجھ اٹھانا اور ایک پر حاکم ہے تو ایک کا بوجھ اٹھانا ہے اور یہ بوجھ اٹھانا اور ان کی راحت کی فکر کرنا نہایت دشوار کام ہے جیسا تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرت عمرؓ ایک مقام پر پہنچے۔ آپ کو ایک خیمہ جنگل میں نظر آیا آپ اس خیمہ کے باہر کھڑے ہو گئے۔ دیکھا کہ اس میں بچوں کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ اور گو یہ تجسس تھا مگر امام وقت کو تفتیش اور تجسس جائز ہے۔ دوسرے کو جائز نہیں۔ غرض آپ کو معلوم ہوا کہ ایک خاندان باہر سے آ کر ٹھہرا ہے۔ اُن کے بچے بھوک سے چلّا رہے ہیں۔ کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ بی بی نے ایک خالی دیگچی چڑھا رکھی ہے اور بچوں سے کہہ رہی ہے کہ سو جاؤ کچھ دیر میں کھانا پکا کر تمہیں اٹھا لیں گے۔

اس حالت کو دیکھ کر آپ بے حد دلگیر ہوئے۔ پھر آپ اُن کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ وہاں کوئی نیشن تو تھا نہیں جس سے شناخت ہوتی معمولی وضع سے جو کھڑے ہوئے تو کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کون ہیں۔ آپ نے اُن سے خود فرمایا کہ عمر کے پاس جا کر اپنے حال کی اطلاع کرو۔ وہ تمہیں کھانے پینے کا سامان دیں گے۔ تو وہ عورت کہتی ہے سبحان اللہ! یہ ہمارے ذمہ ہے یا اُن کے ذمہ ہے کہ وہ خود ہماری خبر رکھیں۔ اُنہوں نے خلافت کیوں اختیار کی ہے جب اُن سے انتظام نہیں ہو سکتا۔ آپ نے کہا کہ عمر غیب دان نہیں ہے۔ ایک شخص تمام باتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اُس عورت نے کہا کہ پھر کیوں خلافت کا منصب اختیار کیا ہے چھوڑ دیا ہوتا۔ بس یہ سن کر آپ واپس ہوئے اور رات ہی کو بیت المال کا قفل کھولا ——— اور کچھ آٹا اور جنس اپنے ساتھ لیا۔ غلام نے کہا کہ یہ سامان میرے حوالے کیجئے۔ میں لے چلوں گا۔ تو آپ فرماتے ہیں۔

لا تزر وازرة وزر اخریٰ — فرمایا یہاں کا بوجھ اٹھانا سہل ہے آخرت کا بوجھ اٹھانے سے۔

آپ لے کر وہیں پہنچے اور ان سے کہا کہ اس کو کھاؤ پیو۔

میں نے ایک تاریخ میں دیکھا ہے کہ اسی طرح آپ شب کے وقت ایک بار گشت کرتے پھر رہے تھے۔ ایک خیمہ دیکھا اور اس میں سے دردناک آواز سنی۔ تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ ایک عورت کے دردزہ ہو رہا ہے آپ نے کہا کہ تم نے کسی دایہ کو نہیں بلایا۔ وہ لوگ بولے ہم پردیسی ہیں ہمارے پاس کون ہے بلانے والا۔ بس آپ فوراً اپنے گھر گئے اور اپنی بیوی کو وہاں لائے اور ان سے کہہ دیا کہ یہ ظاہر نہ کرنا کہ میں خلیفہ کی بیوی ہوں۔ اس کے جتلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ غرض یہ کہ بچہ پیدا ہوا اور ان کے منہ سے بے اختیار یہ کلمہ نکل گیا۔

ابشر یا امیر المؤمنین — بشارت ہو آپ کو یا امیر المؤمنین!

اس سے ان لوگوں کو پتہ چل گیا کہ یہ امیر المؤمنین ہیں۔ خیال تو فرمائیے کہ یہ خلیفہ کی بیگم ہیں۔

پس حاکم ہونے کا اس کو حق ہے جو دوسرے کی راحت رسانی کی اتنی ذمہ داری کر سکے۔ نہ یہ کہ نام لکھا لیا اور حاکم ہو گئے۔ حاکم پر بڑی ذمہ داری ہے اور بڑی مشقت ہے جس کو کوئی شخص خوشی سے اپنے لئے گوارا نہیں کر سکتا پھر باوجود اس کے جو شخص درخواست کر رہا ہے حکومت کی تو ظاہر ہے کہ اس کی غرض طلب مال اور طلب جاہ وغیرہ ہے۔ راحت رسانی خلق مقصود

نہیں ــــــ!

مثلاً ایک رئیس ہیں جو تحصیلدار بنے ہوئے ہیں۔ حالت اُن کی یہ ہے کہ کسی کو جیل خانے بھیج دیا، کسی پر جرمانہ کر دیا، کسی کے بید لگا دیئے۔ باوجودیکہ اپنے گھر کی آمدنی پانچ سو اور ہزار ماہوار کی ہے مگر پھر درخواست ہے تحصیلداری اور ڈپٹی کلکٹری کی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جلب جاہ یا جلب مال مقصود ہے اور کچھ بھی نہیں اور اکثر غرباء کو حکومت سے جلب مال مقصود ہوتا ہے اور امراء کو جلب جاہ۔ اور حکومت کے حقوق سنیئے۔

حضرت عمرؓ نے انتظام کیا تھا کہ میری خلافت میں بنی عدی میں سے کوئی حاکم نہ بنایا جائے (بنی عدی حضرت عمرؓ کا قبیلہ اور خاندان ہے) کیونکہ وہ میرے اثر سے دوسروں کو ستا سکتا ہے مگر ایک شخص کو لیاقت کی وجہ سے حاکم بنا دیا تھا۔ اُس نے کچھ اشعار کہے تھے جس میں اپنی بیوی کو خطاب تھا کہ "وہاں ہیں گے اور عیش و عشرت کریں گے"۔ وہ اشعار آپ کے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے اُس کی حاضری کا حکم دیا اور پوچھا کہ یہ تمہارے اشعار ہیں۔ اُس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نیت یہ ہے کہ خوب عیش اڑاؤ گے۔ اُس نے کہا کہ حضرت یہ تو زبانی شاعری تھی۔ دل سے کوئی واقعی مضمون نہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ زبان پر کسی بات کا تذکرہ اُس وقت تک نہیں آسکتا جب تک دل میں نہ ہو۔ تم قابل حکومت نہیں ہو اور معزول کر دیا۔ اسی واسطے قانون ہے شریعت کا کہ صاحب غرض کو حکومت نہ دی جائیگی کیونکہ ایسے شخص کی غرض جلب مال اور جلب جاہ ہوگی۔ واحت رسانی خلق مقصود

نہ ہوگی۔ تو جو مقصود ہے حکومت سے وہ حاصل نہ ہوگا۔

اب لوگ اپنے دلوں میں ٹٹول کر دیکھ لیں کہ عہدوں کی درخواست کرنے سے کیا غرض ہوتی ہے۔ آیا یہ مقصود ہوتا ہے کہ مال وجاہ حاصل ہو یہ کہ خلق کو آرام پہنچے۔ اگر یہ ہوتا تو اس کے آثار بھی تو ہوتے۔ جب آثار نہیں تو یقیناً مطلوب جاہ ومال ہے اور کچھ نہیں۔ اور اگر سو میں ایک ایسا ہو بھی گیا تو وہ کس شمار میں ہے۔ اگر یہ بات ہوتی (یعنی جاہ مقصود نہ ہوتی بلکہ خدمت خلق اور اُن کی حفاظت اور راحت رسانی مقصود ہوتی تو جو شخص تحصیلداری کر رہا ہے اور اُس کی وہی ڈپٹی کلکٹری کی جگہ ہوتی تو وہ اُس جگہ پر نہ جاتا کیونکہ اُس کی غرض تحصیلداری میں بھی حاصل ہو رہی ہے (وہ کیا ہے خدمت خلق) بلکہ سب انسپکٹری میں تحصیلداری سے بھی زیادہ حفاظت کر سکتے ہیں۔ اگر خدمت مدنظر ہے تو اسی کو اختیار کرتے کیونکہ مقصود اس میں زیادہ حاصل ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں کرتے۔ تو یہ علامت اس کی ہے کہ مقصود خدمت خلق نہیں بلکہ مقصود جاہ ہے اور جو تحقیق میں نے ڈپٹی کلکٹری وغیرہ کے متعلق بیان کی، کچھ اسی میں منحصر نہیں ہے۔

بادشاہت اور جمہوریت

میں دینی مناصب والوں کو مثلاً واعظین کو بھی کہتا ہوں کہ اس میں بھی وہی تفصیل ہوگی جو اسباب جاہ میں مذکور ہوئی۔ وہ یہ کہ کبھی تو خود واعظ بنے گا اور کبھی لوگ بنائیں گے اور اس کے متعلق بھی احکام کی وہی تحقیق ہے جو اُوپر آ چکی مثلاً اپنے طور پر تو خود واعظ بننا جائز نہیں اور اگر بنا دیا جائے تو جائز ہے۔ حدیث

یہی فیصلہ کیا ہے۔ حدیث میں ہے لا یقص الا امیر او مامور او مختال۔ یعنی واعظ کون بنے گا ایک امیر یعنی امام المسلمین، ایک اس کا مامور یعنی جس کو امام المسلمین نے اس کام کے لئے تجویز کیا ہو، ایک مختال یعنی متکبر۔ ریاکار جو یوں سمجھتا ہے کہ ہم بڑے ہیں یا بڑا بننا چاہتے ہیں۔ یہ حدیث دلیل ہے میرے دعوے کی۔ اب آج کل کے واعظین سوچ لیں کہ آیا آپ کو کسی نے واعظ بنایا ہے یا خود بنے ہیں۔ اگر کسی نے بنایا ہے تو ماموریں داخل ہیں اور اگر نہیں بنایا تو مختال ہیں۔ کیونکہ امیر نہ ہونا تو ظاہر ہے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ تم بھی تو اسی میں داخل ہو تمہیں کس نے واعظ بنایا ہے؟ اس لئے تم بھی مختال ہوئے اور اگر یہی ہے تو کوئی بھی ہندوستان میں وعظ نہ کہے، کیونکہ یہاں نہ تو کوئی امیر ہے نہ مامور ہے۔ بس تیسری شق رہ گئی لہٰذا سب کے سب مختال ہوئے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اول حدیث کی حقیقت سمجھنا چاہیئے۔ اس سے جواب معلوم ہو جائے گا۔ سو اس کے لئے ایک مقدمہ سمجھئے۔ وہ یہ کہ بادشاہ کے جو اختیارات ہیں اُن کی حقیقت کیا ہے۔ اُن کی حقیقت یہ ہے کہ وہ میزان کل ہے تمام رعایا کے اختیارات کی یعنی فرادیٰ فرادیٰ جو اختیارات رعایا کو تھے سب کی میزان بادشاہ کو سپرد کر دی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ بادشاہ کے اختیارات مستفاد ہوتے ہیں رعایا سے یعنی عوام الناس اختیار دیتے ہیں بادشاہ کو۔ اب چونکہ تمام عوام الناس کا اجتماع تو عادۃً محال ہے اس لئے اُن کے قائم مقام اہل حل و عقد ہوں گے۔ نئی اصطلاح میں اس کو پارلیمنٹ کہتے ہیں اور اس میں یہ

ضرور نہیں کہ عوام الناس زبان سے کہیں کہ یہ لوگ ہمارے قائم مقام ہیں۔ بلکہ عوام الناس اُن کے ساتھ برتاؤ ایسا کرتے ہیں جس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اُن کو اپنا پیشوا اور دلسوز سمجھتے ہیں۔ یہ برتاؤ شہادت اس کی ہے کہ عوام الناس نے ان خواص کو اپنی طرف سے اختیارات دے دیئے ہیں۔ وہ گویا وکیل ہیں عوام الناس کے۔ پس وہ جب کہ بادشاہ کو بناتے ہیں اور اُن کا بنانا سب کا بنانا ہے۔ پس اہل حل وعقد کی جماعت سب کی قائم مقام ہے جب یہ سمجھ میں آگیا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ خود اختیارات میں مستفید ہے عوام سے اور بادشاہ کے بنانے والے بھی عوام ہی ہیں بواسطہ اہل حل وعقد کے۔ تو بس اہل حل وعقد ہی سب کچھ ہوئے۔ جیسا وہ کریں گے وہی سب کی طرف سے سمجھا جائے گا۔ پس یہاں اگرچہ امام المسلمین کا وجود نہیں ہے، مگر اہل حل وعقد تو موجود ہیں یعنی علماء و صلحاء۔ اس لئے صلحا کا تسلیم کیا ہوا واعظ صحیح طور سے واعظ ہوگا گویا اس کو بادشاہ ہی نے واعظ بنایا ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ اگر بواسطہ ایک فعل صحیح ہے تو بلا واسطہ بدرجۂ اولیٰ صحیح ہوگا (مطلب یہ ہے کہ جو واعظ بادشاہ کے واسطہ سے بنایا گیا ہے جب وہ صحیح ہے تو اہل حل وعقد کا بلا واسطہ بادشاہ کے کسی کو واعظ بنا دینا بدرجۂ اولیٰ درست ہوا)

بس فیصلہ یہ ہوا کہ جس کو صلحاء واتقیاء وعظ کے لئے تجویز کریں وہ مامور میں داخل ہو جاوے گا اور اُس کو وعظ کہنا جائز ہوگا اور جس کو یہ جماعت تجویز نہ کرے اُس کو وعظ کہنا جائز نہیں ہوگا۔ اگر اس معیار پر نظر ہو تو جو گمراہی پھیل رہی ہے قوم میں وہ سب جاتی رہے۔ مگر آج کل تو کوئی معیار ہی نہ رہا۔ ہر شخص

واعظ سے مقتدا ہے۔

جاہل واعظ

دیوبند میں ایک نابینا صاحب تشریف لائے۔ آنکھوں کے تو اندھے تھے ہی دل کے بھی اندھے تھے۔ سورہ جمعہ میں جو ان کنتم تعلمون ہے اس کا آپ نے عجیب ترجمہ کیا۔ وہ یہ ہے کہ اے لوگو! بہتر ہے تمہارے لئے کہ تالا لگا کر جمعہ کی نماز کو چلے جایا کرو آپ نے تعلمون کو تالا مونا سمجھا۔ اس کا یہ ترجمہ کیا میں بھی اس جلسہ میں موجود تھا اور مولانا رفیع الدین صاحب بھی موجود تھے۔ مولانا نے دھمکا کر وعظ کہنے سے منع فرمایا۔

ایک اور حکایت ہے کانپور کی کہ مدرسہ جامع العلوم میں ایک واعظ صاحب تشریف لائے اور سورہ الرحمٰن کے تیسرے رکوع کا وعظ شروع کیا جنتان لو نو جنتن پڑھا اور یہ ترجمہ کیا کہ جنت میں ایک ایک تخت کا پایا ہزار ہزار کوس کا ہوگا۔ کوس بڑے شین سے فرمایا پھر اس کی تفسیر بھی فرمائی۔ کہ ایک کوس ہوتا ہے چھوٹے سین سے، وہ چھوٹا ہوتا اور ایک کوش ہوتا ہے بڑے شین سے وہ بڑا ہوتا ہے۔ اور بھی بہت واہی تباہی روایات غلط بیان کیں۔ بے چارے کو اس وعظ میں ایک آنہ نہ ملا۔

میرے چھوٹے ماموں صاحب حکایت بیان کرتے تھے کہ ایک جامع مسجد میں ایک جاہل پہنچا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں وعظ بھی ہوا کرتا ہے معلوم ہوا کہ نہیں ہوتا۔ تو بعد نماز کے خوب ہی پکارا کہ صاحبو! اس وقت واج (واعظ) ہوگا اور نماز کے بعد وعظ کے لئے منبر پر جا بیٹھے۔ تو آپ نے لیسین کو لیشین پڑھا۔ یہاں تک بھی

غنیمت تھا۔ ترجمہ کیا تو نورٌ علی نور۔ ترجمہ یہ کہ اے محمد! اے محمد! اگر تو نہ ہوتا تو آسمان و زمین کچھ نہ ہوتا۔ یہ ترجمہ لیسین کا کیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ بھائیو تھکے ماندے ہیں اس لئے آدھا وعظ آج کہا ہے آدھا کل ہوگا۔ اس جلسہ میں ایک نابینا عالم بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا ذرا ان واعظ صاحب کو میرے پاس لانا۔ جب وہ آئے تو ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر فرمایا کہ آپ کی تحصیل کہاں تک ہے تو آپ کہتے ہیں کہ ہماری تحصیل ہے ہاپوڑ۔ اتنے بڑے عالم تھے اور وعظ فرماتے تھے وہ بولے کہ مولانا میں محکمہ مال کی تحصیل کو نہیں پوچھتا بلکہ یہ پوچھتا ہوں آپ نے پڑھا کیا کیا ہے۔ تو آپ فرماتے ہیں ہم نے سب کچھ پڑھا ہے وفات نامہ سانپ نامہ، ہرنی نامہ اور اس کے بعد کہا اور تو کیا جانے اندھے۔ حالت تو ان کی یہ تھی اور بڑے خوش تھے کہ ہم واعظ ہیں۔

حضرت یہ واعظین کی آج کل کیفیت ہے۔ بعض لوگ لفاظ ہوتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھے لکھے ہیں۔ ان کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کون سی بات صحیح ہے کون سی غلط۔ بس روپے سیدھے کرنے کے لئے وعظ کہتے ہیں شریعت نے اس کا بھی فیصلہ کیا ہے کہ واعظ کون ہو سکتا ہے۔ جس کی تفصیل میں نے عرض کر دی ہے۔

کنارہ تاتراش پیر اسی طرح پیر بن جانا بھی ہے اس میں بھی شرط ہے کہ ماذون ہو یعنی کسی شیخ کامل نے اس کو اجازت دی ہو بیعت کرنے کی۔ مگر آج کل تو یہ حالت ہے پیری مریدی کی۔ زبان واہی تباہی بکتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ فقیری کے راز بیان ہو رہے ہیں۔

داراشکوہ کا قصہ سنا ہے کہ اُس نے ایک شاہ صاحب سے پوچھا کہ جناب کی عمر کتنی ہے۔ کہا کہ جب تمہارے دادا صاحب کی لڑائی محمد صاحب سے ہوئی تھی تو فقیر کی اتنی عمر تھی۔ سعداللہ خان وزیر نے کہا، ماشاءاللہ آپ مورخ بھی بہت بڑے ہیں۔ داراشکوہ بولے، ایسا نہ کہو، بزرگوں کے اسرار ہوتے ہیں یا اور کسی کا قصہ ہو۔

کاندھلہ میں ایک شاہ صاحب آئے۔ مولانا مظفر حسین صاحب، اُن سے ملنے گئے۔ شاہ صاحب کہنے لگے کہ مولوی صاحب! تنہائی میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھوں گا۔ مولوی صاحب نے دل میں کہا کہ خدا جانے تصوف کا کون سا دقیق مسئلہ پوچھیں گے۔ اب سنیئے شاہ صاحب کیا مسئلہ پوچھتے ہیں۔ اُنہوں نے پوچھا کہ محمد صاحب کی جو اتنی شہرت مشرق و مغرب میں ہوئی ہے وہ کس کے مرید تھے۔ کیا بڑے پیر صاحب سے آپ نے بیعت کر لی تھی۔ مولوی صاحب نے کہا، کم بخت! فقیر بنا پھرتا ہے۔ لوگوں کو بہکاتا پھرتا ہے۔ ملعون تو کیسا مسلمان ہے؟ تجھ کو اتنی خبر بھی نہیں کہ بڑے پیر صاحب تو حضورؐ کی اولاد ہیں اور آپؐ کے اُمتی ہیں۔ غرض قصبہ سے نکلوا دیا۔

ایک صاحب قنوج میں تشریف لائے۔ لوگوں کو مرید کرنا شروع کر دیا اور سب کو یہ تعلیم کی کہ نماز میں قرأت زبان سے مت پڑھو۔ دل دل میں خیال کر لیا اور ساتھ ہی یہ بھی تاکید تھی کہ کسی سے کہنا نہیں۔ غرض لوگوں کی نمازیں خوب تباہ کیں۔ آخر کسی طرح وہاں کے رؤسا کو خبر ہو گئی تب اُس کو نکلوایا۔

غرض پیری مریدی کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ اس کا کوئی صحیح معیار ہی نہیں

رہا۔ صرف معیار یہ رہ گیا ہے کہ جس طرف مخلوق جا رہی ہے اُسی طرف ہو لئے۔
اشعب طماع کا قصہ ہے کہ لڑکے اُن کو بہت چھیڑا کرتے تھے۔ جب زیادہ پریشان ہو جاتے کہہ دیتے کہ یہاں کیا رکھا ہے فلاں امیر کے گھر مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے یا کھانا بٹ رہا ہے وہاں جاؤ۔ لڑکے یہ سُن کر امیر کے گھر کی طرف دوڑتے تو کچھ دیر میں آپ بھی اُسی طرف کو دوڑتے۔ کوئی کہتا کہ میاں تم کیوں چلے۔ تو کہتے کہ شاید مٹھائی تقسیم ہی ہو رہی ہو کیونکہ لڑکے بھاگے جا رہے ہیں۔ حالانکہ آپ ہی نے اُن کو بھگایا تھا۔
یہی حال یہاں ہے کہ عوام الناس کہہ دیتے ہیں کہ جب اتنے آدمی اُس کے پاس جاتے ہیں تو پیر میں کچھ تو ہوگا اور پیر صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ جب اتنے آدمی میرے معتقد ہیں تو میں بھی کچھ ہوں گا۔ حالانکہ خود ہی اُن کو دھوکا دیا ہے۔ مگر خود بھی اپنے دھوکا میں آ گئے۔ آج کل بزرگی کا معیار اکثر تو یہ رہ گیا ہے کہ بڑے بڑے لوگ جس کے مرید ہوں تو بس وہ پیر ہے یا جس کو کشف ہوتا ہو وہ پیر ہے۔ اگر کشف ہی پر دارومدار ہے تو شیطان کو ایسا کشف ہوتا ہے کہ بڑوں بڑوں کو بھی نہیں ہوتا۔
دیکھئے بدر میں بڑے بڑے صحابہؓ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے شیطان بھی کفار کے لشکر میں تھا اور اُن سے آ کر کہا کہ میں تمہارا حامی ہوں۔ لوگ کوئی سردار سمجھے۔

فلما تراءت الفئتان نکص علی عقبیه وقال انی بریٔ منکم انی اری مالا ترون۔

کہ جب دونوں جماعتیں مقابل ہوئیں اور فرشتوں کا نزول ہوا تو شیطان صاحب گھبرا گئے اور کہا کہ مجھے ایسی ایسی چیزیں نظر آتی ہیں کہ تمہیں نظر نہیں آتیں۔ یہ حالت دیکھ کر شیطان تو بھاگ گیا اور بہت سے کفار کے بھی قدم اکھڑ گئے۔ اب دیکھ لیجئے کہ بہت سے صحابہ تو فرشتوں کو نہ دیکھ سکے اور شیطان نے دیکھ لیا۔

قبر میں جب عذاب ہوتا ہے تو جانوروں کو معلوم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتوں اور بلیوں کو کشف قبور ہوتا ہے۔ مگر آج کل پیری کی یہ خاص علامت ہے۔ بھلا جو چیز حیوانات تک میں مشترک ہو وہ کیسے انسانی کمال ہو سکتی ہے افسوس یہ لوگ اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے۔

بعضوں نے بزرگی کا معیار یہ مقرر کیا ہے کہ تصرف کر کے لوگوں کو لوٹ پلوٹ کر دے بس وہ بزرگ ہے۔ اگر یہی معیار ہے تو ایسا تو جوگی بھی کر دیتے ہیں جو کافر محض ہیں مسمریزم والے کیا کیا نہیں کرتے۔ عجیب عجیب کام کر کے دکھلا دیتے ہیں۔ تو چاہیے یہ سب بھی بزرگ ہو جائیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس سے خرق عادت صادر ہو وہ بزرگ ہے اگر یہی حال ہے تو خرق عادت دجال سے زیادہ کسی سے بھی صادر نہ ہو گی۔ زمین کے خزانے تک نکل کر اس کے ساتھ ساتھ چلیں گے۔ ایک صالح شخص اس کی خدائی کا انکار کرے گا۔ پس وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔ پھر اس کو زندہ کرے گا۔ وہ پھر انکار کرے گا۔ مگر وہ پھر اس پر قادر نہ ہو گا۔ اگر تصرفات اور خوارق دلیل بزرگی کی ہیں تو دجال بڑا بزرگ ہونا چاہیے۔ پس یہ سب معیار تو غلط ہیں۔

شیخ کامل کا معیار

شیخ کامل کے معیار کی چند صفات ہیں۔ اُن صفات کو سب سے پہلے دیکھنا چاہیے۔

ایک یہ کہ بقدر ضرورت اُس کو علم دین حاصل ہو۔ جاہل محض نہ ہو۔

دوسرے اُس کو علماء سے موانست ہو نفرت نہ ہو۔ اگر پیر جاہل ہے اور اس کو علماء سے نفرت ہے تو جب اُسے مسائل کی ضرورت ہوگی، تو اپنی رائے پر عمل کرے گا اور گمراہ ہوگا۔

تیسری بات یہ ہے کہ وہ عامل ہو شریعت پر متبع سنت ہو، شریعت کے خلاف عمداً نہ کرتا ہو کیونکہ جو شخص گو صحیح تعلیم پر قادر ہو خود عمل نہ کرتا ہو تو اُس کی تعلیم میں برکت نہ ہوگی۔

چوتھے یہ کہ کسی شیخ مسلّم عند العلماء سے مجاز بھی ہو۔

پانچویں یہ کہ اُس کی صحبت میں یہ اثر ہو کہ روز بروز دنیا سے دل افسردہ ہوتا جاتا ہو اور آخرت کی رغبت بڑھتی جاتی ہو۔

مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

کارِ مرداں روشنی و گرمی ست　　　کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی ست

اور مکار پیروں کے بارہ میں فرماتے ہیں ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　　پس بہر دستے نباید داد دست

تو یہ منصب بھی بہت بڑا ہے اس میں بھی وہی تفصیل ہے کہ کسی شیخ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہو۔ اب تو پیری بھی ایک رسم ہوگئی ہے۔ وہ یہ کہ کسی خاندان میں کوئی اُن کے بڑے پیر ہو گئے۔ بس اُن کی نسل میں پیری چل پڑی۔ جب اُن

کسی کو صاحب سجادہ بناتے ہیں تو سب لوگ جمع ہو کر اُن کے سر پر پگڑی
باندھتے ہیں۔ گویا یہ مرید لوگ پیر کو پیر بناتے ہیں (کیونکہ پیر کی نسل تو خود پیر ہوتی
ہے۔ پھر اُن کے سر پر پیری کی پگڑی باندھی تو اور زیادہ پیر ہو گئے) پھر اُن میں
اہل ہوتے ہیں وہ تو کسی شیخ کامل کی طرف بغرض اصلاح رجوع کر لیتے ہیں ورنہ
نانداز تو ہیں ہی۔

چنانچہ گنگوہ میں ایک پیرزادہ تھے۔ اُنہوں نے اپنی بی بی کو مجھ سے بیعت
دلایا کسی نے اُن سے کہا کہ تم تو خود پیر ہو خود کیوں نہ بیعت کر لیا۔ اُنہوں نے
پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ ہم تو اس کے پیر ہیں (یعنی کھانے کمانے کے پیر ہیں)
ہم کہاں سے پیر ہوتے تھے۔ تو بعضے ایسے منصف مزاج بھی ہیں مگر شاذ۔

غرض حضرت یہ بہت ہی بڑا منصب تھا مگر اس منصب کی اب یہ
درگت ہو رہی ہے کہ عوام الناس اُس کی دستار بندی کرتے ہیں۔ جب دستار بندی
ہو گئی اور بڑے ہو گئے مگر ہیں جاہل، تو اب اُن کو تعلیم حاصل کرنے اور کسی کامل
کی طرف رجوع کرنے سے عار آتی ہے کیونکہ بڑا ہو کر چھوٹا نہیں ہوا جاتا۔ ایسے
پیر قابل اس کے ہیں کہ اُن کو خیر خواہی سے یہ خطاب کیا جاوے ؎

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی
تا راہ بیں نہ باشی کے راہبر شوی

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق
ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

باقی بدون شرائط کے محض اپنی رائے سے پیر بن جانا خود رائی ہے اور

سلوک میں خود رائی وہ چیز ہے جس کی بابت کہتے ہیں ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست

کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

دیکھئے عارف شیرازی ایسے لوگوں کو کافر کہتے ہیں یعنی کافر طریقت۔
ایسے مشائخ جو حقیقت میں خود رائے ہیں وہ خود رو پیر ہیں حقیقی پیر نہیں۔ ایسے پیر
کی علمی تحقیقات دیکھئے تو قابل دید ہیں۔

ایک ایسے ہی پیر والضحیٰ کی تفسیر بیان کر رہے تھے والضحیٰ واللیل اذا
اے نفس تیری یہی سجا دسزا) ایک مسئلہ وحدۃ الوجود کا ان کو مشق کے لئے مل گیا۔
اس کا وہ ناس مارا ہے کہ خدا کی پناہ۔ وحدۃ الوجود جو حق کے موافق ہے اس
تو کلام نہیں۔ باقی یہ لوگ جو اس کے متعلق تحقیقات بیان کرتے ہیں باطل ہو
کے ساتھ مضحکہ آمیز بھی ہیں۔

ایک ایسے ہی پیر کہتے ہیں کہ وحدۃ الوجود قل یا سے ثابت ہے کسی
نے کہا کہ قل یا سے کیسے ثابت ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ دیکھو قل یا
ایہا الکافرون لا اعبد ما تعبدون۔ اس میں لا زائد ہے یعنی اعبد ما تعبد
ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے کافرو! میں بھی اسی چیز کی عبادت کرتا ہوں تو دو
کے معبود یعنی بت اور خدا تعالیٰ نعوذ باللہ ایک ہو گئے۔ اب ان سے کوئی پو
کہ دلیل کیا ہے لا کے زائد ہونے کی۔ سو وہ دلیل یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک
دفعہ نماز میں قل یا پڑھی تھی تو لا چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے اس ترک سے قط
اس بات کو ظاہر کر دیا کہ لا زائد ہے۔ پھر اس پر یہ شبہ ہوتا تھا کہ وہ تو حالت

ن تنگ ہوگیا تھا۔ اُس کا جواب یہ عطا ہوا تھا کہ پہلے تمام شراب پی لی تھی تاکہ
خشک مولویوں کے فتویٰ سے بچ جاؤں اور سکہ وغیرہ کچھ نہ تھا۔ خدا کی پناہ پھر
ان خرافات کو فقیری کے نکات سمجھتے ہیں۔

نکات پر یاد آیا۔ ہمارے یہاں ایک رئیس تھے قاضی امیر احمد وہ کہتے
تھے کہ میں ایک دفعہ پیران کلیر میں موجود تھا ان کو دو درویشوں نے پکارا، اومرغے
دھر آ۔ اُن کو خیال بھی نہ ہوا کہ مجھ کو کوئی پکارتا ہوگا۔ پھر پکارا، او مرغے ادھر آ
اس پر انہوں نے پیچھے پھر کر دیکھا کہ آخر یہ کس کو کہہ رہے ہیں تو وہ کہنے لگے کہ
ابے ہم تجھ ہی کو تو بلا رہے ہیں۔ اُن کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر کے تماشا دیکھنے
چلے گئے کہ دیکھوں کیا بات ہے جب اُن کے پاس پہنچے تو کہا بیٹھ جا، دیکھ
مرشد کا نکتہ سن۔ کہنے لگے کہ جب خدا نے بندوں سے احکام کا اقرار لیا تھا
تو درویش تھے اگلی صف میں اور مولوی تھے پیچھے کی صف میں۔ خدا نے (نعوذباللہ)
بھنگ بوزہ کا حکم فرمایا تھا۔ چونکہ مولوی دور تھے بھنگ بوزہ کا نماز روزہ سن
لیا اور درویشوں نے بھنگ بوزہ ہی سُنا۔ اس لئے ہم اس میں مشغول ہو گئے اور وہ
اس میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد کہا کہ جا مرشدوں کا یہ نکتہ یاد رکھنا، بھولنا مت۔

ایک اور قصہ ہے۔ ایک درویش نے مولوی فیض الحسن صاحب سے کہا کہ
مولوی بتلا چار میم کون سے ہیں۔ وہ اس مہمل بات کو سُن کر خاموش ہو گئے۔ بقول
شخصیکہ ع

جواب جاہلاں باشد خموشی

درویش نے کہا کہ نہیں بتلاتا تو چوغہ مولویت کا اتار کر رکھ اور اس کو فقیر
سے سُن کر چار میم کون سے ہیں۔ مولا محمدؐ، مکہ، مدینہ۔ یہ ہیں چار میم اور اس نکتہ کو

یاد رکھو۔ بھولیو مت!

ہمارے ماموں صاحب کہتے تھے کہ ایک فقیر نے اُن سے کہا، بتلاؤ
کا مرتبہ بڑا ہے یا رزق کا۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ
سے بڑھا ہوا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ بے پیرا معلوم ہوتا ہے اور سوٹا سر
گھما کر (جیسے ان لوگوں کی عادت ہے) کہنے لگا دیکھو، اذان میں ہے اشہد ان
محمدا رسول اللہ۔ اس میں اَن پہلے ہے اور محمد بعد میں۔ اَن رزق کو کہتے ہیں
لئے رزق کا مرتبہ بڑا ہے۔

یہ تصوف کے محققین ہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے ناس کر رکھا ہے لوگوں
بس یہ عوام الناس کا دیا ہوا منصب ہے کہ چند جاہل باہم جمع ہو گئے اور کسی
پیر بنا لیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے تو ایسے ہی جاہل پیر پیدا ہوں گے۔ حقیقی پیر اس
طرح تھوڑا ہی بنتا ہے۔ میں اسی کو کہہ رہا تھا کہ واعظ اور پیر خود بننا جائز نہیں
بلکہ کسی محقق کے امر و اذن کے بعد اس منصب کو قبول کرنا جائز ہے

طلب منصب کی صورت

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ حکومت کی خو
درخواست کرنا جائز نہیں۔ بلکہ اسلام
قانون تو یہ ہے کہ طالب التولیۃ لا یولی۔ جو خود حکومت کی درخواست کرے اس
کو حاکم نہ بنایا جائے۔

اس پر اگر کوئی کہے کہ جب اصل قانون یہ ہے کہ خود حکومت کی درخواست
کرنا درست نہیں اور ہر شخص اس پر عمل کر کے کوئی بھی درخواست نہ کرے اور
جو درخواست کرے وہ حاکم نہ بنایا جاوے اور دوسروں کو اس کی اہلیت

صلاحیت کی اطلاع نہ ہو تو پھر دنیا کا انتظام کس طرح ہو۔
اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں ایک استثناء ہے۔ وہ یہ کہ اگر کوئی کام ضروری ہو اور کوئی اہل موجود نہ ہو اور ظاہراً یہ شخص اس کا اہل ہے اور اس کو امید ہے کہ میں کام کر سکتا ہوں۔ ایسے شخص کو درخواست کرنا درست ہے۔ دلیل اس کی حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ہے کہ جب بادشاہ نے ان سے کہا تھا کہ اتنا بڑا کام یعنی قحط عام کا انتظام کون سر دھرے تو انہوں نے فرمایا کہ میں کر سکتا ہوں۔ چنانچہ ان کا مقولہ یہ ہے کہ

اجعلنی علی خزائن الارض یعنی مجھ کو ملک کے غلہ کے
انی حفیظ علیم خزانوں پر مقرر کر دیجئے میں اس
کی خوب نگرانی کروں گا۔ میں اس کے طریقوں کو جانتا ہوں۔

تو گو اس موقع پر یوسف علیہ السلام اپنی تعریف خود کر رہے ہیں کہ میں ایسا ہوں اور ایسا ہوں۔ لاؤ حکومت مجھ کو دے دو مگر آپ کو یہ یقینی طور سے معلوم تھا کہ یہ کام ضروری اور عظیم الشان ہے اور انتظام کا اہل کوئی ہے نہیں اس لئے آپ نے اس موقع پر تواضع سے کام نہیں لیا ورنہ ساری مخلوق تباہ ہو جاتی۔ بلکہ آپ نے اظہار نعمت کے طور پر اپنے واقعی اوصاف بیان فرما دیئے تاکہ بادشاہ کو پورا اطمینان ہو جاوے کہ ہاں یہ کام آپ خوب کر سکتے ہیں۔ آپ کو بھروسا تھا کہ میں اس کام کو بخوبی کر سکتا ہوں۔ اس لئے آپ نے خود درخواست کی۔ پس اگر کسی زمانہ میں کسی شخص کو اپنی نسبت یہ معلوم ہو کہ میں اپنے بھائیوں کو راحت پہنچا سکتا ہوں۔ اور مخلوق اگر کسی دوسرے کے قبضہ میں پہنچے گی تو راحت نہیں

مل سکتی اور اس کو بھروسہ ہو کہ میں آرام پہنچا سکتا ہوں اور شریعت کے موافق حکومت و انتظام کر سکتا ہوں۔ اور اُس کو مال وجاہ کی بالکل پروا نہ ہو۔ تو ایسے شخص کو اب بھی حکومت کی درخواست کرنا جائز بلکہ مستحسن ہے، اور ہمارے نزدیک عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کا اپنی سلطنت کیلئے سعی کرنا بھی اسی وجہ سے تھا یا یہ صورت ہو کہ کوئی حاکم نہ ہو تو غیر قوم سے ہو جائے گا اور اس صورت میں مسلمانوں کی بُری گت بنائی جائے گی۔ تو درخواست کرنا حکومت کی اس صورت میں بھی جائز ہے۔ مگر اس میں بھی دو شرطیں ہیں۔

ایک یہ کہ مال مقصود نہ ہو۔

دوسرے جاہ مقصود نہ ہو۔

یہ اور بات ہے کہ مال وجاہ از خود حاصل ہو جاوے مگر مقصود نہیں لیکن اب تو یہ کیفیت ہے کہ مال وجاہ ہی مقصود ہو گئے ہیں۔ حق و ناحق سے بھی کچھ بحث نہیں رہی، نہ اہلیت و عدم اہلیت سے۔

چنانچہ ایک حکایت ہے کہ ایک جاہل بد لیاقت آنریری مجسٹریٹ ہو گئے تھے بوجہ عدم لیاقت کے حیران تھے کہ فیصلے کیسے کروں گا۔ فیصلہ کا طریقہ دیکھنے کسی حاکم کے اجلاس میں پہنچے اور اتفاقاً اُس حاکم کے پاس دو شخصوں نے اپنی اپنی عرضیاں پیش کیں۔ حاکم نے ایک کو کہہ دیا منظور اور دوسری کو کہا نا منظور۔ آپ نے اپنے دل میں کہا کہ یہ تو بڑا آسان کام ہے۔ جب یہ اپنے اجلاس میں بیٹھے، بہت سی عرضیاں پیش ہوئیں۔ آپ نے کیا کیا کہ ایک کو منظور اور ایک کو نا منظور کرنا شروع کر دیا۔ خلاف سلسلہ میں تو منظور اور حقیقت میں نا منظور۔ بعض لوگ

یا اسی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ جیسے بعضے مدرس کیا کرتے ہیں۔ کسی طالب علم کا خط اچھا دیکھ لیا۔ بس اور باتوں میں بھی اُس کو پاس کر دیا۔ اس میں بڑی خیانت ہوتی ہے حضرت ساری خرابی اس کی ہے کہ کام نا اہلوں کو سونپ دیا گیا ہے۔ اگر کوئی کام کسی کے سپرد کیا جاوے تو اُس کی لیاقت اُس کو ہونا چاہیے۔

حضورؐ کی بدنی قوت

حکومت میں بڑی مشقت اور دلسوزی کرنی پڑتی ہے۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔ حاکم اگر قصد کرے مخلوق کی نفع رسانی کا تو خدا تعالیٰ کی طرف سے اُس کے تمام کاموں میں مدد ہوتی ہے مگر دلسوزی کی ضرورت ہے۔ میں تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں مشائخ کو بھی، اطبا کو بھی، عہدہ داروں کو بھی کہ دوسروں کو وہی شخص راحت پہنچا سکتا ہے جو اپنے اوپر تکلیف اٹھائے اور جو شخص خود آرام طلب ہوگا، وہ شخص دوسروں کو آرام نہیں پہنچا سکتا۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون محبوب ہوگا۔ آپ کے ساتھ صحابہؓ کی یہ جاں نثاری تھی کہ جہاں آپ کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے کو تیار تھے۔ آپؐ کی ذرا سی تکلیف بھی اُن کو گوارا نہ تھی مگر با ایں ہمہ آپ کو دوسروں کی راحت رسانی کی کتنی فکر رہتی تھی۔ اس کو احادیث سے معلوم کرو۔

ایک دفعہ سفر میں اونٹ کم تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ سب باری باری اُترتے چڑھتے چلو اور سب سے پہلے اس قانون پر حضورؐ نے عمل کیا۔ ہر چند صحابہؓ نے عرض کیا کہ آپؐ نہ اتریں مگر حضورؐ نے نہ مانا اور فرمایا کہ تم مجھ سے زیادہ قوی نہیں ہو اور میں تم سے زیادہ ثواب سے مستغنی نہیں۔ ثواب کی

حاجت مجھ کو بھی ہے۔ (کہ پیادہ چلوں اور ثواب ملے) اور میں کچھ کمزور
کہ چل نہ سکوں۔

آپ کے قویٰ ظاہری بھی سب سے اچھے تھے۔ آپ میں تو
ہی کمال کی صفتیں تھیں۔ آپ کی تو شان یہ تھی ؎

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حضورؐ کی جسمانی قوت کا یہ حال تھا کہ عرب میں ایک پہلوان تھا رکانہ
جو کہ ایک ہزار آدمیوں کا مقابل سمجھا جاتا تھا۔ ایک دفعہ آپؐ نے اس کو اسلام
کی دعوت دی۔ اس نے کہا میں ایک شرط سے مسلمان ہوتا ہوں کہ آپؐ مجھ
کشتی میں پچھاڑ دیں۔ بھلا کہاں حضورؐ اور کہاں کشتی! آپؐ نے کشتی کی کہاں تعلیم
تھی۔ مگر آپؐ نے فرمایا، اچھا۔ چنانچہ کشتی ہوئی اور آپؐ اس پر غالب آئے
اس نے کہا، ایک دفعہ نہیں بلکہ دوبارہ پھر کشتی ہو۔ اگر یہ پچھاڑنا اتفاقاً ہوتا،
حضورؐ دوبارہ ہرگز منظور نہ فرماتے۔ مگر دوبارہ پھر کشتی ہوئی اور حضورؐ اس دفعہ
بھی اس پر غالب آئے۔ وہ مسلمان ہو گئے اور سمجھ گئے کہ واقعی آپؐ من
من اللہ ہیں۔

غرض حضور صلے اللہ علیہ وسلم میں بدنی قوت بھی بہت تھی۔ اس لئے
آپؐ نے فرمایا میں کمزور نہیں پیادہ چلوں گا۔ غرض آپؐ دوسروں کی راحت
کے لئے خود تکلیف برداشت فرماتے تھے۔ آپؐ کی وراثت میں یہی رنگ
حضرات صحابہ کا تھا۔

دیکھئے جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ شریف پہنچے

تو آپ جس وقت مجلس میں تشریف فرما تھے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی خدمت میں حاضر تھے۔ لوگ زیارت کو آتے تھے۔ چونکہ حضرت ابو بکرؓ ذرا زیادہ بوڑھے معلوم ہوتے تھے، لوگوں کو حضرت صدیقؓ کی صورت دیکھ کر یہ گمان ہوا کہ حضورؐ یہ ہوں گے۔ اس لئے اُن سے مصافحہ کرتے رہے اور حضرت صدیقؓ نے بھی یہ نہیں کہا کہ مجھ سے نہیں بلکہ حضورؐ سے مصافحہ کرو۔ کیونکہ اس سے حضورؐ کی راحت میں خلل پڑتا۔ جب ذرا آفتاب بلند ہوا اور دھوپ آئی تو صدیق اکبرؓ چادر تان کر آپ پر سایہ کرنے کی غرض سے کھڑے ہو گئے۔ اُس وقت لوگوں کو پتہ چلا کہ حضورؐ آپ ہیں۔ دیکھئے ابو بکرؓ نے آپؐ کو مصافحہ کی بھی تکلیف نہیں ہونے دی مصافحہ کی تکلیف کو خود گوارا کر لیا۔ یہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا نہایت ادب تھا کہ آپ وقایہ ہو گئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے کہ آپؐ کو تکلیف نہ پہنچے۔

غرض حضور صلے اللہ علیہ وسلم بھی خود پیدل چلے اور فرمایا کہ میں قوت میں کم نہیں۔ پھر کیوں نہ پیادہ چلوں کہ ثواب ملے۔ غور کیجئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اپنے کو اتنا محتاج بنانا چاہتے ہیں خدا تعالیٰ کا کہ ذرا ذرا سے ثواب کے طالب ہیں مگر بعض لوگوں کی آج کل یہ حالت ہے کہ آپؐ کو خدائی کے رتبہ تک پہنچانا چاہتے ہیں کہ آپؐ کے لئے وہ اوصاف ثابت کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے خاص اوصاف ہیں (مثلاً علم غیب محیط کو آپؐ کے لئے ثابت کرتے ہیں)

حضورؐ کا اصلی مذاق

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا مذاق نہیں دیکھتے کہ میں خدا تعالیٰ کا محتاج رہوں اور مجھے ثواب ملے کیسے

حضرت عاشق کی شان یہی ہوتی ہے کہ اُس کو کسی حالت پر بس نہیں ہوتی۔ اُن کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے ؎

لب از تشنگی خشک بر طرف جوئے
دلآرام در بر دلآرام جوئے
نگویم کہ بر آب قادر نیند
کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ حضورؐ ثواب کے طالب ہوئے خدا کے طالب نہ ہوئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جس چیز کو مطلوب قرار دے دیں گے، عاشق کو اُس کی بھی طلب ہوگی اور وہ خدا ہی کی طلب ہے اور اس لئے اُن کو ان چیزوں کی رغبت کرنا بھی لازم ہے چنانچہ ارشاد ہے وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون۔ عشاق کا یہی مذہب ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں
خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

پس جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم ثواب حاصل کرنے کے لئے بیدل ہیں تو اب کون شخص ہے جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہو۔ مگر آج کل لوگ اپنے کو بڑا بنانا چاہتے ہیں اور یہی دلیل ہے کہ بڑے بننے کے لائق نہیں اور اس پر متفرع ہوتا ہے کہ منصب حکومت ہر شخص کے مناسب نہیں بلکہ اُس شخص کے لئے جائز ہے کہ اپنے کو تکلیف اور دوسروں کو راحت دینا چاہتا ہو۔

جاہ طلبی

بہر حال جاہ کی دو قسمیں ہوئیں۔ ایک یہ کہ وہ دوسرے کی جانب سے حاصل ہو خواہ من جانب المخلوق ہو یا من جانب الخالق۔ اور دوسری قسم یہ ہے کہ اپنی جانب سے ہو۔ پس جو اپنی جانب سے ہو اس

اس کے ذرائع خود بہم پہنچائے جائیں وہ بجز خاص حالات کے ناجائز ہے
آج یہ کیفیت ہے کہ عوام الناس سے ممبری وغیرہ کی درخواست کی جاتی
ہے کہ ہمارے واسطے پرچہ دینا۔ پرچوں کے واسطے تیری میری خوشامد کرتے
پھرتے ہیں۔ بعض لوگ اس کے لئے مال بھی خرچ کرتے ہیں۔ رشوتیں دیتے ہیں
آپ سمجھ لو کہ اس میں برکت نہیں ہوتی اور خدا کی مدد بھی نہیں ہوتی۔ البتہ اگر
ان کو بلا طلب کوئی عہدہ مل جائے تو اس کو خدا کی مدد ہوتی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کو قضا کا عہدہ ملتا تھا مگر آپ نے قبول نہیں کیا۔ حتیٰ کہ جیل
تک میں بھیجے گئے۔ دیکھئے آپ کو اس قدر نفرت تھی قضا سے اور عجیب لطیفہ یہ
ہے کہ خلیفہ جعفر بن منصور نے اس جبر حاکمانہ کے ساتھ آپ سے عالمانہ مباحثہ
بھی کیا۔ اس طرح سے کہ جب آپ سے منصب قضا قبول کرنے کے لئے
کہا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں اس لائق نہیں ہوں۔ بادشاہ نے کہا کہ آپ جھوٹ
کہتے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اگر میں جھوٹ کہتا ہوں تو جھوٹ بولنے والا
بھی حکومت کے لائق نہیں ہوتا۔ تمام دربار میں اس جواب سے سناٹا ہو گیا
اور کسی سے جواب نہ بن پڑا۔

صاحبو! ہمارے سلف تو اتنا ڈرتے تھے قضا اور حکومت سے، مگر
آج ان کی درخواست کی جاتی ہے اور اس کے لئے ذرائع پیدا کئے جاتے ہیں
کہیں سفارش کرائی جاتی ہے کہیں دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ سو ان ذرائع کا استعمال
جائز نہیں۔ ہاں اگر منجانب اللہ مل جاوے تو خیر مگر بے عزتی کیوں اختیار کی جائے
وجہ یہ کہ لوگوں کی خوشامد کی جاوے اور مال خرچ کیا جاوے۔ سو بکھیڑے کئے

جا دیں ؟ اس وقت تو یہ حالت ہو رہی ہے کہ ایک شخص کا نمبر بھی مقدم
اور وہ غریب حاجت مند بھی ہے مگر پھر بھی دوسرا شخص اُس کے مقابلہ
کے لئے درخواست کرتا ہے ۔ حالانکہ یہ قابلیت میں بھی اس کے برابر
اور نہ غریب محتاج ہے مگر پھر یوں کہتے ہیں کہ عہدہ ہم کو ہی ملنا چاہیئے
ہم زمیندار ہیں اور اس کے پاس کچھ بھی نہیں حالانکہ یہی وجہ دوسرے کے ا
اور اس کے عدم استحقاق کی تھی ۔

جو لوگ آج کل ہمدردی کا دعویٰ کرتے ہیں ۔ کیا وہ اس کی کوئی نظیر پیش
سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنی درخواست کو اپنے بھائی کے مقابلہ میں منسوخ
دیا ہو اور ایثار اور ہمدردی سے کام لیا ہو ۔ غالباً وہ ایسی ایک نظیر بھی پیش
سکتے ۔ وجہ اس کی صرف یہی ہے کہ ان کو صرف مال و جاہ مقصود ہے او
نہیں ۔ زبان پر ہمدردی کے الفاظ ہی الفاظ ہیں حقیقت کچھ نہیں ۔ آج کل ہم
کیا ہمدردی ہے ۔ جس میں خلوص کا پتہ ہی نہیں ۔

حضرت علی خواص رح فرماتے ہیں کہ اگر کسی جگہ کوئی عالم ہو اور دین کا کام
رہا ہو اور سمجھتا ہو کہ میں یہ کام ثواب کے لئے کر رہا ہوں ۔ یا کوئی پیر ہو ا
تربیت باطنی کر رہا ہو اور دل میں یہ سمجھتا ہو کہ میں دین کے لئے یہ کام کر
ان دونوں کو ایک علامت سے اپنے خلوص کا امتحان کرنا چاہیئے
علامت یہ ہے کہ اگر اس کے مقابلہ میں دوسرا شخص آ جاوے اور وہ بھی
جیسا یا اس سے اچھا کام کر سکتا ہو تو دیکھنا چاہیئے کہ یہ شخص کام کو اس
سپرد کرتا ہے یا نہیں ۔ اگر اس کے سپرد کر دے اور خود اس کام سے الگ

...رے اور کسی دوسرے کام میں لگ جاوے تو وہ مخلص ہے اور اگر اسی فکر
ہو کہ یہ کہاں سے آمرا، نکلواؤ اس کو۔ تو مخلص نہیں ریاکار ہے۔

اسی طرح جاہ ومال کے مقصود نہ ہونے بلکہ خدمت خلق مقصود ہونے
...لامت یہ ہے کہ اگر یہ دیکھو کہ ہمارا بھائی ہم سے اچھا کام کرے گا، تو تم
...ش چھوڑ دو تاکہ وہ دوسرا شخص اس منصب پر فائز ہوجائے۔ دوسرے کو بنانا
...ہیے کہ خود اس کام سے الگ ہوجاؤ۔ اور جو شخص ایسا ہوگا وہ اپنی میعاد ملازمت
...ھانے کے لئے یا عہدہ حاصل کرنے کے لئے ڈاکٹری سرٹیفیکیٹ کیوں حاصل
...ے گا مگر آج کل تو اس حکومت اور منصب کے لئے روپیہ خرچ کرکر کے ڈاکٹری
...فیکیٹ حاصل کئے جاتے ہیں۔ یہ صاف علامت ہے اس کی کہ خدمت
مقصود نہیں بلکہ جاہ ومال مقصود ہے۔ یہاں تک تو جاہ کے حاصل کرنے کی
...یل تھی۔

...ہ کا مصرف

اب باقی رہا جاہ کے صرف اور استعمال کرنے کا قاعدہ
کہ جاہ کہاں صرف کی جاتی ہے۔ اُس کی تفصیل یہ ہے۔
...رف جاہ کے مواقع مختلف ہیں اور ہر ایک کا جُدا حکم ہے اور اس کے متعلق
...ی قاعدہ یہ ہے کہ جہاں استعمال جاہ سے دوسرے شخص کی منفعت مقصود
...یعنی کسی دوسرے پر جاہ کا اثر ڈالا جا رہا ہو اور اُس منفعت کی تحصیل اس شخص
...اجب ہے تو اس صورت میں جاہ سے کام لینا جائز بلکہ واجب ہے
...ایک شخص نماز نہیں پڑھتا اور ہم اپنی جاہ کے اثر سے اُس کو نماز پڑھنے پر مجبور
...کرتے ہیں۔ تو اس موقع پر صرف جاہ واجب ہے۔ حاکم اپنے ملازموں سے

بادشاہ اپنی رعایا سے نماز پڑھوا سکتا ہے۔ اُستاد شاگردوں سے، شوہر بیوی سے، باپ اولاد سے حکومت کے ساتھ یہ کام لے سکتا ہے۔ تو ان لوگوں پر واجب ہوگا کہ اپنی جاہ سے کام لیں اور ماتحتوں سے نماز پڑھوائیں۔

ایک صورت اس کے مقابل یہ ہے کہ استعمال جاہ سے دوسرے کی مصلحت مقصود نہیں بلکہ اپنی ہی منفعت مقصود ہے۔ اس صورت میں جاہ سے کام لینا جائز نہیں۔ جیسے رئیسوں کی عادت ہوتی ہے کہ ریل پر جانے کو تانگہ والے سے اُجرت طے نہیں کرتے ویسے ہی تانگہ میں سوار ہو لیتے ہیں۔ اسٹیشن پر پہنچ کر ایک آنہ دو آنہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔ وہ غریب اُن کی جاہ کی وجہ سے کچھ نہیں کہتا۔ یہ صورت حرام ہے بلکہ یا تو ابتداء میں اُجرت طے کرو یا عرف عام کے موافق اُس کو پوری اُجرت دو۔

اسی قبیل کی ایک صورت یہ ہے کہ تحصیلدار صاحب، تھانیدار صاحب کسی جگہ پہنچے اور لوگوں نے اُن کے واسطے سواری خود ہی پیش کر دی۔ ظاہر میں یہ ہدیہ کی صورت ہے مگر حدیث میں حکام کو رعایا سے ہدایا لینے کی ممانعت اور شریعت کا فتویٰ ہے ھدایا الامراء غلول۔ ہاں اگر کسی کا تعلق آپ کے ساتھ پہلے سے دوستی یا قرابت کا ہو کہ وہ پہلے بھی آپ کو ہدیہ دیا کرتا ہو تو ایسے شخص کا ہدیہ لینا حکومت کے بعد بھی جائز ہے۔ کیونکہ اس صورت میں جاہ سے نہیں آیا بلکہ جاہ سے پہلے یعنی محبت سے آیا ہے۔ غرض شریعت نے صاحب جاہ کو ڈر ڈالنے کی اجازت نہیں دی۔ ہاں خوش دلی سے محبت سے کوئی اُن کی خدمت کرے تو اس کا مضائقہ نہیں مگر محبت اور خوش

پہچاننے کی سخت ضرورت ہے کہ حکام سے محبت لوگوں کو کم ہوتی ہے۔ خوف اور غرض کا تعلق زیادہ ہے اس لئے حکام کو سخت احتیاط کی ضرورت ہے اور ان ہی حکام میں میانجی لوگ بھی داخل ہیں جو اپنے اثر کو بے محل میں صرف کرتے ہیں۔ یہ لوگ خوب کان کھول کر سُن لیں کہ شاگردوں سے ہر قسم کی خدمت لینا ان کو جائز نہیں۔

مثلاً شاگردوں سے کہتے ہیں کہ ذرا پانی پلا دینا، ذرا پنکھا جھل دینا بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت سخت کام شاگردوں سے لیتے ہیں اور مقصود محض استخدام ہوتا ہے بھلا یہ لوگ کس معاوضہ میں شاگردوں سے کام لیتے ہیں۔ کیا پانی پلانے کے عوض میں ان کو شاگرد بنایا تھا۔ ان صورتوں میں بھی ایسے شخص سے کام لیا گیا ہے جس سے کام لینا جائز نہیں۔ ہاں مصلحت تادیب سے جائز ہے بشرطیکہ غرض بھی تادیب ہو نہ کہ اپنے آپ کو راحت پہنچانا بلکہ مقصود یہ ہو کہ شاگرد کو کام کا سلیقہ آجاوے اور اس کے لئے بھی ولی سے اجازت لینا شرط ہے۔ اور ولی کے واسطے یہ قانون ہے کہ جس میں اس شاگرد کی مصلحت ہو اس کی اجازت دینا ولی کو جائز ہے جب ایسی صورت ہو تو بے شک اُستاذ کو شاگرد سے کام لینا جائز ہے۔ نہ یہ کہ اپنی راحت کے لئے ٹھنڈی ہوا پنکھے سے کھا رہے ہیں۔ اس بیچارہ کو کئی کئی گھنٹے پنکھا جھلتے ہو جاتے ہیں۔ نہ پڑھتے ہیں نہ یاد کرتے ہیں گھنٹوں اُن سے پاؤں دبواتے ہیں بڑی بڑی خدمتیں لیتے ہیں۔ ایسا تصرف کرنے کا تو خود ولی کو بھی اختیار نہیں۔ پھر جس کو ولی سے اجازت لینے کی بھی ضرورت ہو اُس کو تو ایسا تصرف کرنا کب جائز ہوگا۔ بس اُستاد تو آج کل بچوں کو اپنی ملک سمجھتے ہیں جیسے غلام۔ جہلا یوں کہتے

ہیں کہ جان خدا کی اور ہڈیاں ماں باپ کی اور گوشت اُستاد کا۔ خوب سمجھ لو کہ اُستاد کو شاگرد پر حق ملک نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لئے شریعت میں خاص حدود ہیں۔

میانجی لوگوں کی یہ حالت ہے کہ بی بی پر تو خفا ہو کر آئے اور بچوں پر غصہ نکالا اور قمچی بجانی شروع کر دی۔ ایسے ظالموں کو شاگرد بھی ایسے ہی مل جاتے ہیں جو درحقیقت ان کی عقوبت ہیں۔ چنانچہ اُن میں بعض طلبا تو وہ ہیں جن میں ادب ہی نہیں ہوتا اُستادوں کا جیسے تعلیم جدید کے طلبا ہیں کہ وہ اُستاد کو اُستاد ہی نہیں سمجھتے بلکہ اسکول کا نوکر سمجھتے ہیں اور بعض شریر لڑکے ایسے ہوتے ہیں کہ ظاہر میں تو ادب کرتے ہیں مگر دل سے ادب نہیں کرتے اور بعض اُستادوں سے خیانت بھی کرتے ہیں۔

چنانچہ لوہاری میں ایک میانجی تھے۔ لڑکے اُن کی چیزیں چرا کر کھا جاتے۔ اُن کے پاس کسی جگہ سے بہت سے بتاشے آئے تھے۔ انہوں نے لڑکوں سے بچانے کے لئے ایک بدھنے میں اُن کو بھر کر اُوپر سے ٹونٹی ڈھانک کر آٹا لگا دیا لڑکوں نے کمیٹی کی کہ کسی طرح بتاشے کھانے چاہئیں۔ مگر اس میں حیران تھے کہ کیا تدبیر کریں کیونکہ لوٹے کے منہ کو آٹا لگا ہوا ہے۔ آخر یہ رائے ہوئی کہ اس میں ٹونٹی سے پانی بھر کر شربت بنا کر پی جاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ کئی روز کے بعد میانجی صاحب کا بتاشے کھانے کو جی چاہا۔ بدھنی منگوا کر جو کھولی بالکل میدان صاف۔ سو ایسوں کو ایسے ہی مل جاتے ہیں

غرض یہ میانجی لوگ بہت ہی ظلم کرتے ہیں بچوں پر۔ حالانکہ ظلم کرنا کسی پر بھی

تو حرام ہے خاص کر عاجز بچوں پر اگرچہ باپ بھی اجازت دے دے پھر غضب یہ کہ قصور تو ہو کسی کا اور ایک طرف سے سب کو گھڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ غصّہ میں اُن کو خبر نہیں رہتی کہ کون قصور وار ہے اور کون بے قصور ہے۔ کوئی مقدمہ ہوتا ہے تو بلا تحقیق سب کو مارنا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں اور مارتے اس قدر ہیں جس کی انتہا نہیں ہے۔

حکام اور میاں جی کیلئے دستور العمل

میں عہدہ داروں کو بھی اور میاں جی لوگوں کو بھی ظلم سے بچنے کا ایک دستور العمل بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ غصّہ میں کسی مقدمہ کا فیصلہ نہ کیا کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہی سکھلایا ہے۔

لا یقضی القاضی وھو غضبان کہ قاضی کو چاہیئے کہ غصّہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے۔

میاں جی وغیرہ کو بھی چاہیئے کہ غصہ میں نہ ماریں۔ جب غصہ آئے تو خاموش ہو جائیں۔ جب غصّہ اتر جائے تو غور کریں کہ کتنی سزا دینی چاہیئے اور ہر جرم پر تھپڑ یا قمچیوں کا عدد مقرر کر لیں۔ یہ نہیں کہ بے طرح مارنا شروع کر دیا۔ خواہ ہاتھ ٹوٹے یا ٹانگ کہ جو شخص اس دستور العمل کا لحاظ رکھے گا اُس کے ہاتھ سے ظلم نہ ہو گا۔

اب رئیسوں کی کیفیت سنیئے کہ ذرا ملازم نے تین پانچ کی اور اُن کو غصّہ آیا اور لگے اُس پر بے بھاؤ جوتے پڑنے بلکہ ملازم تک بھی محدود نہیں ہے۔ بے تعلق لوگوں پر بھی ظلم سے نہیں رُکتے۔

ہمارے یہاں کا قصّہ ہے ایک شخص رئیس تھے اور بڑے متکبّر۔ ایک

غریب قوم کے آدمی ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ کے مرید اُن کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ صاحب سفید کپڑے پہنے ہوئے آرہے تھے۔ وہ رئیس صاحب بھی راستہ میں بیٹھے تھے۔ اُن کو دیکھ کر بہت ہی ناگوار ہوا کہ اس نے بھی ہمارے جیسے صاف کپڑے پہنے ہیں۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ معلوم ہوا کہ قصائی ہے اور حاجی صاحب کا مرید ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حاجی صاحب نے ہی اس کا دماغ خراب کیا ہے۔ بڑے ولی ہو گئے۔ بس اس غریب کو پاس بلا کر پانچ جوتے لگائے۔ اس بیچارے نے کہا کہ شیخ جی خدا کے یہاں جا کر اس کا مزہ چکھو گے۔ یہ بات سن کر آپ کو اور مسخرہ پن سوجھا کہ آپ نے اس کے سامنے جوتا رکھ دیا کہ تو اب میرے مار لے۔ اس نے کہا، میری کیا مجال ہے جو ایسی گستاخی کروں۔ تو آپ کیا کہتے ہیں کہ اب تو سمجھ میں آگیا ہوگا کہ ہمیں خدا تعالیٰ کا ہی حکم ہے کہ تمہارے جوتے لگائیں۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ ہم نے تو بلا اجازت بھی تم کو مار لیا اور تم اجازت سے بھی ہم کو نہیں مار سکے اور تمہیں حکم نہیں۔

پھر اس ظلم کا سبب کیا تھا صرف تکبر۔ یعنی اپنے کو بڑا سمجھنا کہ یہ قصائی ہے اور ہم شیخ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ سب خدا تعالیٰ کے بندے ہیں خواہ قصائی ہوں یا اور کوئی ہو۔ ان باتوں کے انسداد کا طریقہ یہی ہے کہ بے وجہ کسی پر غصہ مت کرو اور غصہ میں فیصلہ مت کرو۔

نسب اور فخر

نسب پر یا منصب پر فخر کرنا چھوڑ دو۔ آخرت میں اس کو کون پوچھتا ہے۔ خوب فرماتے ہیں حضرت علیؓ

الناس من جهة التمثال اکفاء   ابوهم آدم والام حواء

جس کی نسبت فرماتے ہیں ؎

ما الفضل الا لاھل العلم انھم　　علی الھدیٰ لمن استھدیٰ ادلاء

ہاں شرافت نسبی بھی خدا تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ اگر کوئی شریف النسب ہو تو خدا تعالیٰ کا شکر کرے۔ نہ یہ کہ جس کے پاس یہ نعمت نہیں اس پر ظلم کرے، بلکہ اس نعمت کے شکر میں تو چھوٹوں کے ساتھ احسان کیا کرو۔

ایک رئیس صاحب تھے، اُن کا برتاؤ چھوٹوں کے ساتھ دیکھئے کہ ایک بھنگن اُن کے گھر کمانے آئی بچی کو ایک جگہ بٹھلا کر کام میں لگ گئی بچی رونے لگی تو انہوں نے بے تکلف اُس کو گود میں اٹھا لیا۔ حالانکہ بھنگن کی بچی تھی۔ جو لوگ واقعی شریف ہیں، اُن میں شرافت سے تواضع پیدا ہوتی ہے غرور پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب صورتیں تھیں جاہ کے استعمال کی۔

ان ہی میں ایک صورت جاہ سے کام لینے کی چندہ کے بارہ میں اثر سے کام لینا بھی ہے۔ اس میں دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس پر ہم زور ڈال رہے ہیں اُس پر شرعاً انفاق واجب ہے۔ مثلاً ایک شخص کے ذمہ زکوٰۃ ہے اور ہم اس پر[1] اثر

---

[1] اگر کسی کو شبہ ہو کہ اس تقریر پر تو چندہ مدارس کے لئے امراء و روساء پر زور ڈالنے کی گنجائش نکل آئی کیونکہ آج کل اکثر امراء و روساء زکوٰۃ نہیں دیتے بس چندہ لے کر اُن سے کہہ دیا جاوے کہ آپ اس میں زکوٰۃ کی نیت کر لیجئے اور ہم اس میں شرائط زکوٰۃ کی رعایت کریں گے تو جواب آگے موجود ہے کہ اداء واجب کے لئے زور ڈالنا تو جائز ہے مگر ان قید کے ساتھ تو

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۲۶۸)

ڈال سکتے ہیں تو ہمارے ذمہ واجب ہے کہ اُس پر اپنا اثر ڈالیں کہ زکوٰۃ ادا کیے مگر یہ زور ڈالنا حرام ہے کہ فلاں مدرسہ میں یا فلاں انجمن ہی میں دو۔

ایک صورت یہ ہے کہ جس پر ہم چندہ کے لیے زور ڈال رہے ہیں اُس پر انفاق واجب نہیں اور جس کام کے لیے چندہ کیا جارہا ہے وہ کسی خاص شخص کے ذمہ نہیں بلکہ واجب علی الکفایہ ہے۔ تو اس میں اثر اور جاہ سے کام لینا جائز نہیں خواہ چندہ کسی مدرسہ کے لیے ہو یا قومی کام کے لیے یا مسجد کے لیے۔ دلیل اس کی یہ ہے۔

لا یحل مال امرء مسلم الا لطیب نفس منہ

کہ کسی مسلمان کا مال لینا حلال نہیں مگر اُس کی خوش دلی سے۔

میاں بی بی کے علاقہ کو سب جانتے ہیں کہ کیسا کچھ ہوتا ہے کہ دونوں میں تعشق کا علاقہ ہوتا ہے مگر اُن کے بارہ میں بھی حق تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے

وآتوا النساء صدقٰتھن نحلۃ فان طبن لکم عن شیء منہ نفسا فکلوہ ھنیئا مریئا۔

اگر وہ خوشی سے مہر کا کچھ حصہ معاف کر دیں تو جائز ہے ورنہ جائز نہیں۔

یعنی بی بی کا اتنا کہہ دینا کہ میں نے مہر معاف کر دیا کافی نہیں ہے بلکہ خوشی سے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۲۶۷) زور ڈالنا جائز نہیں کہ ہماری ہی معرفت ادا کرو بلکہ اُن کو آزادی دینا واجب ہے خواہ مساکین کو دیں خواہ اُن کو۔

معاف کرنا معتبر ہے۔ دیکھئے میاں بی بی کا ایسا تو علاقہ مگر وہاں بھی یہ حکم ہے کہ ظاہری معافی کافی نہیں ہے۔ یہ بھی دیکھ لو کہ ایسے قرائن بھی موجود ہیں جن سے اُن کی خوش دلی پائی جاتی ہو، تو دوسروں کے عطایا میں تو اس کا لحاظ بہت ہی زیادہ ضروری ہوگا۔ پس چندہ میں ان کا بہت ہی خیال کرنا چاہیئے۔

مثلاً ہم ایک شخص سے چندہ مانگنے گئے اور اُس نے مجمع میں ہم کو دو روپے دیئے اور ظن غالب یہ ہے کہ اگر ہم اُس سے خلوت میں مانگتے تو ایک ہی روپیہ دیتا۔ اس صورت میں ایک روپیہ تو حلال ہے اور ایک روپیہ حرام ہے۔ ہمارے کہنے سے تو اُس نے ایک روپیہ دے دیا اور اگر اُسی کام کے لئے دوسرا کہتا تو کچھ نہ دیتا۔ تو اس صورت میں ایک روپیہ بھی جائز نہیں۔

باطنی تصرّف

اسی طرح اگر کوئی درویش باطنی تصرف سے کسی کے قلب میں یہ خیال ڈال دے کہ فلاں شخص کو ایک ہزار روپیہ دیدے تو اُس کا لینا بھی حرام ہے۔ لوگ اس کو کمال سمجھتے ہیں مگر یہ صورت حرام ہے کہ باطنی تصرف سے کسی کا مال لیا جاوے۔ تجربہ ہے کہ ایسی صورت میں آدمی دب کر کچھ دے دیتا ہے پھر بعد میں پچھتاتا ہے۔ یہ اس کی علامت ہے کہ خوش دلی سے نہیں دیا تھا۔

ایک مسئلہ یاد آگیا، اثر باطنی کے متعلق۔ وہ یہ کہ بعض لوگ بد دُعا کیا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ہلاک ہو جاوے۔ تو اگر کسی نے کسی کے واسطے بد دُعا کی اور وہ اتفاق سے مر گیا۔ تو اُس کا کیا حکم ہے۔ تفصیل اس میں یہ ہے کہ یہ بد دُعا کرنے والا صاحب تصرف ہے یا نہیں۔ اگر واقعات سے اُس کو اپنا صاحب تصرف

نہ ہونا معلوم ہے۔ تو اُس کو اگر بددعا کرنا جائز نہ تھا تو صرف بددعا کا گناہ ہوا قتل کا گناہ نہ ہوگا۔ اور اگر واقعات سے اُس کو اپنا صاحبِ تصرف ہونا معلوم ہو تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ جس وقت اُس نے بددعا کی ہے آیا اُس وقت یہ خالی الذہن تھا یا دل اس بات پر متوجہ تھا کہ یہ مر جائے۔ اگر خالی الذہن تھا تو بھی بددعا ہی کرنے کا گناہ ہوا قتل کا نہیں ہوا۔ اور اگر دوسری شق تھی یعنی اُس کے ہلاک کی طرف باقاعدہ توجہ تھی تو قاتل ہونے کا بھی گناہ ہوا۔ کیونکہ اُس نے اپنے فعل سے اس کو قتل کیا۔ تصرف نفس سے قتل کرنا اور زہر دے کر مارنا برابر ہے۔ اور یہ تجربہ سے ثابت ہے کہ نفس بھی فاعل ہوتا ہے جیسے ہاتھ پاؤں فاعل ہیں۔ تو جیسے ہاتھ پاؤں سے قتل کرنا قتل ہے ایسے ہی قلب سے قتل کرنا بھی قتل ہے۔ کیونکہ دونوں کا فعل برابر ہے۔ قتل کے سب احکام جاری ہوں گے البتہ اس قتل میں شبہ عمد کے احکام جاری ہوں گے۔

ایک مسئلہ اسی کے متعلق اور ہے وہ یہ کہ کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے اور وہ نہیں چاہتی اور اُس پر نکاح کرنا واجب بھی نہیں، تو اُس نے کسی سے تعویذ کرایا اس غرض سے کہ وہ نکاح کرلے۔ تو یہ بھی جائز نہیں نہ ایسا تعویذ دینا جائز ہے۔ کیونکہ اس میں بھی عامل کی قوتِ خیالی کا اثر ہوتا ہے اور قلب سے کسی کو مجبور کرنا جائز نہیں۔ البتہ میاں بی بی کی موافقت کے لئے تعویذ کرنا جائز ہے۔ مثلاً کوئی شخص حقوقِ واجبہ اپنی بی بی کے ادا نہیں کرتا اس نیت سے تعویذ کرنا جائز ہے کہ دونوں میں موافقت ہو جائے اور شوہر حقوق کو ادا کرنے لگے۔ مگر عامل یہ تعویذ نہ کرے کہ شوہر اس پر فریفتہ ہو جائے بلکہ صرف

تصور اولئے حقوق واجبہ کا رکھے۔ اور جس کو آج کل تسخیر کہتے ہیں اس کا قصد نہ کرے تعویذ دینے والے اور لینے والے سب کو یہی لحاظ رکھنا چاہئیے۔

سفارش کا مسئلہ

اسی استعمال جاہ کے فروع میں سے ایک جزئیہ آج کل کی سفارش کا بھی ہے جو حقیقت میں زور ڈالنا ہے لوگ زور ڈال ڈال کر اپنے کام کے لئے دوسروں کو مجبور کرتے ہیں اور جو چیز دوسرے کے ذمہ واجب نہ تھی اس کو اس کے ذمہ لازم کرتے ہیں۔ سو یہ جائز نہیں کیونکہ یہ دوسرے کو مجبور کرنا ہے۔ ہاں اگر سفارش اس طریقہ سے ہو، کہ دوسرے پر بار نہ ہو، اس کی آزادی میں خلل نہ پڑے تو جائز بلکہ سنت ہے دلیل اس کی حضرت بریرہؓ کا قصہ ہے کہ آپ نے اُن سے فرمایا کہ اے بریرہ تم مغیث سے نکاح کرلو۔ یہ اُن کے شوہر کا نام ہے جن سے یہ خیار عتق کے سبب جدا ہو چکی تھیں۔ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم ہے یا سفارش۔ آپ نے فرمایا حکم نہیں سفارش ہے۔ اس پر انہوں نے عرض کیا تو میں اس سفارش کو نہیں مانتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ سفارش کی حقیقت کے لئے یہ لازم ہے کہ دوسرے کی آزادی میں خلل نہ پڑے۔ چنانچہ آپ نے پھر اُن کو مجبور نہیں کیا۔ نہ اُن کے صاف جواب سے آپ کو ناگواری ہوئی۔ بہرحال سفارش میں یہ صورت ہونا چاہئیے کہ جس سے سفارش کی ہے اس کی آزادی میں خلل نہ ہو، نہ اُس پہ بار ہو اور اگر وہ ان کی سفارش قبول نہ کرے تو سفارش کرنے والا بُرا نہ مانے۔

اب تو کہا جاتا ہے کہ صاحب جب تک زوردار الفاظ نہ ہوں، تو

سفارش سے کیا ہوتا ہے اس لئے خوب زوردار الفاظ لکھو تاکہ اثر پڑے جاہ یہ تو جبر اور اکراہ ہے

یہ چند صورتیں جاہ سے کام لینے کی جو آج کل زائج زیادہ ہیں مع ضروری احکام کے بیان کردی گئیں اور بھی اس کے متعلق بہت سی جزئیات ہیں مگر سب کا استیفا ایک جلسہ میں دشوار ہے۔ اس لئے اب میں بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں اور جس حدیث کی خطبہ میں تلاوت کی تھی اس کا ترجمہ کرکے ختم کرتا ہوں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ ہر شخص راعی اور حاکم ہے۔ کوئی اپنے گھر والوں پر کوئی نوکروں پر۔ اور بھی کچھ نہیں ہے تو اپنے نفس اور ہاتھ پاؤں پر ضرور حاکم ہوگا۔ اور سب سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنی رعیت کے بارہ میں کیا کیا۔ یعنی ہم نے یہ جاہ اور اثر جو تم کو ماتحتوں پر دیا تھا اس کو کہاں استعمال کیا۔

یہ سوال تو اس صورت میں ہے جب کہ جاہ اور اثر خدا تعالیٰ کا عطا کیا ہوا ہو بدون ان کے کسب کے اور اگر ان کے کسب اور اسباب سے حاصل ہوا ہے تو یہ سوال بھی ہوگا کہ تم کس ذریعہ سے راعی بنے تھے۔ بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ثابت ہو گیا کہ جاہ کے بھی حقوق ہیں۔ قیامت میں ان کی بازپرس ہو گی کہ کہاں سے حاصل کی اور کہاں صرف کی۔ جیسے مال کے متعلق پوچھ ہو گی کہ

من این اکتسبتہ واین انفقتہ — کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا

اسی واسطے میں نے نمونہ کے طور پر متعدد جزئیات بیان کر دیں۔ مزید جزئیات اور اُن کے متعلق احکام تحقیق سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ مگر میرے اس مختصر بیان سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ جاہ اور اثر جس کا نام ہے اُس کا خود حاصل کرنا بجز مستثنےٰ صورتوں کے جائز نہیں اور جو بدون تحصیل کے حاصل ہو جائے اُس کا ہر جگہ استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ اب لوگ شریعت کو نماز روزہ ہی میں منحصر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ شریعت نے سب چیزوں سے بحث کی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی کو فکر اور تلاش ہی نہ ہو۔ مگر حجت الٰہیہ قائم ہو چکی ہے۔ اب کوئی عمل نہ کرے گا تو عنداللہ اُس سے مواخذہ ہو گا۔

اب دُعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرماویں۔ آمین ثم آمین وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یاارحم الراحمین ○ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔
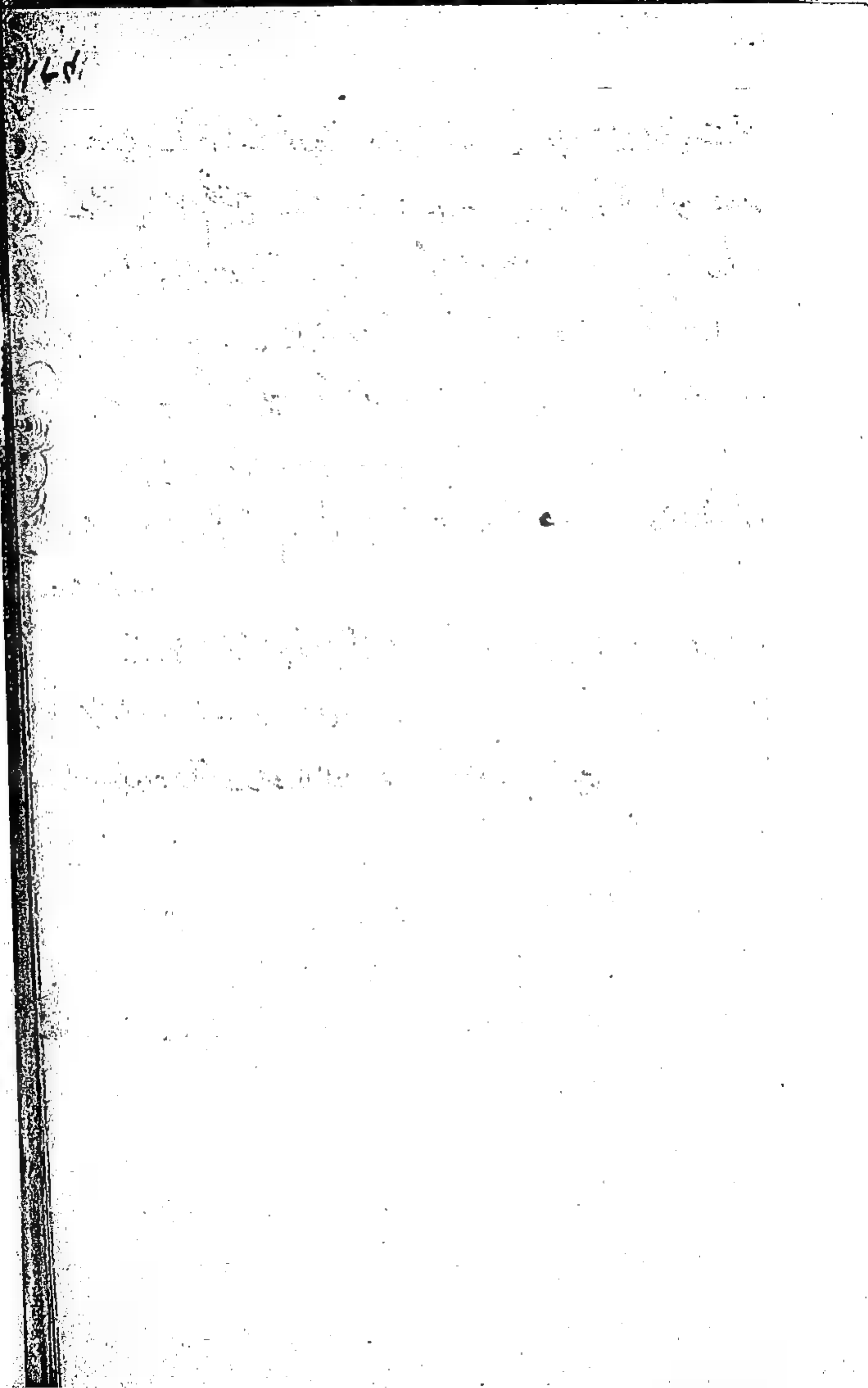
خیر المال للرجال

تجارت اور آخرت کے متعلق یہ وعظ ۸۔ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۷ھ کو تلی بازار، کانپور میں فرمایا جو ۱/۲ ۳ گھنٹے میں ختم ہوا۔ حاضری قریباً ۵۰۰ کی تھی۔ حکیم محمد یوسف صاحب مرحوم بجنوری نے قلمبند کیا ـــــ!

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیّاٰت اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ طوا قام الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ یخافون یوما تتقلب فیہ القلوب والابصار لیجزیھم اللہ احسن ما عملوا ویزیدھم من فضلہ واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب ط

ترجمہ

خاص بندے ایسے ہیں کہ اُن کو تجارت اور خرید و فروخت
اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا
کرنے سے غافل نہیں کرتی اور وہ ڈرتے ہیں اُس دن سے
جس میں قلوب اور آنکھیں اُلٹ پلٹ ہو جائیں گے
ضرور اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کے نیک اعمال کا بدلہ دینگے
اور اپنے فضل سے زیادہ دیں گے اور اللہ تعالیٰ جن
کو چاہتے ہیں، روزی بے حساب عطا فرماتے ہیں۔

علم اور عمل

یہ ایک آیت ہے جو ماقبل سے مرتبط ہے مگر میں نے اس وقت اسی پر اکتفا کیا ہے۔ کیونکہ جس مضمون کا بیان کرنا اس وقت مقصود ہے اُس کے لئے یہ آیت کافی ہے۔ رِجَالٌ ترکیب میں فاعل ہے، ایک قرائت پر فعل ملفوظ کا ایک صورت میں مقدر کا جس پر یُسَبِّحُ ماقبل فعل دلالت کر رہا ہے۔ کیونکہ اس جگہ قرائتیں دو ہیں یُسَبِّحُ بصیغہ معروف اور یُسَبَّحُ بصیغہ مجہول ہے۔ اُس قرائت پر یہاں یُسَبِّحُ بصیغہ معروف مقدر کیا جائے اس بنا پر میں نے اُس کو تلاوت میں یہاں شروع کیا۔ مگر ہر حال میں مطلب ایک ہی ہے۔ یہ سب اس لئے عرض کر دیا تاکہ ترکیب معلوم ہونے سے ترجمہ میں آسانی ہو۔

خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ مدح فرماتے ہیں اُن خاص بندوں کی جن میں یہ خاص صفات ہوں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ پس ہم کو چاہئے

وہ خاص صفات اپنے اندر پیدا کریں۔ مگر ہم لوگوں کا عجیب مذاق ہے کہ فقط تذکرہ میں تو ان صفات کی مدح کی جاتی ہے مگر ان صفات مدح کی تحصیل نہیں کی جاتی۔

اس کی ایسی مثال ہے، جیسے کوئی شخص اکتساب مال پر قادر ہو اور اس کے اصول بھی اس کو معلوم ہوں لیکن وہ ان اصول کی صرف مدح ہی مدح کرتا ہے مگر مال کا اکتساب نہیں کرتا۔ بتلائیے کہ نری مدح سے اس کو کیا فائدہ مل سکتا ہے یا ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص کو کھانے کی حاجت ہے اور سامان بھی کھانے کا موجود ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ کھاؤ مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ ہاں تعریف بہت کر رہا ہے کہ اس کھانے سے ایسی قوت آجاتی ہے اور اس سے یہ ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے لیکن باوجود اس کے خود محروم ہے۔ سب کے منہ تک رہا ہے۔ مگر کھاتا نہیں۔ بس تعریف کرنے کو ہی کافی سمجھ رہا ہے۔ انصاف سے کہئے کہ کوئی شخص دنیا میں اس کو عاقل قرار دے گا۔ ہرگز نہیں!

مگر تعجب کی بات ہے کہ آج کل دین کے معاملے میں عقلاء اور اہل الرائے اپنے کو عاقل تو سمجھتے ہیں اور اسلام کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ان صفات کی مدح بھی کرتے ہیں جو اسلام نے تعلیم فرمائی ہیں۔ مگر جن صفات کی مدح کی جاتی ہے ان صفات کی تحصیل میں سعی نہیں کرتے۔ دنیا میں کوئی ایسا مسلمان نہ ہوگا جو حضرات صحابہؓ اور بزرگوں کے اخلاق کی مدح نہ کرتا ہو کہ فلاں ایسے بزرگ تھے اور فلاں ایسے تھے۔ ان میں ایسی اچھی اچھی صفات تھیں کیسی مسلمان سے ان کے خلاف نہ سنا ہوگا۔ مگر اس شخص سے کوئی پوچھے کہ تم نے بھی ان

خوبیوں کے حاصل کرنے کی طرف توجہ کی تو صاف جواب ملے گا۔ تو کیا محض ان کا معتقد ہو جانا کافی ہے۔ پھر اس سے بڑی سخت غلطی یہ ہے کہ لوگ اس کوتاہی کی تاویلیں کر لیں گے مگر غلطی کا اقرار نہیں کریں گے۔ اگر آدمی غلطی کا اعتراف کرے تو اصلاح کی بھی امید ہے مگر ہم نے تو کلمۂ حق اُرِیْدَ بِہِ الْبَاطِلُ (اس سے باطل مراد لیا جاتا ہے) کے طور پر یہ حدیث یاد کر لی ہے۔

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ قَالَہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ جَوَابِ مَنْ سَأَلَہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَیْفَ تَقُوْلُ فِیْ رَجُلٍ اَحَبَّ قَوْمًا وَلَمْ یَلْحَقْ بِھِمْ رواہ الشیخان۔

جو شخص جس سے محبت رکھے اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کو رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے جواب میں ارشاد فرمایا جس نے آپؐ سے دریافت کیا، آپؐ اس کے بارہ میں کیا فرماتے ہیں کہ ایک شخص ایک قوم سے محبت رکھتا ہے اور ان کے ساتھ ملحق نہیں ہے۔ اس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا۔

یعنی جو شخص جس قوم سے محبت رکھے وہ انہیں میں سے ہے۔ کسی نے اس کا ترجمہ نظم میں کر لیا ہے۔ وہ یہ کہ ؎

اُحِبُّ الصَّالِحِیْنَ وَلَسْتُ مِنْھُمْ لَعَلَّ اللّٰہَ یَرْزُقُنِیْ صَلَاحًا

میں نیکوں سے محبت کرتا ہوں اور ان میں سے نہیں ہوں۔ شاید اللہ تعالیٰ مجھ کو نیکی کی توفیق عطا کر دیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ اگر کھانے سے کسی کو محبت ہو تو کیا محض محبت سے

پیٹ بھر جائے گا۔ وہاں نہیں کہتے ؎

اُحِبُّ الْآکِلِیْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللّٰهُ یَرْزُقْنِیْ رَغِیْفًا

کھانے والوں سے محبت کرتا ہوں اور میں اُن میں سے نہیں ہوں
شاید اللہ تعالیٰ مجھ کو روٹی عنایت کر دیں۔

کہ میں کھانے والوں کو دوست رکھتا ہوں اسی سے میرا پیٹ بھر جائیگا
پس اس شعر کے مصنف پر اعتراض نہیں کرتا اور حاشا و کلا حدیث پر تو کون اعتراض
کر سکتا ہے۔ میں تو استدلال باطل کرنے والوں پر اعتراض کرتا ہوں اور اُن سے
پوچھتا ہوں کہ اگر اس کے یہ معنی ہوتے جو آپ نے سمجھے ہیں کہ محبت ہی کافی
ہے اور کسی بات کی ضرورت نہیں جیسا آج کل لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ تو وہ
پہلے لوگ بھی یوں ہی رہا کرتے کچھ بھی نہ کرتے۔ بس محبت ہی کا سلسلہ رہتا اور
اخیر والے بھی صرف محبت کرتے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے۔ بس کوئی بھی
عمل نہ کرتا۔ بس صرف آپ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی عمل کر لیتے اور دوسرے
لوگ صرف محبت کو کافی سمجھ لیتے مگر ایسا تو نہیں ہوا۔

استحقاق اور فضل

اب رہی یہ بات کہ پھر المرء مع من احب کے
کیا معنی ہیں۔ سو بات یہ ہے کہ اس میں عمل کرنے
والوں کے لئے ایک تسلی ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جس کو
اہل سلوک سمجھ سکتے ہیں۔ باقی جس کو درد ہی نہ ہوا ہو وہ درماں کی قدر کیا جانے۔ وہ
تسلی یہ ہے کہ اہل طریق عبادت کرتے ہیں، کوشش کرتے ہیں مگر پھر بھی یہ معلوم ہوتا ہے
کہ کچھ کمی رہ گئی۔ اور واقع میں کوئی نہ کوئی کمی رہ ہی جاتی ہے۔ اگر کمی محسوس نہ ہو تو

یہ بھی برکتِ عمل اور ترقی کے لئے مانع ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ بندہ عمل کے بعد بھی کمی کو محسوس کرے۔ چنانچہ کاملین اس کو محسوس کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمی کا احتمال فرماتے ہیں۔

لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ ۔ میں آپ کی تعریف کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

کہ میں آپ کی ثنا کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ حالانکہ آپ میں فی الواقع کمی نہیں مگر عظمتِ حق پر نظر کر کے آپ فرماتے ہیں کہ میں حق ادا نہیں کر سکتا۔ سو یہ کمی اضافی ہے حقیقی نہیں۔ کیونکہ جو درجہ ثنا کا آپ سے مطلوب ہے اور جو طاعت خدا تعالیٰ کو آپ سے مقصود ہے آپؐ سے اس میں ذرہ برابر بھی کوتاہی نہیں ہوئی مگر آپ جب عظمتِ خداوندی پر نظر کرتے ہیں یعنی عظمتِ حق جس درجہ کو مقتضی ہے جس کے آپؐ مکلف نہیں ہوئے اور وہ امکان لبشر سے خارج ہے۔ اس کے اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں۔ لا احصی ثناء علیک۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ کمی کا اپنے اندر محسوس ہونا کمالات میں سے ہے۔ پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہے تو پھر اولیا تو کیا چیز ہیں پھر عوام تو کوئی چیز ہی نہیں۔ بہرحال ہم میں طاعت کی کمی ضروری ہے اور اس کمی پر نظر نہیں تو ہمارے اندر خود ایک کمی یہ ہوگی کہ اپنے نقص پر نظر نہیں بہرحال جب ہمارے اعمال پورے نہیں تو ضابطہ کا مقتضا تو یہ ہے کہ ہمیں کچھ جزا اور اجر بھی نہ ملے۔ ویسے اللہ تعالیٰ فضل فرماویں تو وہ اور بات ہے ان کے فضل کو کون روک سکتا ہے۔ باقی ہم ضابطہ سے جزائے موعود کے

کسی طرح مستحق نہیں۔ اور واقع میں مستحق تو اتنی کے بھی نہیں تھے۔ اگرچہ اعمال میں کمی بھی نہ ہوتی جتنا وعدہ ہے۔ وعدہ کے اعتبار سے غیر لازم استحقاق ہے مگر اب کمی کی صورت میں اس کے بھی مستحق نہیں۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اے اللہ! ہم نے کام ہی کیا کیا ہے پھر جزا کیسے ملے گی۔ اور یہ سب باتیں موٹی ہیں مگر چونکہ ہم کو فکر نہیں اس لئے ذہن میں نہیں آتیں ورنہ جن حضرات کو فکر ہے ان کی حالت دیکھو۔

خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے کیسے متواصل الفکر تھے۔ کسی وقت قلب مبارک آپ کا بے چینی سے خالی نہ تھا۔ باوجودیکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ شان تھی کہ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل، تمام ملائکہ سے افضل اور پھر احتمال باز پرس کا بھی نہیں۔ اوّل تو اس وجہ سے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اندر کوئی بات باز پرس کی تھی ہی نہیں۔ اگر شاید خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو احتمال بھی ہوتا باز پرس کا تو اس کے بارے میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا اطمینان کر دیا گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں فرما دیا۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ	تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے
مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ	پچھلے گناہ بخش دیں۔

یہاں ایک عاشقانہ نکتہ ہے وہ یہ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے ذنب کا اطلاق کیا گیا۔ حالانکہ واقعہ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہر ذنب سے پاک ہیں۔ یہ اس لئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مجھ سے کچھ گناہ ہو گیا ہو۔ تو اس شبہ کو بھی رفع فرما دیا گیا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے عاشق

اپنے محبوب سے رخصت ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میری خطا معاف کر دیجئے گا۔ حالانکہ عاشق سے خطا کا احتمال کہاں۔ خصوصاً ایسا عاشق جو عشق کے ساتھ عقل بھی کامل رکھتا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی شان ہے۔

شغل اور استغراق

اولیاء اللہ ایسے ہوئے ہیں۔ جن سے باوجود کمال عشق کوئی امر خلافِ عقل اور دین کے صادر نہیں ہوا شیخ عبدالحق ردولوی رح باوجود غایت استغراق کے فرماتے ہیں کہ

"منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد۔ اینجا مردانند کہ دریاہا فرو برند و آروغ نزنند"

منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ (شراب عشق) سے شور و غل کرنے لگا۔ یہاں ایسے (بہادر) مرد ہیں کہ دریا کے دریا پی جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے۔

حضرت شیخ علی احمد صابر صاحب رح بارہ سال تک مراقبہ میں مشغول رہے کچھ ہوش نہ تھا۔ حتیٰ کہ پیر کے یہاں سے مزاج پرسی کے لئے ڈوم آیا تو آپ کو خبر دی گئی کہ شیخ کے یہاں سے ڈوم آیا ہے۔ آپ نے سر اٹھا کر اتنا فرمایا کہ پیر اچھے ہیں۔ کہا، جی ہاں! خیریت سے ہیں۔ اور اُس کی یہ خاطر کی کہ آپ گولر پھیکے بلا نمک کے کھایا کرتے تھے۔ اُس روز فرمایا کہ آج گولروں میں نمک ڈال دینا۔ اُس بیچارے کے تو زخم پر نمک چھڑکا گیا۔ وہ تو بڑی بڑی خاطروں کا خوگر تھا۔ اُس نے واپس ہو کر شیخ سے بڑی شکایت کی کہ حضرت انہوں نے تو آپ کو بھی زیادہ نہیں پوچھا۔ صرف کچھ دیر کو آنکھیں کھول کر اتنا پوچھا تھا کہ

شیخ اچھے ہیں۔ اس کو سُن کر شیخ پھڑک گئے اور فرمایا اُن کی محبت ہے کہ ایسی حالت میں مجھ کو یاد رکھا۔

دیکھئے حضرت صابر صاحبؒ اس قدر تو مشغول و مستغرق تھے مگر بارہ سال تک ایک وقت کی نماز وقت سے ٹلی نہیں۔ عوام الناس اہل کمال کو کیا جانیں وہ تو بھنگڑوں کو جانتے ہیں جو نماز بھی نہ پڑھیں۔ استغراق محمود وہ ہے جو سنت کے دائرہ سے خارج نہ ہونے دے۔ غرض انبیاء علیہم السلام کی تو بڑی شان تھی، اولیاء اللہ ایسے ایسے گزرے ہیں جن کا دین غالب تھا عشق پر اور ان کو استغراق میں بھی دین سے غفلت نہ ہوتی تھی۔

غم اور فکر مگر چونکہ ہم خالی ہیں اس غم سے کیونکہ ہمارے اوپر دوسرا غم ضرر رساں مسلط ہو گیا ہے (یعنی غم دنیا) اس لئے ہم کو دین کے کاموں میں حلاوت محسوس نہیں ہوتی۔ باقی جن کو یہ غم حاصل ہے اُن کی تو اس غم سے یہ حالت ہے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش　　اگر ریش بینند وگر مرہمش

اُس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے۔ اگر غم دیکھتے ہیں تو اُس پر مرہم رکھتے ہیں۔

گدایانے از پادشاہی نفور　　بامیدش اندر گدائی صبور

ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنے والے ہیں اور اُس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہیں۔

دمادم شرابِ الم درکشند　　وگر تلخ بینند دم درکشند

ہر دم رنج کی شراب پیتے ہیں۔ جب اس میں رنج کی کڑواہٹ
دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں۔

ان اشعار کی بندش بتلا رہی ہے کہ سچا مضمون ہے۔ کیونکہ ان اشعار کا قلب پر اثر پڑتا ہے اور جمتا ہے۔ جو بات دل سے نہیں ہوتی اس کا اثر اول تو ہوتا نہیں۔ اگر عارضی طور پر ہو جاتا ہے تو باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ رنگین وعظ میں کہ بعض لوگوں کو رونا آجاتا ہے مگر مجلس سے اٹھے اور سب اثر جاتا رہا۔

غرض اہل غم کی یہ حالت ہے مگر ہمیں دین کا غم ہی نہیں۔ اسی لئے اگر ہم تقویٰ بھی اختیار کرتے ہیں تو وہ بھی نام ہی کا ہوتا ہے۔ ورنہ اس کی بھی یہ حالت ہوتی ہے کہ کسی چیز سے ٹوٹتا ہی نہیں۔ ہمارا تقویٰ کیا ہے؟ بی بی تمیزہ کا وضو ہے کہ فسق فجور سے بھی نہیں ٹوٹتا تھا۔

ایک بی بی تمیزہ تھی فاسقہ فاجرہ کسی بزرگ نے اس کو وضو کرایا، نماز پڑھوائی اور نصیحت کی کہ نماز پڑھتی رہنا۔ ایک عرصہ کے بعد وہ بزرگ جو پھر ادھر آئے تو ان بزرگ نے پوچھا کہ پابندی سے نماز بھی پڑھتی ہو؟ کہا، جی ہاں! فرمایا، وضو بھی کرتی ہو؟ تو کہتی ہے کہ آپ جو وضو کرا گئے تھے میں اسی سے پڑھ لیتی ہوں۔

یہ حکایت تو کتابی ہے۔ ایک حکایت مولانا رفیع الدین صاحب کی بیان کی ہوئی ہے کہ ایک سقہ کو وضو کرا دیا اور خیال کیا کہ یہ تو ہر وقت پانی میں رہتا ہے۔ اس کو کیا مشکل ہے وضو کرنا۔ اس لئے کوئی خاص تاکید نہیں کی کچھ روز کے بعد دیکھا کہ وہ سقہ بے وضو نماز میں آ کھڑا ہوا۔ اس سے پوچھا کہ

نہ کیا تو وہ کہتا ہے کہ جی اُس دن وضو کرا نہیں دیا تھا۔

وضو پر ایک لطیف بات یاد آگئی۔ اللہ تعالیٰ کی کیا رحمت ہے کہ وضو میں وہی اعضاء دھونے کو بتلائے ہیں کہ اگر نہ بھی بتلاتے تو ضرورت کی وجہ سے اُن کو ویسے بھی دھوتے ہیں۔ سو کوئی کام بڑھایا نہیں۔ حق تعالےٰ کے احکام کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مریض طبیب کے پاس گیا اور کہا کہ گوشت کھانے کو طبیعت چاہتی ہے۔ طبیب نے کہا کہ گوشت تو مضر ہوگا۔ مگر طبیب شفیق بھی ہے۔ اُس نے کہا کہ گوشت کھا لینا مگر اس میں دھنیے کی پوٹلی ڈال لیا کرو۔ ایسا طبیب کہاں ملے جو طبیعت کے موافق دوا اور غذا بتلاتے۔ حق تعالیٰ کی ہر تعلیم ایسی ہی ہے۔ چنانچہ وضو میں وہی اعضا دھونے کا حکم دیا جن کو ہم خود بھی دھوتے ہیں۔ کیونکہ ان ہی پر گرد و غبار کا زیادہ اثر ہوتا ہے مگر اتنا بتلا دیا کہ اس ترتیب سے دھو لیا کرو۔ جو امور فطرت کے مناسب تھے وہی تجویز فرمائے بشرطیکہ فطرت سلیمہ ہو۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا میں اس کو کہہ رہا تھا کہ بعض کا تقویٰ ایسا ہے جو کبھی ٹوٹتا ہی نہیں۔ چاہے کچھ ہی کر لیں۔ (ہنس کر فرمایا کہ) ہاں پیروں کے توڑنے سے نکاح تک ٹوٹ جاتا ہے۔

اس پر ایک پیر کی حکایت یاد آئی۔ کسی مرید نے نکاح پڑھنے کے لئے اُن کو نہ بلایا۔ دوسرے کسی آدمی سے نکاح پڑھوا لیا۔ پیر نے سمجھا کہ یہ تو بُری رسم نکلی۔ اس سے تو بڑا نقصان ہوگا۔ وہ اُس کے گھر پہنچے اور کہا کہ بغیر ہمارے کس نے نکاح پڑھایا ہے۔ بہت خفا ہوئے اور کہا کہ میں ابھی اس کو ادھیڑتا

ہوں۔ پس بیٹھ گئے پڑھنے وَالشَّمْسِ وَضُحٰھَا (قسم ہے آفتاب کی اور اس کی
روشنی کی) اُدھیڑ بے تکا تھا۔ تمام آیتوں میں اسی طرح جوڑ لگاتے چلے گئے (
کہا ایک دو آیت اور رہی ہے بس اُدھڑا ہی چاہتا ہے۔ اس بیچارے نے
پانچ روپے نکال کر دے دیئے اور کہا اجی ایسا مت کرو۔

سو ہم جو اپنے تقویٰ طہارت کو ایسا سمجھتے ہیں کہ زوال کا خوف ہی نہیں
وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم کو وہ غم نہیں جس سے فکر ہو۔ اسی غم کو ان اشعار میں
فرمایا ہے اور چونکہ صاحب مشاہدہ کا سچا مضمون ہے اس لئے مؤثر ہوتا
ان کا اثر دل پر پڑتا ہے۔ غیر صاحب مشاہدہ کے کلام میں اثر نہیں ہوا کرتا
عارف شیرازی کے کلام میں بھی اسی لئے بے حد اثر ہے کہ وہ صاحب مشاہدہ
ہیں۔ ان اشعار کو پھر دہراتا ہوں ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش — اگر ریش بینند وگر مرہمش
گدایانے از بادشاہی نفور — بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم در کشند — اگر تلخ بینند دم درکشند

محبت اور عمل

یعنی اہل اللہ اس غم میں بھی خوش رہتے ہیں یہ غم ایسی نعمت ہے کہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ
نعمت پر مسرور ہیں۔ یہ قید ایسی ہے کہ اس کا قیدی رہائی نہیں چاہتا ؎

اسیرش نخواہد رہائی ز بند — شکارش نجوید خلاص از کمند

اس کا قیدی قید سے چھٹکارا نہیں چاہتا۔ اس کا شکار کمند سے خلاصی
نہیں ڈھونڈتا

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی معشوق عاشق کو اچانک پیچھے سے آکر بغل میں زور سے دبالے کہ ہڈی پسلی ٹوٹنے لگے۔ اوّل بے خبری سے ذرا گھبرایا اس گھبرانے کو دیکھ کر معشوق کہتا ہے کہ اگر تمہارا جی گھبراتا ہو، پریشانی ہو، تکلیف ہو تو چھوڑ دوں۔ تمہاری آزادی میں خلل پڑ گیا ہو تو چھوڑ دوں۔ اگر عاشق صادق ہے تو جواب میں یہی کہے گا۔

اسیرت نخواہد رہائی ز بند   شکارت نجوید خلاص از کمند

تیرا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا اور تیرا شکار کمند سے چھٹکارا نہیں ڈھونڈتا۔

اور یوں کہے گا کہ بھائی خدا نہ کرے کہ مجھ کو اس قید سے رہائی ہو۔ جس کو یہ قید نصیب ہو گئی ہے وہ اس سے نکلنا کب چاہے گا۔ اسی طرح حضرت جب دین کا غم ہو جائے گا تو حقیقت کا ادراک ہوگا۔ اس وقت اپنی کمی اعمال میں محسوس ہونے لگے گی اور اس کمی کے احساس سے بعض اوقات دل شکستگی اور مایوسی کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ ایسوں کی تسلی کے لئے فرمادیا گیا ہے۔ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ یعنی اگر تم نے کوشش کی مگر پھر کمی رہ گئی تو غم مت کرنا، دل کو مت توڑنا پریشان مت ہونا۔ تم ان ہی کے ساتھ ملحق ہو جاؤ گے جن سے تم کو محبت ہے۔ غرض اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ ایسے شخص کی تسلی کے لئے فرمایا گیا ہے نہ کہ سب لے عملوں کے لئے۔

جیسے کوئی شخص کام میں کوشش کرے اور آقا کو معلوم ہو کہ اس نے پوری کوشش کی ہے اور اتفاق سے کام میں کچھ نقص رہ جاوے تو اجرت کے وقت

اُس کو پوری مزدوری دیتے ہیں اور اُنہی کام کرنے والوں کے ساتھ لاحق کرتے ہیں جن کے کام میں کوتاہی واقع نہیں ہوئی۔ یہ معنی ہیں اس حدیث کے اور گو مفید خالی محبت بھی ہے۔ یعنی اگر محبت بھی نہ ہوتی تو اُس کے اعتبار سے یہ خالی محبت بھی مفید ہے مگر یہ تو نہیں کہ عمل کی ضرورت ہی نہ رہے۔ نری محبت ہی محبت کافی ہو جاوے گو عمل کچھ بھی نہ ہو۔

اس کا ایک راز ہے۔ وہ یہ کہ بدون عمل کے جو محبت ہوتی ہے، اُس محبت میں بھی ثبات اور قوت نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک شیخ کے دو مرید ہوں ایک تو ہو متبع دوسرا غیر متبع۔ تو متبع ہی کی محبت قابل اعتبار ہو گی۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جو اتباع کرتا ہے وہ شیخ کو پہچانتا ہے۔ روزمرہ شیخ کے ساتھ اس کی معرفت بڑھتی ہے اور معرفت سے محبت بڑھتی ہے بخلاف اُس شخص کے جو متبع نہیں وہ شیخ کو پہچانے ہی گا نہیں۔ تو اُسے محبت کیا خاک ہو گی۔ اُس کے نزدیک تو پیر اگر اُس کی مرضی کے خلاف ہوا تو پیر ہی نہ رہے گا۔ اور متبع شخص کی یہ حالت ہے کہ اگر پیر سے لغزش بھی ہو جاوے تو وہ موازنہ کرتا ہے اُس لغزش کا اُس کے کمالات کے ساتھ۔ پھر کمالات کو غالب دیکھتا ہے تو بداعتقاد نہیں ہوتا اور اُس کی لغزش کو خیال میں بھی نہیں لاتا اور اس پر محمول کرتا ہے۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ — پس جن لوگوں کی ترازو کا پلڑا

فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ — بھاری ہو گا وہی لوگ کامیاب ہیں۔

اُس کو ایسا خیال کرتا ہے جیسے کوئی حسین ہو مگر اُس کے چہرے پر ایک

کا لال بھی ہو کہ وہ بھلا ہی نظر آتا ہے۔ اس تل پر اہل عرب کا مذاق یاد آیا عرب کی عجیب تشبیہات تھیں۔ اشعار کہا کرتے تھے کہ اُس کے چہرہ پر ایسا تل ہے، جیسے میدان میں اونٹ کی مینگنی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلے یہ تہذیب تھی، اہل عرب کی۔ اُن کو تو اسلام ہی نے کام کی باتیں سکھلائیں۔ بعد کے اشعار دیکھئے وہ کیسے اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ عرب کو اونٹ بہت محبوب تھے۔ اسی واسطے ہر جگہ اُن ہی کا تذکرہ تھا۔ اس لئے محبوب کے تل کو بھی تشبیہ دی تو مینگنی سے اگر اسلامی شعراء کے یہاں یہ مضمون ہوتا تو اور عنوان سے ہوتا۔

غرض یہ ہے کہ جو پیر کے کمالات کو جانتا ہے تو وہ اُس کی لغزش کو تل کی مثل سمجھے گا اور جس کی نظر کمالات پر نہیں اُس کے نزدیک معمولی لغزش بھی بلکہ غیر لغزش بھی پہاڑ کے برابر ہوگی۔

ایک شخص نے ایک بزرگ کی نسبت یہ کہا تھا کہ یہ کیسے بزرگ ہیں کہ ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے یہاں ایک بی بی تھیں۔ انہوں نے ایک بزرگ کو پاخانے جاتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگیں یہ کیسے بزرگ ہیں جو پاخانہ بھی کرتے ہیں۔ اسی بناء پر شریف عبداللہ نے بدوؤں کو اپنی ولایت کا معتقد بنانے کے لئے رکھا ہوا تھا۔ اور یہ انتظام کیا تھا کہ وہ اُن کے پاخانہ پیشاب کی اطلاع کسی کو نہ ہونے دیتے۔ جہلاء کا اعتقاد ہی کیا۔ بس جاہل لوگ اُن کی ولایت کے قائل تھے۔ اُن کا یہ خیال جم گیا تھا کہ شریف صاحب پاخانہ پیشاب نہیں کرتے۔ اس لئے ولی ہیں۔

ایک شخص ایک معمولی بات پر میرے معتقد ہوئے تھے اور ایک معمولی

بات پر غیر معتقد ہو گئے۔ معتقد تو اس بات پر ہوئے تھے کہ میں نے ایک شخص سے تین روپے نہ لئے تھے جو مجھ کو ہدیۃً دینا چاہتے تھے۔ بس اتنی بات پر معتقد ہو گئے اور کئی سال تک معتقد رہے۔ اور غیر معتقد اس پر کہ اُن کو دنیا کا ایک کام پیش آیا۔ انہوں نے مجھ سے سفارش چاہی۔ میں نے انکار کر دیا۔ بس غیر معتقد ہو گئے۔ کہنے لگے یہ کیسے بزرگ ہیں کہ ایک مسلمان کی سفارش نہیں کرتے۔

نادان کی دوستی

بس نادان کی دوستی ایسی ہی ہوتی ہے۔ الف لیلیٰ میں ایک حکایت جاہل کی دوستی کی لکھی ہے کہ ایک شخص قاضی کی لڑکی پر عاشق تھا اور وہ بھی اُس کو بلاتی تھی مگر موقع نہ ملتا تھا۔ جمعہ کا دن آیا تو اُس نے خیال کیا کہ آج اچھا موقع ہے۔ سب لوگ نماز کے لئے چلے جائیں گے۔ میدان خالی ہو گا۔ اُس سے کہلا بھیجا، مگر اُس نے خیال کیا کہ محبوب کے پاس اچھی ہیئت سے جانا چاہیئے۔ چنانچہ ایک حجام کو بلا کر خط بنوانے کا ارادہ کیا۔ وہ نائی اس قدر بکی تھا کہ ذرا سا خط بنا لیا اور پھر بک مارنے لگا اور یہ شخص ادھورا خط چھوڑ کر اٹھ بھی نہیں سکتا۔ حجام نجومی بھی تھا۔ کبھی خط کو چھوڑ کر دھوپ میں جا کھڑا ہوا، کبھی اسطرلاب نکال کر ارتفاع شمس کو دیکھتا غرض اُس نائی نے ایسے قصے پھیلا دیئے کہ جمعہ کا وقت بھی گزرنے لگا۔ یہ شخص اُس سے پیچھا چھڑا کر معشوقہ کے مکان میں گیا۔ نائی صاحب بھی خیر خواہی سے جا کر مکان کے باہر ایک تخت پڑا تھا، اُس پر بیٹھ گئے۔ جب قاضی صاحب جمعہ سے واپس ہو کر مکان پر آئے۔ گھر میں جا کر کسی غلام پر خفا ہو کر

اُن کو مارنے لگے، وہ رونے چلّانے لگا۔ حجام صاحب سمجھے شاید میرے میاں پکڑے گئے اور پٹ رہے ہیں۔ فوراً مدد کے لئے پہنچ گئے اور کہنے لگے کہ اپنی بیٹی کو نہیں کہتا، اسی نے تو میرے آقا کو بلایا ہے۔ غرض راز فاش ہوگیا۔ وہ آقا ڈرا کہ اب پکڑا جاؤں گا۔ بیچارہ اندر مکان کے اس حال کو معلوم کر کے کہیں کو چھُپ کر بھاگا اور چھت پر سے کودا۔ پاؤں ٹوٹ گیا۔ جانے کس طرح پیچھا چھڑا کر وہاں سے بچا۔ نادان کی دوستی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک رئیس کے ہاں ایک ریچھ پلا ہوا تھا جب وہ رئیس سوتا تو ریچھ اُس کی مکھیاں جھلا کرتا۔ ایک روز اتفاق سے مکھیوں نے بہت زور باندھا۔ ریچھ اڑاتے اڑاتے دق ہوگیا۔ اُس نے دل میں کہا کہ اچھا میں تمہارا علاج بتاؤں گا۔ جب مکھیاں اچھی طرح آقا کے منہ پر بیٹھ گئیں، اُس نے بڑا سا پتھر لا کر اُن مکھیوں کے مارا۔ مارا تو تھا مکھیوں کے وہاں آقا صاحب ہی کا چکنا چور ہوگیا۔ غرض نادان کی دوستی ہی کیا بلکہ مضر اور ایذادہ ہے۔

اسی لئے حضرت مولانا گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص میرے ایک مرید کو ہٹا دے تو فی مرید ایک آنہ اور مولوی کے ہٹانے پر فی مولوی چار آنہ لے لے۔ غرض یہ ہے کہ جو شخص نادان ہے اُس کو شیخ سے بھی برائے نام ہی محبت ہوگی۔ نادان کی دوستی رہ نہیں سکتی۔ وہ معمولی بات کو بھی بزرگی کے خلاف سمجھے گا۔ اور غیر معتقد ہو جائے گا۔ اُس کی نظر جہل کے سبب اکثر عیوب ہی کی طرف زیادہ ہوگی اور کمالات کو تو وہ جانتا ہی نہیں اُن پر تو اُس کی نظر کیا ہوتی۔ سچی محبت اسی کو ہوگی جس کو شیخ کی معرفت ہوگی اور شیخ کی معرفت

اُس کے اتباع سے ہو گی۔ جیسا اوپر قریب ہی مذکور ہوا۔ پس حُبّ احب پورے طور پر وہیں صادق آئے گا جہاں اتباع ہو اور جہاں اتباع نہ ہو گا محبت بھی کامل نہ ہو گی۔ اسی درجہ کے لئے عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں ؎

تعصی الالہ وانت تظہر حبہ
ھذا لعمری فی الفعال بدیع

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اور اُس کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے
اپنی جان کی قسم یہ فعلوں میں انوکھی بات ہے

لو کان حبک صادقا لاطعتہ
ان المحب لمن یحب یطیع

اگر اس کی محبت میں صدق ہوتا تو اس کی فرمانبرداری کرتا۔ اس لئے محبت کرنے والا محبوب کی اطاعت کیا کرتا ہے۔

احکام و آثار

مگر اس وقت محبین بہت ہی کم ہو گئے ہیں جو متبع ہوں ہاں محبت کا دم بھرنے والے بہت ہیں۔ اُن کی مثال وہی ہے۔ جیسے ایک بدوی کو کسی نے دیکھا کہ زار زار رو رہا ہے اور ایک کتا اُس کے پاس پڑا ہے۔ اُس نے رونے کا سبب پوچھا، تو کہا، میرا کتا مارے بھوک کے جاں بلب ہے۔ اُس کے فراق میں رو رہا ہوں۔ اُس شخص کی نظر ایک تھیلے پر پڑی جس میں روٹی کے ٹکڑے بھرے ہوئے تھے۔ اُس نے بدوی سے کہا کہ اس تھیلے میں کیا ہے۔ کہا روٹی کے ٹکڑے ہیں۔ کہا پھر اس کو کھلاتا کیوں نہیں۔ کہنے لگا ؎

گفت نایدبے درم دلراہ ناں ، لیک ہست آب دو دیدہ رائیگاں
روٹی تو بغیر پیسوں کے راستہ میں نہیں ملتی لیکن آنسو تو مفت کے ہیں۔

یعنی اتنی محبت نہیں کہ روٹی خرچ کردوں اور آنسو تو مفت کے ہیں چار آنسو کی جگہ دس بہا دوں گا اور روٹی کو لگے ہیں دام۔ بس محبت رونے کی ہے کھلانے پلانے کی نہیں ہے۔

غرض یہ ہے کہ بغیر تبع کے محبت نہیں ہوتی یعنی کامل۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ قابل اعتبار وہی چیز ہوتی ہے جو معتدبہ درجہ میں ہو۔ جیسے رائی کا دانہ ترازو میں رکھا جائے تو اس کا وزن تو ضرور ہوتا ہے۔ اگر ایک دانہ میں وزن نہیں تو ویسے ہی دانے بہت سے ڈال کر ترازو کا پلہ کیسے جھک گیا۔ یہ تو سب کو مسلم ہے کہ ایک دانہ میں وزن ضرور ہے مگر چونکہ اس پر آثار مرتب نہیں ہوتے۔ اس لئے اس کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ نہ شریعت نے اعتبار کیا ہے نہ اہل عرف نے۔ گو فلاسفہ کے نزدیک یہ بات مانی ہوئی ہے کہ جب چیونٹی زمین پر چلتی ہے تو ساری زمین کو حرکت ہو جاتی ہے اور دلیل سے یہ بات سچی ہے۔ مگر سننے والوں کو تعجب اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس پر احکام و آثار مرتب نہیں دیکھے جاتے۔ اس لئے قابل اعتبار نہیں سمجھا۔ اسی طرح احکام شرعیہ و حسیہ میں وہی چیز معتبر ہو گی جس پر احکام و آثار مرتب ہوں۔ پس محبت وہی معتبر ہو گی جس پر آثار مرتب ہوں (یعنی جس میں اتباع ہو وہی محبت قابل اعتبار ہو گی، نرا عجبہ کچھ بھی نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں نے اپنے مطلب کی حدیث یاد کر لی ہے اپنے کو عمل سے فارغ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کلمۃ الحق اُرِیْدَ بِہِ الْبَاطِلُ ہے یعنی اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ بالکل حق ہے مگر اس سے اپنے مطلب کے لئے باطل مراد لیا گیا ہے جس کو خدا تعالیٰ نے بھی رد کیا ہے۔

غزوہ اُحد

چنانچہ غزوہ اُحد کے متعلق فرماتے ہیں۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَۃً نُّعَاسًا یَّغْشٰی طَآئِفَۃً مِّنْکُمْ وَطَآئِفَۃٌ قَدْ اَھَمَّتْھُمْ اَنْفُسُھُمْ یَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاھِلِیَّۃِ ط یَقُوْلُوْنَ ھَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ ط قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ ط یُخْفُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَکَ ط یَقُوْلُوْنَ لَوْ کَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا ھٰھُنَا ط قُلْ لَّوْ کُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِکُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقَتْلُ اِلٰی مَضَاجِعِھِمْ ۚ وَلِیَبْتَلِیَ اللّٰہُ مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ وَلِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِکُمْ ط وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔

پھر تم پر اتارا تنگی کے بعد امن کو۔ وہ اونگھ تھی کہ گھیر رہی تھی تم میں سے بعضوں کو اور بعضوں کو فکر پڑی تھی اپنی جان کی۔ خیال کرتے تھے اللہ پر۔ جھوٹے خیال جاہلوں کے سے۔ کہتے تھے کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں۔ تو کہہ سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اپنے جی سے چھپاتے ہیں جو تجھ سے ظاہر نہیں کرتے۔ کہتے ہیں اگر کچھ کام ہوتا ہمارے ہاتھ میں تو ہم مارے نہ جاتے اس جگہ

آپ کہہ دیجیے اگر تم ہوتے اپنے گھروں میں البتہ باہر نکلتے جن پر لکھا تھا مارا ہی جاتا اپنے پڑاؤ پر۔ اور اللہ کو آزمانا تھا، جو کچھ تمہارے جی میں ہے اور نکھارنا تھا جو کچھ تمہارے دل میں ہے اور اللہ کو معلوم ہے دل کی بات۔

یہ حاصل ہے مدلول آیات کا۔ غزوۂ اُحد میں اوّل غلبہ مسلمانوں کو تھا اور آثار فتح کے نظر آتے تھے۔ اس کے بعد مسلمانوں سے بے حکمی ہوئی اور شکست ہوئی۔ ان میں بہت سے شہید ہو گئے اور جو میدان میں باقی رہے ان پر اونگھ آئی اور اس کے بعد سب رُعب و دہشت جاتی رہی۔ سب نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہو کر پھر لڑائی قائم کی۔ جو لوگ اس میں ضعیف الایمان تھے انہوں نے کہا۔ هَلْ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ۔ ظاہر معنی تو اس کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا سو کیا ہمارا کیا اختیار ہے اور یہ معنی نہایت اچھے ہیں مگر اُن کی نیت میں یہ نہ تھا ——— بلکہ نیت میں یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے مشورہ پر عمل نہ کیا جو اتنے لوگ مرے۔ اگر ہمارے مشورہ پر عمل کرتے، تو کیوں مارے جاتے۔ حق تعالیٰ نے انکار فرمایا۔ فرماتے ہیں يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ کہ دل کی بات آپ سے ظاہر نہیں کرتے۔ اُن کے دلوں میں تو یہ ہے لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا کہ اگر ہمارے مشورہ پر عمل کیا جاتا تو یہ نوبت کیوں آتی۔ آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم گھروں میں بھی ہوتے تو بھی موقع پر آکر مارے جاتے بچ نہیں سکتے یہ تمہارا غلط خیال ہے۔ اس آیت میں یہ جو کلمہ ہے هَلْ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ

شئ۔ یہ کلمہ تو حق ہے (جس کے یہ معنی ہیں کہ ہمارے اختیار میں کچھ نہیں اللہ نے جو چاہا سو کیا) مگر انہوں نے اس سے باطل مراد لیا۔ کیونکہ اُن کی نیت میں دوسری بات تھی کیونکہ اُن کی مراد یہ تھی کہ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا (پس یہ قول) هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ (کیا کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں منافقین کا ہے۔ اور وہ علی الاطلاق کفر کی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ ذو وجہین بات کہہ سکتے تھے۔ چنانچہ یہ بات اُنہوں نے ذو وجہین کہی۔

اس کا ایک محمل تو حق ہے۔ وہ محمل حق یہ ہے کہ وہ اعتقاد قدر ظاہر کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے اختیار میں کوئی چیز نہیں سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو اُس نے چاہا وہ کیا۔ ظاہر تو یہ کر رہے ہیں مگر اُن کے دل میں یہ تھا کہ اگر ہمیں اختیار ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ پس وہ ظاہر تو کچھ کر رہے تھے اور دل میں اُن کے کچھ اور تھا۔ سامنے تو اعتقاد حق ظاہر کیا جو اسلام کے موافق ہے اور دل میں یہ کہ اگر یوں ہوتا تو یوں ہو جاتا یعنی اگر ہمیں اختیار ہوتا تو مارے نہ جاتے۔ یہ اعتقاد اسباب کے مؤثر ہونے کا ہے۔ اور یہی اُن کا عقیدہ تھا کہ اسباب مؤثر بالذات ہیں۔ پس اسی پر

يُخْفُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ۔ — اپنے جی میں چھپاتے ہیں جو تم سے ظاہر نہیں کرتے۔

مرتب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کے دلوں میں تو کچھ ہے اور ظاہر کچھ کر رہے ہیں۔ آگے اس کو بیان فرماتے ہیں۔

يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ — کہتے ہیں کچھ بھی کام ہے ہمارے

الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۔   ما تھ ہیں۔
کہ اُن کے دلوں میں یہ ہے کہ اگر ہمارا اختیار ہوتا تو ہم مارے نہ جاتے۔
آگے اس کا رد ہے۔

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِكُمْ الخ   کہہ دیجئے اگر تم گھروں میں بھی ہوتے ۔۔۔ الخ

مطلب یہ ہے کہ یہ تمہارا خیال باطل ہے۔ تم کہیں بھی ہوتے جن کے لئے قتل لکھا گیا تھا تو وہ یہیں آکر قتل ہوتے اجا نہیں سکتے تھے۔ غرض اس آیت سے اُن کی تائید ہوگئی کہ سچی بات سے جھوٹی بات مراد لینا کس قدر برا ہے یہی حال ہے اُس شخص کا جو اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ سے غرض باطل یعنی عدم ضرورت عمل پر تمسک کرتا ہے۔

داخلہ جنت کی خوش فہمی

اس حدیث کی طرح ہم نے اور چند حدیثیں بھی یاد کر رکھی ہیں۔ جیسے

مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ ۔   جس نے لا الہ الا اللہ کہا، جنت میں داخل ہو گیا۔

اس سے اپنے نفس کے موافق یہ مراد لے لی کہ بس یہی کافی ہے۔ نہ کسی عمل کی ضرورت ہے نہ کسی گناہ سے بچنے کی حاجت۔ جو جی چاہے کرتے پھرو۔ بس لا الہ الا اللہ کہہ لو سیدھے جنت میں چلے جاؤ گے۔ یہ بھی وہی کلمۃ الحق۔ اُرِیْدَ بِهَا الْبَاطِلُ (یہ کلمہ تو حق ہے مگر اس سے مراد باطل لی گئی ہے۔)
اگر کوئی کہے کہ ہم نے جو اس حدیث میں کہا ہے خود اسی حدیث ہی

میں آگے مصرع ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ   یعنی اگرچہ وہ زنا کرے اور چوری کرے

تب بھی جنت میں داخل ہوگا۔ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعد لا الہ الا اللہ کہہ لینے کے کچھ بھی کرتا پھرے کچھ مضر نہیں۔

جواب یہ ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اعمال مامور بہا (جن کاموں کا حکم دیا گیا ہے۔) انکے بجالانے اور معاصی سے بچنے کی ضرورت نہیں بلکہ مطلب اس کا یہ ہے کہ زنا وسرقہ سے ایمان نہیں جاتا۔ اس ایمان کی برکت سے کبھی نہ کبھی جنت میں داخل ہو جائے گا۔ گو بعد سزا سہی۔ تو اعمال کی عدم ضرورت اس سے کیسے ثابت ہوئی۔ جیسے جہلاء کا زعم ہے کہ جو جی چاہے کرتا پھرے کچھ بھی حرج نہیں۔ اور موٹی بات ہے کہ اگر صرف لا الہ الا اللہ کافی ہوتا اور کسی عمل کے کرنے یا گناہوں کے چھوڑنے کی ضرورت نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیوں اعمال کی تاکید فرماتے اور گناہوں پر وعیدیں کیوں ارشاد فرماتے۔ یہ تو بہت آسان بات تھی۔ اسی کی تعلیم فرما دیتے۔ نیز جب آپ ہی سے اعمال ساقط نہ ہوئے تو اور کس سے ساقط ہو سکتے ہیں۔ دیکھئے آخر صحابہؓ میں کوئی بھی سمجھ دار تھے یا نعوذ باللہ سارے ناواقف ہی تھے۔ کیا صحابہؓ نماز نہیں پڑھتے تھے اور اعمال نہیں کرتے تھے۔ کیا صرف لا الہ الا اللہ پر بس کرتے تھے۔ ان کے واقعات دیکھ لیجئے دین پر ان کو کیسی توجہ تھی۔ مستحب تک کو چھوڑنا بہت برا خیال کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ صرف تمہارا مذاق ہے۔ ان دلائل

کا یہ مفہوم نہیں۔ صرف نفس کو اعمال کی مشقت سے بچانے کے لئے تم نے حیلے تراش لئے ہیں۔ کیا آیت

وَلِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ — اس کی مثل عمل کرنے والوں کو چاہیئے کہ عمل کریں۔

اور حدیث

مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا — جس نے نماز کو قصداً چھوڑ دیا

فَقَدْ كَفَرَ — وہ کافر ہو گیا۔

وغیرہ یہ نصوص نہیں ہیں۔ کیا آپ کو صرف ایک ہی نص ملی۔ مجھے تو شرم آتی ہے ایسی ظاہر بات کی تفصیل کرتے ہوئے۔ غرض یہ بات

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ الخ — ایسے بندے ہیں جن کو تجارت نہیں غافل کرتی ——— الخ

جس کی اس وقت تفصیل کی گئی ہے اُن ہی اعمال کو بتلا رہی ہے۔ جن کی حق تعالیٰ نے مدح فرمائی ہے۔

دین و دنیا کا تعلق

اب وہ صفات سنیئے کیا ہیں۔ بعضے ایک ورجہالت میں گرفتار ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم تو ذات کے عاشق ہیں ہمیں جنت و دوزخ سے کچھ سروکار نہیں۔ اس لئے ہمیں عمل کی کیا ضرورت ہے۔ عمل تو وہ کرے جو جنت کو لینا چاہے۔ ہمیں اس سے مطلب ہی نہیں۔ ہم تو ذات کے عاشق ہیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ ذات کے عاشق کو زیادہ عمل کرنا چاہیئے۔ جنت تو تھوڑے عمل میں مل جاتی ہے۔ ذات کی طلب میں تو بڑی

مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ کے قرب کے لئے اور زیادہ عمل کی ضرورت ہے۔ اب ان اعمال کو سنیئے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ الخ — ان کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

اپنے اچھے بندوں کی ایک صفت یہ ارشاد فرمائی کہ وہ ایسے لوگ ہیں جن کو غافل نہیں کرتی تجارت اور بیع ذکر اللہ سے۔ اس صفت کا حاصل ایک غلطی کا رفع ہے اور اسی غلطی کی وجہ سے لوگوں میں عمل کی ہمت نہیں رہی۔ آج کل کے غیر محقق واعظین نے عقل کو کھو رکھا ہے۔ ایسی ایسی حکایات لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کی ہمت باقی نہیں رہتی۔ اور وہ غلطی یہ ہوئی ہے کہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ دین کا کام کرنے سے آدمی دنیا سے جاتا رہتا ہے۔ اس لئے وہ دین کا کام نہیں کرتے۔

تو خوب سمجھ لیجئے کہ دین کا کام کرنے سے آدمی دنیا سے نہیں جاتا بلکہ جس وقت آدمی کو دین کا شوق ہوتا ہے تو ضروری دنیا تو اور زیادہ آسانی سے ملتی ہے البتہ فضول دنیا خود رخصت ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے چراغ کے جلنے سے تاریکی جاتی رہتی ہے۔ جب چراغ آیا تو اندھیرا کہاں۔ باقی ضروری دنیا میں تو اور زیادہ برکت نصیب ہوتی ہے تو ضروری اور مفید دنیا دین کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ پس بہت لوگ جو کہتے ہیں کہ دنیا کے تعلقات جب سب ختم ہو جائیں تب دین اختیار کریں۔ یہ خیال محض غلط ہے۔ البتہ دین میں

یہ ضروری ہے کہ کمال پر غیر اللہ یعنی جو دنیا مضر ہے وہ خود رخصت ہو جاتی ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھو کہ دین پر چلنے سے بیٹا مر جائے گا۔ بہن مر جائے گی۔ مال و دولت جاتا رہے گا۔ سو دنیا کی دولت رخصت نہیں ہوتی۔ البتہ ان چیزوں کے مضر تعلقات رخصت ہو جاتے ہیں۔ یعنی بیٹے کے ساتھ جو تعلق اب ہے محبت کا جو حاجب عن اللہ ہے وہ نہیں رہتا۔ جو تعلق بیٹے کے ساتھ اب ہے وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہو جائے گا۔ سب چیزیں فنا ہوتی ہیں مگر فنا کے وہ معنی نہیں جو عوام کے نزدیک ہیں کہ آدمی کو کہیں کی بھی خبر نہ رہے نہ کھانے کی نہ پینے کی نہ اپنے تن کی۔ سو یہ معنی نہیں۔ فن کی کتابیں دیکھئے تو معلوم ہو۔ پڑھے لکھے لوگ بھی کتابیں پڑھتے ہیں مگر تدبر نہیں کرتے۔ فنا کا حاصل ہے فضول تعلقات کا جاتا رہنا۔ یعنی دنیا کی چیزوں سے جو تعلق اب ہے، وہ نہیں رہتا بلکہ وہ تعلق خدا کے ساتھ ہو جاتا ہے اور یہ بھی نہیں کہ یہ چیزیں کسی درجہ میں محبوب بھی نہ رہیں ان سے بالکل ہی بے تعلقی ہو جاتے۔ اُن سے کوئی واسطہ ہی نہ رہے۔ یہ نہیں ہوتا بلکہ اُن کی محبت مغلوب ہو جاتی ہے اور اس میں کوئی ضرر نہیں کہ ان چیزوں کے ساتھ بھی محبت کا تعلق ہو۔ مگر غالب تعلق اللہ کے ساتھ ہو۔ چنانچہ حق تعالیٰ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ

باھرہٖ ط

کہہ دیجئے کہ اگر باپ تمہارے اور بھائی تمہارے اور بیٹے تمہارے اور بیبیاں تمہاری اور قبیلہ اور کنبہ تمہارا اور مال جو کمائے ہیں تم نے اور سوداگری جس کے مندا ہونے سے ڈرتے ہو اور گھر جن کو تم پسند کرتے ہو، اگر یہ چیزیں تم کو زیادہ پیاری ہوں اللہ سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے پس انتظار کرو یہاں تک کہ لاوے اللہ اپنا حکم۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ یہ صورت تو بری ہے کہ یہ چیزیں احب ہوں یعنی زیادہ محبوب ہوں اللہ سے۔ معلوم ہوا کہ اگر کم محبوب ہوں تو مضائقہ نہیں۔ آیت میں زیادہ محبوب ہونے کی مذمت کی گئی ہے یعنی یہ چیزیں زیادہ محبوب نہ ہونی چاہئیں۔

اہل اللہ کی حالت

باقی اگر کسی کو شبہ ہو کہ اس میں تو مساوات کی نفی نہیں کی گئی کہ یہ چیزیں محبت میں مساوی بھی نہ ہوں تو اس سے شبہ ہوتا ہے کہ مساوات میں مضائقہ نہیں۔ حالانکہ یہ بھی خلاف ہے مساوات بھی نہ ہونا چاہئے۔ وہ بھی ایسی ہی بری ہے جیسے زیادہ احب ہونا برا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احتمال ہی نہیں۔ اس لئے مساوات سے بحث ہی نہیں کی کیونکہ برابری ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ مشاہدہ ہے اور جو چیز واقع نہیں ہوتی اس سے بحث نہیں ہوتی۔ وہ تو خود ہی خارج ہے۔ پس بہت لوگ جو

یہ سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت ہو گی تو یہ چیزیں چھوٹ جائیں گی۔ سو یہ بات نہیں، یہ چیزیں چھوٹیں گی نہیں البتہ خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت ہونے سے ان چیزوں کی محبت کم ہو جاتی ہے جو خود مفید ہے کیونکہ محبت کم ہونے سے پریشانی کم ہو جائے گی۔ کیونکہ پریشانی کی حقیقت ہے کسی متوقع چیز کا چھوٹ جانا اور جب محبت کم ہو گی اُس کی طرف التفات بھی نہ ہو گا۔ تو اُس کی تمنا اور توقع بھی نہ ہو گی۔ جب توقع ہی نہ ہو گی تو پریشانی کیسی۔ بلکہ وہ چیز ہونے اور نہ ہونے، دونوں حالتیں برابر ہوں گی۔ جیسے کسی کو اولاد کی تمنا ہو تو اُس کو نہ ہونے سے پریشانی ہو گی اور جو تمنا ہی نہ ہو تو کیا پریشانی ہو گی۔ اہل اللہ کو کسی چیز کے جانے رہنے سے اسی لئے پریشانی نہیں ہوتی کہ اُن کو کسی چیز کی تمنا ہی نہیں ہوتی۔

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ اُن کے پاس کسی امیر نے ایک بیش قیمت موتی ہدیۃً بھیجا۔ خادم نے پیش کیا۔ فرمایا، الحمد للہ! اور حکم دیا کہ اس کو رکھ لو۔ خادم نے رکھ لیا۔ اتفاق سے وہ موتی چوری ہو گیا۔ خادم نے یہ واقعہ بھی عرض کیا۔ اُن بزرگ نے فرمایا، الحمد للہ! خادم کو بڑا تعجب ہوا۔ اُس نے دوسرے وقت پوچھا کہ حضرت! مجھے بڑی حیرت ہے۔ وہ یہ کہ جب موتی حضور میں آیا تھا تو اُس وقت بھی آپ نے الحمد للہ فرمایا تھا اور ضائع ہونے کی خبر معلوم ہو کر بھی یہی الحمد للہ فرمایا۔ اس میں کیا راز ہے؟ آنا اور جانا دونوں پر کیسے خوشی ہو سکتی ہے۔ فرمایا میں نے نہ آنے پر الحمد للہ کہا نہ جانے پر۔ بلکہ جس وقت آیا تھا میں نے قلب کو دیکھا کہ آنے پر کچھ خوشی نہیں ہوئی۔ اس پر

میں نے الحمد للہ کہا تھا۔ اسی طرح جاتے رہنے پر میں نے قلب پر کچھ رنج نہیں پایا۔ اس لئے میں نے الحمد للہ کہا۔ یہ حالت ہے اہل اللہ کی۔

اسی طرح ایک اور قصہ ہے کہ کسی امیر نے ایک بزرگ کی خدمت میں ایک چینی آئینہ بہت قیمتی ہدیۃً بھیجا تھا۔ وہ بزرگ کبھی کبھی اس میں اپنا منہ دیکھا کرتے تھے۔ اتفاقاً وہ آئینہ خادم کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ اس کو بڑا ہی ڈر ہوا کہ دیکھئے کیا ہوگا۔ کیسا جلال آئے گا۔

جلال پر ایک مضمون یاد آیا۔ وہ یہ کہ خدا کے اسماء کو لوگ جلالی اور جمالی کہتے ہیں۔ یہاں تک تو صحیح ہے۔ واقعی اسمائے باری تعالیٰ بعض جلالی ہیں اور بعض جمالی مگر لوگوں نے جو ان سے مراد لے رکھی ہے وہ غلط ہے۔ لوگوں کے نزدیک جلالی اُن اسماء کو کہتے ہیں جن کے پڑھنے سے وبال پڑے گرمی پیدا ہو، جنون پیدا ہو جائے اور جو اسماء ایسے نہ ہوں اُن کو جمالی کہتے ہیں۔ سو یہ تفسیر محض غلط ہے۔ کہیں خدا کے نام سے بھی وبال اور نحوست یا جنون پیدا ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ! بلکہ جلالی وہ ہیں جن میں معنی قہر کے پائے جاتے ہیں جیسے قہار، جبار، عزیز اور جمالی وہ ہیں جن میں معنی لطف کے پائے جاتے ہیں، جیسے رحمٰن، رحیم، کریم، لطیف۔ سو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ میں دونوں صفتیں ہیں۔

اسی معنی کے اعتبار سے بعضے بزرگوں کو بھی لوگ جلالی کہتے ہیں کہ اُن کو غصہ بہت آتا ہے۔ سو یہ صحیح ہے کہ بزرگوں کو غصہ آتا ہے مگر اس میں مصالح ہوتے ہیں۔ پس اُن کا جلال بھی مشتمل بر جمال ہوتا ہے۔ جیسا حق تعالیٰ

کے قہر کے ساتھ بھی لطف ملا ہوا ہوتا ہے۔

اس لطف پر ایک آیت یاد آئی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ	اگر اللہ میاں لوگوں سے اُن
بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَيْهَا	کے گناہوں پر مواخذہ فرماتے
مِنْ دَابَّةٍ۔	تو زمین پر جتنے چلنے والے

ہیں سب کو ہلاک کر ڈالتے۔

بظاہر یہاں مقدم اور تالی میں ملازمت کا تعلق نہیں معلوم ہوتا کیونکہ مواخذہ تو ہو آدمیوں سے اور ہلاک ہوں دواب بھی۔ اگر یوں فرماتے تو ملازمت کا تعلق ہوتا۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ	اگر اللہ تعالیٰ لوگوں سے اُن
بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَيْهَا	کے گناہوں کی وجہ سے مواخذہ
مِنَ النَّاسِ۔	فرماتے تو زمین پر کوئی آدمی

نہ بچتا۔

سو بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آدمیوں کو ڈرا بھی رہے ہیں جو قہر و جلال ہے اور اس کے ساتھ ہی انسان کا شرف بھی بتلا رہے ہیں جو لطف و جمال ہے تقریر اس کی یہ ہے کہ اگر انسان سے مواخذہ کیا جاتا تو سارے عالم کو اس لئے درہم برہم کر دیا جاتا کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے انسان ہی کے واسطے ہے جب یہ نہ رہتا تو کچھ بھی نہ رہتا۔ سبحان اللہ! جن پر غصہ ہے اُن کی شرافت و مقصودیت بھی ظاہر کی جا رہی ہے۔ صاحبو! واقعی تم بڑے مرتبہ والے ہو

مگر افسوس ہم لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر تدبر نہیں کرتے اگر تدبر کرتے تو اللہ تعالیٰ کے غصہ میں بھی رحمت نظر آتی اور اس سے ہمارے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی۔ اسی طرح اہل اللہ بھی غصے ہوتے ہیں مگر ان کے غصہ کے اندر رحمت بھی ہوتی ہے۔ واقعات کو دیکھو تو معلوم ہو کہ وہ کتنی رعائتیں کرتے ہیں۔

چنانچہ جن بزرگ کا واقعہ میں بیان کر رہا تھا کہ خادم کے ہاتھ سے اُن کا آئینہ چینی ٹوٹ گیا جو موجب عتاب وعقاب ہوتا۔ مگر اُس میں بھی اُن کی رحمت کا ظہور ہوا۔ وہ اس طرح کہ خادم کو جب عتاب کا ڈر ہوا تو اُس نے سوچا کہ بزرگ زندہ دل ہوتے ہیں۔ لاؤ شاعری بگھارو۔ خوش ہو کر کچھ نہ کہیں گے۔ چنانچہ وہ حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ ع

از قضا آئینۂ چینی شکست

آپ فی البدیہہ فرماتے ہیں۔ ع

خوب شد اسباب خودبینی شکست

یعنی اس آئینہ کا بھی جھگڑا ہی تھا۔ خود بینی کا سبب تھا، اچھا ہوا ٹوٹ گیا۔ پاپ کٹا۔ یہ حالت ہوتی ہے اہل اللہ کے دنیوی تعلقات کی کہ اُن کو کسی چیز کے نہ آنے سے فرحت ہو، نہ جانے سے غم۔ اسی انقطاع تعلق کو کہتے ہیں ؎

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند از ہمہ کار جہاں بیکار ماند

جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا بنا لیتے ہیں اُس کو تمام دنیا کے کار و بار سے بیکار کر دیتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ زراعت، تجارت، بی بی بچے سب چھوٹ جاتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُن سے دل کو کوئی خاص لگاؤ اور تعلق نہیں رہتا بلکہ خاص لگاؤ اللہ تعالیٰ سے ہو جاتا ہے۔

مکہ میں کثرت سے ایسے دکاندار ہیں جن کی یہ حالت ہے کہ دکان پر سودا لئے بیٹھے ہیں اور دلائل الخیرات پڑھ رہے ہیں، قرآن مجید کی تلاوت کر رہے ہیں، ذکر میں مشغول ہیں۔ کوئی خریدار آیا سودا دے دیا، پھر ذکر اللہ میں مشغول ہو گئے۔ اور یہ معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر بیٹھ کر جب بقدر ضرورت مل گیا دکان بند کی اور گھر کو بلکہ اکثر حرم شریف کو چل دیئے۔ بس اتنا تعلق ہے اُن کو دنیا کی چیزوں سے۔

رزقِ حلال کا اثر

ایک شخص عبداللہ شاہ تھے دیوبند میں جو گھاس بیچتے تھے جو ملتا تھا اُس میں سے ایک حصہ اپنی والدہ کو دیتے اور ایک حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے اور باقی اپنے خرچ میں لاتے۔ اُنہوں نے ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور دوسرے حضرات کی دعوت کی۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ دعوت کہاں سے کر دو گے۔ تمہارے پاس ہے ہی کیا۔ کہنے لگے کہ جو حصہ خیرات کا نکالتا ہوں، اُسی سے دعوت کر دوں گا۔ غرض پانچ آنے جمع کئے اور حضرت مولانا کے پاس لائے اور کہا کہ تم ہی پکا لیجیو۔ میں کہاں جھگڑا کروں گا۔ اگر دنیا دار بھی اس طرز کو اختیار کر لیں تو کیسا اچھا ہو۔ مہمان تھے کئی اور پیسے کل پانچ آنے۔ بزرگوں مہمانوں کا مشورہ ہوا کہ کوئی سستی سی چیز تجویز کی جائے۔ چنانچہ میٹھے چاول گڑ کے تجویز ہوئے۔

بڑی احتیاط سے پکائے گئے۔ کوری ہانڈی منگائی گئی۔ پکانے والے کو وضو کرایا گیا۔ غرض ہر طرح کی احتیاط کی گئی۔ وہ چاول بھتے ہی کتنے۔ ایک ایک دو لقمے کھا لئے۔ مولانا خود فرماتے تھے کہ ان دو لقموں کی یہ برکت دیکھی کہ ایک ماہ تک قلب میں انوار و برکات محسوس ہوتے تھے۔ ایک ماہ کامل یہ اثر رہا۔ اور میں کہتا تھا کہ جس کی کمائی کے ایک لقمہ کا یہ اثر ہے تو جو دن رات اسی کو کھاتا ہے، اُس کی کیا حالت ہوگی۔

صاحبو! اگر اللہ و رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی کامل محبت ہوگی تو یہ بات پیدا ہو جائے گی۔ پس اہل اللہ دنیا کو ضروری تو سمجھتے ہیں مگر الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ ان کا مشرب ہوتا ہے یعنی ضروری چیز بقدر ضرورت ہی اختیار کی جاتی ہے۔ وہ حضرات بقدر ضرورت دنیا کو حاصل کرتے ہیں جیسے تم پاخانہ میں جاتے ہو تو کیا وہاں تفریح کے لئے جاتے ہو بلکہ ضرورت رفع کرنے کو۔ اور جہاں ضرورت رفع ہو گئی بس باہر نکل آئے۔ اسی طرح ان کے نزدیک دنیا ایک حاجت کی چیز ہے۔ تفریح کی چیز نہیں، دل لگانے کی جگہ نہیں۔ بس اللہ کی محبت میں یہ اثر ہوتا ہے کہ دنیا کی چیزوں سے ضروری تعلق رہ جاتا ہے زیادہ نہیں ہوتا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند　　از ہمہ کار جہاں بیکار ماند

تعلق باللہ کا تعلق دنیا پر اثر

پس یہ جو کہا جاتا ہے کہ اللہ کی محبت سے دنیا جاتی رہتی ہے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ اس کو دنیا سے تعلق و محبت نہیں رہتی۔ یہ معنی نہیں کہ وہ سارے

حقوق کو معطل کر کے بیٹھ رہے۔ وہ کرتا سب کچھ ہے مگر دل اور ہی طرف رہتا ہے۔ پس یہ کیفیت ہوتی ہے کہ دل بیار دست بکار۔ دنیا داروں کی طرح نہیں کہ ہر وقت دنیا ہی میں اُن کا دل رہتا ہے۔

چنانچہ ایک شاعر تھے اُن کو نماز میں بھی شعر ہی کی سوجھتی تھی۔ جہاں کوئی مصرعہ موزوں ہوا نماز توڑ دیتے اور شعر لکھ لیتے۔ ایسے ہی دنیا داروں کا مذاق ہے کہ اگر نماز کے وقت گاہک آگیا تو یوں سمجھتے ہیں کہ اگر نماز جماعت سے پڑھی اور دیر لگ گئی تو گاہک بھاگ جائے گا۔ اور مولوی صاحب کہتے ہیں کہ نماز جماعت سے پڑھو۔ یہ بڑی مشکل بات ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے تعلق ہو جانے کے بعد دنیا کی چیزوں سے ایسا تعلق نہ رہے گا کہ دنیا کو دین پر ترجیح دی جائے۔ باقی وہ کمانے میں تم سے اچھا رہے گا۔

ہمارے قریب گاؤں میں ایک شخص ہیں ایک گاؤں میں کھیتی کرتے ہیں اور کھیتی بھی عجیب طریقہ سے۔ ایک بیل تو اُن کے پاس ہے اور دوسرا بیل ضرورت کے وقت کرایہ پر لے لیتے ہیں کبھی کبھی تیسرے چوتھے سال دس پانچ روپے کسی سے قرض بھی لے لیتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اتنا غلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ سال بھر کو کافی ہو جاتا ہے اور دین کی یہ حالت ہے کہ کام بھی کرتے ہیں اور ذکر میں بھی مشغول رہتے ہیں۔ اطمینان اُن کے اندر اس قدر دیکھا کہ ایسا اطمینان ہونا مشکل ہے۔ بیماری (انفلوئنزا) جو پھیلی تھی تو لوگوں کے دلوں کی کیا حالت تھی سب جانتے ہیں کہ کیسی پریشانی سب کو تھی۔ وہ اسی حالت میں میرے

پاس آئے تھے۔ خوشی کے ساتھ کہنے لگے کہ یہ بھی ایک شان ہے اللہ کی کہ ذراسی دیر میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ ذرا ہراس اُن پر نہ تھا۔ ویسے وہ دیکھنے میں گنوار ہیں۔ کوئی پڑھے لکھے آدمی نہیں۔ مگر فہم کی یہ حالت ہے کہ پڑھے لکھوں سے زیادہ فہیم ہیں۔

دین اور فہم

دین سے فہم بھی درست ہو جاتا ہے۔ ابھی درستی فہم پر ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک شخص گنوار حضرت مولانا گنگوہی صاحب کی خدمت میں آیا اور کہا کہ مولوی جی، مجھے مرید کر لو۔ حضرت نے فرمایا، اچھا بھائی آ۔ مرید کرتے ہوئے جو باتیں کہلواتے ہیں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھا کرو، سب کچھ کہلوا لیا۔ جب مولانا اپنی باتیں پوری فرما چکے تو آپ کہتے ہیں کہ مولوی جی تم نے افیم سے تو توبہ کرائی نہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی مجھے کیا خبر کہ تو افیم بھی کھاتا ہے۔ حضرت چونکہ طبیب بھی تھے، جانتے تھے کہ دفعۃً افیون کا چھوڑنا مشکل ہے اور طالب کی حالت کی رعایت ضروری ہے۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ کتنی کھایا کرتے ہو میرے ہاتھ پر رکھ دو۔ اُس نے گولی بنا کر حضرت کے ہاتھ پر رکھ دی۔ حضرت نے اُس میں سے کچھ کم کر کے باقی اُس کو دے دی اور فرمایا کہ اتنی کھا لیا کرو۔ پھر مشورہ کر لینا۔ وہ شخص کچھ دیر خاموش بیٹھ کر کہنے لگا۔ اجی مولوی جی جب توبہ ہی کر لی۔ پھر اتنی اور اُتنی کیا۔ یہ کہہ کر افیون کی ڈبیہ نکال کر دیوار پر ماری اور یہ کہا کہ اری افیم، جا میں نے تجھے چھوڑ دیا۔ بس یہ کہہ کر چلا گیا نہ ذکر پوچھا نہ شغل۔

افیون کے چھوڑنے سے دست آنے لگے۔ اُس نے کہلا کر بھیجا

کہ مولوی جی دعا کرو دیکھو کہ میں اچھا ہو جاؤں مگر افیم نہ کھاؤں گا۔ غرض بڑی حالت تک نوبت پہنچی، مرتے مرتے بچا۔ مگر اچھا ہو گیا۔ تندرست ہو کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے پوچھا کون؟ کہا میں ہوں افیم والا اور سارا قصہ بیان کیا۔ اس کے بعد دو روپیہ پیش کئے۔ مولانا نے کسی قدر عذر کے بعد دلجوئی کی۔ اور روپے قبول فرما لیئے۔ تو آپ کہتے ہیں کہ اجی مولوی جی! یہ تو تم نے پوچھا ہی نہیں کہ یہ کیسے روپے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی اب بتلا دے کیسے روپے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ روپے افیم کے ہیں۔ حضرت نے پوچھا کہ افیم کے کیسے۔ اس نے کہا کہ میں دو روپے مہینہ کی افیم کھاتا تھا جب میں نے افیم سے توبہ کی تو نفس بڑا خوش ہوا کہ اب دو روپے ماہوار بچیں گے۔ میں نے کہا کہ یہ تو دین میں دنیا مل گئی۔ بس میں نے نفس سے کہا کہ یہ یاد رکھو کہ یہ روپیہ تیرے پاس نہ چھوڑوں گا۔ یہ مت سمجھ کہ تجھے دے دونگا بلکہ اسی وقت نیت کر لی کہ جتنے کی افیم کھایا کرتا تھا وہ پیر کو دیا کروں گا پس یہ دو روپیہ ماہوار آپ کے پاس آیا کریں گے۔

دیکھا آپ نے یہ گنوار کی حکایت ہے جس کو پڑھنا لکھنا کچھ نہ آتا تھا مگر دین کی سمجھ ایسی تھی کہ دین میں دنیا کی آمیزش کو فوراً سمجھ گیا۔ یہ وہ بات ہے کہ اچھے اچھے لوگوں کی بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ کامل بزرگوں سے ایسے واقعات منقول ہیں۔

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کا واقعہ ہے کہ ایک جہاز میں بیس مٹکے شراب کے خلیفہ وقت کے واسطے آ رہے تھے۔ آپ بھی دریا کے کنارے

ٹہلتے ہوئے پہنچے۔ جہاز والے سے پوچھا کہ اس میں کیا چیز ہے؟ اُس نے کہا کہ خلیفہ کے واسطے شراب آئی ہے۔ آپ نے مٹکوں کو توڑنا شروع کیا۔ اُنیس توڑ دیئے صرف ایک مٹکا باقی رہ گیا تھا کہ اُس کو آپ نے چھوڑ دیا۔ اس واقعہ کی خبر خلیفہ کو پہنچی۔ خلیفہ کو غصہ آیا اور اُن کے پکڑ لانے کا حکم ہوا۔ حاضر کیئے گئے۔ خلیفہ نے ایسی جرائت کی وجہ دریافت کی تو آپ نے کہا حق تعالیٰ کا حکم ہے

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ	حکم کر کہنے کا اور روک برائی
عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا	سے جو تکلیف تجھ کو پہنچے اُس
أَصَابَكَ	پر صبر کر۔

خلیفہ نے پوچھا کہ ایک کو کیوں چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ اس کے توڑنے میں نفس کی آمیزش ہو گئی تھی۔ اس لئے چھوڑ دیا۔ وہ اس طرح کہ جب میں انیس مٹکے توڑ چکا تو نفس کے اندر خیال ہوا کہ تو نے بڑا کام کیا کہ خلیفہ کی بھی پرواہ نہ کی۔ اس بات پر نفس پھولا۔ تو میں نے ایک کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ کام خالص اللہ کے واسطے نہ رہا تھا۔ خلیفہ پر اس اخلاص کا یہ اثر ہوا کہ اُن کا معتقد ہو گیا اور محتسب شہر بنا دیا۔ اسی طرح نفس کی کید کی طرف اس گنوار کا فہم بھی پہنچا۔

یہ حکایت (گنوار کی) اس پر یاد آگئی تھی کہ میں نے کہا تھا کہ دین اختیار کرنے سے آدمی کا فہم بھی درست ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کو وہ باتیں منکشف ہوتی ہیں جو علماء کو بھی نہیں ہوتیں۔ یہ تو نعمت معنوی تھی باقی حسی نعمتیں بھی ایسے شخص کو اوروں سے زیادہ عطا ہوتی ہیں۔

چند غلط فہمیوں کا ازالہ

چنانچہ سب نعمتوں کی روح اطمینان ہے اور اس شخص کو اطمینان کہ اگر خاص دین کے ہو جاؤ گے تو اوروں سے اچھے رہو گے، ایسا میسر ہوتا ہے جو مال سے بھی کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک اور بات کہتا ہوں کہ دنیا کی چیزوں سے اگر تعلق کم ہو گیا تو ضرر کیا ہوا بلکہ تعلق کم ہونے سے تو اور قید سے رہائی ہو جائے گی بہر حال یہ اثر ہے دین میں کہ دنیا کا فکر و غم کم ہو جائے گا۔ یہ خود اس میں خاصیت ہے۔

باقی بعضوں کا یہ خیال بالکل ہی غلط خیال ہے کہ پہلے دنیا کے سب کام پورے کر لیں، اس کے بعد دین حاصل کر لیں گے۔ کیونکہ دنیا کا سلسلہ تو کبھی ختم ہی نہیں ہوتا۔ ع

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد

بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ ساری عمر دنیا کے قصوں میں گزر جاتی ہے۔ دین کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔ بس اگر کامیابی کی صورت ہے تو یہی ہے کہ دین کا کام شروع کر دو۔ یہ انتظار ہی مت کرو کہ پہلے دنیا کا کام تمام کر لیں پھر دین کا کام کریں گے۔ دین کی روشنی پھیلنے سے فضول دنیا کی ظلمت خود ہی جاتی رہے گی اور میں تو کہتا ہوں کہ اگر اس کی ہمت نہ ہو تو چلو یہ بھی نہ سہی بلکہ یوں کرو کہ دونوں کو ساتھ ساتھ شروع کر دو۔ دنیا سے فارغ ہونے کا انتظار مت کرو۔ دین خود دنیا پر غالب آ جاوے گا۔

دنیا کے ساتھ دین شروع کرنے کے متعلق بھی لوگ ایک بڑی غلط فہمی

میں مبتلا ہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ طاعت و تجارت میں منافات ہے پھر دنیا کے ساتھ دین کیسے شروع کریں۔ اُن کا یہ خیال ہے کہ دکانداری نہ ہو تب طاعت ہو سکتی ہے۔ دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ حق تعالیٰ اس غلطی کو بھی رفع فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔	یعنی تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غفلت نہیں ڈالتی۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی صفت بیان فرما رہے ہیں کہ اُن کو تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غفلت نہیں ڈالتی۔ یوں نہیں فرمایا رِجَالٌ لَا يَتَّجِرُوْنَ کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ تجارت نہیں کرتے۔ اگر دونوں میں منافات ہوتی تو یوں فرماتے۔ پس معلوم ہوا کہ دونوں میں منافات نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تجارت تو وہ لوگ کرتے ہیں مگر تجارت اُن کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی۔ ذکر اللہ بیع و تجارت کو چھوڑاتا نہیں البتہ غفلت سے روکتا ہے۔

بہرحال ایک غلطی تو یہ ہے کہ بعض لوگ یوں خیال کرتے ہیں کہ دنیا کو جب تک بالکل نہ چھوڑ دیں، دین کیا اختیار کریں اور دنیا چھوڑنا مشکل اس لئے وہ دین کو اختیار ہی نہیں کرتے حالانکہ دین دنیا کو چھوڑاتا نہیں۔ یہ غلطی تو اُن لوگوں کی ہے جو ہنوز دین کے طالب ہی نہیں ہوئے۔ اس غلطی کا سبب یہی دین و دنیا میں تنافی کا اعتقاد ہے۔

ایک وہ لوگ ہیں جن کے قلب میں دین کی عظمت ہے اور بزعم خود اُس کے طالب بھی ہیں مگر اُن کی یہ حالت ہے کہ جس کو فقیر سن لیا اُس کی تعظیم

کرنے لگے۔ گو وہ تعظیم شرک ہی کیوں نہ ہو۔ اگرچہ منشا اس تعظیم کا عظمت ہے دین کی مگر اس عظمت میں غلو ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ پیروں ہی کے ہو لئے اور بیوی بچوں سے بے تعلق ہو گئے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تجارت اور دین میں تنافی ہے اس لئے دنیا کو بالکل قطع کرتے ہیں۔ اس غلطی کا سبب بھی وہی دین و دنیا کی تنافی کا اعتقاد ہے۔

ایک غلطی نئی تعلیم یافتوں کو ہوتی ہے کہ وہ خالص دنیا کے قصد کو ضروری نہیں سمجھتے۔ انہوں نے اصل اور مقصود بالذات دنیا ہی کو قرار دے رکھا ہے اس کے تابع دین بھی سہی۔ دین کو دنیا کے ساتھ ایسا سمجھتے ہیں جیسا دو پٹہ میں ٹیک اصل مقصود تو دنیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تھوڑا لگاؤ دین کا بھی سہی۔ دین کو متبوع نہیں سمجھتے جیسے کپڑا تو اصل ہے اور بیک اس کے تابع۔ اسی طرح یہ لوگ دنیا کو اصل قرار دے دیتے ہیں کہ اگر وقت بچے تو خیر دین کا کام بھی کر لو۔ اگر نہ بچے تو مت کرو۔

بعض کا یہاں تک خیال ہے کہ مذہب صرف اس لئے ہے کہ دنیا کی ترقی کی جائے۔ بعض کو جنت و دوزخ سے بھی انکار ہے۔ کہتے ہیں کہ صرف ڈرانے کی غرض سے جنت و دوزخ کا ذکر کیا گیا ہے کوئی واقعی چیز نہیں۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ غیر واقعی چیز سے جس کا غیر واقعی ہونا بھی بتلا دیا جائے کیسے تخویف ہو سکتی ہے۔ جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ جس چیز سے ڈرایا جا رہا ہے اس کا وجود الفاظ ہی میں ہے واقع میں نہیں تو وہ اس سے کیا خاک ڈرے گا۔ پس یہ دعوے عقلاً بھی غلط ہوا کہ صرف ڈرانے کی غرض سے دوزخ

کا ذکر کیا ہے۔ جب عقلاً یہ مصلحت محض باطل ہوئی تو یوں کہو کہ فضول ذکر کیا ہے۔ سو ایسا ایمان واسلام آپ ہی کو مبارک ہو۔ جو خدا کی طرف لغو اور عبث کو منسوب کرے۔ اور اگر فرض بھی کر لو نعوذ باللہ جنت و دوزخ واقعی کوئی چیز نہیں اور اللہ تعالیٰ نے محض بطور پالیسی کے اُن کا ذکر کیا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ جب خدا نے ہم کو ڈرایا ہے تو یہ تو معلوم ہو گیا کہ اُس کی غرض یہی ہے کہ لوگ جنت و دوزخ کا اعتقاد رکھیں تو پھر اس کی کیا وجہ کہ خداوند تعالیٰ ایک پالیسی قائم رکھنا چاہتے ہیں اور آپ اُس کو توڑنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کے ذمہ یہ بات لازم نہیں کہ خدا کی پالیسی کی حفاظت کریں۔ نہ معلوم ان لوگوں کی عقل کہاں چلی گئی یا مسخ ہو گئی۔

علاوہ اس کے اگر جنت دوزخ کا وجود نہیں تو اُن سے ڈرانا ایسا ہوا جیسے ہوّے سے بچوں کو ڈرایا کرتے ہیں کہ اس کا وجود کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ جھوٹ بولا۔ پھر اس کا بھی قائل ہونا پڑے گا کہ نیز اللہ تعالیٰ بے وقوفوں ہی کے ڈرانے کو ہیں۔ ان عاقلوں کے ڈرانے کو نہیں کیونکہ ہوّا سے تو بے وقوف ہی ڈرا کرتے ہیں۔ لندن کی ہوا کھانے والے خاک ڈریں گے۔ سبحان اللہ! کیا عظمت کی ہے ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی۔ عنقریب معلوم ہو جائے گا آخرت میں۔ غرض ان لوگوں کے نزدیک اصل تو ہے دنیا باقی دین و مذہب وہ محض دنیا کی حفاظت کے لئے ہے۔

مذہب کا اثر اس طرح سے مشاہدہ ہے کہ مذہب کے برابر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا جب مذہب کی پابندی ہوگی تو فتنہ فساد

نہ ہوگا کوئی کسی کا حق نہ مارے گا، چوری نہ کرے گا۔ آپس میں اتفاق قائم رہیگا
پس دُنیا پُر امن ہو گی۔ گویا مذہب اُن کے نزدیک اس لئے بنایا گیا ہے کہ
دنیا کی حفاظت رہے۔

صاحبو! اس سے تو سارا قرآن و حدیث ہی اڑا جاتا ہے۔ پھر چونکہ اصل
مقصود ان کے نزدیک، دنیا ہے اور اہل دین مقصود دین کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے
یہ لوگ دین والوں کو بے وقوف بھی سمجھتے ہیں۔ اور اس اعتقاد کا ایک اثر یہ
بھی ہے کہ اپنوں سے بوجہ طالب دین ہونے کے غیر معتقد اور غیر قوموں کی
بوجہ طالب دنیا ہونے کے مدح کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ مذاق ہے۔ دلیل
اس کی یہ ہے چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں جو بات بھی ہے وہ تو ان
کے نزدیک بری اور غیر قوموں میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اچھی۔ ہمیشہ اپنے
لوگوں کی برائی اور غیر قوموں کی مدح کرتے رہتے ہیں۔

ایک اثر یہ ہے کہ علماء کی بات کو نہیں مانتے کیونکہ ان کو تو بیوقوف
شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ علماء ہمیشہ سے کہتے آرہے ہیں کہ مسلمانوں میں ایک
جماعت خالص مذہبی ہونی چاہیئے جو محض مذہب کی خدمت کرے مگر
یہ لوگ اس میں قیل و قال کرتے رہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ان کی یہ
ساری قیل و قال اسی وقت تک رہی جب تک کہ غیر اقوام نے اپنے اندر
ایسی مذہبی جماعت پیدا نہیں کی تھی۔ اور اب جو وہ ایسا کرنے لگے تو یہ بھی ان
ہی کا دم بھرنے لگے۔ کہ مذہبی جماعت ضرور ہونا چاہیئے۔ چنانچہ غیر قوموں کی
دیکھا دیکھی اب کسی قدر یہ بھی علماء کے ہم زبان ہو گئے ہیں۔ بس ان کا مشرب

وہی ہو جاتا ہے جو غیر قوموں کا مشرب ہو جاوے۔ حالانکہ بفضلہ تعالیٰ ہمیں قوموں سے کسی چیز کے لینے کی کچھ بھی حاجت نہیں۔ ہمارے یہاں تو سب کچھ ہے مگر ان کی مثال ایسی ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں ؎

یک سبد پُر نان ترا بر فرق سر   تو ہمی جوئی لب نان در بدر

ایک ٹوکرا روٹیوں کا بھرا ہوا تیرے سر پر رکھا ہوا ہے اور تو روٹی کا ٹکڑا در بدر مانگتا پھرتا ہے۔

ہمارے یہاں تو جواہرات بھرے ہوئے ہیں اور یہ دوسروں سے کوڑیوں کے طالب ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ تقلید کرتے ہیں غیر قوموں کی حالانکہ اپنے یہاں سب کچھ ہے۔

کورانہ تقلید

اور طرفہ یہ ہے کہ اس کورانہ تقلید میں پریشانی بھی اٹھاتے ہیں۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک اچھے صاحب تھے جنٹلمین، مگر کے غریب تھے اس لئے کوٹ پتلون بھی صرف سوتی گبرون کا تھا جس میں ذرا گرمی نہ تھی۔ جاڑے کا موسم، ریل میں سفر کر رہے تھے اور جنٹلمینی لباس پہنے ہوئے تھے۔ کان بھی کھلے ہوئے سر بھی کھلا ہوا۔ ایک انگریز نے لیمن پانی اور برف پیا۔ آپ نے بھی تقلید میں برف پیا۔ بس اینٹھ گئے۔ ایک اور صاحب جو مجھ سے اس حکایت کو بیان کرتے تھے اسی درجہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے پاس رضائی تھی۔ اُن کو صاحب بہادر کے حال پر رحم آیا۔ اُنہوں نے کہا کہ رضائی لیتے ہو۔ کچھ انکار نہ کیا چپکے سے لے لی۔ سب اینٹھ مروڑ نکل گئی۔ خدا کے بندے کو اس حالت میں بھی برف پینا رہ گیا تھا مگر صاحب

بہادر کیلئے نہیں، اگر ایسا نہ کریں۔ وہی مثل ہے ؎

کلاغے تگِ کبک در گوش کرد
تگ خویشتن را فراموش کرد

ایک کوئے نے چکور کی چال اختیار کی اپنی چال کو بھول گیا۔

ایک اور صاحب بہادر ریل میں سفر کر رہے تھے اور ایک مولوی پرانے خیال کے سیدھے سادے چلن والے بھی اُسی درجہ میں بیٹھے ہوئے تھے اور اُن کے ساتھ صراحی تھی۔ اُس میں اُنہوں نے پانی بھر کر رکھ لیا تھا کیونکہ راستہ میں پانی کی کمی تھی۔ آپ صراحی کو دیکھ کر کہتے ہیں یہ کیا بھنگیوں کا سا برتن لیا ہے۔ اُنہوں نے کہا، جیسا میں ہوں ویسا ہی میرا برتن ہے۔ چونکہ بیچارے سادے کپڑے پہن رہے تھے اور ایسے لوگوں کی آج کل کچھ قدر نہیں۔ بلکہ ایسے لوگوں کو یہ لوگ دقیانوسی خیال کا کہتے ہیں۔ اس لئے اُنہوں نے ایسی بیباکی کی گفتگو کی۔ صاحب بہادر کو اتفاق سے شدت کی پیاس لگی اور پانی ساتھ رکھنا خلافِ تہذیب تھا۔ اب لگے کن انکھیوں سے مولوی صاحب کی صراحی کو تکنے مگر شرم کے مارے مانگیں کیسے۔ واقعی کریم النفس اہل اللہ پر ختم ہے۔ مولوی صاحب کو اُن کی حالت پر رحم آیا۔ کوئی اور ہوتا تو کبھی رحم نہ کرتا، اُنہوں نے قرائن سے معلوم کر لیا کہ اس کو پیاس لگی ہے مگر شرم کی وجہ سے کہہ نہیں سکتے تو یہ مولوی صاحب بتکلف آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے اور تھوڑی ہی سی دیر میں مصنوعی خراٹے بھی لینے لگے تاکہ یہ صاحب سمجھیں کہ سو رہے ہیں۔ جب اپنے خیال میں اُنہوں نے سوتا ہوا سمجھ لیا تو اپنی جگہ سے اٹھے صراحی سے پانی پینے کے ارادے سے۔ یہ بھی چپکے چپکے دیکھتے رہے۔ صاحب بہادر نے

صراحی اٹھائی مگر ڈرتے جاتے ہیں کہ کہیں جاگ نہ جائیں۔ مگر اس وقت انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ اس خیال سے کہ بیچارے غریب کو پانی پی لینے دو پیاسا رہ جائے۔ دیکھئے کیا حوصلہ ہے اہل اللہ کا۔ غرض آپ نے خوب پانی جب پانی پی کر صراحی رکھنے لگے تو مولوی صاحب نے فوراً ہاتھ پکڑ لیا اور کہا، ہائیں! آپ نے بھنگیوں کے برتن سے پانی کیسے پی لیا۔ اب تو بڑے خفیف ہوئے اور کہا، معاف کیجئے میں اپنی بات کو واپس لیتا ہوں۔ مجھ سے حماقت ہوئی۔ پھر جو صاحب بہادر کو معلوم ہوا کہ مولانا کسی اسکول پروفیسر بھی ہیں۔ اب تو لگے تعظیم کرنے۔

ایسے لوگوں کا ایک فیشن یہ بھی ہے کہ سفر میں بستر بچھونا نہیں لیتے۔ پا کا برتن ساتھ نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں کہ جہاں جائیں گے وہاں بستر بچھونا موجود اور پانی اسٹیشنوں پر ملتا ہی ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے۔ کچھ نہیں صرف غیر قوم کی تقلید ہے خواہ اس میں تکلیف ہی ہو۔

ان کے اسی مذاق کی بناء پر میں نے الہ آباد میں ایک وعظ میں جنٹلمینو سے خطاب کیا تھا کہ صاحبو! لندن سے داڑھی رکھنے کا فتویٰ آنے والا اخبار کی خبر ہے کہ لندن والوں نے اس پر رائے دی ہے کہ داڑھی رکھنی چاہئے اب قبل اس کے کہ وہ لوگ داڑھی رکھیں تم جلدی داڑھی رکھ لو۔ کیونکہ اگر اب نہ رکھی اور بعد میں تو ضرور ہی رکھو گے تو لوگ مطعون کریں گے کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے سے تو نہ رکھی اور لندن والوں کے کہنے سے رکھ لی اس لیے ابھی سے رکھ لو تاکہ بدنامی نہ ہو۔

اسی طرح علماء کی اس بات کو کہ ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو محض دین کی خادم ہو اور کوئی کام اس سے نہ لیا جاوے کسی نے نہیں مانا تھا۔ مگر ابھی تھوڑے دنوں سے ہندوؤں نے یہ کام شروع کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ایک جماعت مذہبی ایسی ہونی چاہیئے جو صرف مذہب کی خدمت کرنے والی ہو اور کوئی کام اس کے متعلق نہ ہو۔ بس دن رات یہی کام کیا کرے، تو مسلمان بھی کچھ کچھ سمجھنے لگے۔

غرض ان کو شب و روز دنیا ہی مقصود ہے۔ مذہب کو یہ لوگ محض اس لئے اختیار کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے مصالح دنیا محفوظ رہیں۔ باقی دین کو دینی حیثیت سے اختیار نہیں کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو دینی امور کو از خود اختیار کرتے۔ اسی کو پسند کرتے۔ دوسری قوموں کے کیوں منتظر رہتے۔ بس ایک غلطی ان لوگوں کی یہ ہے کہ دنیا کو اصل مقصود اور دین کو تابع قرار دیتے ہیں حالانکہ

لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ	تجارت اور خرید و فروخت ان کو اللہ سے غافل نہیں بناتی۔

کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا تو مقصود نہیں بلکہ دین اصل مقصود ہے۔ اگر دنیا مقصود ہوتی تو یوں فرماتے لَا تُلْهِيهِمْ ذِكْرُ اللّٰهِ عَنِ التِّجَارَةِ یعنی ذکر اللہ کے شغل سے تجارت میں غفلت نہیں ہوتی۔ اب تو یوں فرما رہے ہیں کہ تجارت اور بیع ان کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصود دین ہے۔

بعثتِ انبیاء کا مقصد

یہ مسئلہ تو مسلمانوں کے نزدیک بالکل بدیہی بلکہ حسی ہے کہ اگر دین مقصود نہ ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام نے دنیا کمانے کے طریقے نہیں بتلائے ہیں۔ صرف احکام بتلائے ہیں اور چونکہ عقلی مسئلہ ہے کہ فعل کا اثر قول سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے میں پوچھتا ہوں کہ اگر دنیا مقصود تھی تو اللہ تعالیٰ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کا نمونہ کیوں نہیں بنایا۔ اس طرح سے کہ آپ کا کوئی کارخانہ ہوتا اور بہت بڑا کارخانہ ہوتا جیسے حضور صلے اللہ علیہ وسلم دین میں بے مثل نمونہ بنے تو دنیا میں بھی بنتے۔ مگر احادیث دیکھ لیجئے کہ آپ کس چیز کا نمونہ تھے۔ اگر حدیث صحیح نہیں، (جیسا کہ ان میں سے بعض کا خیال ہے) تو تواریخ تو موجود ہیں (تواریخ ان حضرات کا دین ایمان ہے) تواریخ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات دیکھئے کہ کیا تھے۔ معلوم ہو جائے گا کہ دنیوی اعتبار سے آپؐ کی کیا حالت تھی ——— !

میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جب تادیباً اپنی بیبیوں کے پاس جانے کی ایک مہینے کے لئے قسم کھالی تھی اور مشہور یہ ہو گیا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے سب کو طلاق دے دی ہے۔ اور اس پر سب لوگ رو رہے تھے۔ اس حالت میں حضرت عمرؓ نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی مگر اجازت نہیں ہوئی۔ حضرت عمرؓ کو شبہ ہوا کہ شاید آپؐ کو خیال ہوا ہے کہ حفصہؓ کی سفارش کرنے آئے

ہیں اور اگر ایسا ہوا تو اُن کی سفارش ماننی پڑے گی۔ اس لئے اجازت نہیں ملی۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے پکار کر عرض کیا کہ میں حفصہؓ کی سفارش کرنے نہیں آیا۔ اگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم آپؐ فرمائیں تو میں حفصہ کا سر اتار لاؤں میں صرف واقعہ معلوم کرنے آیا ہوں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو آنے کی اجازت دے دی۔

وہ حاضر ہوئے۔ اس کے بعد اُن کی نظر دولت خانہ کی ہیئت پر پڑی تو دیکھا کہ گدے ہیں کھجور کے پتے بھرے ہوئے ہیں اور کچھ چمڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ بس یہ کائنات تھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سامان کی نہ بکس نہ الماری نہ میز نہ کرسی نہ بنگلہ نہ کوٹھی نہ اور کوئی ساز و سامان۔ اس حالت کو دیکھ کر حضرت عمرؓ کے آنسو جاری ہو گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، یہ قیصر و کسریٰ خدا تعالیٰ کے دشمن، صلیب پرستی کرنے والے، اُن کے پاس تو یہ ساز و سامان اور آپ کی یہ حالت۔ آپؐ خدا تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ آپؐ کی اُمت پر دنیا کی وسعت فرمائیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ادب سے یہ نہیں کہا کہ آپؐ پر وسعت فرما دیں۔ جیسے کہتے ہیں کہ آپ کے خادموں کو ایسا کر دیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم اُن کی یہ بات سُن کر اُٹھ بیٹھے اور فرمایا

اَفِیْ شَکٍّ اَنْتَ یَا عُمَرُ۔ اے عمرؓ! تم ابھی تک شک ہی میں ہو۔

ان لوگوں کو تو جو ملنا تھا سب کچھ دنیا میں مل گیا ہے وہاں کچھ نہیں۔ اور ہمارے لئے آخرت کی راحت ہے۔ یہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

اور یہ معاشرت ہے۔ آج کل بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حدیث مولویوں کی گھڑی ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تمہارے نزدیک تاریخ تو گھڑی ہوئی نہیں تاریخ ہی کو دیکھ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں دنیا کم تھی یا زیادہ۔ سو حدیث میں بھی ہے اور تاریخ میں بھی ہے کہ دنیا آپ کے یہاں بہت ہی کم تھی۔ یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ آپ کے یہاں مہمان آئے ہیں۔ پوچھنے پر آپ کے سارے گھروں سے جواب آیا کہ گھر میں پانی تو ہے اور کچھ نہیں۔ کیا اس واقعہ سے نہیں معلوم ہوتا کہ آپ صرف دین کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ قرآن ہی کو دیکھ لیجئے دین کے ساتھ کہیں دنیا کا مطلوبیت کے ساتھ نام بھی نہیں لیا گیا جس جگہ ذکر ہے دین ہی کا بالذات امر فرمایا ہے۔ ایک جگہ بھی ایسی نہ ملے گی جہاں بالذات دنیا کی رغبت دلائی ہو۔

کسبِ حلال اور حُبِّ دنیا

باقی میں کسبِ حلال سے منع نہیں کرتا کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ حدیث ہے پس کسبِ حلال تو فرض ہے۔ ہاں حُبِّ دنیا سے منع کیا جاتا ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے۔

حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ کہ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

صاحبو! ایک تو یہ ہے کسبِ دنیا اور ایک ہے حُبِّ دنیا۔ کسبِ دنیا جائز اور بعض مواقع پر واجب اور فرض بھی ہے اور حُبِّ دنیا حرام ہے اور اُن میں باہم تلازم نہیں نہ کسبِ دنیا کے لئے حُبِّ دنیا لازم اور نہ حُبِّ دنیا

کے لئے کسب دنیا لازم۔ کیونکہ کسب دنیا اُس وقت بھی ممکن ہے کہ معاش
حاصل کرے مگر اُس کے ساتھ شغف نہ ہو۔ اسی طرح حبِ دنیا اس وقت بھی
ہو سکتی ہے کہ کمائے بھی نہیں مگر اُس کے ساتھ شغف ہو۔ مثلاً کوئی شخص دنیا نہ
کماتا ہو مگر دین سے بھی غافل ہو تو اُس کو حبِ دنیا حاصل ہے اور کسب دنیا حاصل
نہیں۔ کیونکہ دین سے غفلت ہونا یہی حب دنیا ہے اور بعض جگہ دونوں جمع ہو
جاتی ہیں یعنی کسب دنیا بھی ہو اور حبِ دنیا بھی ہو۔ مثلاً ایک شخص دنیا بھی کماتا
ہے اور دین سے بھی غافل ہے۔ اور بعض جگہ دونوں نہیں ہوتیں۔ نہ کسب دنیا
نہ حبِ دنیا۔ مثلاً کوئی شخص کسبِ دنیا نہیں کرتا اور دین سے غافل بھی نہیں۔ غرض
حبِ دنیا و کسب دنیا متلازم نہیں۔ بعض محب ہیں کاسب نہیں۔ اور یہ بھی ہو
سکتا ہے کہ کوئی کاسب ہو اور محب نہ ہو سو ہم حبِ دنیا سے منع کرتے ہیں
باقی کسب دنیا وہ تو خاص قیود کے ساتھ ضروری ہے۔ آپ یہ سُن کر تعجب
کریں گے کہ شرعی فتوے سے تجارت فرض کفایہ ہے اسی طرح زراعت بھی
فرض کفایہ ہے کیونکہ زندگی موقوف ہے اُن چیزوں پر اور ضروریات معاش
کی تحصیل فرض کفایہ ہے اور فرض کفایہ وہ ہے کہ بعض کے کر لینے سے بقیہ
لوگوں کے ذمہ سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ خیال بالکل ہی غلط
ہے کہ علماء کسبِ دنیا سے منع کرتے ہیں۔ بھلا فرض کفایہ سے کون منع کر سکتا
ہے۔ بس محبِ دنیا ہونا تو کسی کو جائز نہیں۔ باقی کسب دنیا میں کسی قدر تفصیل ہے
یعنی ایک وہ شخص ہے کہ جس کو کسبِ دنیا ضروری ہے۔ اور بعض وہ ہیں جن
کے لئے کسب دنیا ضروری نہیں۔ بیان اس کا یہ ہے کہ جس شخص کو عدم کسب کی

حالت میں پریشانی ہو تو پریشانی کی حالت میں کسب دنیا ضروری ہے۔ اُن کو چاہیئے کہ کسب دنیا کرے۔

علماء اور کسبِ دنیا

ایک وہ لوگ ہیں کہ اُن کے دنیا میں نہ مشغول ہونے سے کسی کا حرج نہیں۔ نہ اُن کا نہ اہل عیال کا۔ سو یہ لوگ اگر کسب دنیا نہ کریں تو کچھ حرج نہیں۔ خصوص ایسی حالت میں کہ اگر وہ دنیا میں مشغول ہوں تو دین کی خدمت نہ کرسکیں۔ اُن کے لئے کسب دنیا مناسب نہیں بلکہ ترک کسب سے تشویش میں نہ پڑیں۔ اللہ کے ایسے بندے بڑے بڑے ہوئے ہیں۔ مگر ایک جماعت ہے دنیا پرستوں کی۔ وہ ایسے حضرات پر طعن و اعتراض کرتے ہیں کہ یہ اپاہج ہیں، آرام طلب ہیں۔ حالانکہ یہ مسئلہ عقلی بھی ہے چنانچہ اس مضمون کو ایک مسلّم عند العقلاء (عقلمندوں کے نزدیک) مثال سے سمجھاتا ہوں جو بالکل مذاق جدید کے موافق ہے۔

وہ یہ کہ سرکاری قانون ہے کہ جو شخص سرکاری ملازم ہو اُس کو دوسرا کوئی کام تجارت وغیرہ کرنا ممنوع ہے۔ مثلاً کوئی شخص سرکاری ملازم ہو اور وہ ٹھیکہ لینے لگے تو سرکاری طور سے اُس پر گرفت ہوگی۔ چنانچہ ایک شخص ملازم تھے اُنہوں نے ملازمت کی حالت میں مطبع کیا۔ کچھ روز کے بعد کسی نے مخبری کردی۔ اُن پر شبہ ہوگیا۔ بہت قصہ پھیلا۔ گو پورا ثبوت نہ ہونے سے بری تو ہوگئے مگر وہ پریشان اتنے ہوئے کہ اُنہوں نے ملازمت ترک کردی۔

غرض سرکاری آدمی کو اجازت ہی نہیں کہ وہ دوسرا کام کرے۔

اس قانون پر کوئی روشن دماغ اعتراض نہیں کرتا۔ لیکن اگر بڑی سرکار (یعنی اللہ میاں) کا کوئی ملازم ہو اور اس لئے وہ اسباب معاش کو ترک کر دے، تو اُس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ نکمے ہیں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ تعجب ہے کہ اللہ میاں کے فتوے کی تصدیق نہ ہو اور حکام کے فتویٰ کی تصدیق ہو۔ قَالَ اللّٰہُ وَقَالَ الرَّسُوْلُ (اللہ تعالےٰ نے فرمایا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) پر قناعت نہ ہو اور قَالَ الْحُکَّامُ پر قناعت ہو میں گورنمنٹ کے اس قانون کا راز بتلاتا ہوں گو میرے ذمہ تو ہے نہیں مگر خیر تبرعًا بتلاتا ہوں۔

اس میں حکمت یہ ہے کہ ایک شخص دو طرف پورا متوجہ نہیں ہو سکتا اگر ملازم سرکار دوسرا کام کرے گا تو ضرور سرکاری کام میں خلل واقع ہو گا۔ اس لئے اس کو اجازت نہیں کہ بحالت ملازمت دوسرا کام کرے اسی طرح جو لوگ مولویوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ دنیا کی ترقی کیوں نہیں کرتے، مشینیں اور کارخانے کیوں نہیں چلاتے، تو وہ مثال مذکورہ کو پیش نظر رکھ کر خوب سمجھ لیں کہ جب یہ لوگ دنیا میں مشغول ہوں گے تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا یہی ہوگا کہ دین کا کام نہ کر سکیں گے۔

ایک مولوی صاحب جو ایک دینی ملازم تھے مگر لکڑیوں کی تجارت بھی کرتے تھے، خود اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ مدرسہ کے وقت میں طلباء کو پڑھانے بیٹھے ہیں کہ گاہک آ گیا۔ اس نے لکڑی کا سودا کرنا چاہا بس مولوی صاحب کشمکش میں پڑ گئے۔ اگر اٹھتے ہیں تو مدرسہ کا حرج، اگر نہیں اٹھتے، تو

خریدار لوٹا جاتا ہے۔ مجبوراً اُس سے کہتے ہیں بھائی ابھی اٹھتا ہوں ذرا ٹھہر و۔ اس میں تھوڑا جھوٹ بھی تھا۔ غرض اُن کا دل بٹ جاتا۔ سبق میں کچھ سے کچھ بیان کر جاتے۔ پہلے تو طالب علموں کو ہنسی خوشی بتلا رہے تھے، اب دل دوسری طرف ہو گیا۔ طلباء کچھ پوچھتے ہیں اور پوچھنے کے سبب اٹھنے میں دیر ہوتی ہے تو اُن پر جھنجلاتے ہیں، غصے ہوتے ہیں۔ بس علماء کے دنیا میں مشغول ہونے کا یہی اثر ہوتا ہے کہ وہ دین کا کام پوری طرح نہیں کر سکتے

انہی کے متعلق ایک اور قصہ ہے کہ ایک روز میں راستہ میں جا رہا تھا ایک بڑھیا اپنے دروازے میں جھانک رہی تھی۔ مجھ کو دیکھ کر بولی کہ بیٹا، یہاں آنا۔ میں گیا تو بولی، کہ ایک مسئلہ بتا دو۔ وہ یہ کہ زکوٰۃ دینا مدرسہ میں جائز ہے یا نہیں۔ میں نے مسئلہ بتلا دیا۔ پھر کہنے لگی کہ میں نے اُن سے (یعنی لکڑیوں والے مولوی صاحب سے) بھی پوچھا تھا۔ انہوں نے بھی تمہارے موافق بتلایا مگر مجھ کو اُن کا یقین نہ ہوا کہ شاید اپنے مطلب کو کہتے ہوں۔ اب تمہارے بتلانے سے یقین ہوا کیونکہ تم پر یہ شبہ نہیں۔ خیر میں نے بڑی بی کو سمجھا دیا کہ ایسا گمان علماء پر جائز نہیں۔

یہ ہے علماء کے دنیا میں مشغول ہونے کا نتیجہ۔ تو معلوم ہو گیا کہ مسائل تک میں اُن کا اعتبار نہیں رہتا۔ میں کہتا ہوں جو لوگ علماء کو مشورہ دیتے ہیں دنیا میں مشغول ہونے کا اگر علماء اُن کی رائے پر عمل کریں تو سب سے پہلے یہی لوگ اُن کو مردود ٹھہرائیں گے۔ اس لئے علماء کو یہ مشورہ مت دو کہ وہ دنیا میں مشغول ہوں۔ اُن کے مشغول ہونے میں بڑی خرابی یہ ہے کہ خود تم کو اُن

کے فتاویٰ کا، اُن کے وعظوں کا اعتبار نہ رہے گا۔

غرض علمار کے دنیا میں مشغول ہونے کا یہ اثر ہے۔ اسی لئے میری رائے یہ ہے کہ علمار سے چندہ کی تحریک بھی مت کراؤ۔ انہیں چندہ وصول کرنے کے لئے مت مقرر کرو۔ اس میں بھی اُن کا اعتبار جاتا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ چندہ کی تحریک روٴسار کریں۔ اُن کی تحریک کا اثر زیادہ ہوگا کیونکہ وہ خود بھی دیں گے۔ علمار کی طرف سے تو یہ خیال ہو گا کہ وہ دوسروں ہی سے کہنے کو ہیں خود کبھی کچھ بھی نہیں دیتے۔ علمار سے وہی کام لو جس کے لئے وہ ہیں (یعنی ان سے دین سیکھو) مگر آج کل علمار سے وہ کام لیا جاتا ہے جو اُن کا نہیں ہے۔ کانفرنسوں میں لوگ علمار کو صرف اس لئے بلاتے ہیں کہ اُن کے قال اللہ اور قال الرسول کے ذریعہ سے خوب چندہ ہوگا۔ سبحان اللہ! مولوی کیا ہوئے بھاڑے کے ٹٹو ہوئے۔ علمار کو بھی چاہیئے کہ وہ ایسے امور سے احتراز کریں۔ علمار کا طرز تو وہ ہونا چاہیئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز تھا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا تو یہ حکم تھا۔

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ	اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم کرو۔

یہی اُن کا طرز بھی ہونا چاہیئے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے

اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ	یا آپ اُن سے کچھ آمدنی چاہتے ہیں تو آمدنی تو آپ کے رب کی سب سے بہتر

ہے اور وہ سب دینے والوں سے اچھا ہے۔

سو مانگنا علماء کا کام نہیں۔ ان قصوص کی بناء پر اُن کی شان کے خلاف ہے۔ اور وہ بات بھی ہے جو اوپر بیان کی گئی یعنی اُن پر بدگمانی بھی ہوتی ہے اور رؤساء پر یہ بدگمانی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جو شخص پچاس روپیہ اپنی جیب سے دے گا تو اوروں سے پچاس لے سکتا اور یہ رؤساء کر سکتے ہیں۔ اس لئے علماء کو چاہئے کہ وہ اس کام کو نہ کریں۔

علماء و امرائے کے اختلاط کا اثر

پھر یہ تحریک علماء کے فرض منصبی بھی مخل ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مولوی صاحب کہتے تھے کہ چندہ کے واسطے امراء کے دروازوں پر جانے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اگر ہم کسی امیر کے پاس جائیں اور وہ شطرنج کھیل رہے ہوں، تو ہم اُن کو منع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم اپنی غرض کو اُن کے پاس جاتے ہیں اس لئے دبنا پڑتا ہے۔ غرض ان مقاصد کے سبب علماء کا اختلاط امراء سے اچھا نہیں اکثر اُن کے اختلاط سے خود مولوی بگڑ جاتے ہیں۔

ایک کابلی مولوی صاحب مجھ سے ایک حکایت بیان کرتے تھے کہ میں ایک وزیر ریاست کے پاس بیٹھا تھا۔ وزیر صاحب داڑھی صاف کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیسا حسین چہرہ دیا ہے مگر جو چیز چہرہ کی زینت ہے اُس کو آپ مٹا دیتے ہیں۔ اس کہنے سے وہ کچھ شرما گئے۔ ایک دوسرے مولوی صاحب اُن کے ہاں اور بیٹھے تھے وہ خوشامد میں کیا کہتے ہیں کہ داڑھی کبھی نہ رکھنی چاہیئے اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ

اُن میں جوئیں پڑ جاتی ہیں اور باہم زنا کرتی ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر یہ چکلہ آپ نے کیوں رکھ چھوڑا ہے۔ اور باہر آکر میں نے ان مولوی صاحب کو بہت ڈانٹا اور کہا کہ تم کو خوف نہ ہوا کہ ایسی باتوں سے ایمان جاتا رہتا ہے۔ تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم جب مکان سے چلتے ہیں، ایمان تو فلاں نالہ پر چھوڑ آتے ہیں۔

سو علماء کے لئے امراء کا اختلاط ایسا سم قاتل ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جو چیز علماء کے پاس ہے (یعنی علم) امراء کو بزعم خود اس کی ضرورت نہیں اور جو چیز امراء کے پاس ہے (یعنی مال)، علماء کو اس کی ضرورت ہے اس واسطے ان کو امراء کے پاس جاکر جھکنا پڑتا ہے۔ اس لئے حق بات نہیں کہہ سکتے۔ پس علماء کو تو آزاد رہنا چاہیئے اور ان کی آزادی کی یہ حالت ہونی چاہیئے ؎

زیر بار اند درختاں کہ ثمر ہا دارند
اے خوشا سرو کہ از بندِ غم آزاد آمد

پھل دار درخت زیر بار ہیں۔ سرو بہت اچھا ہے کہ غم کی قید سے آزاد ہے۔

اور اس آزادی کے ساتھ دین کی خدمت کرتے رہیں۔

علماء اور تنخواہ

باقی یہ کہ پھر ان کی معاش کا کیا انتظام ہوگا۔ سو اس کی دو صورتیں ہیں یا تو توکل کریں یا پابندی سے جو خدمت کریں تدریس یا تبلیغ اس پہ کسی مدرسہ یا انجمن سے تنخواہ مقرر کرالیں۔ پھر اس

پر اگر کوئی سوال کرے کہ یہ تو پھر وہی دین فروشی ہوئی جس کی خدمت کی جا رہی
سو میں اس کی تحقیق بتلاتا ہوں۔ سنیئے اصولی اور عقلی مسئلہ ہے کہ جو کوئی کسی
خدمت میں محبوس ہو اُس کا نفقہ اُس کے ذمہ ہوتا ہے اور یہ قاعدہ تمام د
کے عقلاء کا معمول بہ ہے۔ حتیٰ کہ سلاطین تک کے لئے بھی یہی قانون نا
ہے۔ بادشاہ کو جو خزانہ سے تنخواہ ملتی ہے وہ بھی محض اس لئے کہ وہ زما
کے کام میں محبوس ہے۔ کیونکہ بادشاہ وہ ہے جس کو ساری قوم حاکم بنا
ہے اور اس کو بیت المال کے خزانہ سے تنخواہ دیتی ہے۔

اب یہ دیکھو کہ وہ خزانہ کس چیز کا نام ہے۔ اس کی حقیقت بتلاتا ہو
ساری قوم سے جو چندہ جمع کیا جاتا ہے کہ ایک پائی زید کی اور ایک پا
عمرو کی اور ایک پائی بکر کی۔ جس کوٹھڑی میں اس کو جمع کیا جاتا ہے اس
کا نام خزانہ ہے۔ حقیقت اس کی وہی چندہ ہے۔ وہ بھی قومی چندہ ہے
اسی سے بادشاہ کو تنخواہ ملتی ہے۔ صرف خزانہ کے لفظ سے اُس کی عزت
بڑھ گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ خزانہ شاہی ہے مگر حقیقت اُس کی وہی چند
قومی ہے۔ پس یہی حقیقت اُس چندہ کی ہے جس سے مولویوں کو تنخواہ یا
نذر ملتی ہے۔ مگر مولویوں کے حق میں چندہ سے تنخواہ ملنے کو لوگ ذلت سمجھ
ہیں اور بادشاہ کے لئے ذلت نہیں سمجھی جاتی۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ بادشا
کو ایک لاکھ ملتے ہیں، اس لئے ذلت نہیں خیال کی جاتی اور مولوی بیچارو
کو تھوڑی مقدار ملتی ہے۔ اس لئے اس کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور
الزام رکھتے ہیں کہ مولوی خیرات کے ٹکڑے کھاتے ہیں مگر بغور دیکھئے حقیقت

دونوں جگہ ایک ہی ہے اور جب حقیقت ایک ٹھہری تو جس نے چندہ میں سے ایک پیسہ لیا اُس کی کم ذلت ہونا چاہئے اور جس نے زیادہ لیا اُس کی زیادہ ذلت ہونی چاہئے۔

اب رہی یہ بات کہ بادشاہ کو خزانہ سے تنخواہ ملنے کے استحقاق کی علت کیا ہے۔ سو وہ استحقاق کی علت یہ ہے کہ وہ ملک کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے کیونکہ وہ قوم کی خدمت کرتا ہے۔ اس لئے اس کا نفقہ رعایا کے ذمہ ہے اور بادشاہ پر کیا موقوف ہے۔ سب کو چندہ قومی ہی سے تنخواہ ملتی ہے۔ کلکٹر کو بھی، ڈپٹی کلکٹر کو بھی، جج کو بھی، منصف کو بھی۔ بس یہ مسئلہ عقلی ہوا اور اسی قاعدہ کو شریعت نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ جیسے زوجہ کا نفقہ اُس کے شوہر پر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اُس کے پاس محبوس ہوتی ہے۔

اب بتلائیے یہ علت علماء کے استحقاق تنخواہ وغیرہ میں بھی مشترک ہے یا نہیں کیونکہ وہ بھی قوم کی دینی خدمت میں محبوس ہیں۔ اس لئے اُن کا نفقہ بھی قوم کے ذمہ ہے۔ کیونکہ جب تک وہ معاش سے فارغ نہ ہوں دین کا کام کر نہیں سکتے۔ اگر ان کی خدمت نہ کی جاوے گی تو وہ کھائیں گے کہاں سے اور اس صورت میں اُن پر کسی کا احسان بھی نہیں۔ کبھی کوئی احسان کرنے لگے۔ اس لئے کہ اگر وہ تنخواہ وغیرہ لیتے ہیں تو آپ کی دینی خدمت بھی تو کرتے ہیں۔ پس آپ کے ذمہ تو اُن کا قرض ہے۔ اگر یہاں دنیا میں نہ دیا تو شاید آخرت میں اگلوائیں اور یہ دوسری بات ہے کہ وہ قیامت میں

معاف کر دیں اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ انشاء اللہ معاف ہی کر دیں گے۔ غرض علماء چونکہ قوم کی دینی خدمت میں محبوس ہیں اس لئے ان کی تنخواہ یا نذرانہ قوم کے ذمہ ہے۔ البتہ کسی خاص وعظ پر نذرانہ ٹھہرا کر لینا یہ ناجائز ہے۔ باقی جو محبوس ہونے کے سبب تدریس یا تبلیغ پر تنخواہ لیں گے وہ جائز ہے۔ ایسا نہ ہو تو پڑھنے پڑھانے کا اور تبلیغ کا سلسلہ ہی ختم ہو جاوے گا۔ اور سارا دین درہم برہم ہو جاوے۔ اس تقریر سے دونوں باتوں کا جواب نکل آیا۔ ایک تو یہ کہ مولوی تنخواہ وغیرہ کیوں لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خیرات کے ٹکڑے کھاتے ہیں۔ سو خوب سمجھ لو کہ اگر یہ لوگ خیرات کے ٹکڑے کھاتے ہیں تو بادشاہ اور وائسرائے اور جج، کلکٹر سب ہی خیرات کھاتے ہیں۔ اگر یہی بات ہے تو کسی کو بھی تنخواہ نہ لینی چاہیے۔ کیونکہ سب کو قوم ہی کے چندے سے تنخواہ ملتی ہے۔

آزمائش علماء

مگر اس تقریر سے کوئی مولوی صاحب دھوکا میں نہ پڑ جائیں کہ ہم تو دین کی خدمت کر رہے ہیں اور ہماری تنخواہ نفقہ حبس ہے۔ اس لئے ہم کا سب دنیا نہیں۔ خوب سمجھ لیجئے اور اپنے معاملات میں غور کر لیجئے ان معاملات اور واقعات سے کاسب دنیا ہونے نہ ہونے کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ معاملہ محل غور یہ ہے کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ مولوی صاحب ایک جگہ نوکر ہیں۔ دین کی خدمت کر رہے ہیں اور پچاس روپے تنخواہ پاتے ہیں اور اس میں گذر بھی اوسط درجہ کا ہو رہا ہے تنگی بھی نہیں، پچاس روپے کافی ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں ایک اور جگہ

سے خط آیا ملازمت کا کہ مبلغ سو روپے تنخواہ ملے گی یہاں چلے آؤ۔ شاید کہیں طلباء نے بیچاروں کی تعریف کر دی ہوگی۔ بعض مدرسین اس لئے بھی طلباء کی خاطر کرتے ہیں کہ کہیں مہتمم سے ان کی برائی نہ کر دیں اور نوکری جاتی رہے۔ اسی طرح بعض مہتممین بھی طلباء کی بہت خاطر داری کیا کرتے ہیں اگرچہ وہ نا قابل ہی ہوں کہ کہیں مدرسے سے چلے نہ جائیں جس سے مدرسہ کی رونق کم ہو جانے پھر اس سے چندہ کم ہو جائے۔ حالانکہ مدرسہ علمی کا مہتمم عالم باعمل ہونا چاہئے جو علم کے سبب تو بھلے برے کو سمجھتا ہو۔ کیونکہ ناواقف ہونے کی صورت میں طلباء کی جرأت بڑھتی ہے۔ اور جو عالم ہوگا وہ سب باتوں کو سمجھے گا اور طلباء پر اس کا دباؤ ہوگا۔ یا اگر مہتمم عالم نہ ہو تو کم از کم علماء باعمل کی صحبت میں رہا ہو۔ ہر بات کو سمجھتا ہو یہ نہ ہو کہ نہ عالم ہو نہ صحبت یافتہ ہو اور عمل کے سبب حسد و طمع و غرض سے پاک ہو۔ خواہ اپنی غرض یا مدرسہ کی غرض سے تکثیر سواد یا تکثیر چندہ پر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ کہیں طلباء نے مولوی صاحب کی تعریف کر دی تو مال سے سو روپیہ تنخواہ کی ملازمت آگئی۔ اب اس سے دین یا دنیا کی طلب کا حال معلوم ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ وہاں نئی جگہ میں نفع مالی بھی زیادہ ہے عزت بھی زیادہ ہے، مگر دین کی خدمت کا موقع زیادہ نہیں بلکہ دین کی خدمت اس جگہ زیادہ ہے جہاں تنخواہ پچاس روپیہ ہے مگر کافی ہے۔ اب دیکھا جائے گا کہ مولانا پھسلے تو نہیں۔ اگر لکھ دیا کہ میں نہیں آنا چاہتا ہوں میرا گزر ہو رہا ہے تو سمجھا جائے گا کہ مقصود ان کا دین کی خدمت ہے اور

تنخواہ نبھائے رہے ہیں اور ان کی تنخواہ جز لائے جبس اور میری تقریر کا معداق ہے۔ اور جو مولانا چل دیئے تو سمجھا جائے گا کہ مولانا دنیا دار ہیں۔ انہوں نے جو تنخواہ کو جز لائے جبس بنایا تھا وہ صحیح نہ نکلا بلکہ محض دھوکا تھا۔ اسی طرح جب مولوی صاحب کسی مدرسہ میں نوکر ہونے لگیں اور وہاں ایسی صورت ہے کہ جو تنخواہ ہم کو ملے گی ہمارا گزارہ معمولی طریقہ سے اس میں ہو سکتا ہے۔ اگر اس کو ہم نے بطیب خاطر اختیار کر لیا اور واقع میں ہمارے مناسب حال بھی یہی تھا کہ تین پانچ نہ کریں تو سمجھا جائے گا کہ تنخواہ لینا دراصل مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود دین ہے اور اگر باوجود کافی ہونے کے پھر بھی تین پانچ کر کے تنخواہ طے ہوئی تو معلوم ہو گا کہ مولوی صاحب دنیا دار ہیں۔

اب تو یہ حالت ہے کہ گویا جر مولی کا سا مولویت کا بھاؤ ہونے لگا ہے لوگ بیس روپے تنخواہ کہتے ہیں اور وہ مولانا کے گزر کے لئے کافی ہے مگر مولانا کہتے ہیں کہ چالیس لوں گا جب رہوں گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ تیس لے لیجئے۔ مولانا کہتے ہیں کہ اچھا نہ ہمارا کہنا رہے نہ تمہارا پینتیس سہی۔ آپس میں جھگڑا تکرار ہو رہا ہے۔ بالکل گاجر اور مولی کا سا سودا ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول ہی نظر میں لوگوں کے دل سے اتر جاتے ہیں۔ خیر کہنے سننے سے پینتیس قرار پا گئے۔ پھر تھوڑے دنوں میں مولانا کے بچہ ہو گیا۔ اب درخواست ہے کہ ہمارے ذمہ ایک خرچ آ گیا ہے۔ ذرا خیال رکھئے گا۔ اب اس جستجو میں ہیں کہ تنخواہ میں اضافہ ہو جائے۔ وقتاً فوقتاً لوگوں کے کان میں یہ بات ڈالتے ہیں۔ خیر لوگوں نے طوعاً و کرہاً چالیس کر دیئے۔ پھر اس پر بھی قناعت نہیں۔

سال چھ مہینے میں دوسرا بچہ ہو گیا۔ اب پھر لوگوں کے سر ہیں۔ درخواستیں کرتے کرتے لَا تَقِفُ عِنْدَ حَدٍّ تک نوبت پہنچتی ہے۔ پس اگر یہ صورت ہے تو دنیاداری ہے۔ اور اگر دوسری صورت ہے کہ تنخواہ میں گزر ہونے کی صورت میں اس کو چھوڑ کر زیادہ تنخواہ پر نہیں لگے یا جو تنخواہ گزر کے قابل مل گئی منظور کر لی۔ کچھ تین پانچ نہ کیا اور خدمت دین میں مشغول ہو گئے تو ایسے شخص کو کاسبِ دنیا نہ کہا جائے گا۔

یہ تو معیار تنخواہ کی صورت میں تھا لیکن اگر کسی میں قوتِ توکل اعلیٰ درجہ کی ہو اور وہ تنخواہ وغیرہ سب چھوڑ دے تو سبحان اللہ! مگر ہر ایک کے لئے یہ صورت درست نہیں کیونکہ سب میں یہ قوت نہیں یا کسی میں قوتِ توکل خود اپنی ذات کے واسطے تو ہے مگر اہل وعیال میں قوتِ توکل ایسی نہیں ہے۔ یعنی اگر تنخواہ نہ لیں تو وہ لوگ پریشان ہو جائیں۔ تو ایسے شخص کو بھی تنخواہ چھوڑنا درست نہیں کیونکہ یہ بھی ایک عبادت ہے کہ انسان اپنے اہل وعیال کی کوئی خدمت کرے۔ ان کے حقوق کو ادا کرے۔ غرض اس بات میں لوگوں کے مختلف حالات ہیں۔ بعض کو مال کے ہونے سے پریشانی ہوتی ہے بعض کو نہ ہونے سے پریشانی ہوتی ہے اور ہونے سے اطمینان رہتا ہے۔ پس جس کو جس طرح اطمینان اور جمعیتِ قلب حاصل ہو وہ کرنا چاہیئے۔

اہل اللہ کا استغناء

میں نے جو ابھی عرض کیا ہے کہ بعض کو مال کے ہونے سے پریشانی ہوتی ہے اس پر تعجب نہ کیا جائے۔ واقعی اللہ کے بعضے بندے ایسے بھی ہیں جن کو مال کی کثرت سے

بار ہوتا ہے۔ وہ یوں سمجھتے ہیں کہ جس قدر مال زیادہ ہوگا اُن کے حقوق کا ادا کرنا اتنا ہی مشکل ہوگا۔ اس لئے ایسے لوگ کثرتِ مال سے گھبراتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو ایک صاحب مطبع میں ملازم رکھنا چاہتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ علمی لیاقت تو مجھ میں ہے نہیں۔ اس لئے بڑا کام تو کر نہیں سکتا۔ البتہ قرآن کی تصحیح کر لیا کروں گا۔ اس میں دس روپیہ ماہوار دے دیا کرو (اللہ اللہ کیا تواضع اور زہد ہے)

اسی زمانہ میں ایک ریاست سے تین سو روپیہ ماہانہ کی نوکری آگئی مولانا جواب میں لکھتے ہیں کہ میں آپ کی یاد آوری کا شکر گزار ہوں۔ مگر مجھ کو یہاں دس روپے ملتے ہیں جس میں پانچ روپے تو میرے اہل وعیال کے لئے کافی ہو جاتے ہیں اور پانچ بچ جاتے ہیں۔ آپ کے یہاں سے جو تین سو روپے ملیں گے، اُن میں پانچ روپے تو خرچ میں آئیں گے۔ آگے دو سو پچانوے جو بچیں گے میں اُن کا کیا کروں گا۔ مجھ کو ہر وقت یہی فکر لگا رہے گا کہ ان کو کہاں خرچ کروں۔ اس لئے معذور ہوں۔ اس لئے تشریف نہیں لے گئے۔

اسی کے ساتھ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو بھی لکھا تھا اور سو روپیہ تنخواہ لکھی تھی۔ مولانا نے دوسرا جواب دیا کہ میں آ سکتا ہوں مگر تین سو روپے سے کم میں نہیں آ سکتا۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے فرمایا کہ مولانا ذرا سنبھل کر جواب لکھئے۔ اگر تین سو کی منظوری پر طلبی آ گئی تو وعدہ پر جانا پڑیگا تو مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اُس کے ساتھ یہ جملہ بھی بڑھا دیا کہ مگر اک

میں ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ جب چاہوں گا یہاں رہوں گا، جب چاہوں گا وہاں رہوں گا۔ وہ رئیس صاحب سمجھ گئے کہ ان حضرات کو آنا ہی منظور نہیں اور واقعی جانا تھوڑا ہی منظور تھا۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے یہ بات ظرافت کے طور پر لکھ دی تھی۔

اللہ اکبر! کس قدر استغنا تھا ان حضرات میں۔ واقعی اہل اللہ کے دل پر مال کی کثرت سے بھی بار ہوتا ہے۔ اُن کو خیال ہوتا کہ خدا معلوم اس کے حقوق ہم سے ادا ہوں یا نہ ہوں۔

میرے ذوق میں اسی لئے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو سلطنت دی گئی تھی تو اس کے ساتھ اُن کی یہ خاص تسلی بھی حقوق ادا ہو سکنے یا نہ ہو سکنے کی کر دی گئی تھی۔ ارشاد ہے۔ هٰذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ کہ یہ ہماری عطا ہے خواہ کسی پر احسان کرو یا جمع کرو یعنی عطا وامساک بالکل تمہارے اختیار میں ہے۔ آپ پر کسی قسم کی پابندی نہیں۔ تم سے اس کا کوئی حساب نہ ہوگا۔ اس تسلی کے بعد اُن کو سلطنت سے گرانی نہیں ہوئی ورنہ گھبرا جاتے اور ایک دن بھی بادشاہت نہ کر سکتے۔

اس آیت پر ایک بات یاد آگئی کہ آج کل تعلیم جدید والے ترقی دنیا پر اس سے دلیل پکڑتے ہیں اور کہتے ہیں کیا سلیمان علیہ السلام بادشاہ نہ تھے معلوم ہوا ترقی دنیوی محمود ہے۔ اوّل تو ان لوگوں کو تمام انبیاء علیہم السلام میں دلیل پکڑنے کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام ہی ملے ہیں۔ میں کہتا ہوں کیا اور انبیاء علیہم السلام دنیا میں نہیں ہوئے۔ اُن کے حالات بھی

لینے چاہئیں۔ دیکھ لیجئے کہ ان میں سے اکثر کی بلکہ قریب قریب کل انبیاء علیہم السلام کی کیا حالت تھی۔ سب کی حالت قریب قریب فقر کی رہی ہے۔
دوسرے خود یہ استدلال بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ حکمت الٰہیہ سے ہر زمانہ کا ایک خاص مقتضا ہوتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں بڑے بڑے جبّار اور متکبر بادشاہ تھے۔ اس وقت کا مقتضا یہی تھا کہ نبی کو بطور معجزہ ایسی سلطنت دی جاوے جس کا سب لوہا مان لیں۔ اسی واسطے جانوروں اور ہوا تک پر ان کو حکومت دی گئی کہ تمام بادشاہ پست ہو گئے۔ پس سلطنت ان کا معجزہ تھا۔ یہ راز تھا ان کی سلطنت میں، ترقی دنیا مطلوب نہ تھی۔ چنانچہ اس حالت میں بھی حسب نقل عارف رومی۔ ع

زاں سلیمانؑ خویش را مسکیں بخواند

یعنی آپ اپنے کو مسکین ہی کہا کرتے تھے اور اپنی ذات کے لئے بادشاہی سامان سے کام نہ لیتے تھے بلکہ حسب نقل بہشتی زیور اپنی دستکاری زنبیل سازی کے پیسوں سے کھاتے پیتے تھے اور بادشاہت سے گھبراتے تھے کہ مبادا حقوق کی ادائیگی میں کمی رہ جائے۔ اس لئے آپ کے بارے میں ارشاد ہوا۔

فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ پس خواہ کسی پر احسان کرو یا بے اندازہ جمع کرو۔

کہ ہم ان حقوق کے متعلق آپ سے حساب نہ لیں گے۔ آپ نہ گھبرائیے۔

جمعیتِ قلب

میں نے اوپر اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ اصل چیز جمعیت قلب ہے جس طریقہ سے بھی حاصل ہو بعض کو پریشانی ہوتی ہے۔ مال کے ہونے سے اُن کے لئے مال کا نہ ہونا اچھا اور بعض کو جمعیت ہوتی ہے مال کے ہونے سے۔ اُن کے لئے مال کا ہونا اچھا۔ ہر ایک کی حالت جدا ہے۔ پس اگر کسی کو مال کے نہ ہونے سے تکلیف نہ ہو اُسے چاہئے کہ خدا نے جس کام کے لئے اس کو پیدا کیا ہے۔ بس صرف وہی کام کرے۔

اس بیان پر ایک شبہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ ادھر تو وجوباً یا اباحۃً یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں لگو اور اس کے ساتھ ہی یوں کہا جاتا ہے کہ غافل مت رہو۔ دونوں باتوں کا اجتماع کیسے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب دنیا میں لگا جاوے گا تو دوسری طرف سے غفلت ضرور ہوگی۔ یہ تو وہ بات ہو گئی ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش

(گہرے دریا میں تو نے مجھے تختہ سے باندھ دیا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ ہوشیار رہ کہ دامن نہ بھیگے۔)

میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض غیر محقق ہی کرے گا۔ محقق کبھی یہ اعتراض نہ کرے گا۔ بات یہ ہے کہ امور غیر مطلوبہ دو قسم کے ہیں اختیاری اور غیر اختیاری امور غیر اختیاری میں تو ملامت نہیں۔ وہ تو اختیار سے باہر ہیں۔ انسان اُن کا مکلف نہیں کیا گیا۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا

دُوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے البتہ امور اختیاریہ پر ملامت ہے۔ پس غفلت ایک تو اختیاری ہے اور ایک غیر اختیاری ہے۔ غفلت اختیاری میں تو ملامت ہے اور غیر اختیاری میں بالکل ملامت نہیں۔

مثلاً ایک نیک کام کیا جو توجہ کے ساتھ کرنا چاہیئے تھا اور بلا اختیار اُس میں غفلت ہو گئی تو یہ موجب ملامت نہیں۔ اس صورت میں "درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ" کہاں ہے؟ کیونکہ اس میں ملامت ہی نہیں ہاں یہ سوچنا کہ قلب کی ایسی حالت کیوں ہے کہ دنیا میں لگ کر اللہ سے غفلت ہو جاتی ہے۔ اور یہ سوچ کر غفلت دور کرنے کی تدبیر کرنا یہ امر اختیاری ہے۔ اس اصلاح میں کوشش نہ کرنے پر بے شک ملامت ہے جیسا قرآن کا بلا اختیار غلط پڑھنا قابل ملامت نہیں۔ ہاں صحیح پڑھنے کی کوشش نہ کرنا یہ اختیاری ہے اور قابل ملامت ہے۔

غرض یہ سوچنا کہ غفلت کا سبب کیا ہے پھر اس کی تدبیر کرنا یہ امر اختیاری ہے۔ جب اس کا سبب سوچے گا یہ معلوم ہو گا کہ خدا کی محبت قلب پر غالب نہیں ورنہ غفلت کیوں ہوتی۔ جن حضرات میں خدا کی محبت غالب ہوتی ہے اُن کے تمام کام خدا ہی کے واسطے ہوتے ہیں گو ظاہر میں وہ دنیا کے کام معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کو دنیا میں لگ کر بھی خدا سے غفلت نہیں ہوتی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو اُس کی معشوقہ نے بلایا اور وہ بیچ

چاہتا ہے کہ معشوقہ کے پاس اس ہیئت سے جاؤں کہ وہ دیکھ کر خوش ہو اس لئے حجام کو بلایا کہ وہ خط بنائے، غسل کرے اچھے کپڑے پہنے اور اس کے بعد محبوبہ کے پاس جائے تو جو شخص عشق سے خالی ہے وہ اُس کو اس شغل میں دیکھ کر یوں کہے گا کہ یہ تو اپنے بناؤ سنگار میں مصروف ہے محبوب سے غافل ہے مگر اُس کو کیا خبر ہے کہ اُس کی نیت ہر چیز میں محبوب ہی کے لئے ہے۔ کپڑے پہنتا ہے تو اس نیت سے کہ محبوب خوش ہوگا اور غسل کرتا ہے تو اس نیت سے کہ محبوب کو اچھا لگوں گا غرض اُس کی ہر چیز میں محبوب ہی مقصود ہے۔ جب یہ حالت ہے تو اُس کو محبوب سے غافل کس طرح کہیں گے۔ اگر تم بھی حق تعالیٰ کی محبت کو غالب کر لو تو دنیا کے ہر کام میں تمہارا بھی یہی حال ہو جائے گا۔ اب جو ہم کو دنیا میں لگ کر خدا سے غفلت ہو جاتی ہے تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ محبتِ حق غالب نہیں اور اس محبت سے مراد وہ محبت ہے جس کا انسان مامور ہے۔ سو اس محبت کا غالب کرنا اختیاری ہے اس لئے ہمارے ذمہ ہے کہ محبت الٰہی کو دل میں غالب کریں۔ باقی اس کے اختیاری ہونے کی دلیل وہ مشاہدہ اور واقعات ہیں۔ آزما کر دیکھ لو، تدبیر کر کے دیکھ لو۔ خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ یہ امر اختیاری ہے ۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب گر دلیلت باید ازوے رُو متاب

سورج کا نکلنا سورج کے وجود پر دلیل ہے اگر تم کو دلیل کی خواہش ہے تو اس سے منہ پھیرو۔

جب اختیاری ہے تو اس کی تدبیر کیجئے اور ہر کام تدبیر ہی کرنے

سے ہوتا ہے۔ نری تمنا یا باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر آپ چاہیں کہ تعریج کر کے اور محض وعظ سن کر کام ہو جاوے تو یہ نہیں ہو سکتا ؂

کار کن کار بگذر از گفتار　　کاندریں راہ کار باید کار

کام کرو باتوں کو ترک کرو۔ اس راہِ سلوک میں کام کرنا چاہیئے کام ـــــ!

طریق تربیت

اب تدبیر کے متعلق یہ سوال ہو گا کہ کیا دنیا کو چھوڑ دیں۔ یہ سوال اس لئے پیدا ہوا ہے کہ کسی غیر محقق کے ہاتھ میں پھنس گئے تھے۔ اُس نے اسی طرح تبلایا ہو گا۔ اُس نے تبلا دیا ہو گا کہ ایک وقت کھانا کھایا کرو۔ چھ مہینے میں بیوی بچوں کو دیکھ لیا کرو۔ نیز طاقت سے زیادہ کام تبلا دیا ہو گا۔ کیونکہ آج کل کے پیروں میں یہ بھی ایک مرض ہے کہ وسعت سے زیادہ کام تبلا دیتے ہیں۔ جس سے وہ پریشان ہو کر ہمت ہار دیتا ہے اور مایوس ہو جاتا ہے۔ اسی واسطے مولانا شیوخ کو تعلیم فرماتے ہیں ؂

چار پا را قدر طاقت بار نہ　　بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ

چار پایوں پر ان کی طاقت کے مطابق بوجھ لادو۔ کمزوروں کو اُن کی ہمت کے موافق کام دو۔

طفل را گر ناں دہی بر جائے شیر　　طفل مسکیں را ازاں ناں مردہ گیر

بچہ کو اگر بجائے دودھ کے روٹی دی جائے تو بچہ کو اس روٹی سے مردہ سمجھو۔

اگر بچہ کو بوٹیاں کھلانے لگو گے تو اُس کا پیٹ پھٹے گا یا نہیں۔ اسی کی شکایت عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خستگان را چو طلب باشد و قوت نبود

گر تو بیداد کنی شرطِ مروّت نبود

کمزوروں میں جب طلب ہو اور قوت نہ ہو، اگر تم اُن کی ہمت سے زیادہ کام دے کر ظلم کرو تو مروّت کے خلاف ہے۔

یہ ان پیروں کو خطاب ہے جو محقق نہ ہوں۔ شیوخ کو چاہئے کہ ہر ایک کی حالت دیکھ کر اُس کے مناسب تعلیم کریں۔ جیسے کوئی مریض طبیب سے یوں کہے کہ میں نادار ہوں قیمتی نسخہ کا متحمل نہیں ہو سکتا، ارزاں نسخہ لکھ دو۔ تو طبیب کو چاہئے کہ اس کی حیثیت کے موافق نسخہ تجویز کرے۔ اسی طرح شیوخ باطن کو طالب کی طاقت و ہمت کا لحاظ لازم ہے۔ اگر کسی کو ایک سال کا دستور العمل ایک دن میں بتلا دیا تو وہ کس طرح کرے گا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ کام چھوڑ کر بیٹھ رہے گا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑے اور کام ہو جاوے۔ کچھ نہ کچھ تو مشقت اٹھانا ہی پڑے گی۔ جو لوگ گھر بیٹھے کام بنانا چاہیں، وہ اپنے گھر پر رہیں مشائخ کو پریشان نہ کریں۔

مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص نے ایک گودنے والے سے کہا کہ میری پیٹھ پر شیر کی تصویر بنا دو تاکہ کمر میں قوت رہے وہ تصویر بنانے بیٹھا اور سوئی چبھوئی۔ اُس نے ایک آہ کی اور پوچھا، کیا

بناتے ہو؟ اُس نے کہا کہ دُم بناتا ہوں۔ آپ بولے کہ دُم نہ بناؤ۔ یہ کوئی کھلا
کھوڑا اڑائے گا۔ اُس نے دم چھوڑ کر دوسری طرف سوئی چبھوئی۔ پھر آہ کی اور
پوچھا کہ اب کیا کرتے ہو؟ اُس نے کہا کہ سر بناتا ہوں۔ آپ نے کہا یہ کون
دیکھے گا کھوڑا ہی۔ ایسے ہی رہنے دو۔ پھر اُس نے پیٹ بنانا چاہا تو آپ
کہتے ہیں کہ یہ کوئی کھائے گا کھوڑا ہی۔ غرض جس عضو کو بناتا تھا۔ آپ یہی کہتے
تھے کہ اس کو کیوں بناتے ہو۔ اس پر بنانے والے نے سوئی پھینک دی اور
کہا ؎

شیر بے گوش و سر و شکم کہ دید　　　　ایں چنیں شیرے خدا ہم نآفرید

شیر بغیر کان اور سر اور پیٹ کا کس نے دیکھا ہے۔ ایسا شیر تو
خدا نے بھی نہیں بنایا میں کیا بناؤں گا۔

آگے مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں نداری طاقتِ سوزن زدن　　　　از چنیں شیر ژیاں لب دم مزن

یعنی اگر تمہارے اندر اتنی بھی طاقت نہیں کہ سوئی کو برداشت
کر سکو تو شیر کا نام بھی مت لو۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ یہ چاہیں کہ رہیں تو اسی مرکز پر جس پر پہلے
سے تھے اور کام ہو جاوے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ دہلی جانا ہو تو ذرا گھر سے
ہٹو بھی تو سہی۔ چلتے تو ہو نہیں اور چاہو کہ دہلی پہنچ جاویں تو کیسے ممکن ہے
اور یہاں تو برخلاف مقاصد دنیا کے کوشش کے بعد ناکامی میں بھی کامیابی
ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ کام کرنے کے بعد جو ناکام رہنے

وہ بھی عنداللہ کامیاب ہے۔ مگر کام تو کرے۔ باقی یہ نہیں ہو سکتا کہ رہو تو اسی چکر میں اور چاہو کہ ہمیں مقصود تک پہنچا دو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

صاحبو! مقصود بہت دور ہے۔ وہ کیا ہے۔ رضائے حق تعالیٰ جس کی مثال جنت کی سی ہے کہ جنت سے پہلے پلصراط ہے اور اس سے پار ہو کر جنت ہے۔ اور جس طرح پلصراط پر رفتار ہر شخص کی مختلف ہو گی بعض بجلی کی طرح عبور کر جائیں گے اور بعض کی رفتار گھوڑے کے سوار کی سی ہو گی اور بعض کی اس سے کم اور بعض کی اس سے بھی کم۔ اسی طرح یہاں سلوک کا مقام اخیر یعنی رضا جنت کے مشابہ ہے اور لوگ اس مقام تک مختلف طرق سے پہنچتے ہیں بعض جلدی اور بعض دیر میں۔ بس جیسے پلصراط پر چلنے کے بعد جنت ملے گی اور بعد تکلیف کے راحت نصیب ہو گی اسی طرح یہاں بھی ہے کہ تکلیف کے بعد راحت نصیب ہو گی۔

باقی اس سے اطمینان رکھو کہ شیخ محقق تمہارے دنیا کے کام نہیں چھڑائیگا بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ وہ حرام نوکری بھی اس وقت تک نہ چھڑائیں گے جب تک حلال میسّر نہ ہو جائے۔ کیونکہ افلاس بعض دفعہ کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا تنگ دستی بعض دفعہ کفر کے قریب ہو جاتی ہے۔

اس لئے محقق عوام کو دنیوی تعلقات ملازمت وغیرہ سے الگ نہیں کرتا۔ حرام نوکری سے بھی تدریجاً الگ کرتا ہے کہ پریشانی نہ ہو۔ پھر

بھی تعجب ہے کہ ایسا راستہ بے خطر اور اس پر بھی ہم نہ چلیں۔ صاحبو! محبت کا طریق گو کسی قدر مشکل تو ہے مگر محال نہیں۔ بس کسی محقق سے تعلق پیدا کرو بوجہ صالح مت ڈھونڈو مصلح کو ڈھونڈو۔ تندرست کو مت دیکھو بلکہ تندرست کنندہ یعنی معالج کو تلاش کرو۔

شیخ وہ ہونا چاہیئے جو خود بھی متقی ہو اور مصلح بھی ہو۔ گو ایسا شیخ تمہارے دنیا کے کام نہیں چھڑائے گا۔ مگر یہ بھی نہیں کہ تم تو کچھ نہ کرو اور شیخ تمہاری اصلاح کی غرض سے تمہارے پیچھے پیچھے پھرے۔ کیونکہ اس کی جوتی کو غرض پڑی ہے جو تمہارے پیچھے پھرے گا۔ بس ان اصول پر فوراً کام شروع کر دو۔ کل پرسوں کا انتظار مت کرو۔ گو یہ دریا ہے ناپیدا کنار ہے مگر جب خدا تعالیٰ کا فضل شامل حال ہو گا تو ان شاء اللہ ایک نہ ایک دن دوسرے کنارہ پر پہنچ ہی جاؤ گے۔ میں مکرر کہتا ہوں اور اطمینان کلی دلاتا ہوں کہ تمہاری معاش میں خلل ہرگز نہ پڑے گا۔

طریق عمل

مگر یہ بھی نہیں کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑے اور پرہیز تو کرنا ہی پڑے گا۔ اگر کسی مریض سے طبیب کہے کہ بھائی دوا پینا اور پرہیز کرنا اور مریض یوں کہے کہ حضور آپ ہی پی لیں۔ آپ ہی پرہیز کر لیں۔ تو ایسے مریض کو کیوں کر شفا ہو گی۔ شفا تو خود مریض کے دوا پینے اور پرہیز کرنے سے ہو گی۔ باقی یہ اطمینان دلاتا ہوں کہ اس طریق میں ذرا بھی تعب اور مشقت نہیں۔ البتہ نفس کے خلاف کرنا پڑے گا۔ سو اس میں کیا مشقت ہے مثلاً پرائی عورت کو مت دیکھو، چوری مت کرو۔ سو اس میں کون سی مشقت ہے بلکہ

یہ تو باتیں وہ ہیں کہ ان کے چھوڑنے سے علاوہ ایصال الی المقصود کے اور بہت سی دینوی مضرتوں سے بچ جاؤ گے۔ پھر تمہارا نقصان ہی کیا ہوا۔ دنیا بھی نہیں گئی بلکہ اور سنور گئی اور دین مل گیا۔ بس صرف مقاومت کرنا پڑے گی نفس کی۔ اور یہ کام تو ضرور کرنا پڑے گا۔ اب تمہیں غرض ہو تو تم اس طرف آؤ۔ آگے تم جانو۔ باقی خدا تعالیٰ کو کوئی غرض نہیں کہ گھیر کر لاویں۔ مگر جب آؤ سمجھ کر آؤ۔ کبھی خام ہوسیں لے کر نہ آؤ کہ اس میں ایسی لذت ہوگی، ایسے انوار ہوں گے۔ کشف و کرامت ہوگی۔ جب کچھ نہ ہو تو بعد میں کہو کہ دھوکا ہی ہوگیا۔

جیسا کسی بدوی نے کلام اللہ میں یہ سن کر کہ خدا نے انجیر اور زیتون کی قسم کھائی ہے انجیر کھالیا تھا۔ بہت اچھا معلوم ہوا۔ پھر آپ نے زیتون بھی کھایا وہ بدمزہ اور پھیکا معلوم ہوا تو آپ کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ زیتون کی بے چکھے ہی قسم کھالی۔ بڑا دھوکا ہوا۔

اسی طرح اس طریق کے زیتون میں پھیکا پن تو ہوگا مگر وہ زیتون ایسا ہے کہ لَا شَرْقِیَّةٍ وَّلَا غَرْبِیَّةٍ (نہ مشرق میں نہ مغرب میں) پھر تو وہ زیتون ایسا اچھا لگے گا کہ کسی چیز کی بھی اس کے سامنے کچھ حقیقت نظر نہ آئے گی۔ جیسے تمباکو کھانے والوں کو تمباکو اوّل اوّل کیسا برا معلوم ہوتا ہے مگر پھر اس سے زیادہ کوئی چیز مزیدار نہیں معلوم ہوتی۔ اسی طرح جب کوئی مرچ کھاتا ہے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے مگر پھر وہی اچھی لگتی ہے کہ گھی بھی اس کے سامنے اچھا نہیں لگتا۔ کیا خدا کے راستے کی چیزیں مرچ سے بھی کم ہیں۔ یہ راستہ بھی اوّل اوّل قدرے دشوار اور بدمزہ معلوم ہوتا ہے مگر پھر تو یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اس

کی تحصیل میں جان و مال سب کچھ دینا گوارا کر لو گے۔ ذرا اس راستہ پر چل کر تو دیکھو میں کہاں تک تفصیل کروں۔ کیا تصوف کا لقمہ منہ میں بنا کر دے دوں۔ پکاؤ اور کھاؤ ترکیب ہم بتلا دیں گے۔ پہلے کچی روٹی پکاؤ گے پھر پھلکے پکانے لگو گے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ روٹی پکانے میں دھواں بھی ضرور لگے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اس طریق میں مقاومت نفس اور شیخ کی ڈانٹ ڈپٹ بھی برداشت کرنی پڑے گی۔ جیسے روٹی پکانے میں دھواں اور آگ کی گرمی ضرور لگتی ہے۔

سختی مشائخ کی حکمت

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ بعض لوگوں پر تیزی فرماتے تھے۔ اس پر ایک تعلقہ دار نے مجھ سے شکایت کی کہ گنج مراد آباد میں تو غلامی کرنا پڑتی ہے۔ اس لئے کوئی اور پیر بتلاؤ جہاں کچھ رعایت ہو۔ بس اتنی سی بات پر برگشتہ ہو گئے۔ صاحبو! اتنے بھڑکے تو لگیں گے ہی۔ مشائخ کی سختی تو برداشت کرنا ہی پڑے گی۔ مگر وہ سختی عین حکمت اور مصلحت ہوتی ہے۔ وہ بے فائدہ سختی نہیں کرتے بلکہ معالجہ کرتے ہیں امراض کا۔ گو سمجھ میں نہ آوے۔

ہمارے ہاں خانقاہ میں ایک شخص تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے شخص کو امر بالمعروف کیا۔ امر بالمعروف ہے تو اچھی چیز مگر مجھ کو ان کے طرز سے یہ محسوس ہوا کہ منشاء اس کا کبر ہے۔ انہوں نے اپنے کو اچھا اور دوسرے کو حقیر سمجھ کر ایسا کیا ہے۔ میں نے ان کو بلایا اور کہا۔ کیا آپ محتسب ہیں یا کسی کی طرف سے مامور ہیں۔ انہوں نے اول اول بہت تاویلیں کیں مگر اخیر میں سمجھے۔ میں نے ان کی یہ سزا مقرر کی کہ خانقاہ کے لوگوں کی جوتیاں سیدھی کیا

کریں۔ چنانچہ وہ کرتے رہے۔ پھر مکان چلے گئے۔ وہاں بھی غالباً کرتے رہے۔ جب میں نے دیکھا کہ مرض نکل گیا۔ لکھ بھیجا کہ اب نہ کرو۔

اُنہوں نے ایک شخص سے بیان کیا۔ واقعی مجھ میں یہ مرض تھا اور مجھ کو اس تدبیر سے اتنا نفع ہوا کہ دس برس کے مجاہدہ سے بھی نہ ہوتا۔ کبھی برسوں کا علاج ایک آن میں ہو جاتا ہے۔ غرض مشائخ کی سختی اور بدمزاجی میں اصلاح ہی ہوتی ہے اس کو سختی سمجھنا غلطی ہے۔

عادت اللہ

اسی طرح اس کے علاوہ ایک غلطی اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ یہ مشہور ہے کہ فلاں بزرگ نے فلانے کو ایک نظر میں غوث کر دیا۔ ایک نظر میں کیمیا بن گئی۔ ایسی باتوں کو سن کر بعضے لوگ پیر کے بھروسا پر کام سے بیٹھ رہتے ہیں اور خیال کر لیتے ہیں کہ پیر ایک نظر میں ہم کو کامل بنا دیں گے۔ ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ سو یہ خیال بالکل غلط ہے۔ کام اپنے ہی کرنے سے ہوتا ہے۔ باقی بعضے واقعات جو مشہور ہیں کہ ایک نظر میں طالب کی کیمیا بن گئی۔ سو یہ بھی ایک درجہ میں صحیح ہے مگر یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ اس اکسیر بننے سے پہلے کتنی دیر لگی تھی اور کیا کچھ ان کو کرنا پڑا تھا کتنے اور کیسے کیسے مجاہدے اُنہوں نے کئے تھے۔ جب اکسیر بنے۔ ہاں عین اکسیر بننے کے وقت دیر نہیں لگی۔ ایک نظر میں کام ہو گیا۔ یہ ہے حقیقت واقعہ کی۔ البتہ کہیں خرق عادت کے طور پر ایسا بھی ہو گیا ہے کہ کچھ بھی نہیں کرنا پڑا۔ صرف ایک نظر میں کام ہو گیا مگر یہ شاذ و نادر ہے۔ وَالشَّاذُّ کَالْمَعْدُوْمِ (نادر مثل نہ ہونے ہی کے ہے) عادۃ اللہ اسی طرح جاری ہے کہ کام کرنے سے ہوتا ہے۔ جو بھی ہوتا

ہے ـــــــ :

شاہ بھیک صاحبؒ حضرت شاہ ابوالمعالی صاحبؒ کے مریدیں ا
کو ایک نظر میں کامل کر دیا تھا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ انہوں نے اس سے پہلے کیا
تھا۔ کتنے ریاضات و مجاہدے کئے تھے۔ اس کے بعد یہ نوبت آئی۔ ایک ا
اُن کے مجاہدہ کا سنئے۔

شیخ نے ایک روز کسی بات پر اُن سے کہا کہ جاؤ نکل جاؤ۔ یہ نکل گ
برسات آگئی۔ گھر گرنے کو ہوگیا۔ بی بی صاحبہ نے کہا، ایسے کاموں کا ایک
ر آدمی تھا، اسے بھی نکال دیا۔ اب گھر کی مرمت کون کرے۔ آپ نے فرما
میں نے نکال دیا ہے تم بلا لو۔ بی بی صاحبہ نے بلا لیا۔ شاہ بھیک صاحب اد
کی وجہ سے پاس نہیں گئے تاکہ حضرت شیخ کو ناگوار نہ ہو۔ بی بی صاحبہ نے ک
کہ بھائی بھیک، چھت خراب ہو گئی۔ کڑیاں ٹوٹ گئیں۔ اس کو درست کر
جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لائے، چھت پاٹی، مٹی ڈالی، کوٹا پیٹا۔ جس وقت
چھت کوٹ رہے تھے، شاہ ابوالمعالیؒ گھر میں تشریف لائے۔ معلوم ہوا
بھیک چھت کوٹ رہے ہیں۔ اُس وقت آپ روٹی کھانے بیٹھے تھے۔
ہاتھ میں لئے ہوئے صحن میں آئے اور فرمایا، لو میاں بھیک! وہ آپ
زبان سے اتنا سنتے ہی چھت پر سے کود پڑے۔ آپ نے ہاتھ پکڑ کر
لیا اور لقمہ منہ میں دے دیا۔ بس ایک لقمہ میں کام ہو گیا اور کامل ہو گئے۔
سو یہ تو صحیح بات ہوئی کہ ایک نظر میں کامل ہو گئے مگر یہ دیکھنا چا
کہ کتنی دقتوں کے بعد اور کتنے مصائب کے بعد۔ سوکھی لکڑی میں آگ ک

جلد لگتی ہے مگر سو کھتی ہے کتنے دنوں میں۔ یہ شیخ کے پاس رہ کر پہلے اپنا گیلا پن تو دور کرو۔ اس کے بعد پھر آگ کا فوراً ہی اثر ہو گا۔ عارف شیرازیؒ اسی کو تو فرماتے ہیں ؎

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند
وندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

کل رات صبح کے وقت غصہ و غم سے مجھ کو نجات دی۔ شب کی ظلمت میں مجھ کو آبِ حیات دی۔

کیمیائیست عجب بندگی پیر مغاں
خاکِ او گشتم و چندیں درجاتم دادند

پیر کامل کی اطاعت عجیب کیمیا ہے۔ اس کے قدموں پر رہا اتنے درجات پا گئے۔

اس میں طریقہ بھی بتلا دیا کہ میں نے شیخ کا اتباع کیا تھا۔ اس کی جوتیوں کی خاک بن گیا تھا۔ اس لئے ایسا ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ طریقہ اختیاری ہے پھر کیا عذر ہے۔ پس اس طریقہ سے غلبہ محبت پیدا کر لو۔ پھر دنیا میں لگ کر بھی اللہ سے غفلت نہ ہو گی۔ یہ ہے کامیابی اور فرضا۔ اگر کامیاب نہ بھی ہوئے تب بھی اسی جماعت کے ساتھ محشور ہوں گے اور یہی معنی ہیں اس کے کہ اس طریق کی ناکامی میں بھی کامیابی ہوتی ہے۔ اسی واسطے اہل طریق کہتے ہیں کہ کام کرنے والے اس طریق میں ضرور کامیاب ہی ہوتے ہیں۔ ناکامی محض کسی کو نہیں ہوتی۔

ذکر اللہ

آگے فرماتے ہیں۔ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ۔ یعنی وہ ایسے بندے ہیں جن کو تجارت اور بیع ذکر اللہ اور نماز اور زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی۔ ذکر فعل قلب ہے اور نماز فعل جوارح عبادت بدنی ہے۔ زکوٰۃ عبادت مالی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تجارت وبیع اُن کو نہ قلب کی عبادت سے غافل کرتی ہے نہ بدنی عبادت سے نہ مالی عبادت سے۔ اس میں یہ بھی بتلا دیا کہ محض عبادت ظاہری کافی نہیں، بلکہ قلب کو بھی عابد و ذاکر بناؤ۔ اور ظاہر ہے کہ ذکر قلبی موقت نہیں۔ کیونکہ اس میں تعین وقت کی قید نہیں۔ وہ تو ہر وقت ہو سکتا ہے۔ کسی کام میں اس سے حرج ہی واقع نہیں ہو سکتا بخلاف دوسرے اعمال کے۔ جیسے نماز ہی ہے مثلاً اُس میں وقت کا اس لئے تعین ہے۔ اگر تعین نہ ہو تو دوسرے ضروریات میں بڑی دقت پیش آئے۔ اسی طرح زکوٰۃ بھی ورنہ مال ہی فنا ہو جاوے جس کا ضرر ظاہر ہے اور تعین دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔

پس مجموعہ دلائل سے یہ حاصل ہوا کہ نماز و زکوٰۃ تو وقت معین پر ادا کرو مگر ذکر ہر وقت کرو یعنی دل سے ہر وقت اللہ کی طرف متوجہ رہو۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

ایک پلک مارنے کی مقدار بھی محبوب حقیقی سے غافل مت ہو شاید کہ تم پر لطف کی نگاہ کریں اور تم آگاہ نہ ہو۔

بس اس میں ہر وقت لگے رہو۔ خدا جانے کس وقت کام بن جاوے اور
گو مقصود اس تقریر کا ذکر قلبی ہی ہے مگر وہ عادۃً پیدا ہوتا ہے، ذکر لسانی سے
اس لئے زبان کو بھی ذاکر بنانا چاہیئے۔ گو کسی وقت ذکر قلبی سے خالی ہی ہو
وہ بھی اگر خلوص سے ہو موثر ہوتا ہے۔
شاید اس پر کوئی ناواقف کلام کرے کہ زبان سے نام لینے سے کیا
ہوتا ہے جب اس کے ساتھ قلبی توجہ نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ کھٹائی کے نام
لینے میں تو یہ اثر مشاہد ہے کہ اس کے نام لینے سے منہ میں پانی بھر آتا ہے
کیا اللہ کا نام اتنا بھی نہیں ہے کہ دل تک اس کا اثر پڑے۔
صاحبو! اعتراض مت کرو۔ اللہ اللہ کہہ لیا کرو۔ پھر خود دیکھ لو گے کیا
اثر ہوتا ہے۔ تجربہ سے یہی ترتیب ہے سلوک کی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى۔ اپنے برتر رب کے نام
کی پاکی بیان کرو۔

میں اس طرف اشارہ بیان فرمایا ہے۔ اس میں لفظ اسم بڑھا کر ابتدا بیان فرمائی
ہے سلوک کی کہ اول اپنے رب کے نام کی تسبیح کرو۔ اسی واسطے سَبِّحْ
رَبَّكَ الْأَعْلَى (اپنے برتر رب کی پاکی بیان کرو) نہیں فرمایا بلکہ اسم کا لفظ
بھی لائے۔ گویا یہ تعلیم فرمادیا کہ ابتدا نام ہی سے کرو۔ اس سے آگے ترقی
ہو جاتی ہے۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں اور تسلی کرتے ہیں ؎

از صفت وز نام چہ زاید خیال وان خیالش ہست دلال وصال

وصف اور نام سے کیسا خیال پیدا ہوتا کہ وہ اس کا خیال وصال

کے لیے رہنما ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب یہ خیال مت کر کہ صفت اور نام سے کیا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس سے خیال پیدا ہوگا۔ پھر وہی خیال رہنمائے وصال ہو جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر فرضاً ذکر لسانی سے نفع موہوم بھی نہ ہو، تب بھی محبوب کا نام لینے میں کم سے کم مزہ تو آوے ہی گا۔ اسی کو ایک شاعر کہتا ہے ؎

اَلَا فَاسْقِنِیْ خَمْرًا وَّقُلْ لِیْ ہِیَ الْخَمْرُ
وَلَا تَسْقِنِیْ سِرًّا مَتٰی اَمْکَنَ الْجَھْرُ

کہ اے ساقی شراب پلاتا جا اور اس کے ساتھ یہ بھی کہتا جا کہ یہ شراب ہے۔

ایسے ہی مجنوں کی حکایت ہے ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد — در بیابانِ غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم — می نمودے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنونِ شیدا چیست ایں — می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشقِ نامِ لیلیٰ می کنم — خاطرِ خود را تسلی میدہم

مجنوں کو کسی نے جنگل میں دیکھا کہ تنہا بیٹھا ہوا اپنی انگلی سے ریت پر کچھ لکھ رہا ہے۔ پوچھا کس کو خط لکھ رہے ہو۔ جواب دیا کہ میں اپنی محبوبہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں اور اپنے دل کو تسلی دیتا ہوں۔

عشق کا خود مقتضا ہے محبوب کا نام لینا۔ جب یہ سمجھ میں آگیا تو بس
چلتے پھرتے زبان سے اللہ کا نام لیتے رہو۔ اس طور پر

لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ — اُن کو اللہ کی یاد سے نہ تجارت
عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۔۔۔ الخ — غافل کرتی ہے نہ خرید و فروخت

کا ایک شعبہ تو حاصل ہو جائے گا۔ اور اگر چند دن ایسا کر کے بھی اعتراض کرو
کہ ہم نے تو ایسا کیا تھا مگر دل میں اثر نہیں ہوا۔ تو وجہ یہ ہو گی کہ آپ نے اس
نیت سے نہیں کیا ہو گا کہ دل میں اثر ہو۔ اگر اس نیت سے کرو تو ضرور اثر
ہو گا۔ آگے ارشاد ہے۔

يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ — وہ اس دن سے ڈرتے ہیں
الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ — کہ اس میں دل اور آنکھیں اُلٹ
پلٹ ہو جائیں گی۔

اس میں عجب کا علاج ہے۔ یعنی اُن کو عبادت کر کے ناز نہیں ہوتا باوجود
عبادت کرنے کے پھر بھی ڈرتے ہیں۔ یہی مضمون دوسری آیت میں بھی ہے

قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ — اُن کے دل ڈرتے ہیں اس
اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۔ — بات سے کہ وہ اپنے رب
کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

پہلی آیت کے ترجمہ کا یہ حاصل ہے کہ وہ ڈرتے ہیں اس دن سے
کہ اُلٹ پلٹ ہو جائیں گے اُس میں دل اور آنکھیں۔ مطلب یہ کہ اُن میں
باوجود عبادت کے پھر خوف ہے، عجب نہیں۔ وہ اپنے اعمال کو ہیچ

سمجھتے ہیں۔

عمل اور اجر

ایک مسئلہ یہاں سے اور مستنبط ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جو عمل کو ہیچ سمجھے گا وہ ثمرات کا منتظر نہ ہوگا۔ تو اس میں اس کی بھی تعلیم ہے کہ اعمال کے ثمرات کا انتظار نہ کرو۔ جیسے آج کل اکثر کی یہ حالت ہے کہ جہاں دو چار روز ذکر کیا اور منتظر ہوئے تجلی کے۔

حضرت حاجی صاحبؒ ان تجلیات کے متعلق فرماتے تھے کہ حجاب نورانی اشد ہیں حجاب ظلمانی سے۔ کیونکہ سالکین کو جو انوار نظر آتے ہیں، وہ ظاہر ہے کہ خدا تو نہیں غیر خدا ہیں۔ مگر یہ عجیب ہونے کے سبب اُن کی طرف توجہ کرتا ہے اُن سے مزے لیتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اُن کو مقصود سمجھنے لگتا ہے۔ بخلاف حجاب ظلمانی کے کہ اُن کی طرف ایسا التفات نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ اشد نہیں۔ مگر لوگ ان ثمرات مانع ہی کو چاہتے ہیں اور انہی کو مقصود سمجھتے ہیں۔ سو ان کے آنے کا ہرگز قصد نہ کرے اور اگر بلا قصد آویں تو ان کی طرف التفات نہ کرے۔

ان کی مثال ایسی ہے جیسے بچہ کو لڈو دے کر یا پیسہ دے کر بہلاتے ہیں، اسی طرح مبتدی سلوک کو اس رنگ آمیزی سے بہلایا کرتے ہیں کہ نشاط سے کام میں لگا رہے۔ سو مقصود کام ہی ہے۔ اسی لئے اکثر یہ انوار عقلاء کو نہیں دکھائے جاتے بلکہ کم عقلوں کو دکھاتے ہیں۔ تاکہ ذکر اللہ کا چسکہ لگ جاوے اور آگے کو قدم بڑھاوے اور میں جو ان انوار کی نفی کر رہا ہوں، وہ بدرجہ مقصودیت ہے ورنہ فی نفسہ وہ محمود ہیں گو مقصود نہیں۔ ان کو مذموم

نہ سمجھنا چاہیئے ۔ اگر خود آئیں آنے دو۔ ان کے دُور کرنے میں بھی پریشانی مت اٹھاؤ۔ اگر نہ آئیں تو مغموم مت ہو کیونکہ مقصودیت کے درجہ میں تو ہیں نہیں نہیں آتے بلا سے مت آئیں۔

اس آیت میں یَخَافُوْنَ یَوْمًا (اس دن سے خوف کرتے ہیں) فرمایا۔ یَخَافُوْنَہٗ نہ فرمایا۔ حالانکہ بظاہر یخافونہ زیادہ مناسب تھا کیونکہ اصل خوف کی چیز اللہ تعالیٰ ہیں۔

سو بات یہ ہے کہ اس میں ایک خرابی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض کو عروج کے مقام میں پہنچ کر فنا کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے جس سے وہ ماسوائے اللہ سے ایسا مستغنی ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کی چیزوں کو بے وقعت سمجھنے لگتا ہے کہ نہ جنت کی پرواہ ہے نہ دوزخ کا ڈر، نہ یوم آخرت سے خوف۔ صرف خدا ہی سے تعلق، محبت یا خوف رہتا ہے اور استغناء میں ایسا غلو عبدیت کے خلاف ہے۔ اس وقت شیخ کامل اس کو عروج سے نزول کی طرف لاتا ہے تاکہ اللہ کی چیزوں کو بے وقعت نہ سمجھے اور اپنے کو خدا کی سب چیزوں کا محتاج جانے، نہ کہ اُن چیزوں کی ذات کی وجہ سے بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے دیکھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا عالی مقام تھا مگر پھر بھی آپ جنت طلب کر رہے ہیں۔ جنت تو جنت کھانے کے بعد حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں غَیْرُ مُوَدَّعٍ وَلَا مُسْتَغْنیً عَنْہُ رَبَّنَا یعنی ہمیں آپ کی ہر چیز کی حاجت ہے۔ ہم آپ کی کسی چیز سے بھی مستغنی نہیں۔ ہم تو بندے ہیں۔ ہر حال اور

ہر چیز میں آپ کی عطاؤں کے محتاج ہیں۔

اہل طریق کا جو قول ہے کہ غیر اللہ سے مستغنی ہو جاؤ اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ کے سوا دوسری چیزوں کو کوئی مقصود سمجھنے لگے۔ اس سے استغنا ہونا چاہئے۔ باقی اس حیثیت سے کہ ان چیزوں کو تعلق ہے اللہ تعالیٰ سے اس حیثیت سے اُن کے ساتھ تعلق رکھے۔ تو اس سے استغنا، نہ ہونا چاہئے بلکہ ان چیزوں کی طرف اپنے کو محتاج سمجھے۔ یہ عین عبدیت ہے۔

پس آیت میں لفظ یَوْمًا لاکر سالک کو علو سے عبدیت کے مقام پر اتارتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خدا سے تو کیوں نہ ڈرتے۔ وہ تو خدا کی چیزوں تک سے بھی ڈرتے ہیں۔ پس یَوْمًا لانے میں یہ نکتہ ہے۔ اور بعض مقام پر یَخَافُوْنَ رَبَّھُمْ (اپنے رب سے ڈرتے ہیں) فرمایا ہے۔ وہاں طرف اشارہ ہے کہ اصل خوف اللہ ہی سے ہونا چاہئے۔ اسی لئے صوفیاء کرام کہتے ہیں کہ اگر عذاب بھی نہ ہو تب بھی خدا سے ڈرنا چاہئے۔

آگے فرماتے ہیں لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰہُ۔ اس میں لام عاقبت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں میں یہ صفات ہوں گے۔ اُن کا یہ انجام ہوگا۔ اُن کو یہ ملے گا اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا میں اَحْسَنَ اور مَا عَمِلُوْا (جو انہوں نے عمل کئے ہیں) ایک ہی چیز ہے۔ لفظ اَحْسَنَ سے یہ تلا دیا کہ ہر عمل تمہارا احسن ہی ہے۔ پس یہ قید واقعی ہے احترازی نہیں۔

جیسے ہم چنوں کو کھاتے ہیں تو پہلے کھلے کھلے انتخاب کر کے کھاتے ہیں اور پھر سب کو کھا جاتے ہیں۔ بے کھلے ہوئے بھی کھلے ہوؤں کے ساتھ کھا

جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی ہے کہ نیک عمل کیسا ہی ہو سب اَحۡسَنَ مَا عَمِلُوۡا میں داخل ہے۔

سبحان اللہ! کتنی بڑی رحمت ہے اور کتنی بڑی تسلی فرمائی ہے اور کتنا بڑا انعام ہے ہم ناچیزوں پر۔ اور ہماری کتنی ہمت بڑھاتے ہیں۔ قرآن میں تدبر کیا جائے تو جابجا رحمت اور تسلی نظر آئے گی۔ چنانچہ ایک موقع پر ارشاد ہے۔

وَاللّٰہُ یَدۡعُوۡۤا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ — کہ اللہ تعالیٰ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتے ہیں۔

یوں نہیں فرمایا۔

وَاللّٰہُ یَدۡعُوۡۤا اِلَی الصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ۔ — اور اللہ تعالیٰ نماز اور زکوٰۃ کی طرف بلاتے ہیں۔

اگر ابتداءً یوں فرما دیتے تو ہم گھبرا اٹھتے اور دل توڑ دیتے۔ قلب پر بڑا بار ہوتا کہ بڑی مشقتوں کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ پس حق تعالیٰ نے یہ رحمت فرمائی کہ عبادات کی طرف بلانے کو سلامتی کے گھر کی طرف بلانا فرمایا تاکہ دل کو رغبت پیدا ہو جاوے۔ پھر اس رغبت سے عبادت کی طرف دل بڑھے۔ واقعی کیا رحمت ہے۔ اس کے علاوہ رحمت اور دل بڑھانا اور دیکھئے وہ یہ کہ قاعدہ کے موافق جزا بقدر عمل ہوا کرتی ہے یعنی جیسا عمل ہو ویسی ہی اس کی جزا ہونی چاہیئے۔ سو اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہم نے جیسے اعمال کیے ہیں۔ ویسی ہی جزا مل جاتی اور ہمارے اعمال کی حالت

معلوم ہی ہے جیسے کچھ ہیں۔ چنانچہ اگر ہم بندوں کا کام ایسا ناقص کریں جیسا حق تعالیٰ کا کرتے ہیں تو ہم کو پوری اُجرت تو کیا ادھوری بھی نہ ملے بلکہ سزا دی جاوے تو قاعدہ مذکورہ کے موافق ہم کو اس صورت میں جزا ملنی چاہیے تھی کہ دس برس یا بیس برس جنّت میں رکھ کر پھر باہر کر دیئے جاتے۔ کیونکہ محدود کی جزا قاعدہ کے موافق محدود ہی ہوتی ہے مگر کیا رحمت ہے اور کیسا ہمارا دل بڑھاتے ہیں کہ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَيَزِيدُهُم مِّن فَضْلِهِ ۔ اور زیادہ دیں گے اُن کو اپنے فضل سے۔

کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے فضل سے زیادہ دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اعمال تو تمہارے اس قابل نہیں مگر یہ ہمارا فضل ہے کہ استحقاق سے زیادہ دیتے ہیں۔ صرف تمہارے اعمال پر حصر نہیں رکھتے بلکہ ہم جنّت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دیں گے۔ اس میں تو شاید کسی کو یہ ناز ہوتا کہ ہمارے اعمال شاید نیچے جیسے ہوں یعنی اُن میں خاصیت ہو نشو و نما کی۔ اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا مِن فَضْلِهِ کہ تمہارے اعمال نیچے ویچے کچھ نہیں جنتے بلکہ یہ محض ہمارا فضل ہے اور کچھ نہیں۔ آگے ارشاد ہے۔

وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے حساب روزی دیتے ہیں

یعنی کسی کو حق تعالیٰ پر حق اعتراض نہیں۔ اللہ میاں جس کو چاہیں بے حساب روزی دیں۔ اُن کو کوئی روکنے والا نہیں۔ جس کو دیتے ہیں محض اپنے فضل اور

مشیت سے دیتے ہیں جس میں کسی کو مزاحمت کا منصب نہیں۔ بس آیت کا بیان ختم ہوا۔ ان اعمال کا آیت میں بیان ہے۔

صاحبو! یہ ہے مومن کا اصلی مال۔ باقی جس کو ہم مال سمجھتے ہیں وہ مال نہیں بلکہ جو مآل میں کام آوے وہ ہے مال حقیقی (یعنی اعمال صالحہ) واللہ! مال سے وہ راحت نہیں جو ان اعمال سے راحت ہوتی ہے۔ دونوں جہان میں اسی کو ارشاد فرماتے ہیں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

کہ ہم نیک کام کرنے والوں کو جو کہ مومن ہیں دنیا میں بھی پاکیزہ زندگی عطا فرمائینگے یعنی ایسی زندگی جس میں راحت ہی راحت ہوگی یعنی اس سے دل کو سکون واطمینان ہوگا اور آخرت میں اُن کے نیک اعمال کی کامل اُجرت دیں گے۔

ایک جگہ اس کے مقابل ارشاد ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى۔

یعنی جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اُس کو ملتی ہے گزران تنگی کی یعنی دنیا میں۔ اور قیامت کے روز اُس کو اندھا اٹھائیں گے۔

یہ نتیجہ ہے خدا کی یاد سے غفلت کا کہ یہاں بھی مصیبت وہاں بھی مصیبت۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ دنیا داروں کی یہاں بھی زندگی تنگ ہے۔ یہ حال ہے کہ

مال و دولت تو اُن کے پاس سب کچھ ہے مگر اطمینان و راحت جس کا نام ہے وہ میسّر نہیں بعض اوقات تو اُن کی یہ حالت ہوتی ہے کہ موت کی تمنا کرتے ہیں۔ اور اعمال صالحہ سے حال کا عیش بھی اور مآل کا عیش بھی۔ دنیا بھی اچھی اور آخرت بھی اچھی۔ اصلی مال اس کو کہنا چاہیئے۔ دنیوی مال کو تو مال اسی لئے کہتے ہیں یمیل الیہ القلب یعنی اُس کی طرف قلب مائل ہوتا ہے۔ پس اعمال صالحہ کو بھی مال کہنا اس وجہ سے درست ہے کہ وہ اس قابل ہیں کہ قلب اُن کی طرف مائل ہو۔

بس وعظ کا مقصود تو ختم ہوا۔ اب دو ایک باتیں تفسیر آیت کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ایک بات تو یہ ہے کہ آیت میں رِجَالٌ کا لفظ آیا ہے۔ عورتوں کا ذکر نہیں کیا۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو وہ تابع ہیں مردوں کے۔ دوسرے دلالۃ النص کے طور پر وہ خود بخود ہی اس حکم میں اس طرح سے آ گئیں کہ یہ صفات جب مردوں کے لئے موجب مدح ہیں۔ اگر کسی عورت میں ہوں تو وہ اور بھی زیادہ قابل مدح ہیں۔ عورت ہو کر ان صفات کو اختیار کرے تو بڑی ہمت کی بات ہے۔

روح آیت کی اور ان سب صفات کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے دل کو ایسا تعلق ہو کہ دوسرے تعلقات پر غالب آ جاوے۔ جیسا لَا تُلْهِيهِمْ اس میں نص ہے یعنی صفت تو اس کی عبدیت ہو اور تعلق اُلوہیت سے ہو۔ پس بندہ کا کمال یہی ہے کہ الوہیت اور عبدیت کو اس طرح جمع

جاوے۔ اور اس کی یہی صورت ہے کہ تعلق تو اللہ سے ہو اور شان عبادت کی ہو۔

بس اب بیان کو ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام "خیر المال للرّجال" رکھتا ہوں۔ اس نام کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ حدیث میں عورت کو مال کہا گیا ہے اور یہ مال ہے تشبیہاً۔ اس لئے میں نے بھی اعمال کو تشبیہاً مال کہہ دیا۔ اور چونکہ میں اس وقت تجارت گاہ میں ہوں جہاں تجار زیادہ ہیں تو شاید کسی کو اُن میں سے یہ خیال ہوتا کہ تجارت مانع ہے آخرت سے۔ اس لئے میں نے اُن کے مناسب مضمون اختیار کیا اور اُس کی اچھی طرح تفصیل کر دی کہ تجارت مانع آخرت نہیں۔ البتہ آخرت کے اختیار کرنے سے دنیا کی قید اور اُس کے ساتھ تعلق ضرور کم ہو جاوے گا۔ سو اس کا کیا مضائقہ بلکہ یہ تو مفید ہے کہ پیر میں ایک بیڑی تھی وہ کم ہو گئی۔ بس یہ خلاصہ تھا بیان کا۔ اب حق تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ عمل کی توفیق دیں۔ آمین!

اشرف علی!

خیر الاثاث للاناث

عورتوں کے بہترین سرمایہ کے متعلق یہ وعظ ۶ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ کو زنانہ مکان مطبع قیومی کانپور میں فرمایا۔ دو گھنٹے میں ختم ہوا مستورات کا مجمع تھا۔ کچھ مرد بھی شریک تھے۔ حکیم محمد یوسف صاحب مرحوم بجنوری نے قلمبند کیا

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیّات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم امابعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ۔ واذا تتلیٰ علیھم آیاتنا بینٰت قال الذین کفروا للذین اٰمنوا ای الفریقین خیر مقاما و احسن ندیاہ وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھم احسن اثاثا ورئیاہ

تمہید

پہلی آیت میں کفار کا تفاخر، سازوسامان اور اہل و اعوان پر مذکور ہے جو حاصل ہے مال وجاہ کا اور دوسری آیت میں
ن سے زیادہ سامان و نمود والوں کا مبغوض اور عذاب سے ہلاک کیا جانا
کور ہے جو حاصل ہے مال وجاہ کے قابل تفاخر نہ ہونے کا۔

سب سے پہلے قابل عرض بات یہ ہے کہ گو اس جلسہ میں مرد بھی شریک
ں مگر زیادہ مقصود مستورات کو سنانا ہے۔ اس لئے مردوں کے مذاق کی زیادہ
عایت نہ کی جائے گی۔ گو فائدہ دونوں میں مشترک ہے۔ مگر اس وقت اس پر
ظر نہیں کہ نفع معتدبہ مردوں کو ہو نہ اس کے دلچسپ ہونے پر نظر ہے۔ بلکہ
رتوں کا افادہ اصل مدنظر ہے تاکہ عورتیں جن کو وعظ سننے کا موقع بہت کم
ملتا ہے محروم نہ رہ جائیں۔ اس وقت وعظ میں مضامین متعدد ہوں گے۔
ہوں گے سہل۔ ارادہ تو یہی ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ کو جو بھی منظور ہو۔ عورتوں

میں جو امراض پائے جاتے ہیں۔ اس وقت اُن کا بیان اور اُن کا معالجہ بتلانے کا قصد ہے اور تلاوت کی ہوئی آیات میں ایسے ہی امراض کا ذکر ہے۔ جیسا آیات کے حاصل سے معلوم ہو گیا ہو گا۔ کیونکہ جب تک مرض نہ معلوم ہو اُس کا علاج کیسے کیا جائے۔ اس لئے ضرور ہے کہ اوّل اُن امراض کو ظاہر کیا جائے تاکہ مرض معلوم ہونے پر اُس کے علاج کی طرف توجہ ہو۔

زیادہ تر افسوس تو یہی ہے کہ ہم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے اندر کچھ امراض بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علاج کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ اور جن کو امراض کا کچھ احساس بھی ہے اُن کی بھی یہ حالت ہے کہ آثار کو تو دیکھتے ہیں مگر اُن کے اسباب کو نہیں دیکھتے کہ اس کا سبب کیا ہے اور یہ فعل کیوں پیدا ہوا۔ پس خوب سمجھ لیجئے کہ ہر فعل کسی خاص صفت سے پیدا ہوتا ہے اور وہ صفت سبب ہوتی ہے اُس فعل کا۔ تو پہلے اُس صفت کا علاج کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد وہ فعل خود بخود جاتا رہے گا۔ جن کی فہم کوتاہ ہے وہ صرف اثر کو دیکھتے ہیں اور اُس کے علاج کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں مگر اُن کو یہ خبر نہیں کہ اُن کا یہ فعل کون سی صفت سے پیدا ہوا۔ اسی لئے علاج سے فائدہ معتدبہ نہیں ہوتا۔ بس اس وقت بھی مقصود یہ ہے کہ ہمارے اندر جو صفات مذمومہ ہیں اُن کو معلوم کیا جائے پھر اُن کا علاج کیا جائے جس سے اصلاح افعال کی ہو اور مراد صفت سے فطرت کا درجہ نہیں۔ وہ تو محل علاج نہیں بلکہ درجہ تخلق یعنی عمل باطنی کا ہے۔

دو قسم کے امراض سو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر لوگوں میں دو مرض بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ایک حب

مال، دوسرے حُبِّ جاہ۔ گو دونوں کا رنگ مردوں اور عورتوں میں مختلف ہے یعنی مردوں میں حُبِّ مال اور حبِ جاہ کا اور رنگ ہے اور عورتوں میں دوسرا رنگ ہے مگر دونوں میں یہی دو مرض زیادہ ہیں۔ مردوں میں حُبِّ جاہ اس رنگ سے ہے کہ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں۔ عورتیں اپنے کو بڑا تو نہیں سمجھتیں مگر اپنے کو بڑا ظاہر کرنا چاہتی ہیں۔ ایسی باتیں اور ایسے طریقے اختیار کرتی ہیں کہ جن سے اُن کا بڑا ہونا دوسرے پر ظاہر ہو۔

اسی طرح حُبِّ مال کے رنگ بھی دونوں میں مختلف ہیں۔ مردوں کو زیادہ روپے سے محبت ہے اور کسی چیز سے اتنی نہیں۔ اسی واسطے اُس کے جوڑنے اور جمع کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ اور عورتوں کو زیور اور کپڑے اور برتن وغیرہ خانگی سامان سے زیادہ محبت ہوتی ہے کہ رنگ برنگ کے کپڑے ہوں، قسم قسم کے برتن ہوں، مختلف قسم کے زیور ہوں علیٰ ہذا مگر اس بارہ میں مردوں کی سمجھ عورتوں سے اچھی ہے۔ کیونکہ روپیہ تو ایسی چیز ہے جس سے ہر چیز حاصل ہو سکتی ہے۔ جس کے پاس روپیہ ہے اُس کے پاس سب کچھ ہے۔ کیونکہ وہ ہر چیز کا بدل ہو سکتا ہے اور ہر چیز اُس سے حاصل ہو سکتی ہے۔ بخلاف کپڑے اور برتن وغیرہ کے کہ وہ ہر چیز کا بدل نہیں ہو سکتے اور ہر چیز اُس سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ مرد بکثرت جائدادیں خریدتے ہیں۔ کہیں مواضعات، کہیں مکانات مول لیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو بھی سامان سے محبت ہے روپے سے نہیں۔

جواب اس کا یہ ہے کہ وہاں بھی سامان سے محبت نہیں۔ بلکہ روپیہ سے محبت ورغبت ہے۔ جائداد کے لینے میں بھی روپیہ پھنسانے کی ایک صورت کرلی ہے۔ پس مردوں کو جو جائداد سے محبت ہے وہاں بھی غیر منقول سے منقول ہی مقصود ہے۔ جائداد سے آمدنی ہوتی رہے گی اور محفوظ رہے گا پس وہاں بھی مقصود روپیہ ہی ہے۔

عورتوں کی حرص

عورتوں میں یہ رنگ نہیں۔ وہ تو ساز و سامان پر فریفتہ ہیں۔ ہر وقت چیزوں کے جمع کرنے کی حرص رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روپے کو بے طور اڑاتی ہیں۔ اول تو اس وجہ سے کہ اُن کو اس بات پر نظر نہیں کہ روپے سے ہر چیز حاصل ہو جا[تی] ہے۔ دوسرے روپیہ اُن کا کمایا ہوا نہیں جس سے دل دکھے۔ اس لئے بید[ردی سے] خرچ کرتی ہیں۔

مثل مشہور ہے کہ کسی نے ایک شخص کو دیکھا کہ دوشالہ سے اپنے ادھوڑی کا جوتا صاف کر رہا ہے۔ یہ اُس کو ملامت کرنے لگا، تو اُس نے کہا، بات یہ ہے کہ جوتا تو میری کمائی کا ہے اور دوشالہ ہے ابا جان کی کا۔ یہ طبعی تفاوت ہے اپنے مکسوب اور غیر کے مکسوب میں کہ اپنی کمائی کو لگتی ہے اور دوسرے کی کمائی دل کو نہیں لگتی۔

خیر جو کچھ بھی وجہ ہو اُن کو روپیہ کی قدر نہیں۔ اُن کو زیادہ شوق چیز[وں] کا ہے حتیٰ کہ فضولیات تک ان کی نظر پہنچتی ہے۔ بس ان کو تو یہ خبر ہو[نی] چاہیے کہ فلاں چیز بک رہی ہے فوراً اُس کے خریدنے کا اہتمام ہو[تا ہے]

گویا پہلے ہی سے اس چیز کی منتظر تھیں۔ یہاں تک حالت ہے کہ ایک اضافی بنائی کسی کپڑے کی۔ اس کے بعد دوسرا کپڑا سامنے آگیا۔ بس کوشش کریں گی کہ اس کو بھی خرید لیں۔ یہ واقعات میری آنکھوں کے دیکھے ہوئے ہیں۔ اور اس کا بہانہ کیا ٹھہرایا ہے کہ یہ کپڑا اگلے سال کام آجاوے گا اور اگر کہا جائے کہ اگلے سال اور تیار ہو جاوے گی یا پہلی کو فروخت کر کے دوسری بنالو، تو کہتی ہیں کہ ایک تو آنے جانے کے لئے ہے اور ایک گھر کے لئے۔ غرض ہر ٹکڑا کہ دوسری کی ضرورت کو ثابت کرتی ہیں۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ وہ کپڑا پسند آگیا ہے اور کچھ نہیں۔ حالانکہ شوہر سمجھاتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے پاس گنجائش نہیں مگر وہاں اس کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ ان کو چیزوں سے ایسی محبت ہے کہ ہر شے کے لئے بیس ضرورتیں تراش لیں گی۔ برتن بکتا ہوا آجائے خواہ اس کی کچھ بھی ضرورت نہ ہو بس خرید لیں گی۔ چنانچہ گنجائش والے گھروں میں اتنا سامان موجود ہے کہ کبھی استعمال کی بھی نوبت نہیں آتی۔ مگر عورتوں کو سامان کے خریدنے سے کسی وقت بھی انکار نہیں۔ آدمی کو تو حقیقت میں تھوڑے ہی سامان کی ضرورت ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں ؎

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش
آنچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست

یہ حالت ہے کہ بڑے بڑے فرش اور صندوق فضول رکھے ہوئے ہیں، مگر ان کی خریداری بند نہیں ہوتی۔ خصوصاً نازک اور تکلف کا سامان خریدنے کا آج کل بڑا ہی شوق ہے۔ جو سوائے زینت و آرائش کے کسی کام کا نہیں اور

ماشاء اللہ پختہ ایسا ہے کہ اگر ذرا ٹھیس لگ جاوے تو کسی کام کا بھی نہیں۔
جیسے ایک شخص چوڑیوں کی گٹھڑی کمر پر رکھے ہوئے جا رہا تھا۔ راہ میں ایک گنوار ملا۔ گنواروں کی عادت ہوتی ہے کہ لکڑی مار کر پوچھا کرتے اُس نے گٹھڑی میں لکڑی مار کر کہا کہ اس میں کیا چیز ہے۔ چوڑی والے کہا کہ ایک دفعہ اور مار دو تو کچھ بھی نہیں۔ بیچارے کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔
یہی حال تکلف کے سامان کا ہے کہ ذرا سی بے احتیاطی میں کسی کا بھی نہیں۔ مگر مستورات کو دن رات اسی کا اہتمام ہے کہ گھر میں بہت چیزیں ہوں تکلف کا سامان ہو۔ ہر وقت یہی دھن ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان کے اندر حُبِّ مال اس رنگ میں ہے کہ اُن کے پاس کتنی ہی چیزیں ہوں مگر طالب مزید ہی رہتی ہیں۔ اُن کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔
ایک عورت نے خود مجھ سے کہا تھا کہ ہماری مثال تو جہنم کی سی کہ اس سے کہا جائے گا ھل امتلئت کہ کیا تو بھر چکی۔ تو وہ کہے گی ھل من مزید یعنی کچھ اور بھی ہے۔ اسی طرح ان کو صبر نہیں طالب مزید ہی رہتی ہیں۔

عورتوں کی ناشکری

جب کبھی ان سے پوچھو تو یہی کہیں گی کہ ہمارے پاس کیا ہے کچھ بھی نہیں۔ شکر کرنا تو کبھی جانا ہی نہیں۔ مولوی عبدالرب صاحب واعظ ایک مضمون اپنے وعظ میں فرمایا کرتے تھے۔ گو مضمون تو ہے شاعرانہ مگر ہے واقعی۔
چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ عورتوں کے پاس اگر کپڑوں کے صندوق کے بھرے ہوں مگر اُن سے جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں چار چیتھڑے۔ سارا گھر

برتنوں سے بھرا ہوا ہو مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں چار ٹھیکرے۔ جوتیوں کے کتنے ہی جوڑے ہوں مگر ہمیشہ یوں ہی کہیں گی کیا ہیں دو لیترے۔ یہ مضمون ممکن ہے قافیہ کی ضرورت سے بنا ہو مگر واقعہ سچا ہے۔

حاصل یہ کہ ان کو سامان سے کبھی صبر ہوتا ہی نہیں۔ مرد تو کپڑوں میں پیوند تک لگا لیتے ہیں مگر عورتیں ہیں کہ ان کو نئے کپڑوں کے صندوق بھر کر بھی کفایت نہیں ہوتی۔ چاہتی ہیں کہ کپڑوں سے گھر بھر لیں۔ اگر سخت مجبوری ہو تو پیوند بھی لگا لیں گی۔ مگر وسعت میں تو لگاتی ہی نہیں۔ بعض مرد بیچارے ہیں تو مزدور چار آنے آٹھ آنے کے مگر بیبیوں کو دیکھو تو بیگم بنی ہوئی ہیں مرد اپنے لئے پیوند لگے کپڑوں کو عیب نہیں سمجھتا مگر عورت غریب کی بھی ہوگی اپنے کو ایسا بنائے گی کہ گویا بنت الامیر و زوجۃ الکبیر ہے اور یہ سب ساز و سامان اور سجاوٹ شوہر کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کو دکھانے کی غرض سے ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ محض کم فہمی کی بات ہے۔ دکھانے سے ہوتا کیا ہے کیونکہ آپس میں خاندان والوں کو ایک دوسرے کا حال تو معلوم ہی ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت اتنی ہے اور اس کی اتنی۔ پھر دکھانے سے نتیجہ کیا۔ یہ مانا کہ عورتوں کے مناسب زینت ہے مگر اس میں اعتدال تو ہو حد سے بڑھی ہوئی تو نہ ہو۔ ان میں حُبِ مال کا یہ رنگ ہے اور مردوں میں بھی یہ مرض حُبِ مال کا موجود ہے مگر رنگ مختلف ہے۔

عورت اور حُبِ جاہ

دوسرا مرض عورتوں میں حُبِ جاہ ہے اور یہ مرض مردوں میں بھی ہے مگر دوسرے رنگ

ہیں۔ وہ بھی اپنے کو بڑا بناتے ہیں مگر رنگ اور ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر مردوں میں اور کمالات بھی ہیں جیسے علم وغیرہ۔ اس لئے اُن کا حُب جاہ اس قدر نمایاں نہیں اور عورتوں میں تو یہ بھی نہیں مگر پھر بھی اُن میں حبِّ جاہ ہے۔ گو یہ اپنے کو بڑا نہیں سمجھتیں مگر یہ چاہتی ہیں کہ دوسرے اُن کو بڑا سمجھیں ان میں اس کے ساتھ تذلل اور تواضع کی بھی ایک شان ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض بیبیاں پائنتی بیٹھتی ہیں اور خادمہ سرہانے۔ اور خود پان لگا کر بھنگن وغیرہ کو دے دیتی ہیں۔ ان بیچاریوں میں اس قسم کی تواضع بھی ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس کی کوشش بھی کرتی ہیں کہ ہم سب سے بڑھی رہیں بیچاریوں میں کمالات تو ہیں نہیں مگر چاہتی ہیں کہ زیور اور سامان بہت سا ہو۔ کہ دوسروں سے بڑھی چڑھی رہیں۔ جب کہیں جائیں گی، تو خوب زیور لاد پھاند کر جائیں گی۔ خواہ مانگا ہوا ہی زیور ہو اور گو دوسروں کو معلوم بھی ہو کہ مانگ کر پہنا ہے۔ یہ اس لئے کہ ہم کو کوئی ہلکا نہ سمجھے۔ رات دن اسی کا اہتمام ہے۔ یہی سبق ہے کہ پیمک ہو، گوٹہ ہو، ٹھپہ ہو، لچکہ ہو، کپڑے کی تراش ایسی ہو، جھالر بھی لگا ہوا ہو۔ جہاں تک اُن کے امکان میں ہے بناوٹ کا اہتمام کرتی ہیں۔

اس کے متعلق ان میں کمیٹی بھی ہوتی ہے جس میں بڑے بڑے معاملات اس کے متعلق طے ہوتے ہیں کہ بہن ذرا بتلاؤ تو کہ اس کرتہ کے ساتھ کون سا پاجامہ اچھا لگے گا اور اس جوڑے پر دوپٹہ کون سا ہونا چاہئے۔ پھر اُن کا سب سے بدتر یہ مذاق ہے کہ یہ سب زینت محض دوسرے کے

خوش کرنے کو کرتی ہیں۔ باقی خاوند کے سامنے ایسی میلی کچیلی رہیں گی جیسے بھنگن اگر کہیں برادری وغیرہ میں جائیں گی تو غسل صحت بھی ہوگا (یعنی جیسے آدمی تندرست ہو کر مدت کے میل کچیل کو اچھی طرح صابون کھلی وغیرہ لگا کر بدن سے صاف کرتا ہے) جب واپس آئیں گی تو خاوند کی قسمت میں وہی مبارک صورت ہوگی۔ جہاں گھر میں آئیں فوراً زیبائش کے کپڑے اتار پھینکے۔ خدا جانے یہ عورتوں کا کیا مذاق ہے۔ کہتی ہیں وہاں ضرورت تھی اس لئے زیور کپڑے پہن لئے۔ یہاں کیا ضرورت ہے! اور وہ ضرورت صرف یہ ہے کہ شان کو ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ ہم کو کوئی ہلکا نہ سمجھے۔ اگر اعتدال سے زینت ہو تو مضائقہ نہیں مگر اتنا انہماک کہ ہر وقت اسی میں لگی رہتی ہیں یہ ٹھیک نہیں۔

یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ ان کے پاس اچھا خاصا زیور ہے مگر کسی بی بی کے پاس کسی اور وضع یا نقشہ کا زیور بنا ہوا دیکھا بس فریفتہ ہو گئیں۔ اور ان سے فرمائش کی جاتی ہے کہ بہن ذرا مجھ کو دے دینا میں بھی ایسا ہی بنواؤں گی۔ پھر ان سے زیور لے کر شوہر سے فرمائش کرتی ہیں کہ ایسا بنوادو۔ اب وہ ہر چند سمجھاتا ہے کہ اس کو کیوں خراب کرتی ہو اچھا خاصا بنا بنایا زیور خراب ہو جاوے گا۔ سنار کھوٹ ملادے گا تو چار پیسہ کا زیور رہ جائے گا۔ مگر ایک نہیں سنتیں۔ یہی کہتی ہیں کہ مجھے تو اسی نمونہ کا بنوادو کچھ ہی ہو۔ اب وہ بیچارہ ان کے اصرار پر دلجوئی بھی کرتا ہے اور یہ ان کی عقل پر غالب ہو جاتی ہیں۔ عاقل دلشکنی کو پسند نہیں کرتا۔ آخر

وہ کہتا ہے کہ تم جیسی ہیں ہارا۔ اور پھر اس پر بھی بس نہیں۔ اگر اگلے مہینہ اور کوئی نمونہ سامنے آگیا تو یہ کہتی ہیں کہ اب یہ نمونہ ہونا چاہیے۔

غرض ہر چیز پر ان کا عشق ہے۔ بس یہی چاہتی ہیں کہ جیسی چیز اور کے پاس ہو ویسی ہی ہمارے پاس ہو جاوے۔ شوہر کی ساری کمائی ان کی زیب و زینت ہی میں صرف ہوتی ہے۔ اور یہ ساری مذکورہ خرابیاں حب جاہ اور حبِ مال کی ہے مردوں میں بھی اور عورتوں میں بھی۔ صرف فرق ہے کہ مردوں میں کسی قدر ضرورتوں پر نظر ہے اور عورتوں میں ضرورتوں پر نظر نہیں۔ اس لئے اس کے متعلق بیان کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے میں نے یہ آیت اس وقت اختیار کی ہے۔

خوارج اور معتزلہ کا مذہب

اگرچہ آیت میں کفار کی حالت بیان کی گئی ہے کہ اُن میں فلاں فلاں صفات ذمیمہ پائی جاتی ہیں مسلمانوں کی حالت بیان نہیں کی گئی مگر اس عنوان سے بیان کرنے میں ایک بڑا فائدہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس میں اس پر دلالت ہے کہ یہ صفات فی نفسہٖ ایسی بُری خصال ہیں کہ کفار میں بھی باوجود کافر ہونے کے بُری ہیں۔ تو مسلمانوں میں تو اسلام کے ہوتے ہوئے بدرجہ اولیٰ نہ ہونی چاہئیں۔ اس اعتبار سے یہ آیت مسلمانوں کے لئے ان صفات ذمیمہ سے زیادہ مانع ہونی چاہیے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک تو سیاہ کپڑے پر دھبہ ہو، وہ ایسا بُرا نہیں معلوم ہوتا جیسا سفید کپڑے پر معلوم ہوتا ہے۔ یہ میں نے اس لئے

کہا کہ بعض لوگ شاید یوں کہیں کہ یہ آیتیں تو کفار کے بارہ میں ہیں اور مسلمانوں میں ان کو کیوں جاری کیا جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں ان آیات کے جاری کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ صفات اگر مسلمانوں میں پائی جاویں تو اُن کو ان صفات کی وجہ سے کافر بنایا جاوے۔ اس درجہ میں تو منطبق کرنا حرام ہے۔ اور اس میں ترک ہے نصوص کا۔ یہ تو مذہب ہے خوارج کا۔ وہ کہتے ہیں کہ کبائر کے ارتکاب سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے۔ حالانکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لا تکفروہ بذنب ولا تخرجوہ من الایمان۔ یعنی کسی مسلمان کو کافر مت بناؤ کسی گناہ کی وجہ سے اور اس کو ایمان سے خارج مت کرو۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دو جملے ارشاد فرمائے ایک لا تکفروہ بذنب اور دوسرا لا تخرجوہ من الایمان۔ بظاہر دوسرے جملہ کے بیان کرنے کی حاجت نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ لا تخرجوہ من الایمان تو لا تکفروہ بذنب میں خود ہی آگیا۔ کیونکہ جب مسلمان کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ ہوا تو خروج من الایمان بھی نہ پایا گیا۔ پھر دوسرا جملہ ارشاد فرمانے کی کیا ضرورت تھی۔

سو اس کا راز یہ ہے کہ آپ کے بعد دو متنوع فرقے بڑے بڑے پیدا ہونے والے تھے جن کا فتنہ عظیم تھا۔ ایک خوارج دوسرے معتزلہ خوارج کا مذہب یہ ہے کہ مسلمان گناہ کبیرہ کی وجہ سے کافر ہو جاتا ہے اور معتزلہ

کہتے ہیں کہ کبیرہ کے ارتکاب سے کافر تو نہیں ہوتا مگر مومن بھی نہیں رہتا ایک بین بین حالت ہو جاتی ہے۔ نہ اس کو کافر کہہ سکتے ہیں نہ مومن۔ آپؐ نے ان دونوں فرقوں پر نکیر فرمائی۔ پہلے جملہ میں تو خوارج کا رد ہے اور دوسرے میں معتزلہ کا۔ اس لئے آپ نے دو جملے ارشاد فرمائے۔

میں ہر چند قصد کرتا ہوں کہ ایسے غیر اہل علم کے مجمع میں ایسی باتیں نہ بیان کروں جو اہل علم کے لائق ہیں عوام کے مناسب نہیں مگر ایک آدھ بات بیان ہو ہی جاتی ہے۔ بہرحال ان آیات کا مسلمانوں کے حق میں اس طرح جاری کرنا کہ اُن کو ان صفات کے ارتکاب سے کافر بنایا جاوے، یہ تو مذموم ہے لیکن ایک دوسری صورت ہے کہ تعبیر (من العار) یعنی شرم دلانے کے طور پر ان آیات کو مسلمانوں پر جاری کیا جاوے۔ یہ عین حکمت ہے اور شرعاً مطلوب ہے۔

چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

من ترك الصلوٰة متعمدا — یعنی جس نے عمداً نماز چھوڑ دی

فقد کفر — وہ عملاً کافر ہے۔

گو عقیدہ کے اعتبار سے کافر نہیں۔ یعنی نماز کا ترک کرنا کفار کا سا عمل ہے کہ وہ بھی نماز نہیں پڑھتے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ترک صلوٰۃ کو کفر فرمایا گو اس میں تاویل ہے مگر اصل مقصود عار دلانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافروں کی سی خصلتیں مسلمانوں میں کیوں ہوں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ جو صفات ان آیات میں مذکور ہیں اُن کے مذموم

ہونے کے لئے کفر شرط ہے یعنی جس شخص میں یہ صفات کفر کے ساتھ ہوں
وہی ان کا مخاطب اور مورد عتاب ہوگا اور اگر ان کے ساتھ کفر نہ ہو تو مورد
عتاب نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک دعوےٰ ہے جس کے لئے دلیل کی
ضرورت ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کافروں میں تو کفر تھا ہی اور وہ اُن کے
لئے کافی تھا اور صفات پر عتاب کیوں کیا گیا۔

حُبّ اللہ و بغض اللہ

سو کفار کے لئے ان صفات کے ذکر کرنے
کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو کسی کی ذات سے
نہ محبت ہے نہ بغض۔ بلکہ اُن کے بغض و محبت کا مدار صفات پر ہے جس میں
اچھی صفات ہوں اُس سے محبت ہے اور جس میں بُری صفات ہوں اُس سے
بغض ہے۔ اوروں کا تو کیا ذکر ہے خود حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں
ارشاد ہے۔ لو اشرکوا لحبط عنھم ما کانوا یعملون۔ یعنے اگر انبیاء علیہم
السلام میں بھی ایسی صفت پائی جاوے تو اُن کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا
جاوے گا۔ جو اوروں کے ساتھ کیا جاوے گا۔ اور مقدم اور تالی میں صرف
ملازمت کافی ہے گو مقدم کا وقوع محال ہی ہو۔ پس ہر چند کہ اُن حضرات
سے ایسا ہو نہیں سکتا مگر نعوذ باللہ، نعوذ باللہ! بفرض محال اگر ایسا ہو، تو وہی
اثر ہوگا جو اوروں میں ہوتا ہے۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے بارہ میں ارشاد ہے یضاعف
لھا العذاب ضعفین۔ کہ نافرمانی کرنے پر اُن کو دوسروں سے دگنا عذاب

ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جس کو ناز و نعمت سے پالتے ہیں اور جس کی زیادہ خاطر داری کرتے ہیں وہ اگر نافرمانی کرے تو اس پر غصہ بھی بہت آتا ہے ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کی اہل بیت سے زیادہ کون مورد انعام وفضل ہوگا۔

بہرحال ان نصوص سے معلوم ہوگیا کہ خدا تعالیٰ کو کسی کی ذات سے نہ ایسی محبت ہے کہ چاہے جو بھی کرتا رہے پھر بھی کچھ نہ کہیں۔ اور نہ کسی کی ذات سے ایسا بغض ہے کہ وہ کیسی ہی اطاعت و فرماں برداری کرے پھر بھی قدر نہ ہو۔

میں نے اپنے بیان میں ایسی کی قید اس لئے لگائی ہے کہ حق تعالیٰ کو بعض سے اتنی محبت ضرور ہے کہ ان کو معاصی نہیں کرنے دیتے۔ ان کے افعال کے ساتھ خدا تعالیٰ کو محبت ہوگئی ہے جس سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کو گناہوں سے بچاتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں۔

ولولا ان ثبتناك لقد کدت ترکن الیھم شیئا قلیلا۔ — یعنے اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو آپ ان کی طرف کسی قدر تھوڑا سا مائل ہونے کے قریب ہو جاتے۔

اللہ اکبر! کیا شان حفاظت ہے کہ قلیل در قلیل کے میلان سے بھی حفاظت کی جاتی ہے۔ اگر کبھی ایسوں سے لغزش ہونے والی ہوتی

ہوتی ہے تو اُن کو سنبھال لیتے ہیں۔ آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ ایسے بندوں کو خدا تعالیٰ نے پہلے سے محفوظ رکھا ہے معصیت اُن سے ہوتی ہی نہیں جیسے انبیاء علیہم السلام سب ہی ایسے ہوئے ہیں۔ اولیاء میں بھی بعض ایسے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مراد کہتے ہیں اور ایک ہوتے ہیں مرید جو کہ مجاہدہ کر کے معاصی سے محفوظ رہتے ہیں۔ بعض اولیاء کو یہ مرتبہ دیا ہے (یعنے مرادیت کا) اُن کے ارادوں کے اسباب بعد منہدم کر دیتے ہیں۔ اس لئے اُن سے معصیت سرزد ہی نہیں ہوتی۔ ایسے اولیاء کو محفوظ کہتے ہیں اور انبیاء کو معصوم۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ انبیاء سے تو معاصی صادر ہوئے ہیں پھر معصوم ہونے کا حکم کیسے کیا گیا۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں ہے عصیٰ آدم ربہ کہ آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ عصیٰ کے معنی مجازی مراد ہیں یعنی خطائے اجتہادی۔ جیسا اپنے موقع میں ثابت ہو چکا ہے۔ اور خطائے اجتہادی میں تو ایک گنا ثواب ملتا ہے۔ پس وہ صورۃً خطا ہے ورنہ واقع میں طاعت ہے کیونکہ ثواب مخصوص ہے طاعت کے ساتھ۔ پس انبیاء علیہم السلام کی لغزشیں حقیقت میں طاعات ہی ہیں۔ اُن کو حق تعالیٰ عقوبت کا کام کرنے ہی نہیں دیتے۔ اس وقت اس تحقیق کا زیادہ موقع نہیں۔

اس وقت مجھے فقط اتنا بتلانا ہے کہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی بندہ کے ساتھ حق تعالیٰ کا یہ معاملہ ہو کہ اُن کو گناہ کرنے ہی نہ دیں مگر یہ نہیں ہو سکتا

کہ باوجود گناہ کرنے کے محبت باقی رہے۔ اسی واسطے میں نے اپنی تقریر میں ایسی کی قید لگائی۔ بہت لوگوں کو یہ ناز ہے کہ ہم کچھ ہی گناہ کرلیں کچھ نہ ہوگا کیونکہ ہم بزرگوں کی اولاد ہیں۔ مگر یہ خیال محض باطل ہے۔ یہ عقیدہ یہود اور نصاریٰ کا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ خدا تعالیٰ کو کسی سے ایسی محبت نہیں کہ معاصی کرنے پر بھی وہ باقی رہے۔ نہ ایسا بغض ہے کہ طاعت سے بھی قدر نہ ہو۔

جیسے انسان کا حال ہے کہ کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو وہ جو کچھ بھی کرے سب معاف اور یا بغض ہو جاتا ہے تو وہ گو کیسی ہی طاعت کرے مگر قبول ہی نہیں۔ جیسے کسی حاکم کو کسی کی ذات سے بغض ہو جاتا ہے تو وہ اُس کو قید ہی کرنا چاہتا ہے۔ وکلاء و بیرسٹر وغیرہ سب کے سب رہ جاتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کسی سے ذاتی نفرت ہوتی ہے اُس کے ہزار کمالات بھی بے اثر ہو جاتے ہیں بلکہ عیوب نظر آنے لگتے ہیں۔

ایک بزرگ تھے۔ اچھے اچھے لوگ اُن کے معتقد تھے مگر بی بی اُن کی نہایت نالائق تھی۔ وہ اُن کی معتقد نہ تھی بلکہ ایذائیں دیتی تھی۔ ہمیشہ اُن سے لڑتی رہتی تھی۔ اُن کے خوارق اور کرامات کو بھی دیکھتی تھی مگر اس کا اعتقاد ہی اُن پر نہ ہوتا تھا۔ ایک روز وہ بزرگ قصداً ہوا میں اڑے اور اپنے گھر کے اوپر سے گزرے تاکہ بی بی دیکھے اور ایذا دینا چھوڑ دے۔ مستورات نے جو اُن کے گھر میں جمع تھیں دیکھ کر کہا کہ یہ کوئی ابدال معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی بی بی نے بھی کہا کہ واقعی ابدال ہی ہیں۔ جب وہ گھر میں آئے تو بی بی نے

...ا، اللہ اکبر! آج ہم نے عجیب بات دیکھی جو کبھی نہ دیکھی نہ سُنی۔ ایک بزرگ
...وا میں اڑ رہے تھے۔ بڑے صاحب کمال تھے۔ اُن بزرگ نے کہا کہ بی بی
...م نے پہچانا بھی۔ کہا نہیں۔ فرمایا وہ میں ہی تھا۔ تو وہ کہتی ہے کہ ہاں جب ہی
...ڑھے اڑ رہے تھے۔ اُن بی بی کو اُن کی ذات سے بغض تھا۔ اس لئے
...وجود ایسا کمال دیکھنے کے بھی اُن کی معتقد نہ ہوئی۔

بات یہ ہے کہ انسان جس کے متعلق کوئی رائے اچھی بُری قائم کر لیتا
ہے تو گو اُس کو کیسی ہی دلیل اُس کے خلاف کی ملے مگر یہی چاہتا ہے اپنی
...ئے نہ بدلے۔ سو خدا تعالیٰ کی شان اس سے بہت ارفع ہے کہ کوئی ہزار
...رس بھی اطاعت کرے اور بغض ذاتی کی وجہ سے اُن کے نزدیک اُس کی
...در نہ ہو یا کوئی گناہ کیا کرے اور حُبِ ذاتی کی وجہ سے وہ کچھ نہ کہیں۔ ہاں
...ہ بات ضرور ہے کہ کسی کی طاعت سے نہ اُن کا ذرہ برابر نفع نہ کسی کی
معصیت سے اُن کا کچھ ضرر۔ وہاں تو یہ کیفیت ہے ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو

دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

حق سبحانہٗ تعالیٰ کے غنی ہونے کے یہی معنی ہیں نہ وہ معنی جس کو عوام سمجھے
ہیں کہ نعوذ باللہ نہ کسی بات کا انتظام ہے نہ کسی کے آرام و تکلیف کی پروا ہے
جس کو چاہا بدون کسی حکمت کے یتیم کر دیا، جس کو چاہا مصیبت میں ڈال دیا
جسے چاہا بیمار کر دیا۔ جب کوئی یتیم ہو جائے یا غریب ہو جائے یا مصیبت
میں پڑ جائے تو ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ خدا کی ذات بے پروا ہے یعنی

کسی کے نفع و ضرر کی کوئی رعایت نہیں۔ ایسے موقع پر یہ کلمہ بہت ہی سخت
ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کو کسی پر رحم نہیں آتا نہ کسی کی مصلحت کی
کرتے ہیں۔ لوگ بدلالت حال یہ چاہتے ہیں کہ جو مصلحت کسی واقعہ میں ہم
ہیں، خدا تعالیٰ بھی نعوذ باللہ اسی کے موافق معاملہ فرماویں۔ اگرچہ یہ عقیدہ
مگر اقوال سے تو یہی مفہوم ہوتا۔ بڑے بڑے اس میں مبتلا ہیں۔

یہ جو بیماری آج کل ہوئی تھی۔ اس میں کیسے کیسے کلمات لوگوں نے
ہیں۔ کفر تک بکا ہے۔ (بیماری ہوئی تھی) اس میں بہت جگہ ایسا ہوا کہ
یتیم رہ گئے۔ گھر میں کھانے کو نہ تھا۔ بی بی بیوہ ہوگئی تو لوگ کہتے تھے
بس اللہ میاں کے یہاں نعوذ باللہ کوئی قاعدہ نہیں۔ اندھا دھند معاملہ ہے
کی پرواہ ہی نہیں۔ بڑی بڑی شکایتیں کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی، اس سے تو
کرنا چاہیے۔ خدا تعالیٰ کے غنی ہونے کے یہ معنی نہیں جو مذکور ہوئے بلکہ
معنی ہیں کہ کسی کی طاعت سے اُن کو نفع نہیں اور کسی کے کفر و معصیت
سے اُن کا ضرر نہیں۔ چنانچہ اسی معنی کو صریحاً فرماتے ہیں۔

ان تکفروا فان اللہ غنی عنکم — یعنی اگر تم کفر کرو تو اللہ تم سے غنی ہے۔

یعنی اُس کا کچھ بھی ضرر نہیں، جیسے سلاطین دنیا کو رعایا کے بگڑنے سے
ضرر ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اگر کسی بادشاہ کی رعایا اُس سے باغی ہو جا
تو اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اُس کا تخت و تاج باقی نہیں رہتا۔ ذلیل و خوار
ہو جاتا ہے۔ اس کا احتمال حق تعالیٰ میں نہیں ہے۔ اگر تمام آسمان و ز

لے باغی ہو جاویں تو وہاں ذرہ برابر بھی ضرر نہیں اور یہ بھی نہیں کہ کوئی ہزار
ن تک معاصی کرتا رہے پھر رجوع کرے اور توبہ کرے تو قبول نہ ہو۔
انچہ ارشاد بالا کے بعد ہی یہ بھی ارشاد ہے۔ وان تشکروا یرضہ

۔

یطان سے رعایت

چنانچہ میں ایک روایت سیر کی نقل کرتا ہوں۔ سیر کی روایت بطور تائید کے بیان
دی جاوے تو مضائقہ نہیں جب کہ وہ نصوص سے متائید ہو۔ اس روایت
ے معلوم ہوگا کہ شیطان کو بھی جو سب سے اعلیٰ درجہ کا نافرمان ہے حق
الیٰ نے توبہ سے مستثنیٰ نہیں کیا۔

وہ روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حق تعالیٰ سے
اجات کے لئے تشریف لے جا رہے تھے کہ شیطان ملا اور آپ سے
اکہ میری بھی ایک درخواست ہے۔ میں بہت گنہگار ہوں۔ میرے
ے بھی حق تعالیٰ سے دو کلمہ کہہ دیجئے گا۔ انبیاء علیہم السلام بڑے شفیق ہوتے
ں۔ اس کے اس کہنے پر آپ کو رحمت کا جوش ہوا اور آپ نے وعدہ
رالیا۔ غرض خدا تعالیٰ سے مناجات ہوئی۔ آپ شیطان کا پیام بھول گئے
ق تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کسی بندہ سے وعدہ کر کے بھول گئے۔ آپ کو
د آگیا اور آپ نے شیطان کے بارے میں عرض کیا۔ اس پر ارشاد ہوا کہ
ں سے کہہ دینا کہ ہمارا تمہارا جس بات پر بگاڑ ہوا ہے وہی اب بھی ہے
آدم اس وقت موجود نہیں مگر ان کی قبر موجود ہے۔ ان کی قبر کو سجدہ کرلے

بس سب معاف ہے۔ آپ بہت خوش ہوئے کہ یہ تو بڑا سستا نسخہ
اس میں اس کا کیا حرج ہے۔ اچھا ہو کہ وہ ایسا کر لے تو دنیا سے سارا فساد
مٹ جاوے۔ غرض آپ واپس تشریف لائے اور شیطان ملا تو آپ
نے فرمایا تو بڑا خوش قسمت ہے۔ وہاں سے عجیب و غریب جواب
ہے۔ اس نے کہا بتلایئے تو سہی۔ آپ نے جو جواب ارشاد ہوا
سے کہہ دیا۔ اس نے کہا سبحان اللہ! اچھا پیام لائے۔ جب میں نے
کو اُن کی زندگی میں سجدہ نہیں کیا تو اب مرنے کے بعد تو ضرور کروں گا کم
خبیث ملعون نے یہ جواب دیا۔

شیطان کی خود ہی حالت ایسی ہے کہ آسان سے آسان نسخہ
کم بخت کو بتلایا تو اس سے نہ ہو سکا۔ جب خناس دماغ میں گھسا ہو
عمل کون کرے لیکن اگر وہ بھی توبہ کر لے تو اس کو بھی روک ٹوک نہیں
کم بخت کیوں کرنے لگا۔ اس کی قسمت ہی میں نہیں۔

آگے راز قدر کا ہے اس میں خوض نہ کرنا چاہیئے۔ غرض جب شیطان
کے لئے بھی توبہ کی گنجائش ہے تو پھر اور کون رہ گیا۔ حق تعالیٰ بعد ذکر
کبائر کے ارشاد فرماتے ہیں۔

ومن یفعل ذلک یلق اثاما یضاعف لہ العذاب یوم
القیامۃ ویخلد فیہ مہانا الا من تاب۔ الخ

اس آیت میں کسی کو توبہ سے مستثنیٰ نہیں کیا جب تک مغرب سے
آفتاب نہ نکلے اس وقت تک یہی قانون ہے کہ ہر ایک کی توبہ قبول ہے

کوئی بھی ہو۔ غرض قانون عام ہے گو اُس کا زمانہ محدود ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو کسی سے بھی حُب ذاتی اور بغض ذاتی نہیں کفار سے بھی اُن کی ذات کی وجہ سے بغض نہیں بلکہ اُن کے افعال سے بغض ہے جس میں کفر سب سے اشد ہے۔ اور دوسرے افعال بھی موجب بغض ہیں۔

احتیاط کی ضرورت

اس سے یہ معلوم ہوا کہ حقیقت میں یہ افعال مبغوض ہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ ان افعال کی وجہ سے خدا تعالیٰ کو کفار سے بغض ہے تو ان سے ہمیں بھی بچنا چاہیئے ایک تو اس وجہ سے کہ وہ افعال مبغوض ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ ہم مکلف ہیں فروع کے۔ اس لئے ہمارے حق میں اُن کا قبح زیادہ شدید ہوگا اس لئے ہم کو اور بھی زیادہ بچنا چاہیئے۔ یہ تو تمہید تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بغض اور حُب کا مدار افعال و صفات پر ہے نہ ذات پر۔

اب میں آیت کی تفسیر شروع کرتا ہوں جس میں اللہ تعالیٰ کفار کا ایک مقولہ بیان فرماتے ہیں جس کو وہ مسلمانوں سے کہا کرتے تھے۔ وہ مقولہ یہ ہے ای الفریقین خیر مقاما واحسن ندیا یعنی جب ہماری آیتیں کھلی کھلی ان لوگوں کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو یہ کفار ایمان والوں سے یوں کہتے ہیں کہ دونوں فریق میں سے کونسا فریق بہتر ہے۔ مکان میں اور اچھا ہے محفل میں۔ واذا تتلی علیھم میں ھم کی ضمیر ظاہرا ان کفار کی طرف عائد ہے مگر نہ تخصیص کی بناء پر بلکہ تبلیغ عام کے وقت وہ تلاوت

ان لوگوں کے سامنے بھی ہو جاتی تھی۔
تخصیص کی نفی اس لئے کی گئی کہ ایسا نہ ہوتا تھا کہ خاص ان کا کوئی جلسہ کر کے اس میں تلاوت ہوتی ہو۔ گو کفار نے جدا جلسہ چاہا تھا۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر ایک دفعہ یہ کہا تھا کہ ہم آپ کی بات کو سنیں گے مگر ہماری مجلس غرباء سے علیحدہ کر دیجئے۔ ہم ان میں بیٹھنا نہیں چاہتے کیونکہ یہ ذلیل لوگ ہیں اور ہم رؤساء ہیں۔ ان میں بیٹھ کر ہماری عزت کو بٹہ لگتا ہے ہماری اہانت ہوتی ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اتمام حجت کی غرض سے اس کا کچھ خفیف سا خیال بھی کیا تھا تاکہ ان کے پاس پھر کوئی عذر نہ رہے اور شاید ہدایت ہی ہو جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ ما علیک من حسابھم من شیء وما من حسابک علیھم من شیء فتطردھم فتکون من الظلمین۔

اور مت دور کرو ان کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام چاہتے ہیں رضامندی اس کی۔ تم پر نہیں ان کے حساب میں سے کچھ اور نہ تمہارے حساب سے ان پر کچھ۔ تم اگر ان کو دور کردو پھر ہو جاؤ گے تم بے انصافوں میں سے۔

ایک جگہ اسی کے قریب المعنی یہ آیت ہے۔

واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ ولا تعد عیناک عنھم ترید زینۃ الحیوۃ

الدنیا ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذکرنا واتبع هواہ و
کان امرہٗ فرطا۔
اور روک رکھو اپنی ذات کو اُن کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے
رب کو صبح وشام۔ طالب ہیں اُس کی رضامندی کے اور نہ ہٹیں
تمہاری آنکھیں اُن کو چھوڑ کر تلاش میں رونق دنیا کی زندگی کی اور نہ
کہا مانو اُس کا جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے اور پیروی
کی اُس نے اپنی خواہش کی اور ہے اُس کا کام حد سے نکلا ہوا
یہ تدیلی مستقل جملہ نہیں ہے کہ جس سے لازم آوے کہ آپ سے اس کا (یعنی
ارادہ زینت دنیا کا) صدور بھی ہوا ہو بلکہ نہی کے تحت میں ہے۔ اور ترکیب
میں حال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی آنکھیں ان سے نہ ہٹیں جس کا منشا اور
سبب ارادہ حیات دنیا کا ہونا۔ آگے صاف صاف فرما دیا۔

فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر — کہ جس کے جی میں آئے ایمان لائے جس کے جی میں آئے کفر کرے۔

آپ کو کچھ خوشامد نہیں پڑی۔ غرض آپ کو منع فرما دیا کہ کوئی خاص جلسہ
ان نجیبوں کے لئے نہ کیا جاوے۔ ان کو سو دفعہ غرض پڑے سے آئیں، ورنہ
جائیں جہنم میں۔

مقامِ طالب و مطلوب

امام مالکؒ سے خلیفہ نے درخواست
کی تھی کہ شہزادوں کے واسطے حدیث

سنانے کا جلسہ علیحدہ کر دیا جاوے کیونکہ عام جلسہ میں پڑھنا اُن کے لئے
ہے۔ آپ نے اس کو منظور نہیں کیا۔ خلیفہ نے پہلے اُن سے یہ فرمائش کی
کہ آپ شہزادوں کو مکان پر آکر درس دیا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ علم مطلوب
ہے طالب نہیں۔ خلیفہ سمجھ دار تھے اور نبوت کا زمانہ بھی قریب تھا اس
لئے فوراً سمجھ گئے اور شہزادوں کو حکم دیا کہ امام کے مکان پر جا کر جلسہ
عام میں بیٹھا کریں۔

یہ تو تتلی علیہم کے متعلق تحقیق تھی۔ اس کے بعد آیت میں بینات
کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کھلی کھلی آیتیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسائل منصوصہ
بھی کھلے ہوئے ہیں بلکہ ظاہر مقصود یعنی عبارۃ النص بالکل کھلا ہوا ہے۔ اس میں
اغلاق نہیں۔ باقی دلالۃ النص اور اشارۃ النص اور اقتضاء النص وہ کھلے ہوئے نہیں
کہ ہر کوئی اُس کو سمجھ لے چنانچہ ایک آیت میں ارشاد ہے

واذا جاءهم امر من الامن او الخوف اذاعوا به ولو
ردوه الى الرسول والى اولى الامر منهم لعلمه
الذين يستنبطونه منهم

اس میں منافقین کی شکایت ہے کہ جب کوئی خبر امن کی یا خوف کی
آتی ہے اُس کو پھیلا دیتے ہیں۔ جب معمولی خبروں کی حقیقت سمجھنے میں تو
استنباط شرط ہے تو امور علمیہ تو جدا رہے۔ ہاں ظاہری مدلول کھلا ہوا
ہی ہے۔

غرض کفار اہل ایمان کی نسبت یوں کہتے ہیں کہ دیکھو گھر کس کا اچھا ہے

بیٹھک کس کی اچھی ہے یعنی اپنی زیب و زینت سے مسلمانوں پر کفار فخر کرتے تھے اور مقصود اُن کا یہ تھا کہ اگر ہم بُرے ہوتے تو ہم سے خدا تعالیٰ کو بغض ہوتا اور جب بغض ہوتا تو نہ ایسا اچھا گھر دیتے نہ بیٹھک دیتے، نہ مال دیتے، نہ اولاد دیتے۔

غالباً اُنہوں نے کسی پھانسی کے مجرم کو نہ دیکھا ہوگا کہ اُس کی کیسی خاطر کی جاتی ہے مگر آج کل تو سب جانتے ہیں کہ پھانسی والے کی بڑی خاطر کی جاتی ہے۔ اُس سے کہتے ہیں کسی چیز کو دل چاہتا ہو تو بتلا دو۔ اگر وہ کہے فلاں چیز کو دل چاہتا ہے تو اُس کے لئے وہ چیز موجود کی جاتی ہے۔ اُس سے پوچھتے ہیں کہ کسی سے ملو گے۔ اگر کہے تو ملاتے بھی ہیں۔ تو اس وقت سب جانتے ہیں کہ اس کی کیسی خاطر کی جاتی ہے مگر نتیجہ بھی سب کو معلوم ہے کہ کیا ہوتا ہے۔ اب اگر وہ پھانسی والا اُس منتظر کو دیکھ کر یوں سمجھے کہ میں حاکم کا بڑا محبوب ہوں اور یہ خیال کرے کہ رُوسا کو ابھی چاٹے تک بھی نہیں دی گئی اور میری یہ خاطر ہو رہی ہے تو یہ اس کی کتنی بڑی حماقت ہے۔

کفار کی غلط فہمی

قاعدہ یہی ہے کہ جتنا سنگین مقدمہ ہوتا ہے اُسی قدر مجرم کو مہلت دی جاتی ہے۔ تو شرک و کفر سے بڑھ کر کون سا جُرم ہوگا۔ اس لئے اُس میں مہلت بھی اچھی دی گئی۔ پس کفار کا یہ استدلال کتنا باطل تھا کہ ہم خوشحال ہیں۔ ہمارے گھر اچھے ہیں۔ ہماری نشست گاہ عمدہ ہے۔ اس لئے ہم خدا کے محبوب ہیں۔ اور تمہارے پاس کیا ہے۔ روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں ملتی۔ ہمارا خوشحال ہونا دلیل ہے اس

امر کی کہ ہم حق پر ہیں۔

اس دلیل کی ایسی مثال ہے جیسے ایک سرحدی دیہاتی ہندوستان آیا تھا۔ ایک دکان پر اُس نے حلوا رکھا دیکھا۔ کھانے کو جی چاہا۔ پاس کچھ تھا نہیں۔ تو آپ نے کیا کیا کہ حلوا مٹھی میں بھر کر وہاں سے بھاگے۔ حلوائی پیچھے پیچھے دوڑا۔ جب دیکھا کہ یہ تو پیچھا ہی نہیں چھوڑتا، تو آپ سارا حلوا منہ میں رکھ گئے اور کہا جاؤ، یہ حلوا نہ تمہارا رہا نہ ہمارا۔ کیونکہ خان نے اپنی منشاء کے موافق لطف کے ساتھ تو کھایا ہی نہ تھا۔ حلوائی آپ کو حاکم کے پاس لے گیا حاکم نے یہ سزا تجویز کی کہ اس کو ایک گدھے پر سوار کرو اور لڑکوں کی فوج پیچھے تالیاں بجاتی جائے۔ اس طرح شہر سے باہر کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا کوئی لڑکا دف بجا رہا تھا۔ کوئی تالیاں پیٹ رہا تھا۔ غرض اس ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالے گئے اور اپنے ملک میں پہنچے۔ وہاں لوگوں نے پوچھا "آغا ہندوستان رفتہ بودی۔ چہ طور یافتی؟"

تو آپ کہتے ہیں، "بابا! ہندوستان خوب ملک است۔ حلوہ خوردن مفت است۔ فوج طفلاں مفت ست۔ سواری خر مفت است۔ ہندوستان خوب ملک است۔"

یعنی ہندوستان میں مجھ کو دُولہا بنایا گیا۔ پیچھے پیچھے باجا بجتا چلا آتا تھا دُور تک گدھے کی سواری ملی۔ سبحان اللہ! کیا آپ کا مذاق تھا۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ دنیا کا سامان نافرمان کے لئے ایسی ہی سزا ہے، جیسی خان کی سزا تھی۔ مگر وہ اس کو سزا نہیں سمجھتے اور اس کا سزا ہونا کچھ

آخرت ہی پر موقوف نہیں۔ وہاں تو سزا ہو ہی گی۔ اس سازوسامان کا سزا ہونا فہم سلیم کو دنیا ہی میں محسوس ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

انما یرید اللّٰہ لیعذبھم	کہ اللہ تعالیٰ یہی ارادہ کرتا ہے
بھا فی الحیٰوۃ الدنیا۔	کہ اُن کو مال و دولت سے

دنیا میں (بھی) عذاب دے۔

اس ارشاد میں اس کی تحقیق زیادہ نہیں فرمائی کہ وہ عذاب کیا ہے کیونکہ ذرا سے غور سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کا ساز و سامان بظاہر سامان راحت تو ہے مگر اُن کو اس سے راحت نہیں۔

دولت اور کفار کی خصلت

کیونکہ نافرمان لوگ ہمیشہ روحانی پریشانی میں مبتلا رہتے ہیں کہ اگر مال میں نقصان ہو گیا تو کیا ہو گا۔ اگر چور لے گئے تو کیا ہو گا اور یہ ہو گا تو کیا ہو گا اور وہ ہو گا تو کیا ہو گا۔ دن رات اسی اُدھیڑ بُن میں مبتلا ہیں۔ ع

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

اولاد نہیں ہوتی تو اس کی فکر میں ہیں اور اگر ہو گئی تو بھی فکر سوار ہے کہ جانے زندہ رہے گی یا نہیں۔ غرض ہر وقت تردد میں ہیں۔ دن رات مال و اولاد کی فکر میں پریشان ہیں۔

ایک رئیس تھے۔ اُن کو اولاد نہ ہونے کا غم تھا۔ مدت کے بعد اولاد ہوئی تو یہ غم سوار ہوا کہ دیکھئے زندہ بھی رہے گی یا نہیں۔ یہاں تک کہ اُن کی شادیاں بھی کر دیں۔ پھر یہ غم سوار ہوا کہ اولاد کے بھی اولاد ہوتی

ہے یا نہیں۔ بیچارے ہر وقت غم و پریشانی میں رہتے تھے۔

یہی وہ عذاب ہے جو اہل دنیا پر دنیا میں مسلط کیا جاتا ہے۔ غرض وہاں بھی عذاب اور یہاں بھی عذاب۔ اگر صرف وہاں ہی ہوتا وہ بھی بہت کافی تھا چہ جائیکہ دونوں جگہ ہو۔ بخلاف اہل اللہ کے کہ وہ عذاب سے آخرت میں بھی انشاء اللہ تعالیٰ بری ہیں اور دنیا میں بھی۔ اُن کو یہ فکر ہی نہیں ہوتی کہ مال ہوگا تو کیا ہوگا اور نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ اولاد نہ ہوگی تو کیا ہوگا اور ہوگی تو کیا ہوگا مر جائے گی تو کیا ہوگا۔ جو حالت پیش آئے اُن کے نزدیک سب یکساں ہے۔

یہ مسلّم ہے کہ سامانِ کلفت سے فی نفسہٖ کلفت ہوا کرتی ہے۔ مگر وہاں ایک عارض ہے جس کے سبب اُن کو کلفت نہیں پہنچتی۔ وہ عارض کیا ہے محبّت حق۔ چونکہ اُن کو محبّت ہے خدا تعالیٰ سے اس لئے جو سبب بھی کلفت کا پیش آتا ہے وہ اُن کے حق میں عین راحت ہوتا ہے محبت کا خاصہ ہی یہ ہے کہ محبوب کی طرف سے جو تکلیف بھی پہنچے وہ راحت ہی ہوتی ہے۔ عشق مجازی میں اس کا تجربہ کر لیجئے کہ عشاق کو محبوب کی طرف سے کتنی کلفتیں پہنچتی ہیں مگر وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔

غرض کفار استدلال کرتے تھے کہ ہماری حالت اچھی ہے۔ اگر ہم برے ہوتے تو ہمیں یہ چیزیں کیوں دی جاتیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہاں کے اچھے ہونے سے کیا استدلال ہو سکتا ہے۔ جیسا ابھی بیان ہوا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اموال دنیا پر فخر کرنا کفار کی خصلت ہے چنانچہ

پہلے تو خدا تعالیٰ نے کفار کا قول نقل کیا۔ آگے اُن کا رد ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ——!

وکم اھلکنا قبلھم من — کہ ہم نے تم سے پہلے کتنے
قرن ھم احسن اثاثا ورءیا — قرن ہلاک کر دیئے جو سامان
اور منظر میں تم سے بڑھے ہوئے تھے۔

یعنی اُن کی ظاہری حالت بہت اچھی تھی۔ مال واسباب بھی بہت تھا۔ اچھے اچھے مکانات تھے نشست گاہیں نہایت آراستہ و پیراستہ تھیں۔ خلاصہ یہ کہ زیب و زینت کی چیزیں اُن کے پاس بہت تھیں، مگر پھر بھی معذب ہوتے۔ تو ان میں بھی یہی دو مرض تھے حُبِ مال و حُبِ جاہ۔

حُبِ مال کے اثرات

افسوس ہے کہ آج کل اکثر عورتوں کی یہی حالت ہے کہ مال کی بھی محبت ہے اور جاہ کی بھی۔ میرا مقصود اس کی مذمت سے اس وقت اس پر تنبیہ کرنا ہے۔ کہ کفار کی خصلت مسلمانوں میں نہ ہونا چاہیئے۔ اور یہاں گو چند علمی مضامین بھی قابل بیان ہیں مگر اس وقت وہ بیان سے مقصود نہیں۔ کیونکہ مجمع مستورات کا ہے علمی مضامین کو وہ کیا سمجھ سکتی ہیں۔ اس لئے سہل سہل مضامین بیان کر رہا ہوں۔

غرض اس آیت سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ نہ برتنے کی چیزیں قابل فخر ہیں نہ زینت کی چیزیں قابل فخر ہیں مگر عورتوں کو تو دن رات یہی فکر ہے کہ چیزیں جمع کر لیں جو کہ مال ہے اور اُن سے جاہ پیدا کریں۔ اور چونکہ یہ

دو بڑے مرض ہیں اس لئے ان کا علاج نہایت ضروری ہے کیونکہ اس اور امراض مختلفہ پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً انسان کسی کا مال مارتا ہے تو وہ حبِّ مال کی وجہ سے۔ اگر حبِّ مال نہ ہو تو کیوں ایسا کرے گا۔ غیبت اسی سے کرتا ہے کہ اپنے کو بڑا اور دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے جو کہ جاہ ہے۔ غصّہ کو جب ہی جاری کرتا ہے جب اپنے کو بڑا اور دوسرے کو حقیر خیال کرتا ہے۔ جو کہ جاہ اور تکبّر ہے۔ اور یہ تکبّر ایسی بُری خصلت ہے کہ اس سے اور بہت سی بُری باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ شیطان میں یہی تو تھا۔ اسی لئے یہ کہا تھا۔

خلقتنی من نار وخلقتہٗ من طین۔ کہ تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔

میں بڑا ہوں یہ چھوٹا ہے۔ لوگو! تم جو بڑا بننا چاہتے ہو تو ذرا اپنی حقیقت کو تو دیکھو۔

ایک بزرگ کے سامنے ایک شخص اکڑتا ہوا گزرا۔ اُنہوں نے اس کو نصیحت کی۔ اُس نے کہا تم مجھے نہیں جانتے میں کون ہوں۔ وہ بزرگ بولے ہاں جانتا ہوں۔

اوّلک نطفۃ مذرہ واٰخرک جیفۃ قذرہ وانت بین ذلک تحمل العذرۃ۔

یعنی اوّل تو ایک نطفہ ناپاک تھا اور اخیر میں سڑا ہوا مُردار ہو جاوے گا۔ اور درمیانی حالت یہ ہے کہ تیرے اندر پاخانہ

بھرا ہے۔

ہماری عجب حالت ہے۔ اگر ہمارے پیٹ میں سوراخ ہوتا جس سے ہر وقت پاخانہ بہتا یا اس میں سے ہر وقت بدبو آیا کرتی تو کوئی ہمیں اپنے پاس بھی نہ بیٹھنے دیتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایسا چھپا دیا ہے کہ دوسرے کا ذہن بھی نجاست تک نہیں جاتا۔ ورنہ ہماری کیا گت ہوتی۔ اگر ہم بیٹھ کر اپنی اس حالت کو سوچ لیا کریں کہ ہمارے اندر پاخانہ بھرا ہوا ہے تو یہ بھی پورا علاج ہے تکبر کا۔ میں کہتا ہوں کہ جو شخص تکبر میں مبتلا ہو، وہ پاخانہ میں بیٹھ کر ذرا اپنی حالت پر غور کر لیا کرے کہ میرے اندر سے کیسی چیز اور کس طرح نکل رہی ہے۔ اگر اسی کا مراقبہ کر لیا کرے تو کافی ہے بعض لوگ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں کہ تم ہمیں نہیں جانتے۔ ایسے لوگوں کا جواب وہی ہے جو ان بزرگ نے دیا تھا۔

اسی بیماری میں دیکھئے کیا کیا حالتیں ہوئیں۔ ایک دن کی بیماری میں آدمی ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کو اپنے حسن و جمال پر ناز ہوا اور چیچک نکل آئے تو اس سے پوچھئے کہ اب کہاں گیا وہ حسن و جمال اور کمال بعض عالموں کو دیکھا گیا کہ علوم کے ماہر تھے۔ ان کو ایسی بیماری لاحق ہوئی کہ الحمد بھی یاد نہ رہی۔ انسان کس کمال پر فخر کرے۔

مال اور فخر

مال پر فخر کرنا تو بڑی ہی بیوقوفی ہے۔ کیونکہ اور کمالات کو تو انسان سے من وجہ تلبس بھی ہے جیسے علم شجاعت اور سخاوت، مال میں یہ بھی نہیں۔ مال کو انسان کے ساتھ صرف اضافت کا تعلق ہے

کہ یہ فلاں کا مال ہے۔ اضافت پر کیا فخر۔ اگر کہیں چور آگیا اور سب جمع پونجی لے گیا تو بس مضاف الیہ ہی مضاف الیہ رہ گئے۔ مضاف جو تھا وہ نکل گیا۔

تھانہ بھون میں ایک بی بی تھیں۔ کچھ اثاثہ پاس تھا۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ اس کی شادی کے واسطے خوب سامان کیا۔ ان کو خرافات میں خرچ کرنے سے منع بھی کیا گیا تو بولیں، واہ ایک ہی تو بیٹا ہے۔ ارمان تو نکال لوں۔ ہر چند منع کیا مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ غرض خوب شیخ چلی کا سا گھر بنایا کہ اگر خرچ بچ جاوے گا تو کیا ہو؟ جہیز میں اتنا آوے گا نیوتہ میں اتنا۔ اتنا فلاں کا دوں گی اور اتنا فلانے کا۔ پھر اتنا بچ جاوے گا۔ غرض خوب جمع کر کے رکھا۔ چور تاک لگا رہے تھے۔ بس سب کا سب ایک ہی رات میں اٹھا کر لے گئے۔ جب یہ حالت ہے مال کی اس پر فخر کرنا حماقت ہے۔ جو چیزیں فخر کی ہیں جیسے مثلاً علم وغیرہ اس پر بھی فخر نہ چاہیئے۔

اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے کو نہیں نکلتا۔ اپنے آپ کو خدا جانے کیا سمجھتا ہے کہ مجھ سے زیادہ کوئی اونچا نہیں۔ بس میں ہی ہوں جو کچھ ہوں۔ اسی طرح لوگوں نے دنیا میں اپنے سے بڑوں کو نہیں دیکھا۔ اس لئے تکبر کرتے ہیں۔ اپنے سے بڑوں کو دیکھیں تو حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ جب اپنے سے بڑے بڑے بھی دنیا میں موجود ہیں تو پھر فخر کی کہاں گنجائش ہے۔ ہاں اپنے سے بڑا کوئی نہ ہوتا تو کچھ گنجائش بھی تھی فخر کی۔

بوستاں میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک گاؤں کا چودھری تھا جس کی عزت و توقیر گاؤں میں بہت زیادہ تھی۔ وہ اتفاق سے ایک جگہ پہنچ

یہاں شاہی لشکر پڑا تھا۔ ہاتھی، گھوڑے، حشم، خدم، تقدیب، چوبدار ہزاروں کی تعداد میں سب ہی کچھ تھا۔ چودھری یہ حال دیکھ کر کانپنے لگا۔ اُس کا لڑکا بھی اُس کے ساتھ تھا۔ اُس نے کہا، ابا جان! آپ بھی تو چودھری ہیں اور ایسے بڑے ہیں اور ایسے ہیں۔ آپ کی یہ حالت کیوں ہے۔ آپ کے پاس بھی تو حشم خدم ہیں۔ اُس نے کہا، بیٹا میں چودھری اسی وقت تک ہوں جب تک یہاں قدم نہیں رکھا۔ میں تو گاؤں تک چودھری ہوں۔ یہاں میری کچھ بھی ہستی نہیں۔

اسی طرح گولر کا کیڑا جب تک گولر کے اندر ہے یوں سمجھتا ہے کہ بڑی سلطنت کا مالک ہوں۔ مجھ سے زیادہ کون ہوگا۔ مگر جب گولر کا پیٹ پھوٹا تو اپنی حقیقت کھلی۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

چو آں کرمے کہ در سنگے نہاں است — زمین و آسمان او ہماں است

شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید — خجل شد چو دریائے پہنا بدید

یعنی پانی کا ایک قطرہ اوپر سے ابر میں سے چلا اور اپنے کو سمجھ رہا تھا اتنا کذا و اتنا کذا کہ میں ایسا ہوں اور ایسا ہوں۔ مدوّر ہوں یعنی حسین و جمیل ہوں، منوّر ہوں یعنی چمک دمک رکھتا ہوں مطہر ہوں۔ غرض اپنی صفات کمال پر ناز کر رہا تھا جب نیچے آیا اور دریا کو دیکھا تو سب بڑائی نکل گئی فرماتے ہیں۔ ع

خجل شد چو دریائے پہنا بدید

آگے خجالت میں وہی قطرہ کہتا ہے ؎

کہ جائیکہ دریاست من کیستم　　گر او ہست حقا کہ من نیستم

اسی طرح اگر خدا تعالیٰ کی عظمت اور بزرگی کی طرف نظر کی جائے تو ہستی اور نیستی کا تفاوت معلوم ہو جاوے۔ اسی کو آگے کہتے ہیں ؎

ہمہ ہرچہ ہستند ازاں کمتر اند　　کہ با ہستیش نام ہستی برند

عارف نظامی فرماتے ہیں ؎

پناہ بلندی و پستی توئی　　ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

بوستاں میں ایک اور حکایت لکھی ہے۔ جگنو سے کسی نے پوچھا کہ یار تم رات میں تو نظر آتے ہو۔ دن میں کہاں رہتے ہو۔ تو اس نے جواب دیا ؎

کہ من روز و شب جز بصحرا نیم　　ولے پیش خورشید پیدا نیم

کہ میں دن رات صحرا ہی میں رہتا ہوں۔ میں کہیں چلا نہیں جاتا مگر آفتاب کے سامنے مٹ جاتا ہوں۔

خدا جانتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کی عظمت منکشف ہو جائے یعنی اپنی استعداد کے موافق، ورنہ ہم کیا سمجھیں اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت کو، تو نہ اپنے علم پر نظر رہے نہ اور کسی چیز پر، نہ کوئی اپنے کو میر صاحب کہیں، نہ ڈپٹی صاحب کہیں۔ یہ حالت ہو جاوے کہ سب کچھ بھول جاویں۔

بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے وجود کو وجود حقیقی بنا رکھا ہے اور خدا کا ہوائی۔ اسی لیے ہمیں بڑائی سوجھتی ہے۔ پس اصل مرض اپنے کو بڑا

سمجھنا ہے اور اس کی اصل ہے خدا کو بڑا نہ سمجھنا۔ ساری خرابی اسی کی ہے پس اس کا علاج کرو۔

عورتوں کا مذاق نیز اس سے ایک اور مرض بھی پیدا ہوتا ہے یعنی زیب و زینت کا خیال۔ چنانچہ زینت میں عورتوں کا مذاق یہ ہے کہ خوب زینت کرنا چاہیئے۔ کوئی مہمان آجائے تو بڑے بڑے سامان ہوتے ہیں۔ خاصدان جو مہمان کے سامنے ایک دفعہ گیا تھا، دوسری دفعہ پان اس میں نہیں جانا چاہیئے۔ بلکہ دوسرا خاصدان ہونا چاہیئے صرف یہ بات ظاہر کرنے کے لئے کہ ہمارے یہاں خاصدان اور بھی ہے پھر ایک دفعہ تانبے کا ہو تو دوسری بار کوٹ کا ہو۔ اسی طرح اور چیزوں میں اندازہ کر لیجئے۔ روزانہ تو گھر کوڑے سے بھرا پڑا رہتا ہے۔ مہمان آیا تو صاف کیا۔ غرض ہر بات میں دکھلاوا ہے۔ اُن کا تو مذہب یہ ہے کہ کوئی یوں نہ کہے کہ ایسے ہیں اور ویسے ہیں۔ اور کوئی سے اُن کی مراد مخلوق ہی ہوتی ہے ——— کاش! اللہ تعالیٰ کو بھی اس عموم میں داخل کیا جاتا کہ اُن کے ناخوش ہونے کا بھی خیال ہوتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دین سے دنیا بھاری ہے اس لئے اس کی زیادہ رعایت کی جاتی ہے سو بالکل غلط۔ دنیا کیا بھاری ہوتی۔ دنیا ہے کیا چیز۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ! کھانا، پینا، ہگنا، موتنا۔ بس اتنی ہی تو حقیقت ہے دنیا کی۔ یہ امیر کو بھی حاصل ہے اور غریب کو بھی۔ ہاں اگر پانچ روپیہ والے کی خوراک پانچ چھٹانک ہے اور پانچ ہزار والے کی پانچ ہزار

چھٹانک ہوتی تو کہہ سکتے تھے کہ امیر ہونے میں بڑا فائدہ ہے مگر ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ ہاں اتنا فرق بے شک ہے کہ یہ پانچ چھٹانک سو کھاتا ہے اور وہ تر۔ بلکہ امیر صاحب تو پانچ چھٹانک کھا بھی نہیں سکتے وہ تو پانچ تولہ ہی کھائیں گے۔ گھی کی کثرت سے اُن کی خوراک ہی نہیں رہتی۔

جب میں نواب صاحب ڈھاکہ کے یہاں گیا تھا تو وہ میری وجہ سے گھی کم ڈلواتے تھے۔ کیونکہ ہم لوگوں کے مذاق میں زیادہ گھی ڈلنے سے کھانے کا مزہ ہی باقی نہیں رہتا۔ مگر وہاں نواب صاحب کے چچا سے معلوم ہوا کہ ہمارے یہاں تو سیر بھر گوشت میں سیر بھر گھی پڑا کرتا ہے۔ میں نے کہا، اتنا گھی تو ہمارے یہاں بیلوں کو دیا جاتا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ گھی کوئی زیادہ مرغوب چیز نہیں۔ مجھ سے پوچھا گیا۔ قرآن مجید سے کیسے معلوم ہوا۔ میں نے جواب دیا کہ قرآن مجید نے جنت میں چار نہریں بتلائی ہیں۔ ایک پانی کی۔ ایک دودھ کی۔ ایک شراب طہور کی۔ ایک شہد کی۔ اگر گھی بھی مرغوب ہوتا تو ایک نہر اس کی بھی مذکور ہوتی۔ پھر یہ کہ امیر صاحب کو ایک بجے کھانا نصیب ہوتا ہے اور غریب لوگ جب صبح ہوئی اور بی بی سے پوچھتے ہیں کچھ ہے۔ بس باسی واسی جو کچھ ہوا کھا پی کر کھیت یا کچہری یا دوسرے کام کو چلے گئے۔ اور امیر صاحب کو ایک بجے کھانا نصیب ہوگا۔ کیونکہ پُر تکلف کھانے تو جلدی تیار نہیں ہو سکتے۔ تو صاحب ہم باز آئے ایسی امیری سے۔

عورت اور زیور

اسی طرح جو عورتیں دن رات زیور وغیرہ لادنے کی فکر میں رہتی ہیں وہ پوری قید میں ہیں اور اگر اس زیور وغیرہ کی زکوٰۃ نہ دی تو یہاں بھی قید اور وہاں آخرت میں بھی قید۔ مگر عورتیں اس بوجھ کی ایسی عادی ہیں کہ لادے ہی رہتی ہیں۔

ایک بنئے کی حکایت ہے کہ اُس نے اپنی بی بی سے کہا کہ ذرا سل کا بٹہ اٹھا دیجیو۔ وہ بولی کہ میں اتنا بوجھ کس طرح اٹھاؤں۔ وہ بیچارہ خاموش ہو گیا۔ پھر اُس نے یہ کیا کہ بی بی سے چھپا کر سل کو سنار کے پاس لے گیا اور کہا کہ اس پر سونا چڑھا دے اور ایک زنجیر ڈال دے۔ اُس نے سونا چڑھا دیا اور زنجیر بھی ڈال دی۔ اب اُس کو گھر لائے۔ بی بی سے کہا کہ میں نے تمہارے واسطے یہ ایک قسم کا زیور بنوایا ہے۔ یہ سنتے ہی اُس نے وہ سل اپنے گلے میں ڈال لی اور لگی اِدھر اُدھر چلنے پھرنے۔ ذرا بھی بوجھ نہ معلوم ہوا اگرچہ گردن جھک گئی۔ لالہ جی نے کہا کہ تجھ سے تو سل کا بٹہ بھی نہیں اٹھتا تھا اب سل کیسے اٹھا لی۔

بعض دفعہ یہ حالت ہوتی ہے کہ کان زیور کو لادے لادے سوج جاتے ہیں مگر ان کو شوق میں کچھ نہیں سوجھتا۔ اُن کو تو اس کے لادنے پہنانے سے یہ مقصود ہے کہ ذرا بڑی نظر آویں۔ اور کچھ بھی نہیں۔ غرض اس امیری کا یہ انجام ہے کہ یہاں بھی اس سے راحت نہیں ملتی۔ اور بڑی عورتوں کا کیا گلہ کیا جاوے۔ اس بات میں بچیوں کی بھی عجیب حالت ہے۔

ہمارے یہاں قصبہ گنگوہ میں عورتوں کی ناک اکثر نہیں بندھواتے۔ کیونکہ

علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ باقی ہمارے یہاں سب بندھواتے ہیں ہمارے یہاں ایک شخص کی لڑکی تھی جس سے اُن کو بہت محبت تھی۔ اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر اس کی ناک نہ بندھائی جائے تو کچھ حرج تو نہیں میں نے کہا کچھ حرج نہیں بلکہ بہتر ہے۔ اُنہوں نے اس بچی سے جاکر میری طرف منسوب کر کے کہا کہ اب تیری ناک نہیں بندھے گی۔ اُنہوں نے تو کہا تھا اس غرض سے کہ وہ خوش ہو گی کہ میں تکلیف سے بچی، اچھا ہوا مگر لڑکی نے یہ بات سُن کر بڑی لتاڑ کی اور کہا کہ میرے ہی واسطے یہ فتویٰ رہ گیا ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے گھر والوں کے لئے یہ فتویٰ نہ بتلایا۔ غرض بچیوں کو بھی اس قدر شوق ہے زیور کا کہ روتی جاتی ہیں اور کان ناک بندھاتی جاتی ہیں۔ کس قدر محبت ہے زیور سے۔

عورت اور حُبِ زینت

اسی واسطے حق تعالیٰ نے کفار کے رد میں عورتوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے۔ اَوَمَن یُنَشَّاُ فِی الْحِلْیَةِ وَھُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ یعنی کفار جو ملائکہ کو نعوذ باللہ خدا کی بیٹیاں بتلاتے تھے اور کہتے تھے الملائکۃ بنات اللہ کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ خدا تعالیٰ اُن کا رد فرماتے ہیں کہ اُن کی عقل کہاں جاتی رہی۔ خدا کی اولاد بھی کس کو بنایا جن میں یہ دو بُری صفتیں ہیں ایک تو ان میں قوت بیانیہ نہیں ہوتی۔ ان میں قوت استدلالی نہیں۔ مرد کے ساتھ جب ان کی گفتگو ہوتی ہے وہ بیچارہ اس سے رنج ہی اٹھاتا ہے وہ تو مناظرہ رشیدیہ کے قانون سے گفتگو کرتا ہے اور یہ الٹی سیدھی ہانکتی

چلی جاتی ہیں۔ بس زبان چلائے جائیں گی۔ خواہ ایک بات بھی موقع کی نہ ہو مرد بیچارہ ان کی زبان زوری دیکھ کر چپکا ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کبھی چپکی نہیں ہوتیں اکثر یہ مناظرہ میں اس پر غالب آجاتی ہیں۔ اگر محض بولنے اور بک بک کرنے کا نام مناظرہ ہے، تو گدھا بڑا مناظر ہے۔ سو ایک تو ان میں یہ نقص ہے۔

دوسری بات ان میں یہ ہے کہ اومن ینشؤ فی الحلیۃ ان کی پرورش زیور اور زینت میں ہوتی ہے۔ ان کے اندر ایک خاص شان حُبِّ زینت کی ہے جس میں کہ ان کی ساری عقل صرف ہو جاتی ہے۔ آگے علوم و کمالات تک رسائی نہیں ہوتی۔ تو جس میں یہ دو بُری صفتیں ہوں ان کو خدا کی اولاد بنانا کتنی بڑی حماقت ہے۔

اگر کوئی کہے کہ یہ امور تو عورتوں میں فطری ہیں پھر فطری امر پر کیوں ملامت کی گئی۔ وہ تو اختیار سے باہر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مقصود فطری پر ملامت نہیں بلکہ اعتدال کی تعلیم مقصود ہے کہ عورتوں کو زینت میں انہماک نہ ہونا چاہئے۔ باقی اعتدال کے ساتھ تو زینت ضروری ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ مرد بی بی کو ترکِ زینت پر مار سکتا ہے۔ مگر یہ نہ ہونا چاہئے کہ رات دن اسی فکر میں رہیں لیکن ان کا مذاق یہ ہو گیا ہے کہ رات دن اسی فکر میں پڑی رہتی ہیں۔ اور غنیمت ہے کہ غریب آدمی اس قسم کے بہت سے بکھیڑوں سے بچے ہوئے ہیں۔ اور ان کی مستورات کھانا بھی پکاتی ہیں اور دیگر مشاغل خانہ داری میں بھی لگی رہتی ہیں۔ اس لئے ان کو زیب و زینت کے لئے فرصت کہاں بخلاف

امراء کے کہ ان کی مستورات کو کام تو کچھ ہوتا نہیں۔ اس لئے دن رات ان کو یہی مشغلہ ہوتا ہے۔

غریب اور راحت

نیز غریبوں میں ایک اور امتیاز بھی ہے۔ وہ یہ کہ دنیا جس کا نام ہے وہ بھی ان غریبوں ہی کو حاصل ہے۔ یعنی راحت کیونکہ وہ دن کو کام کرتے ہیں اور کام بھی جس کی ضرورت ہے اور رات کو بے فکر پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں۔ وقت پر کھاتے ہیں۔ محنت و مشقت سے ہضم بھی خوب ہوتا ہے۔ غذا بدن کو لگتی ہے۔ اکثر غریبوں کو وہ دولت میسر ہے جس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

من اصبح آمنافی سربہ معافی فی جسدہ وعندہ قوت یومہ فکانما حیزت لہ الدنیا بحذ افیرھا۔

یعنی جو شخص صبح کو اس حال میں اٹھا کہ اسے کسی شخص کا خوف نہ ہو مثلاً مقدمہ وغیرہ کا، کسی دشمن کا۔ معافی فی جسدہ بدن میں مرض اور دکھ نہ ہو اور اس کے پاس ایک دن کا کھانا ہو تو گویا ساری دنیا اس کے لئے اکٹھی ہو گئی۔ اسی کا گویا ترجمہ ہے ؎

چوں نزا نانے و خرقانے بود ۔ ہر بن موئے تو سلطانے بود

اور ذرا سوچا جاوے کہ اگر کسی کو ساری دنیا مل بھی جاوے تو کیا ایک روز میں سب کھا پی کر خرچ کر لے گا ہرگز نہیں۔ خرچ تو مقدار ہی کے

موافق ہوگا۔ سو اتنی دنیا غریب کے پاس بھی ہے۔ اور اگر کسی غریب کے پاس دنیا اس سے بھی کم ہو مگر آخرت کا سامان پورا ہو تو سب کچھ ہے اور اگر کسی امیر کے پاس دنیا میں سب کچھ ہو اور آخرت کے لئے کچھ نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔

ایک مثال سے یہ بات خوب سمجھ میں آجاوے گی۔ مثلاً ایک شخص ریل میں دہلی جانے کے قصد سے سوار ہوا۔ رستہ میں کسی اسٹیشن پر اترا۔ وہاں دیکھا کہ قسم قسم کی چیزیں بک رہی ہیں۔ وہ بندۂ خدا خوب دل کھول کر چیزیں خریدنے لگا۔ اور اُن کے کھانے میں ایسا مشغول ہوا کہ ریل چل دی اور وہ وہیں رہ گیا۔ مقصود سے جاتا رہا۔ تو ایسے مزہ اڑانے کو مزہ نہیں کہہ سکتے عاقل شخص یہی کہے گا کہ جب مقصود سے رہ گیا تو ایسے مزہ پر خاک۔ اور ایک وہ شخص ہے جس نے یہ مزے نہیں اڑائے اور دہلی پہنچ گیا۔ حقیقت میں پہلے شخص نے سراسر اپنا نقصان کیا اور دوسرے شخص کا سوائے اس کے کچھ بھی نقصان نہیں ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے حظوظ سے محروم رہا۔ مگر منزل مقصود تک تو پہنچ گیا۔ جہاں اطمینان سے ہر قسم کے حظوظ حاصل کر سکتا ہے۔

یہی حال دنیا اور آخرت کا ہے۔ ایک دن کو جو پچاس برس سے نسبت ہے، دنیا کو آخرت سے وہ نسبت بھی نہیں۔ وہاں تو ابدالآباد ہے اور وہاں ہر قسم کی راحت کا وعدہ بھی ہے بشرط ایمان۔ البتہ قدر کا مقابلہ تو کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ مگر جو مومن ہے اُسے ضرور توقع ہے۔ پھر

خدا تعالیٰ کسی کا ایمان تھوڑا ہی چھینتے ہیں اور قدر کی وجہ سے بھی جو شخص ایمان سے محروم رہے گا تو وہ بھی اپنے ارادہ سے محروم ہے۔ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ زبردستی ایمان اُس کے قلب سے نکال لیں۔ اور جب مومن کو راحت آخرت کی توقع ہے۔ پھر دنیا سے دل لگانے کی کوئی وجہ نہیں اور آخرت سے غفلت کسی طرح جائز نہیں۔ کیونکہ دنیا میں جب کسی چیز کی توقع ہوتی تو اُس کی تحصیل کے لئے آرام کو چھوڑ دیتے ہیں۔

مثلاً کسی کو سو روپیہ کی ملازمت کی توقع ہوتی ہے تو اُس کے لئے کیسی کیسی مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ اسکولوں میں پڑھتے ہیں، سفر کرتے ہیں، ہر قسم کی تکالیف اٹھاتے ہیں۔ تو جس چیز کا یقین دلایا گیا ہے تو یقین کے بعد اُس کے لئے آرام کو کیوں نہ چھوڑنا چاہیے۔ خصوص جب دونوں میں ایک خاص تفاوت بھی ہے۔ وہ یہ کہ سامان دنیا تو ایسی چیز ہے کہ جس قدر بڑھتا جاتا ہے اسی قدر ہموم کا ہجوم ہوتا جاتا ہے اور اس کی کسی حد پر بس نہیں ہوتی۔ کسی دنیا دار سے نہیں سُنا، نہ اُس نے کسی حد پر پہنچ کر یوں کہا ہو کہ اب مجھے ضرورت نہیں، شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

آں شنیدستی کہ در صحرائے غور | بار سالارے بیفتاد از ستور
گفت چشم تنگ دنیا دار را | یا قناعت پُر کند یا خاک گور

ہوس کی کوئی حد ہی نہیں البتہ ان ہموں کے دور کرنے والی اگر کوئی چیز ہے تو وہ تعلق مع اللہ ہے۔

ایک آسان مراقبہ

میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر خدا سے تعلق ہو جاوے تو کبھی غم پاس نہ آوے۔ یہ ہے زندگی اور یہ ہے حیات طیبہ۔ بخلاف دنیا کے کہ اس کی لذت خیالی لذت ہے۔ اس لئے میں سب کو عموماً اور عورتوں کو خصوصاً خطاب کرتا ہوں کہ دنیا کی فنا اور آخرت کی بقا کا مراقبہ کیا کریں۔ زیادہ نہیں تو دس ہی منٹ کے لئے روزانہ کر لیا کریں۔ اور وقت بھی وہ لیں جو محض بیکار ہو یعنی جس وقت سونے کو لیٹیں اس وقت دس منٹ کے لئے سوچ لیا کریں کہ دنیا ایک نہ ایک دن ہم سے چھوٹ جائے گی۔ سارا سامان پڑا رہ جاوے گا۔ پھر آخرت کو پیش نظر کریں کہ خدا تعالیٰ کے سامنے جانا ہوگا۔ اعمال پیش ہوں گے۔ اعمال ٹھیک نہ ہوئے تو دوزخ میں جانے کا گمان غالب ہے۔ اس واسطے ہمیں اچھے اعمال کرنا چاہئیں تاکہ دوزخ کے عذاب سے بچیں اور جنت ملے۔ جس میں ہمیشہ کے لئے سب نعمتیں ہوں گی۔ اور وہ دنیا کی نعمتوں کی طرح فنا نہ ہوں گی۔ خدا تعالیٰ کا دیدار بھی وہاں ہوگا۔ جو سب نعمتوں سے بڑی نعمت ہوگی۔ جس میں یہ حالت ہوگی ؎

ہر چند پیر و خستہ و بس ناتواں شدم
ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

اور ظاہر ہے کہ ایسی دائمی نعمت کو چھوڑ کر دنیا کی فانی چیزوں میں منہمک رہنا سراسر بے عقلی ہے۔ حرص دنیا کے متعلق مجھے ایک قطعہ یاد آیا اسی کا مراقبہ کر لیا کریں۔ اور بھی کچھ نہیں تو یہی سہی۔ کیونکہ عورتوں کو گیت کا

بہت شوق ہوتا ہے تو وہ مراقبہ کے لئے اسی کو پڑھ لیا کریں، یہ تو آسان مراقبہ ہے۔

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
خوب ملک روس ہے اور سرزمین طوس ہے
گر میسر ہو تو کیا عشرت سے کیجے زندگی
اس طرف آواز طبل ادھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہو مے گلگوں کا دور
شب ہوئی تو ماہرویوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے
چل دکھاؤں تو جو قید آز کا محبوس ہے
لے گئی یکبار گی گور غریباں کی طرف
جس جگہ جان تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے
یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و حشمت دنیا سے آج
کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت و افسوس ہے

حقیقت یہ ہے کہ انسان مال و جاہ پر کیا ناز کرے جب کہ اس سے زیادہ مال و عزت والے آج زمین کے اندر ایسے بے کس و بے بس پڑے ہیں کہ نہ مال ان کے ساتھ گیا نہ عزت کچھ کام آئی۔ یہی حال ہر شخص کو پیش

آنے والا ہے۔ البتہ اگر آخرت کا سامان ساتھ ہے تو یہ وہاں ضرور آرام دیگا پس یہ مراقبہ ہر شخص کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس مراقبہ سے انشاء اللہ پورا علاج ہو جاوے گا حُبّ مال اور حُبّ جاہ کا۔ یہی دو مرض بڑے مہلک مرض ہیں جو اصول امراض ہیں۔ ان ہی سے تمام خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ تو ایک وقت معین کر کے یہ سوچا کرو کہ دنیا ہیچ در ہیچ ہے۔ اس لئے دنیا یہاں سے چلی گئی تو کیا اور ہم دنیا سے چلے گئے تو کیا۔

شادی میں بربادی

عورتوں کی ایک حالت یہ ہے کہ شادیوں کے موقع پر اتنا خرچ کرتی ہیں کہ سارا گھر خالی کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں اور مقصود وہی نام ہوتا ہے۔ مگر اکثر تو نام بھی نہیں ہوتا کیونکہ بدنام کرنے کو بہت لوگ موجود ہو جاتے ہیں اور اگر ہو بھی گیا تو کیا ملا ایک صاحب نے دیوبند میں بیٹے کی شادی کی اور بہت ہی ضرورت سے زیادہ خرچ کیا۔ ایک بزرگ بھی وہاں تھے۔ اُنہوں نے اُن سے کہا کہ آپ نے خوب ہی خرچ کیا اور بڑے حوصلہ سے کام کیا۔ اس بات سے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد اُن بزرگ نے فرمایا کہ مگر افسوس یہ ہے کہ آپ نے خرچ کر کے کیا چیز خریدی، نام؟ کہ اگر اس کو بازار میں لے جاؤ تو اُس کا کیا اُٹھے گا۔ ایک پیسہ بھی نہیں۔ شیخ صاحب! یہ تو آپ سے حماقت ہو گئی۔ باقی اور سب آپ نے اچھا کیا۔

خوب سمجھ لیجئے کہ اگر آپ برباد ہو گئے تو کیا کوئی عزیز و قریب آپ کا ساتھ دے گا، ہرگز نہیں مصیبت میں کوئی پاس بھی کھڑا نہیں ہوتا۔ اپنے

پرانے سب آسودگی کے ساتھ ہیں۔

علاجو! یہ ساری خرابیاں حبّ مال اور حبّ جاہ کی ہیں۔ یہی بات اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

قال الذین کفروا للذین آمنوا ای الفریقین خیر مقاماً واحسن ندیا۔

یعنی کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ بتلاؤ ہم دونوں فرقوں میں سے کس کا گھر اچھا ہے اور کس کی مجلس اچھی ہے۔

آگے ان کا جواب ہے۔

وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھم احسن اثاثا ورئیا

یعنی ہم نے تم سے پہلے لوگ ہلاک کر دیئے جو تم سے اچھے سامان والے اور اچھے منظر والے تھے۔

جیسے فرعون، ہامان، شداد، قارون وغیرہ۔

اہل اللہ کی کشش

پھر ہلاک بھی ایسے جن کا نام و نشان تک بھی مٹ گیا بلکہ مرنے کے بعد اکثر فقراء کا تو نام بھی باقی رہتا ہے کہ ان کی جوتیاں تک آج سر پر رکھی جاتی ہیں بخلاف بادشاہوں کے کہ ان کی تو کھوپڑیاں بھی ماری ماری پھرتی ہیں۔

ایک ہندو کلکٹر ہمارے ضلع میں تھا۔ بیمار ہو کر نینی تال گیا۔ وہاں مر گیا اس کی میم لاش کو نینی تال سے لائی تھی۔ اس کی لاش کو کہار بہنگی میں لئے ہوئے میم کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ ایک شخص نے دیکھا کہ اس کا سر کہیں

گیا اور پتھر پر لگتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ غرض اُن کی تو کھوپڑی تک کا بھی احترام
نہیں ہوتا۔ بخلاف اہل اللہ کے کہ اُن کی جوتیاں تک محترم ہیں۔
ہمارے قصبہ کے قریب لوہاری ایک قصبہ ہے۔ وہاں ہمارے دادا
حضرت میانجی نور محمد صاحب قدس اللہ سرہٗ تشریف رکھتے تھے۔ اُن
جوتیاں اب تک محفوظ رکھی ہیں جن کو لوگ آنکھوں سے لگاتے ہیں میں
بھی حضرت میانجی صاحب رح کی جوتیاں آنکھوں سے لگائی تھیں۔
اس سے بڑھ کر ایک اور واقعہ ہے۔ وہ یہ کہ وہاں ایک صاحب
اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کوئی شخص میاں جی صاحب کے شاگردوں
زندہ ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک ہندو حلوائی زندہ ہے۔ آپ اُس کے پاس
اور اس کو بلایا اور پوچھا کہ تو نے میانجی سے پڑھا ہے۔ اُس نے کہا،
پھر پوچھا کبھی تجھے مارا بھی ہے؟ کہا، ہاں! کہا کس جگہ مارا تھا؟ کہا گدی
پر مارا تھا۔ کہا بھائی میں مسلمان ہوں اور تو ہندو ہے۔ شاید تو مجھ سے
کرے۔ لیکن اگر تو اجازت دے تو میں اس جگہ کو چوم لوں جہاں مارا
۔ اس نے اجازت دے دی۔ تو آپ نے اُس جگہ کو بوسہ دیا۔ یہ کشش
تھی۔ صرف اس لئے کہ وہ اللہ والے تھے۔ اسی لئے لوگ اُن کی جوتیاں
چومتے ہیں۔ اسی لئے تو عاشقانہ رنگ میں کہتے ہیں ؎

عشق را نازم کہ یوسف را ببازار آورد　　ہمچو صنعا زاہدے را او بہ زنار آورد

اُن سے اتنی محبت کیوں تھی۔ اس لئے کہ وہ اللہ والے تھے۔ اگر
مال عزت بھی چاہیے تو اُس کا طریقہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا

کرے۔ مگر اس میں یہ غرض نہ ہو کہ ہماری عزت ہو گی بلکہ پستی اختیار کرو۔ ا
طریق میں پستی ہی سے علو ہوتا ہے اور جو علو چاہتے ہیں تو اوّل غلو ہو جاتا
پھر غلو ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ دنیا کی محبت ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ سارے امرا
اسی سے پیدا ہوتے ہیں اور سارے امراض کا علاج دنیا کی فنا اور آخر
کی بقا کا پیش نظر رکھنا ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ ہر وقت یہ خیال ر
کہ گناہ پر سزا ہو گی اور نیک کام پر جزا ملے گی۔ اجمالاً اتنا کافی ہے۔
تمام اعمال کے بیان کی اس وقت گنجائش نہیں، نہ ضرورت ہے۔ کیوں
کتابوں میں سب تفصیل موجود ہے۔ اور اب تو اردو میں بھی اچھی اچھی کتا
طبع ہو گئی ہیں جن کو کسی محقق سے معلوم کر لیں۔ پھر وہ کتابیں دیکھا کریں یا
کریں اور اُن کے موافق عمل کریں۔

بس اب ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام "خیرالاثاث للاناث" ر
ہوں یعنی اچھی پونجی عورتوں کے لئے۔ خدا تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ ہم س
کو عمل کی توفیق عطا فرماویں۔ آمین!

اشرف علی!

علاج الحرص

حرص کی مذمت کے متعلق مستورات کی درخواست پر یہ وعظ
۹ شوال ۱۳۴۳ھ بروز یکشنبہ بوقت صبح مکان موقوفہ خود واقعہ
تھانہ بھون میں کرسی پر بیٹھ کر فرمایا جو ۲ گھنٹہ ۴۵ منٹ میں ختم
ہوا۔ مرد تقریباً ۴۰ تھے۔ مجمع مستورات پردہ میں تھا۔ مولانا ظفر احمد
صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ و
نتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات
اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا
ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک
لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم
اما بعد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو کان لابن آدم
وادیان من المال لابتغی ثالثا ولا یملأ جوفہ الا التراب
ویتوب اللہ علی من تاب ـــــــــ!

تمہید یہ ایک حدیث ہے جس میں آدمی کی ایک خاصیت بیان کی گئی ہے جو تمام بنی آدم میں قریب قریب مشترک ہے۔ کوئی اس سے بچا ہوا نہیں الا ماشاء اللہ۔ اور بعض کے استثناء ہی کی وجہ سے قریب قریب کا لفظ کہا گیا ہے۔ چونکہ یہ مرض ایسا عام ہے اس لئے اس کو اختیار کیا گیا ہے کیونکہ معمول یہ ہے کہ جب تک کوئی مضمون ضروری ذہن میں نہ آجائے اس وقت تک بیان نہیں کیا جاتا اور اسی لئے اس بیان میں تاخیر ہوئی حالانکہ بیان کا وعدہ بہت دنوں سے ہو چکا تھا۔ چنانچہ وعدہ کے بعد بھی میں گھر میں پوچھتا رہا کہ مستورات کو کس قسم کے مضمون کی زیادہ ضرورت ہے اور ان میں کیا کیا عیوب زیادہ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کچھ ضرورتیں ظاہر کیں مگر کوئی اہم ضرورت خیال میں نہ آئی۔ اور بات یہ بھی ہو گئی ہے کہ اب کوئی ضروری مضمون ذہن میں بہت کم آتا ہے۔ کیونکہ پہلے تو اپنے عیوب پر نظر کر کے دوسروں کو اپنے

اس پر قیاس کر لیا جاتا تھا کہ اُن میں بھی یہ عیوب ہوں گے۔ اس لئے ضرورت جلدی سمجھ میں آجاتی تھی۔ اور اب قیاس سے بھی کسی میں کوئی عیب ہی نظر نہیں آتا۔ اس لئے کوئی ضروری مضمون بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور یہ حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے کیونکہ مخلوق کے عیوب پر نظر نہ ہونا فی نفسہ بڑی نعمت ہے اس لئے اب مجھے بعض دفعہ بیان کے لئے کئی کئی روز تک تردد رہتا ہے کہ کیا بیان کروں۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی کئی روز تک سوچتا رہا۔ مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ تو پھر میں نے ایک کتاب ویسے ہی اپنے سامنے سے اٹھائی مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کون سی کتاب تھی۔ اتفاقاً وہ سامنے رکھی تھی میں نے اٹھا لی اور کھولنے سے پہلے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ بیان کے لئے کوئی ضروری مضمون اس میں نظر پڑ جائے۔

عورت اور حرص

اس کے بعد جو اُسے کھولا تو نظر کے سامنے سب سے پہلے یہ حدیث آئی۔ میں بہت خوش ہوا کیونکہ واقع میں اس کا مضمون بہت ضرورت کا ہے خصوصاً عورتوں کی ضرورت کا کیونکہ عورتوں میں دنیا کے متعلق حرص بہت ہے۔ ان کے یہاں اس کی کوئی حد ہی نہیں۔ بے ضرورت بھی بہت چیزیں جمع کر لیتی ہیں حتیٰ کہ بعض دفعہ اتنی چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ ان کو یاد بھی نہیں رہتا کہ ہمارے پاس کیا کیا ہے چنانچہ بعض چیزیں رکھی رکھی خراب بھی ہو جاتی ہیں اور یہ رکھ کر ایسی بھولتی ہیں کہ نام بھی نہیں لیتیں اور یہ بھول جانا جیسا کہ عورتوں کی حرص کی دلیل ہے کہ اتنا سامان جمع کیا تھا کہ یاد بھی نہیں رہا۔ ایسے ہی حق تعالیٰ کے منعم ہونے کی بھی

دلیل ہے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے اتنی نعمتیں دیں کہ ہم کو یاد بھی نہیں رہتا کہ ہمارے پاس کیا کیا چیزیں ہیں۔

وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا کا ایک محمل یہ بھی ہے کہ تم باد سے نعمتوں کا احصاء نہیں کر سکتے اور ایک محمل اور ہے جو دل کو زیادہ لگتا ہے کہ ضرورت اور حاجت کی صفت سے تم اس کا احصاء نہیں کر سکتے بلکہ بہت چیزیں تم کو بے ضرورت معلوم ہوں گی۔ واقعی بعض دفعہ اتنی چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ انسان سوچنے لگتا ہے کہ ان کو کس کام میں لاؤں تو جیسا کہ اس سے خدا تعالیٰ کا منعم ہونا ظاہر ہوتا ہے ایسے ہی ہماری حرص بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ہم بے ضرورت بھی بہت چیزیں جمع کرتے رہتے ہیں جن کے لئے کوئی مصرف بھی ذہن میں نہیں آتا۔ یہ مادہ عورتوں میں خصوصاً زیادہ ہے۔

اس کے متعلق مولوی عبدالرب صاحب کا ایک لطیفہ ہے کہ عورتوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ان کے پاس کپڑوں کا صندوق بھی بھرا ہوا ہو مگر پھر بھی جب پوچھو یہی کہیں گی میرے پاس کیا ہیں چار چیتھڑے اور برتن چاہے کتنے ہی ہوں مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں چار ٹھیکرے اور جوتوں کے دو تین جوڑے رکھے ہوئے ہوں گے مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں دو لیترے۔

وہ واعظ آدمی تھے قافیہ خوب ملایا۔ واعظوں کے بیان میں ایسی صنعتیں بہت ہوتی ہیں اور اسی کو لوگ پسند کرتے ہیں۔ مولویوں کے وعظ کو پسند نہیں کرتے کیونکہ ان کو یہ قافیے نہیں آتے۔ مگر واقعی عورتوں کی حالت تو وہی ہے جو مولوی عبدالرب صاحب نے کہی ہے۔ چنانچہ بعض عورتیں ضرورت کے موافق کپڑے

بنالیتی ہیں۔ اس کے بعد پھر کوئی بزاز عمدہ سی چھینٹ لے آیا تو ایک دو پارچے کی اگلے سال کے لیے ضرور خرید لیں گی۔ پس اس بارہ میں یہ بالکل اس شعر کے مصداق ہیں ؎

لختے بُرد از دل گذرد ہر کہ ز پیشم
من قاش فروش دلِ صد پارہ خویشم

باقی شاعر نے جس معنی کے اعتبار سے لختے بُرد از دل کہا ہے اس کی مصداق عورتیں نہیں ہیں۔ کیونکہ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میرے سامنے جو حسین بھی آجاتا ہے میں اس پر فریفتہ ہو جاتا ہوں۔ سو یہ بات ماشاء اللہ تعالیٰ عورتوں میں نہیں ہے بلکہ اس بارہ میں تو وہ حوروں کے مشابہ ہیں۔ جیسے ان کے بارہ میں قاصرات الطرف امیٰ علی ازواجہا آیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے سوا کسی کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں گی۔ یہی حالت ہندوستان کے اکثر حصہ کی عورتوں کی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے سوا کسی پر نظر نہیں کرتیں۔ گو بعض کم بخت ایسی ہیں کہ آبرو میں بٹہ لگا دیتی ہیں۔ مگر ایسی بہت کم ہیں۔ زیادہ تر عورتیں عفیف ہوتی ہیں۔ ان کے دل پر غیر مرد کا خیال ہی نہیں گذرتا۔ نہ حلال کا نہ حرام کا۔ گو جیسے باغ میں پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں ایسے ہی بعض دوسری قسم کی ہیں۔ خیر ان سے قطع نظر کر کے اکثر کو دیکھا جائے تو وہ قاصرات الطرف کی مصداق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں نکاح ثانی کا رواج کم ہے حقیقت میں یہاں کی عورتیں یہی چاہتی ہیں کہ شوہر کے مرنے کے بعد خود ہی مر جائیں

موت اور اختیار

مگر موت تو قبضہ میں نہیں ہے۔ رہے اسباب موت وہ گو قبضہ میں ہیں مگر حرام ہیں اور واقع میں اسباب

موت اختیار کرنے کے بعد بھی موت قبضہ میں نہیں ہے کیونکہ اسباب موت اختیار کرنے سے موت کا آجانا لازم نہیں۔ ایسے بہت واقعات ہوئے ہیں کہ بعض لوگوں نے سنکھیا کھا لیا اور نہیں مرے۔ اسی طرح بعضوں نے گلا کاٹ لیا اور نہیں مرے۔

ایک شخص ایک انگریز کا قصہ بیان کرتے تھے کہ اس کو کسی نے کچھ تہمت لگائی تو بدنامی کے رنج سے اس نے استرہ لے کر اپنا گلا کاٹ لیا اور کمرہ اندر سے بند کر لیا تھا تھوڑی دیر کے بعد نالی سے جو خون نکلا تو ملازم گھبرایا کہ یہ خون کیسا۔ اس نے کمرہ کے کواڑوں میں جو اوپر آئینے لگے ہوئے تھے ان میں سے جھانکا تو دیکھا کہ صاحب بہادر کا گلا کٹا ہوا پیچھے کو گرا ہوا ہے مگر کھال اٹکی ہے اور خون بہ رہا ہے اس نے فوراً پولیس اور ڈاکٹر کو کو خبر دی سب نے آکر کواڑ کھولے اور ڈاکٹر نے لاش کا معائنہ کیا۔ اس وقت ڈاکٹر کو یہ معلوم ہوا کہ بدن میں کچھ حرارت باقی ہے اور رگیں سب نہیں کٹیں، تو اس نے جلدی سے سر اٹھا کر سیدھا کر کے جما دیا اور گلے میں فوراً ٹانکے لگا کر کوئی دوا لگا دی۔ شام تک اس مردہ نے آنکھیں کھول دیں اور چند روز میں مقوی دوائیں کھا کھا کر چلنے پھرنے لگا۔ راوی کہتے تھے کہ وہ بالکل اچھا خاصا ہو گیا۔ صرف ایک عیب ہو گیا تھا کہ گنگنا بولتا تھا۔ نہ معلوم خیشوم کی کون سی رگ خراب ہو گئی تھی۔

تو موت تو کسی کے قبضہ میں نہیں مگر عورتیں خاوند کے مرنے سے کالمیت ضرور ہو جاتی ہیں اور پہلے زمانہ میں تو بعض عورتیں سچ مچ میت ہو جاتی تھیں

چنانچہ یہ ستی کی رسم بھی اسی محبت کی وجہ سے نکلی تھی جو ہندوستان کی عورتوں کو خاوند سے ہوتی ہے۔ ہندوستان کی آب و ہوا کا یہ اثر ہے کہ یہاں عورت کو مرد سے تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندی شاعری اس کی دلیل ہے۔ اس میں عورت کی طرف مرد کو خطاب ہوتا ہے۔ میرے پیا وغیرہ۔ اور عرب میں مرد کو عورت کی طرف سے میلان ہوتا ہے جیسا کہ عربی شاعری اس پر شاہد ہے۔ اور فارس میں بڑا گندہ اثر یہ ہے کہ وہاں مرد کو مرد سے میلان ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں مذکر کی طرف سے مذکر کو خطاب ہوتا ہے اور اب یہ اثر ہندوستان کی اردو شاعری پر بھی ہو گیا ہے اور حیرت یہ کہ بعضے ثقہ اور دیندار لوگ بھی اس اثر سے نہ بچ سکے۔ حضرت امیر خسرو کتنے بڑے درویش ہیں مگر شاعری میں وہ بھی لڑکوں اور امردوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

اے دہلی والے بتان سادہ ۔۔۔ پگ بستہ و ریشہ کج نہادہ

کردند مرا خراب آخر ۔۔۔ ہندو بچگاں سادہ زادہ

خیر ہندوستان میں یہ اثر خارج آ گیا ہے۔ ورنہ یہاں کی آب و ہوا کا اصلی اثر یہ ہے کہ عورت کو مرد کی طرف میلان ہوتا ہے اس لئے وہ شوہر کے مرنے سے کالمیت ہو جاتی ہیں۔ نہ نکاح کریں نہ زینت و آرائش عمر بھر کریں

نکاح بیوگاں

اسی لئے یہاں نکاح ثانی معیوب ہو گیا ہے۔ مگر اب رواج ہونے لگا ہے اور اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ گو منشا اس کا امر طبعی تھا مگر بعد میں عقلی کراہت پیدا ہو گئی۔ ورنہ لوگ حکم شرعی کو عیب سمجھنے لگے تھے۔

حتیٰ کہ کانپور میں ایک بیوہ عورت سے کسی نے کہا کہ دوسرا نکاح کرنا سنّت ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں نے دو دو نکاح کئے ہیں تو بھی دوسرا نکاح کرلے۔ تو وہ کمبخت کیا کہتی ہے کہ دیکھو حضورؐ کی بیٹی حضرت فاطمہؓ نے تو دوسرا نہیں کیا۔ وہ خاندانی بی بی سے تھیں اور دوسری بیٹیوں نے جو کیا ہے، تو ظالم نے ایسا سخت لفظ کہا کہ اس کو نقل کرتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ نقل کفر کفر نباشد۔ کمبخت کہنے لگی کہ وہ کسی کم ذات بی بی سے ہوں گی۔ نعوذ باللہ، استغفر اللہ!

حالانکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نکاح ثانی کی ضرورت ہی نہ ہوئی تھی وہ تو حضرت علیؓ کے سامنے وفات پاگئی تھیں۔ پھر حضورؐ کی سب صاحبزادیاں حضرت خدیجہؓ ہی سے تھیں اور کسی اور بیوی سے بھی ہوتیں، تو آپ کی ازواج میں کم ذات کوئی بھی نہ تھی۔ سب شریف زادیاں اعلیٰ خاندان سے تھیں۔ مگر اس کم بخت نے حضورؐ کی صاحبزادیوں کو ایسا سخت لفظ کہا۔

جب اس طبعی اثر کا نتیجہ یہاں تک پہنچ گیا تو علماء نے اس بدعت کے مٹانے میں قولاً و عملاً ہر طرح کوشش کی۔ پہلے مجھے علماء پر شبہ ہوتا تھا کہ نکاح ثانی کے باب میں تصحیح اعتقاد کافی ہے عملی سعی کی کیا ضرورت ہے۔ محض تصحیح اعتقاد پر کیوں اکتفا نہیں کرتے اور خواہ مخواہ سر ہو ہو کر بیوہ کا نکاح کیوں کراتے ہیں۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ظاہر کو بھی باطن میں بڑا اثر ہوتا ہے اور جب کسی عمل کو دائماً متروک رکھا جاتا ہے تو باطن پر اس کا اثر ضرور رہتا ہے۔ بدون عمل کے اعتقاد کی جڑ نہیں نکلتی۔ اس لئے علماء کی رائے صحیح ہے کہ اس

بدعت کا استیصال بدون عملی سعی کے نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب سے اس پر عمل
ہونے لگا ہے۔ اس وقت سے اعتقاد بھی درست ہونے لگے ہیں۔ غرض
عورتوں کے متعلق یہ شعر اس معنی کر تو صحیح نہیں جو شاعر کی مراد ہے۔ شوہر
باب میں ان کی یہ حالت نہیں ہے۔ مگر اور چیزوں کے متعلق اُن کی یہی حالت
ہے۔ زیور اور کپڑوں کے باب میں وہ بالکل اس شعر کا مصداق ہیں ؎

لختے بُرد از دل گزرد ہر کہ زپیشم — من قماش فروشِ دلِ صد پارہ خویشم

کہ جو چیز بھی دیکھتی ہیں اُن پر اس کی حرص غالب ہو جاتی ہے۔ ان کو
چیز کا دکھانا ہی غضب ہے۔ پھر بدون خریدے یا بدون لئے ان کو صبر نہیں آتا
بس ان کو تو کوئی نئی چیز دکھاؤ ہی نہیں۔ غرض چونکہ ان میں حرص کا مادہ زیادہ ہے
اس لئے یہ حدیث اُن کے حال کے بہت مناسب ہے اور بعد میں یہ بھی
اتفاقی مناسبت ہو گئی کہ میں نے اس مکان کو جس میں یہ بیان ہو رہا ہے وقف
کر دیا ہے۔ احباب کو معلوم ہوا ہوگا اور یہ فعل اس خاصیت کا مقابل ہے
جو حدیث میں مذکور ہے کیونکہ حرص میں اپنی ملک کے اندر چیزوں کو لایا
جاتا ہے۔ اور وقف میں ملک سے نکالا جاتا ہے۔ تو وقف حرص کا مقابل
ہوا اور اس پر [illegible] حدیث پر عمل ہے۔ کیونکہ حضور کا مقصود حرص سے
روکنا ہے جس کا یہ سہل عمل میں ہو گیا اور یہ تفاخر نہیں بلکہ شکر ہے۔ بہرحال
اس حدیث میں ایک ضروری مضمون ہے۔ عورتیں غور سے سنیں کیونکہ یہ مضمون
خصوصیت سے اُن کے مناسب ہے۔

قناعت کی ضرورت

پس حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر ابن آدم کے پاس دو وادی سونے چاندی کے ہوں تو وہ تیسرے کا طالب ہوگا۔ وادی کہتے ہیں اس نشیبی زمین کو جس میں پانی بہتا ہو۔ جیسے ندی اور نالہ۔ تو اس لفظ میں زیادہ مبالغہ ہے کہ اگر انسان کے پاس چاندی سونا اس کثرت سے ہو کہ پانی کی طرح بہتا ہو جب بھی وہ زیادہ کا طالب ہوگا۔ چنانچہ اس کے پاس دو وادی بھی ہوں تو تیسری کا طالب ہوگا اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تین ہوں گے تو لا تبتغی رابعا کہ چوتھے کی تلاش میں ہوگا۔ سعدیؒ نے اس کا خوب ترجمہ کیا ہے ؎

ہفت اقلیم ار بگیرد پادشاہ   ہمچناں در بند اقلیمے دگر

سلاطین کو تو اقلیم و سلطنت کی ہوس ہوتی ہی ہے مگر اب تو یہ حالت ہے کہ رعایا بھی سلطنت کے خواب دیکھتی ہے۔ پھر اس کا نتیجہ کیا ہے سوائے پریشانی کے کچھ نہیں۔ بس ان کی وہ حالت ہے، جیسے چیونٹی کے مرنے کے دن قریب آتے ہیں تو اس کے پر لگتے ہیں۔ اس وقت تو وہ خوش ہوتی ہے کہ ہا میں بھی ہوا میں اڑنے لگی اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

چیونٹی کے لگے پر تو وہ کہنے لگی اڑ کر
میں مثل سلیماں ہوں ہوا میں کئی دن سے

مگر اس کو یہ خبر نہیں کہ اس کی ہلاکت کے دن قریب آگئے ہیں۔ اسی طرح جب رعایا سلطنت کے خواب دیکھے گی تو اس کا نتیجہ بجز ہلاکت کے کچھ نہیں اور باوجودیکہ اس خواب پریشاں کا منشا محض حرص ہے اور کچھ نہیں

مگر یہ لوگ اس کو دین سمجھتے ہیں اور اس کا نام ترقی اسلام رکھا ہے۔

صاحبو! نام کے بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ نتائج اور آثار کو دیکھنا چاہیے کہ اس ہوس خام کے آثار و نتائج کیا ہیں۔ کیا اس سے اسلام کو کچھ ترقی ہوئی ہے یا کفر کو۔ صوفیا بڑے محقق ہیں اور ان سے زیادہ دیندار کون ہوگا۔ اُن کی تعلیم یہ ہے ؎

آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ　　　　بر نتابد کوہ را یک برگ کاہ

یعنی آرزو اور تمنا کا مضائقہ نہیں مگر اپنے اندازہ کے موافق ہونی چاہیے حد سے زیادہ آرزو نہ کرنا چاہیے کیونکہ پہاڑ کو گھاس کا تنکا ہٹا نہیں سکتا۔

تو دیکھیے محققین حد سے زیادہ ہوس کو منع کرتے ہیں کیونکہ تجاوز عن الحد میں پریشانی ہی پریشانی ہے اور شریعت نے مسلمانوں کو پریشانی سے بچانا چاہا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لا ینبغی للمؤمن ان یذل نفسہ قالوا یارسول اللہ وکیف یذل نفسہ قال یتحمل من البلاء لما لا یطیقہ

نص قرآنی سے معلوم ہوا کہ جس ہوس کا نتیجہ ہلاکت ہو وہ ممنوع ہے وہ دین نہیں خلاف دین ہے۔ اور حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان کو اپنے آپ کو ذلیل کرنا بھی جائز نہیں گو ہلاکت بھی نہ ہو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مسلمان اپنے آپ کو کیونکر ذلیل کرتا ہے؟ فرمایا ایسی بلا کو سر

دوسرے جس کے تحمل کی طاقت نہیں۔ اس سے بھی تجاوز عن الحد کی مذمت معلوم ہوئی۔

یہ تو مصائب اختیاریہ کے متعلق شریعت کی تعلیم تھی۔ اگر اس پر عمل کیا جائے تو اختیاری مصائب سے جو پریشانی ہوتی ہے وہ کبھی پاس نہ آسکے۔

تفویض کی اہمیت

مصائب غیر اختیاریہ کا شریعت نے ایسا علاج بتلایا ہے کہ تمام حکماء عالم بھی جمع ہو جائیں، تو اس کی نظیر نہیں لا سکتے۔ سنیئے وہ علاج کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

والذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں (یعنی اُس کی ملک ہیں وہ ہمارا مالک ہے اور مالک کو ہر قسم کے تصرف کا مملوک میں حق ہے) اور ہم اُس کے پاس لوٹ کر جانے والے ہیں۔

اس میں تعلیم ہے کہ مصیبت کے وقت اس مضمون کا استحضار کرنا چاہیئے مگر ہم لوگوں نے اس کو محض وظیفہ بنا لیا ہے جیسے اور وظیفے ہوتے ہیں تسخیر جن اور حُب وغیرہ کے یعنی محض زبان اور ہونٹوں تک اس کا اثر رہتا ہے۔ دل سے بالکل اس مضمون کو نہیں سوچتے۔

تو اس کی ایسی مثال ہوئی جیسے کسی نے سنا تھا کہ گل بنفشہ زکام کے لئے مفید ہے اُس نے گل بنفشہ پکا کر ہونٹوں کو لگا لیا۔ تو بتلایئے اس سے

زکام کیونکر جاتا رہے گا۔ اسی طرح ہماری پریشانی کیونکر دور ہو جب کہ ہم نے انا للہ کو محض ہونٹوں سے لگا رکھا ہے۔ ارے بھائی اس کو دل کے اندر اتارو۔ پھر دیکھو پریشانی کہاں جاتی ہے۔ شاید تم یہ کہو کہ قرآن میں تو قالوا آیا ہے تعقدوا نہیں آیا اور قول کا صدور ہم سے بھی ہو جاتا ہے پھر نفع کیوں نہیں ہوتا تو آپ کو خبر بھی ہے کہ قول کسے کہتے ہیں۔ ؎

ان الکلام لفی الفواد وانما

جعل اللسان علی الفواد دلیلا

اصل قول تو قلب ہی سے ہوتا ہے اور قرآن میں یہی مراد ہے کہ زبان و دل دونوں سے یہ کلمہ کہا جائے۔ شاید تم یہ کہو کہ جب ہم زبان سے کہیں گے تو دل میں بھی پہنچ جائے گا کیونکہ اس وقت تصور تو لازم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دل میں کیا پہنچے گا محض الفاظ ہی الفاظ پہنچیں گے۔ اور مقصود معنی کا پہنچانا ہے وہ بدون تامل و تفکر کے نہیں پہنچ سکتے۔ اگر ہم اس کلمہ کو تصور معنی کے ساتھ کہا کریں تو پریشانی پاس نہیں آسکتی۔

چنانچہ اس میں اول تعلیم یہ کی گئی ہے کہ انا للہ کا استحضار رکھو کہ ہم اور ہماری تمام چیزیں حق تعالیٰ کی ملک ہیں اور مالک کو مملوک میں ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہے۔ دوسروں کو کسی کی ملک میں کسی تجویز کا حق نہیں۔ اس میں ہماری تجویز کو قطع کیا گیا ہے کہ تم اپنی طرف سے کوئی خاص حالت اور خاص صورت اپنے لیے یا اپنے متعلقین وغیرہ کے لیے تجویز نہ کرو کیونکہ تم سب خدا کی ملک ہو۔ اور تجویز کا حق مالک کو ہے تم کو نہیں ہے اور یاد رکھئے کہ پریشانی

کا مدار یہی تجویز ہے کہ انسان اپنے لئے یا اپنے متعلقین کے لئے ایک خیالی پلاؤ پکا لیتا ہے کہ یہ لڑکا زندہ رہے اور تعلیم یافتہ ہو اور اس کی اتنی تنخواہ ہو پھر وہ ہماری خدمت کرے اور یہ مال ہمارے پاس رہے۔ اس میں یوں ترقی ہو اور اتنا نفع ہو۔ اسی طرح شیخ چلی کی مانند ہر چیز کے متعلق کچھ نہ کچھ منصوبے قائم کر لئے جاتے ہیں۔

جیسے شیخ چلی کا قصہ ہے کہ ایک شخص نے دو پیسہ کی مزدوری پر تیل کا گھڑا اُس سے اٹھوایا کہ فلاں جگہ تک پہنچادو۔ آپ گھڑا سر پر رکھے ہوئے چلے اور راستہ میں تجویزیں پکانے لگے کہ ان دو پیسوں کے دو انڈے لاؤں گا ان کے بچے نکلواؤں گا۔ اس طرح میرے پاس بہت سی مرغیاں ہو جائیں گی پھر ان کو بیچ کر بکریاں خریدوں گا۔ ان میں بھی اسی طرح سلسلہ توالد چلے گا۔ پھر ان کو بیچ کر گائے خریدوں گا۔ پھر بھینس لوں گا۔ پھر ان کو بیچ کر بہت سا روپیہ حاصل ہوگا تو میں ایک دکان کھولوں گا۔ جس میں بہت نفع ہوگا تو ایک عالیشان محل بناؤں گا۔ اور بادشاہ زادی کو پیغام نکاح دوں گا۔ بادشاہ میری ریاست کو دیکھ کر بس فوراً ہی نکاح کر دے گا۔ پھر اس سے ایک لڑکا ہوگا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ رہا کرے گا اور کبھی مجھ سے پیسہ مانگے گا تو میں کہوں گا ہشت! بس ہشت جو کیا تو سر کے ہلنے سے گھڑا گر پڑا اور سارا تیل بہہ گیا مالک نے کہا ارے یہ کیا کیا۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ میاں جاؤ بھی۔ تمہارا تو چند پیسوں کا تیل ہی ضائع ہوا اور میرا تو سارا کنبہ ہی ہلاک ہو گیا اور سب کارخانہ تباہ ہو گیا۔ کیونکہ سارے منصوبوں کا منشا تو وہ دو پیسے تھے جو میاں کو مزدوری

میں ملتے۔ جب مزدوری پوری نہ ہوئی تو پیسے بھی نہ ملے اور جب پیسے نہ ملے تو سب انڈے بچے رکھے رہ گئے۔ (لوگ اس حکایت پر ہنسنے لگے تو فرمایا کہ)

ہم اس پر ہنستے ہیں مگر درحقیقت ہم سب اسی مرض میں مبتلا ہیں کہ باول دیکھ کر گھڑے پھوڑ دیتے ہیں اور دُور دراز کی امیدیں پکانے لگتے ہیں۔ پھر جب تجویز اور امید کے خلاف وقوع ہوتا ہے تو پریشانی اور رنج میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اگر پہلے سے کوئی تجویز نہ ہو تو پریشانی کبھی پاس نہ پھٹکے۔ اسی لئے اہل اللہ سب سے زیادہ آرام و راحت و مسرت میں ہیں۔ ان کو کسی واقعہ سے پریشانی اور غم نہیں ہوتا کیونکہ وہاں تجویز کا نشان ہی نہیں ہے۔ بلکہ تفویض کلی ہے۔ بس ان کو ایک غم آخرت کا تو ہے اور کسی بات کا غم نہیں مگر غم آخرت ایسا نورانی اور لذیذ ہے کہ اس کے بدلے میں وہ سلطنت بھی لینا نہیں چاہتے۔ اسی لئے کہتے ہیں ؎

غم دین خور کہ غم غم دین ست　　　همہ غم ہا فروتر ازیں ست
غم دنیا مخور کہ بیہودہ ست　　　ہیچ کس در جہاں نیاسودہ ست

موت کے مشتاق

اس مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غم دین بیہودہ نہیں ہے بلکہ یہ غم موجب راحت ہے۔ اسی لئے اہل اللہ ہر وقت شاداں و فرحاں نظر آتے ہیں کہ کوئی مرے جب خوش، جیئے جب خوش، بیمار ہو جب خوش، قحط ہو تب خوش۔ کیونکہ وہ ہر حال میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، محبوب کی طرف سے ہو رہا ہے گو

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

غرض انا للہ میں تجویز کو قطع کیا گیا ہے مگر چونکہ بعض کو ابتداءً اس پر قدرت تام نہیں ہوتی تو اُن کے لئے انا الیہ راجعون کی بھی تعلیم ہے کہ کسی کی مفارقت سے غم نہ کرو کیونکہ تم بھی ایک دن وہیں پہنچو گے جہاں وہ گیا ہے۔ اس میں تسلی عام اور تام ہو جاتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے نظام حیدر آباد کسی کے عزیز کو بلا لے اور اُس کو مفارقت کا صدمہ ہو۔ پھر نظام اُس کو خط لکھ دے کہ تم بھی عنقریب یہیں بلائے جاؤ گے۔ تو اب غم مفارقت نہیں ہوتا۔

اسی طرح اہل اللہ کو کسی کی مفارقت سے زیادہ غم نہیں ہوتا بلکہ وہ تو کسی کو مرتا ہوا دیکھ کر خود بھی موت کے مشتاق ہوتے ہیں۔ پھر کسی کے مرنے سے کیا غم کرتے۔ وہ تو موت سے ایسے مسرور ہیں کہ اس کے لئے نذریں مانتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم		راحت جاں طلبم وز پے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے		تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

اور یہ محض باتیں ہی نہیں ہیں بلکہ عارفین نے اس کو کر کے دکھلا دیا ہے۔ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مر رہے تھے تو سب لوگ رو رہے تھے اور وہ یہ کہہ رہے تھے ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم		جسم بگذارم سراسر جاں شوم

غرض شریعت مسلمانوں کے لئے پریشانی کو پسند نہیں کرتی۔ اسی لئے مرنا محب

اختیاری وغیر اختیاریہ سب کے لئے ایسی تعلیم دی گئی ہے جس سے پریشانی کا استیصال ہو جاتا ہے۔

راحت کی صورت

رعایا کو ہوس سلطنت ہوتا پریشانی کا سبب ہے اس لئے یہ ہوس دین نہیں ہے بلکہ حد سے تجاوز ہے جس کی ممانعت آئی ہے اور منشاء اس ہوس کا محض حرص ہے اور ہر آرزو پوری نہیں ہوا کرتی۔ تو حرص سے پریشانی ہی پریشانی ہوگی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ام للانسان ما تمنی۔ اس لئے حریص کو کبھی راحت نہیں مل سکتی۔ شاعر کہتا ہے۔

ما کل ما یتمنی المرء یدرکہ
تجری الریاح بما لا تشتھی السفن

انسان بہت دفعہ ایک آرزو قائم کرتا ہے اور وہ خاک میں مل جاتی ہے۔ ع
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس لئے اگر راحت چاہتے ہو تو احکام پر عمل کرو اور حرص کو قطع کرو تم اپنے لئے نہ سلطنت تجویز کرو نہ گداگری، صرف خدا تعالیٰ کی غلامی اختیار کرو۔ اس کے بعد وہ جو چاہیں گے خود دے دیں گے۔

یہاں سے معلوم ہو گیا کہ آج کل جو لوگ ترقی متعارف کے معلّم ہیں، وہ درحقیقت پریشانی کی تعلیم دے رہے ہیں کیونکہ جس چیز کا نام انہوں نے ترقی رکھا ہے اس کی حقیقت محض حرص ہے اور جو لوگ ترقی متعارف سے مانع ہیں وہ راحت کے معلّم ہیں۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہر حال میں شریعت سے

موافق چلو اور اسی میں راحت ہی راحت ہے۔ شریعت میں چل کر پریشانی پاس نہیں آسکتی۔ بہر حال حرص تمام پریشانیوں کی جڑ ہے۔ اور یہ مرض عورتوں میں زیادہ ہے۔ اور یہ ایسا مرض ہے کہ اس کو ام الامراض کہنا چاہیئے کیونکہ اسی کی وجہ سے جھگڑے فساد ہوتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں۔ اگر لوگوں میں حرص مال نہ ہو تو کوئی کسی کا حق نہ دبائے۔ پھر ان فسادات کی بھی نوبت نہ آئے۔ بدکاری اور چوری وغیرہ کا منشاء بھی حرص ہے۔ کہیں حرص مال ہے کہیں حرص لذت۔ نیز اخلاق رذیلہ کی جڑ بھی یہی حرص ہے کیونکہ عارفین کا قول ہے کہ تمام اخلاق رذیلہ کی اصل کبر ہے اور کبر کا منشا بھی ایک گونہ حرص ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ بھی حرص کی ایک فرد ہے کیونکہ تکبر طلب جاہ کا نام ہے۔

جاہ کی ہوس

تو اس میں جاہ کی ہوس ہے بلکہ غور کیا جائے تو مال کی بھی حرص ہے کیونکہ طلب جاہ اس واسطے کی جاتی ہے کہ صاحب جاہ کو ضروریات معاش سہولت سے مل جاتی ہیں۔ اس کی حاجتیں آسانی سے پوری ہو جاتی ہیں۔ جو کام دوسرے شخص کا سینکڑوں روپے خرچ ہونے سے نکلتا ہے، وہ صاحب جاہ کی زبان ہلنے سے ہو جاتا ہے چنانچہ سفر و حضر میں مشاہدہ ہے کہ کلکٹر اور حاکم کے منہ سے جہاں یہ نکلا کہ ہم کو دودھ کی ضرورت ہے تو ہر شخص دودھ لانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اور جہاں یہ نکلا کہ ہم کو گائے کی ضرورت ہے تو ہر طرف سے لوگ گائے ہی گائے لئے چلے آتے ہیں۔ چاہے دل سے یا بددلی سے مگر حاکم کا منشا پورا ضرور ہو جاتا ہے تو صاحب جاہ کو انجام حوائج سہل ہو جاتا ہے۔ مال بھی آسانی سے ملتا ہے

ورنہ کم از کم روپے کی بچت تو ضرور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ہر شخص خوشامد میں کچھ لاتا ہے مفت ہی پیش کرتا ہے۔

اسی لئے صوفیا نے صاحب جاہ کے آداب میں لکھا ہے کہ ایسا شخص اپنی حوائج کو ظاہر نہ کرے کیونکہ اس سے لوگ فکر میں پڑ جائیں گے اور ہر شخص اس کی حاجت کو پورا کرنا چاہے گا۔ اس لئے صاحب جاہ کو اظہار حاجت مناسب نہیں۔

شاید کوئی کہے کہ ہم تو اظہار حاجت کے ساتھ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اگر تم پر بار نہ ہو، گرانی نہ ہو تو یہ کام کر دو۔ تو خوب سن لو کہ یہ مقدمات شرطیہ سب فضول ہیں کیونکہ معتقدین ان مقدمات کو نہیں دیکھتے بلکہ وہ تو تالی کو دیکھ کر حوائج کا تالا کھولنے میں لگ جاتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے جاہ کی حقیقت ملک القلوب لکھی ہے اور ملک القلوب سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ہمارے کام سہولت سے نکلتے رہیں پس تکبر کا منشا بھی حرص ہوا اور کبر تمام رذائل کی جڑ ہے۔ تو حرص منشاء ہوا تمام معاصی کا چنانچہ منشا ہے کہ نااتفاقی کا منشا بھی حرص ہے اور تفاخر کا منشاء بھی یہی ہے کیونکہ مال و دولت کو دکھانا جمع مال ہی کے بعد ہو سکتا ہے اور وہ جمع ہوتا ہے حرص سے تو حرص کا ام الامراض اور اصل معاصی ہونا ثابت ہو گیا۔

یہاں سے اس حدیث کا مطلب واضح ہو گیا ہو گا۔ حب الدنیا رأس

لہ لا یخفی ما فیہ من اللطف فللہ درہٗ ما ابلغہ ۱۲ جامع

کل خطیئۃ حُبّ دنیا ہی کا نام تو حرص ہے اور عورتوں میں یہ مرض مردوں سے زیادہ ہے۔ ان کو زیور کپڑے اور برتنوں کی بہت حرص ہے۔ پھر اس سے ریا و تفاخر بھی پیدا ہوتا ہے۔ جب محفل میں بیٹھیں گی تو کسی بہانہ سے اپنے کرن پھول اور کنگن دکھانا چاہیں گی۔ کنگن تو ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ وہ تو سب بے تکلف دیکھ لیتے ہیں البتہ کرن پھول اور طوق گلوبند وغیرہ دوپٹہ سے مستور ہوتے ہیں۔ تو جو ان میں ثقہ نہیں ہیں وہ تو بدلالت قال دکھلاتی ہیں کہ اسے فلانی! دیکھئے میرے کرن پھول کیسے ہیں؟ اچھے بھی بنے ہیں گلوبند عمدہ بھی ہے جس سے سب سمجھ جاتی ہیں کہ مقصود یہ جتلانا ہے کہ ہمارے پاس یہ چیزیں بھی ہیں اور جو ثقہ بھی ہیں وہ بدلالت قال تو نہیں دکھلاتیں مگر بدلالت حال دکھلاتی ہیں کہ بیٹھے بیٹھے اُن کے کان میں یا گلے میں کھجلی اٹھتی ہے۔ بار بار کان اور گلا کھجلاتی ہیں۔ مگر یہ کھجلی اوّل دل میں ہوتی تھی۔ پھر کان میں ہونے لگی۔

بہرحال حرص سے اوّل قلب کو پریشانی ہوتی ہے پھر ظاہر کو بھی پریشانی ہونے لگتی ہے۔ تو اس کا علاج ضروری ہوا۔ جو اس حدیث میں مذکور ہے جس کی تقریر یتوب اللہ علی من تاب کی شرح میں ذکر کی جاویگی۔

آدم اور انسان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لو کان لابن آدم وادیان من المال۔ اس میں حضورؐ نے لفظ ابن آدم اختیار فرمایا ہے، انسان نہیں فرمایا۔ کیونکہ ابن آدم کے عنوان میں ایک مقبول کی طرف نسبت ہے جس سے شرم دلانا منظور ہے کہ ایسے مقبول کا بیٹیا اور نبی زادہ ہو کر اس کی خصلت ایسی جو بہائم جیسی ہے۔ دوسری توجیہ یہ بھی ہو

سکتی ہے کہ حرص کو مذموم کے ساتھ خاص نہ کیا جائے بلکہ عام مان لیا جائے جو محمود و مذموم سب کو شامل ہو۔ اس صورت میں لفظ ابن آدم میں اضافت سے بنا حرص کی طرف اشارہ ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام میں ایک حرص محمود پیدا ہوئی تھی مگر حضرت انسان اس کی وجہ سے حرص مذموم میں مبتلا ہو گئے۔ مگر یہ توجیہ عوام کے مناسب نہیں بلکہ خاص کے سمجھنے کی ہے۔ عوام کو ابن آدم کہنے کی وہی وجہ سمجھنی چاہیئے جو پہلے مذکور ہوئی (نیز ابن آدم کہنے سے اس خاصہ کے عموم پر اور فطری ہونے پر بھی اشارہ ہے)

خلاصہ یہ کہ حرص کا مادہ اس میں طبعی ہے۔ آگے اس کا علاج بتلاتے ہیں مگر علاج صحیح بتلانے سے پہلے ایک غلط علاج کا غلط ہونا بتلاتے ہیں۔ کیونکہ انسان میں ایک مرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے امراض کا علاج خود کیا کرتا ہے جیسے عورتوں کی بھی عادت ہے کہ وہ اکثر امراض کا علاج خود کیا کرتی ہیں مگر حقیقت میں وہ الٹا علاج ہوتا ہے جس سے بجائے اصلاح کے فساد ہی بڑھتا ہے۔ کسی کے پیٹ میں درد ہو تو اس کا علاج عورتوں میں یہ ہے کہ کھانا کھا لو۔ چنانچہ کہا کرتی ہیں کہ یہ بھوک کا درد ہے کھانے سے جاتا رہے گا بھوک کا درد! یہ درد کی نئی قسم ہے جو اطباء کو بھی معلوم نہیں۔

اسی طرح مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری کے پاس ایک مریض آہ آہ کرتا ہوا آیا۔ اس کو درد شکم کی شکایت تھی۔ مولوی صاحب طبیب بھی تھے آپ نے ایک نسخہ تجویز کر کے اس کو دیا کہ یہ دوا پی لو۔ تو آپ کہتے ہیں کہ حضرت اگر پیٹ میں دوا پینے کی گنجائش ہوتی تو میں کھانا ہی اور نہ کھاتا۔ اس

کے نزدیک بھی درد کا علاج کھانا ہی تھا۔

ایسے ہی آج کل لوگوں نے مرض حرص کا علاج الٹا کیا ہے۔ اور یہ بھی وہ لوگ کرتے ہیں جو حرص کو مرض سمجھتے ہیں ورنہ عام طور پر تو اس کو مرض بھی نہیں سمجھتے۔

آج کل کی ترقی

چنانچہ آج کل تعلیم یافتہ لوگوں نے حرص کا نام ترقی رکھا ہے اور اس کے فضائل بیان کیے جاتے ہیں مگر صاحبو! عنوان بدلنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی ڈاکو کا نام کاسب رکھے اور اس کو الکاسب حبیب اللہ کا مصداق بنانے لگے یا جیسے ایک بادشاہ نے کہا تھا کہ ہم جو حاجیوں کو لوٹتے ہیں یہ جائز ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں

یا ایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض۔

اور سلطان روم نصاریٰ سے موالات رکھتا ہے تو (نعوذ باللہ) وہ بھی منہم ہے۔ اس سے ہر طرح لینا جائز ہے اور ہم حجاج کو اسی واسطے لوٹتے ہیں تاکہ دباؤ میں سلطان ہم کو دے۔

یا جیسے معتزلہ اپنے کو اہل توحید و اہل عدل کہتے ہیں کیونکہ وہ زیادت صفات کے منکر ہیں اور عاصی کی مغفرت کو بدون عذاب کے ناجائز کہتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے کو موحد اور اہل عدل کہتے ہیں۔ اور تماشا یہ ہے کہ آج کل بعض نیچری اپنے کو معتزلی لکھتے ہیں۔ حالانکہ جس جماعت کی طرف وہ اپنے کو منسوب کرنا چاہتے ہیں وہ جماعت اس لقب سے نفرت کرتی ہے اور

اس کی اپنے سے نفی ترقی ہے کیونکہ معتزلہ کا لقب تو ان کو ہم نے دیا تھا لاعتزالھم عن جماعۃ الحق ورنہ وہ اس لقب سے خوش نہ تھے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے شیعہ کو ہم لوگ رافضی کہتے ہیں مگر وہ اس لقب سے جلتے اور ناخوش ہوتے ہیں۔

اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک سنی محرم کے زمانہ میں شیعوں کی مجلس میں جانے لگا۔ وہ خاص مجلس تھی جس میں سنیوں کے آنے کی ممانعت تھی۔ دروازہ پر پہرہ تھا جو کوئی اندر جاتا اس سے پہلے پوچھ لیتے تھے کہ تم کون ہو۔ جو کوئی شیعی بتلاتا اس کو اندر جانے دیتے ورنہ روک دیتے۔ جب یہ سنی صاحب دروازہ پر پہنچے تو ان سے بھی پوچھا گیا۔ تو آپ کہتے ہیں کہ ہم رافضی ہیں۔ سب سمجھ گئے کہ یہ سنی ہے کیونکہ شیعی اپنی زبان سے کبھی خود کو رافضی نہ کہے گا۔ چنانچہ میاں نکال دیئے گئے۔ اسی طرح کوئی معتزلی اپنی زبان سے خود کو معتزلی نہیں کہہ سکتا۔ یہ آج کل کے نیچریوں کی کم علمی ہے جو لقب مذلت کو خود اختیار کر رہے ہیں۔

بہرحال عنوان کے اچھا ہونے سے معنون اچھا نہیں ہو سکتا۔ ورنہ پھر ڈاکو بھی اپنے کو کاسب کہہ سکتا ہے اور بدوؤں کا فعل بھی مستحسن ہو جائے گا پس ترقی کا عنوان تو عمدہ ہے کیونکہ قرآن میں بھی اس کا امر آیا ہے فاستبقوا الخیرات استباق کے معنی ہیں ایک دوسرے پر سبقت کرنا یہی ترقی کا حاصل ہے۔

یہاں سے ایک مترجم قرآن کی غلطی واضح ہو گئی۔ جس نے یا ابانا انا

ذہبنا نستبق میں استباق کا ترجمہ کبڈی سے کیا ہے کیونکہ کبڈی میں ایک دوسرے پر دوڑنے میں سبقت مقصود نہیں ہوتی۔

دوسرے کبڈی کا میدان اتنا وسیع نہیں ہوتا جس میں سب کھیلنے والے اتنے دور چلے جائیں کہ ایک بچہ کو بھیڑیا اٹھا لے جائے اور کسی کو خبر نہ ہو بلکہ یہ بات دوڑنے میں بے شک ہوتی ہے کہ دو جماعتیں آپس میں دوڑیں کہ دیکھیں کون آگے نکلتا ہے۔ تو اس میں ایسا ہو سکتا ہے کہ سب کے سب دوڑتے ہوئے اتنی دور نکل جائیں کہ جس لڑکے کو سامان پہ بٹھایا جائے وہ نظروں سے غائب ہو جائے۔

تیسرے کبڈی کا لفظ نہایت مبتذل ہے جو فصحاء کے کلام میں مستعمل نہیں ہوتا اس لئے بھی ترجمہ قرآن میں اس کا لکھنا معیوب ہے۔ کیونکہ قرآن کا ترجمہ ایسا فصیح و بلیغ و پرشوکت ہونا چاہیے۔ مگر باوجود ان غلطیوں کے وہ ترجمہ آج کل تعلیم یافتہ طبقہ میں بڑا مقبول ہے۔ حالانکہ معنوی غلطیوں کے ساتھ اس میں لفظی غلطیاں بھی بہت ہیں۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ ترقی کا عنوان قرآن میں بھی آیا ہے اس لئے یہ عنوان ظاہر میں بہت عمدہ ہے۔ اس کی خوبی میں کلام نہیں ہو سکتا۔

ترقی خیر

مگر قرآن میں اس کو خیرات کے ساتھ مقید کیا گیا ہے کہ باہم خیرات میں ترقی کرو۔ اب فیصلہ اس پر ہے کہ جس امر میں تم ترقی کی تعلیم دے رہے ہو وہ خیر ہے یا نہیں۔ تو ظاہر ہے کہ تم ترقی مال و حکومت کی تعلیم دے رہے ہو اور اس کا خیر ہونا تم شریعت سے ثابت

نہیں کر سکتے۔

شاید تم یہ کہو کہ قرآن میں ہے۔

وانہ لحب الخیر لشدید اور کتب علیکم اذا حضر

احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین الآیہ

یہاں خیر سے مراد مال ہے۔ لہذا ترقی مال بھی ترقی خیر ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فاستبقوا الخیرات میں خیر مطلق مراد ہے کہ خیر مطلق میں باہم سبقت کرو۔ اور مال خیر مطلق نہیں بلکہ خیر مقید ہے جس کی خیریت کے لیے بہت سی شرطیں ہیں جن کی تم رعایت نہیں کرتے۔ لہذا تم اپنی ترقی مالی کو ترقی خیر نہیں کہہ سکتے۔ اور جس درجہ میں مال خیر ہے اس درجہ میں طلب مال سے ہم مانع نہیں ہیں بلکہ اس کو ہم بھی جائز بلکہ فرض کہتے ہیں۔ کیونکہ حدیث میں ہے کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ۔

مگر تم ہی بتلاؤ کہ جیسی ترقی آج کل (یعنی زمانہ تحریکات میں) ہو رہی تھی کیا وہ خیر تھی؟ کیا اس میں شریعت سے تجاوز نہ تھا کہ مسلمانوں کو بدعت کا لقب دیا گیا۔ ہندوؤں کو مولانا کہا گیا، قشقے لگائے گئے۔ گائے کے گوشت کو ممنوع کہا گیا۔ مسلمانوں سے قربانی کی گائیں چھینی گئیں اور ایک ہندو کی نسبت کہا گیا کہ نبوت ختم نہ ہوتی ہوتی تو وہ نبی ہوتا۔ پھر جن لوگوں نے یہ باتیں کہیں ان سے قطع تعلق نہیں کیا گیا بلکہ ان کو بدستور لیڈر مانا گیا، وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس صورت میں بھی تمہاری ترقی استباق فی الخیر کا مصداق تھی تو فرعون سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور کامیاب ہونا چاہیے۔ اس وقت لوگوں کی یہ حالت تھی

کہ جب کوئی یہ کہتا کہ یہ کام شریعت کے خلاف ہے تو اُس کو یہ جواب دیا جاتا کہ تم تو محض ملانے ہو تم کو سیاسیات کی کچھ خبر نہیں۔ یہ وقت جائز و ناجائز کے سوال کا نہیں۔ اب تو جس طرح ہو ترقی حکومت ہونا چاہئے۔

افسوس! ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ شریعت میں سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ ملا پن ہی مطلوب ہے اور سلطنت سے مقصود بھی ملاپن ہی کا پھیلانا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔

مگر لوگ اسی کو مٹا رہے تھے تو اس صورت میں اس کو ترقی خیر کون کہہ سکتا ہے۔ پس حرص کا عنوان ترقی رکھ لینے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ مگر ان لوگوں نے تو اس عنوان سے اس کے عیب کو چھپانا چاہا ہے۔ جب اس کا نام ترقی رکھ لیا تو اب وہ ان کے نزدیک مرض اور عیب ہی نہ رہا پھر وہ اس کا علاج کیا خاک کریں گے۔

ہوس اور موت

مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کو مرض سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ اس کا علاج خود کرنا چاہتے ہیں اور الٹا علاج کرتے ہیں۔ اُن کے علاج کا حاصل یہ ہے کہ ایک دفعہ خوب جی بھر کر ہوس کو پورا کر لو۔ پیٹ بھر کے گناہ کر لو۔ لڑکوں اور عورتوں کو خوب گھور لو۔ پھر توبہ کر لیں گے۔

چنانچہ ایک جنٹلمین مجھ سے ملے جو انگریزی پڑھ رہے تھے اور دین

کا بھی کچھ خیال تھا۔ وہ کہنے لگے کہ میری نیت مستقبل کے متعلق یہ ہے کہ انگریزی پڑھ کر بی اے پاس کر کے بڑی سی نوکری کروں گا اور خوب پیٹ بھر کے رشوت لوں گا۔ اور مال جمع کر کے ایک دو گاؤں خرید کر ملازمت کو ترک کر دوں گا۔ پھر زندگی بھر اللہ اللہ کروں گا۔

اس غلطی میں جاہل صوفی بھی مبتلا ہیں۔ وہ بھی تقاضائے معصیت کا علاج اسی طرح کرتے ہیں کہ ہوس کو اچھی طرح پورا کر کے پھر توبہ کر لینا چاہیئے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس غلط خیال کا اس حدیث میں جواب دیا ہے اور جواب بھی حکیمانہ دیا ہے حاکمانہ نہیں دیا۔ ضابطہ کا جواب تو یہ بھی کافی تھا کہ یوں فرما دیتے کہ ازالہ حرص کی نیت سے بھی ہوس پورا کرنا اور ازالہ تقاضائے گناہ کی نیت سے گناہ کرنا بھی جائز نہیں مگر اس جواب سے فلسفی دماغ والوں کو تسلی نہ ہوتی۔ وہ اس کے ناجائز ہونے کی وجہ نہ سمجھ سکتے۔ اس لئے آپ حکیمانہ جواب دیتے ہیں کہ حرص کے مقتضاء پر عمل کرنے سے جی بھر نہیں سکتا۔ کیونکہ انسان کا طبعی خاصہ یہ ہے کہ اگر اس کے پاس مال کے دو جنگل بھی ہوں جن میں سونا چاندی پانی کی طرح بہتے ہوں پھر بھی وہ تیسرے کا طالب ہوگا۔ پس یہ خیال ہی غلط ہے کہ ہوس کے پورا کرنے سے ہوس بجھ جائے گی۔ بلکہ جتنا اس کو پورا کرو گے یہ اتنا ہی بڑھے گی۔ انسان کی ہوس کے پیٹ کو مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ تراب سے مراد تراب قبر ہے یعنی موت کے سوا کوئی چیز ہوس کو نہیں بھر سکتی۔ شیخ سعدیؒ نے اس کا خوب ترجمہ کیا ہے ؎

گفت چشم تنگ دنیا دار را یا قناعت پر کند یا خاک گور

موت کو ہوس کا پُر کرنے والا اس لئے کہا گیا ہے کہ اُس سے ہوس منقطع ہو جاتی ہے۔ گو پوری اس وقت بھی نہیں ہوتی۔ مگر موت سے قطع حرص اضطراری ہے اور ایسے وقت میں قطع ہے کہ تم کو اس قطع سے نفع نہیں پہنچ سکتا۔ مرنے کے بعد تو کفار بھی مومن ہو جائیں گے۔ مگر وہ ایمان کالعدم اور غیر قابل اعتبار ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ مرتے ہوئے ایمان لانے کے نافع نہ ہونے کی تصریح فرماتے ہیں۔

فلم یک ینفعھم ایمانھم لما راوا باسنا۔ — کہ عذاب کا معائنہ ہو جانے کے بعد ایمان نافع نہیں۔

اور یہی ایمان مبنی ہے امام صاحبؒ کے اس جواب کا کہ امام صاحبؒ سے ایک شخص نے سوال کیا تھا کہ اُس شخص کے بارہ میں آپ کیا فرماتے ہیں جو کہتا ہے کہ جہنم میں کوئی کافر نہ جائے گا۔ امام صاحب نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ فتوے دو۔ سب نے یہ کہا یہ شخص کافر ہے جو نص صریح کا منکر ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کیا اس کے قول میں کچھ تاویل نہیں ہو سکتی۔ لوگوں نے کہا اس میں کیا تاویل ہوگی۔ فرمایا ممکن ہے کہ اُس نے کفر لغوی کا ارادہ کیا ہو، کفر شرعی مراد نہ لیا ہو اور کافر جب مرتا ہے تو خدا پر ایمان لے آتا ہے۔ لہٰذا لغۃً وہ مومن ہے گو شرعاً چونکہ یہ ایمان معتبر نہیں اس لئے کافر ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہے کہ جہنم میں جو بھی جائے گا وہ لغۃً مومن ہوگا کافر نہ ہوگا۔

تو ایسے ہی مرتے ہوئے گو سب کی حرص منقطع ہو جائے گی مگر یہ انقطاع

معتبر نہیں ۔ اس لئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے علاج سے حرص قطع تو ہو گئی گو موت ہی کے وقت ہوئی ۔

جواب یہ ہے کہ انقطاع آپ کے علاج سے نہیں ہوا بلکہ موت سے اضطراراً ہوا۔ اس لئے یہ انقطاع مفید نہیں۔ پس یہ علاج ہی غلط ٹھہرا کہ خوب گناہ کرنے سے حرص بھر جائے گی ۔ ہرگز نہیں! بلکہ اس کو دونی ترقی ہوگی ۔ کیونکہ فلسفی مسئلہ ہے کہ جس وقت قوت سے جتنا کام لیا جاتا ہے اتنا ہی وہ قوت زور پکڑتی ہے اور راسخ ہو جاتی ہے ۔ پس نگاہ بد کرنے سے مرض نگاہ بازی کو سکون نہ ہوگا ۔ بلکہ اس کی جڑ اور مضبوط ہو گئی اور ایک بار گھور لینے سے جو سکون ہو جاتا ہے اس سے دھوکا نہ کھایا جائے کیونکہ یہ عارضی سکون ہے ۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے تمباکو کھانے والے کو جب تمباکو کی طلب ہوتی ہے ، تو اس وقت ایک بار کھا لینے سے کچھ دیر کو سکون معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت اس کا اس وقت تمباکو کھا لینا زیادت طلب کا سبب ہے ۔ اس سے طلب میں کچھ کمی نہیں ہوتی بلکہ ہر دفعہ کے کھانے میں عادت اور پختہ ہو جاتی ہے ۔

گناہ اور طاعت کا کمال

اسی طرح ایک بار گھورنے سے تھوڑی دیر کو عارضی سکون ہو جاتا ہے مگر حقیقت میں عادت پختہ ہو رہی ہے ۔ کیونکہ سکون کی وجہ دو ہیں ایک تو خروج علت سبب ہے کہ جو چیز پریشانی کی علت تھی وہ اندر سے باہر نکل جائے اور ایک سبب یہ ہے کہ وہ تہہ اور جڑ میں بیٹھ جائے ۔ اس سے بھی قدرے سکون

ہو جاتا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے حوض میں ایک ڈھیلا گر پڑے جس سے حوض گدلا ہو جاتا ہے پھر وہ تہہ کے اندر بیٹھ جائے تو تھوڑی دیر میں پانی صاف نظر آنے لگتا ہے مگر وہ ایسا صاف ہے کہ جہاں کوئی ذرا محرک ہوگا، تو حوض پہلے سے زیادہ گدلا ہو جائے گا۔

اسی طرح یاد رکھو کہ نگاہ بد کرنے سے مرض کو سکون نہیں ہوتا بلکہ قوت ہوتی ہے اور اس عارضی سکون کی ایسی حالت ہے کہ جیسے درخت کی جڑ میں جب پانی دیا جاتا ہے تو وہ تھوڑی دیر میں نظروں سے غائب ہو جاتا ہے مگر واقع میں غائب نہیں ہوا بلکہ اب وہ شاخوں اور پتوں میں رطوبت بڑھا کر ظاہر ہوگا اور جڑ کو پہلے سے زیادہ مضبوط کرے گا۔ پس جو لوگ مقتضائے تقاضا پر عمل کرتے ہیں، وہ حقیقت میں تقاضے کو کم نہیں کرتے بلکہ اس کی آبیاری کرتے ہیں ——!

یہ میں جہلا صوفیاء کی غلطی بیان کر رہا ہوں کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو وسوسہ نہ آئے۔ گناہ کا خطرہ نہ آوے اور جب یہ بات حاصل نہیں ہوتی تو وہ اس کی یہ تدبیر کرتے ہیں کہ لاؤ ایک دفعہ اس خطرہ پر عمل کر لیں پھر سکون ہو جائے گا۔ یہ ان کی سخت غلطی ہے۔

اول تو یہ مطلوب ہی صحیح نہیں کہ گناہ کا خطرہ نہ آئے۔ اگر تم کو گناہ کا وسوسہ اور خطرہ ہی نہ آئے تو پھر طاعات میں تمہارا کمال ہی کیا ہوگا۔ پھر تو تم دیوار کی طرح ہو جاؤ گے۔ کیونکہ اس کو بھی گناہ کا خطرہ نہیں ہوتا۔ لیکن دیوار اگر زنا نہ

نہ کرے تو کیا کمال ہے۔ اندھا نامحرم کو نہ دیکھے تو کیا کمال ہے۔ بہرا غیبت نہ سنے تو کیا کمال ہے۔ صاحبو! نور اسی میں ہے کہ تم کو گناہ کا تقاضا ہو اور تقاضے کا مقابلہ کرو۔ گھورنے کو جی چاہے اور نگاہ بد کو روکو۔ پھر دیکھو قلب میں کیسا نور اور انشراح پیدا ہوتا ہے۔ حدیث میں اس کے متعلق وارد ہوا ہے۔

وجد حلاوۃ الایمان — کہ نگاہ کو روکنے سے حلاوت ایمان نصیب ہوتی ہے۔

بھلا یہ بات اس شخص کو کہاں نصیب جسے تقاضا ہی نہیں ہوتا۔ اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؎

شہوت دنیا مثال گلخن است — کہ از و حمام تقویٰ روشن است

اس تقاضے ہی سے تو تقوے کا حمام روشن اور تقوے کا کمال ظاہر ہوتا ہے پس اوّل تو اس کے نہ ہونے کی طلب ہی جہل ہے۔ پھر اس کا جو علاج کیا گیا ہے وہ بالکل الٹا علاج ہے بلکہ علاج صرف یہ ہے کہ تقاضے کا مقابلہ کرو اور گو مقابلۂ تقاضا سے یہ تقاضا زائل نہ ہوگا مگر ضعیف ضرور ہو جائے گا جس کے بعد پھر مقاومت سہل ہو جائے گی اور یہ بھی بڑا نفع ہے کہ دشمن ضعیف ہو جائے۔

ماہ رمضان اور شیطان

یہاں سے ایک حدیث سے اشکال رفع ہو گیا۔ وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے۔

اذا دخل رمضان صفدت الشیاطین۔ — کہ جب رمضان آتا ہے، تو شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں۔

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ پھر رمضان میں گناہ کیوں ہوتے ہیں۔ اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ سب قید نہیں ہوتے بلکہ بڑے بڑے شیاطین قید ہوتے ہیں جس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض روایات میں مردۃ الشیاطین آیا ہے۔ تو چھوٹے قید نہیں ہوتے اور رمضان میں صدور معاصی انہیں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مگر میرے نزدیک اگر سب بھی قید ہو جائیں تب بھی کچھ اشکال نہیں کیونکہ معاصی کا سبب تقاضائے نفس بھی ہے پس شیاطین کے قید ہو جانے کے بعد جو گناہ ہوتے ہیں ان کا منشاء تقاضائے نفس ہے۔

مگر اب یہ سوال ہوتا ہے کہ جب چھوٹے شیاطین قول اول پر اور تقاضائے نفس قول ثانی پر گناہ کرانے کے لئے موجود ہیں تو پھر شیاطین کے قید ہونے سے کیا فائدہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی نفع ہے کہ چوروں کی جماعت کم ہو جائے رمضان سے پہلے اگر ہزار چور تھے تو اب سو رہ گئے اور دوسرے قول پر تو صرف ایک ہی رہ گیا اور ظاہر ہے کہ ایک چور کا ہونا ایک جماعت کے ہونے سے سہل ہے۔ اس کا مقابلہ آسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان میں اور دنوں سے کم گناہ ہوتے ہیں تو جو شخص تقاضے کے ضعیف کرنے کے لئے اس کے مقتضاء پر عمل کر رہا ہے وہ درخت کو پانی دے کر گرانا چاہتا ہے۔ حالانکہ پانی سے تو جڑ اور مضبوط ہو گی۔ اس کی صورت تو یہی ہے کہ اس کو بالکل سکھا دو۔ تاکہ جڑ کمزور ہو جائے۔ پھر وہ خود ہی گر پڑے گا۔ بس ان لوگوں کے علاج کی وہی حالت ہے جس کو طبیب روحانی کی حکایت میں مولانا فرماتے ہیں کہ انہوں نے دوسرے

طبیبوں کے علاج کو سُن کر کہا تھا ؎

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند　　آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

بے خبر بودند از حال درُوں　　استعیذ اللہ مما یفترون

خودرائی کا علاج

خودرائی کے علاج کی یہی گت ہوتی ہے کہ اس سے الٹا مرض ہی بڑھتا ہے۔ اس لیے اس طریق میں دستگیر کی ضرورت ہے۔ اپنے آپ یہ راستہ طے نہیں ہو سکتا۔ مگر دست گیری سے مراد ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کرنا نہیں ہے بلکہ دست گیری سے مقصود یہ ہے کہ ایک شخص راہ بتانے والا ہو اور تم اس کا اتباع لازم سمجھو۔ بیعت کی ضرورت نہیں۔ دست گیری بدون بیعت کے بھی ہو سکتی ہے

دیکھو اگر کوئی اندھا حافظ کسی لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلے تو کیا وہ اس کا مرید ہو گیا۔ ہرگز نہیں۔ مگر لڑکا حافظ جی کا دست گیر ضرور ہے کیونکہ راستہ دیکھنے کے فن میں وہ حافظ جی سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ وہ بصیر ہے اور حافظ جی ضریر ہیں یعنی اندھے۔ وہ اُن کی دست گیری کر کے منزل پر ضرور پہنچا دے گا۔

بشرطیکہ وہ ایسا دست گیر نہ ہو جیسے ایک حافظ جی دعوت کھا کر ایک لڑکے کے ساتھ واپس ہو رہے تھے۔ راستہ میں کھائی یعنی خندق آئی تو لڑکے نے کہا، حافظ جی کھائی۔ تو وہ فرماتے ہیں ہاں بیٹا خوب کھائی۔ اس نے پھر کہا، حافظ جی کھائی۔ وہ یہی کہتے رہے ہاں بیٹا خوب کھائی۔ آخر کو گڑھے میں گر پڑے تو اس پر بڑے خفا ہوئے کہ تو نے بتلایا کیوں نہیں۔ اس نے

کہا کہ میں نے تو بار بار کہا تھا، حافظ جی کھائی۔ حافظ جی کھائی۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ تجھے یوں کہنا چاہیئے تھا، حافظ جی خندق۔

تو ایسا دست گیر تو واقعی دھکے دے گا جو مخاطب کی حالت کو سمجھ کر اس کے موافق علاج نہ کرے اور اگر دست گیر کامل ہے تو وہ ضرور منزل پر پہنچا دے گا۔ اگر تم اس کا اتباع اور انقیاد کرتے رہے۔ باقی بیعت تو جھگڑا ہے۔ اصل بیعت تو انقیاد ہی ہے۔ چنانچہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب نے اس کو خوب سمجھا۔

معاہدۂ بیعت

حافظ محمد ضامن صاحبؒ اور ہمارے حاجی صاحبؒ میں یہ معاہدہ قرار پایا تھا کہ جہاں ایک صاحب بیعت ہوں وہ دوسرے کو خبر کر دیں۔ وہ بھی انہی بزرگ سے بیعت ہو جائیں گے پھر حضرت حاجی صاحب لوہاری جا کر میاں جی صاحب سے بیعت ہو گئے اور حافظ صاحب سے تذکرہ کرنا بھول گئے۔ جب حافظ صاحب نے دیکھا کہ یہ بار بار لوہاری جاتے ہیں تو دریافت کیا کہ آپ بار بار لوہاری کیوں جایا کرتے ہیں۔ تب فرمایا کہ میں ایک بزرگ سے بیعت ہو گیا ہوں۔ فرمایا اور ہمارا تم سے تو معاہدہ ٹھہرا تھا کہ دونوں ایک ہی جگہ بیعت ہوں گے۔ آپ نے ہم سے کیوں نہ تذکرہ کیا۔ فرمایا میں بھول گیا تھا۔ اب چلئے چلو۔ چنانچہ حافظ صاحب بھی ہمراہ ہو لئے۔ جب آپ لوہاری پہنچے تو میاں جی صاحب نے دریافت فرمایا کہ حافظ صاحب کیسے آئے۔ عرض کیا حضرت بیعت کے ارادہ سے آیا ہوں۔ فرمایا بھائی میں تو بزرگ نہیں ہوں۔ ایک میاں جی ہوں

بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ کسی بزرگ سے بیعت ہونا چاہیئے۔ حافظ صاحب نے کہا کہ میں نے تو اپنا ارادہ عرض کر دیا۔ آگے آپ کو اختیار ہے۔ اس کے بعد حافظ صاحب ہمیشہ لوہاری آتے جاتے رہے۔ اور بیعت کے لئے پھر عرض نہیں کیا۔ آخر میانجی صاحب نے خود ہی ایک بار فرمایا کہ حافظ صاحب کیا اب بھی وہی خیال ہے۔ حافظ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میں تو دل سے بیعت ہو چکا ہوں کیونکہ بیعت اعتقاد ہی ہے۔ باقی بزرگوں پر اصرار کرنا بے ادبی ہے۔ اس لئے صورت بیعت پر میں نے اصرار نہیں کیا۔ فرمایا، اچھا وضو کر کے آجاؤ اور بیعت ہو جاؤ۔

تو دیکھئے! حافظ صاحب نے صورت بیعت پر اصرار نہیں فرمایا بس اپنے اعتقاد و انقیاد کو کافی سمجھا۔ پھر خود ہی شیخ نے بیعت کے لئے فرمایا۔ تو صورت بیعت بھی نصیب ہو گئی۔ مگر جیسے حافظ صاحب کو شیخ نے دیر سے بیعت کیا تھا ایسے ہی وہ بھی بہت دیر میں بیعت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے مریدوں سے اس کی کسر نکالی۔ چنانچہ عمر بھر میں آٹھ سے زیادہ آپ کے مرید نہیں۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ آپ نے حاملان عرش کی شمار پوری کر دی۔ وہ بھی آٹھ ہی ہیں۔ اور حضرت حاجی صاحب بہت جلد بیعت کر لیتے تھے کیونکہ آپ کو میانجی صاحب نے فوراً بیعت کر لیا تھا۔

حضرت حاجی صاحب پہلے شاہ نصیر الدین صاحب سے بیعت ہوئے تھے۔ پھر تکمیل سے پہلے ہی ان کا وصال ہو گیا تھا۔ تو حضرت کو دوسرے شیخ کی تلاش تھی اور اس تلاش میں بے چین تھے اور شاہ سلیمان صاحب

سے بیعت ہونے کا کبھی کبھی ارادہ ہوتا تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ مشہور تھے اسی عرصہ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو یا اپنے مشائخ میں سے کسی کو (الشاک منی) آپ نے خواب میں دیکھا کہ حضورؐ کے ساتھ ایک بزرگ ہیں۔ اور حضورؐ نے حاجی صاحب کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر فرمایا کہ یہ تمہارے شیخ ہیں۔ حاجی صاحب خواب سے بیدار ہوئے تو بڑے پریشان تھے کہ یا اللہ یہ کون بزرگ ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ کیونکہ خواب میں پتہ کچھ نہیں بتلایا گیا۔

آخر ایک دن کسی شخص سے میانجی صاحب کا تذکرہ سنا تو قلب کے اندر میانجی صاحب کی طرف ایک خاص کشش پائی۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ تو یہاں سے قریب لوہاری ہی میں رہتے ہیں۔ تو حضرت نے زیارت کا ارادہ کیا۔ اب حالت یہ تھی کہ جوں جوں لوہاری کی طرف بڑھتے جاتے اسی قدر دل میں کشش بڑھتی جاتی جیسے کوئی کھینچ رہا ہو۔ جب لوہاری پہنچے اور میانجی صاحب کی صورت دیکھی تو بعینہ وہی صورت تھی جو خواب میں دکھائی گئی تھی۔ اب تو حاجی صاحب کی اور ہی حالت ہوئی۔ قریب جا کر سلام عرض کیا تو میانجی صاحب نے دریافت فرمایا کہ صاحبزادے کیسے آنا ہو گیا۔ بس حاجی صاحب پر گریہ طاری ہو گیا اور جوش میں عرض کیا کہ کیا حضرت کو معلوم نہیں ہے (نہ معلوم اس وقت حاجی صاحب پر کیا حالت تھی) اس کے جواب میں میانجی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ صاحبزادے خواب و خیال کا کیا اعتبار۔ اس میں خواب کی طرف اشارہ تھا۔ اب تو حاجی صاحب کو اور بھی یقین ہو گیا اور زیادہ گریہ طاری ہو گیا اب میانجی صاحب نے تسلی فرمائی کہ آپ گھبرائیں نہیں۔ جو تم چاہتے ہو، وہی

ہو جائے گا۔ چنانچہ فوراً بیعت فرما لیا۔

حضرت حاجی صاحب پر یہی اثر غالب تھا کہ طالب کو پریشان نہیں کرتے تھے مگر دونوں صاحبوں کی نیت بخیر تھی۔ حاجی صاحب کی نظر وسعت رحمت پر تھی۔ اس لئے فیض کو عام کر رکھا تھا اور حافظ صاحب کی نظر اس پر تھی کہ سلسلہ کی بے قدری نہ کرنا چاہیئے بلکہ اچھی طرح طلب کا امتحان کرنے کے بعد بیعت کرنا چاہیئے۔

الغرض صورت بیعت کی تو ضرورت نہیں مگر کسی کو رہبر بنا لینے اور اس کے اتباع کرنے کی اس طریق میں بہت ضرورت ہے۔ اپنی رائے پر عمل کرنا اس طریق میں سخت مضر ہے کیونکہ رای العلیل علیل۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

یار باید راہ را تنہا مرو — بے قلاؤز اندریں صحرا مرو

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید — ہم بعون ہمت مرداں رسید

ضرورت رہبر و دستگیر

یہ اپنی رائے ہی سے علاج کرنے کا نتیجہ ہے کہ بعض جاہل تقاضائے معصیت کے مقتضا پر عمل کر کے اس کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔

ایک سالک میرے ساتھ سفر میں بڑودت کے رستہ میں تھے۔ وہ اس مرض میں مبتلا تھے کہ نظر بد کو مفید سمجھتے تھے تاکہ تقاضا فرو ہو جائے۔ پھر میں نے اُن کو اس غلطی پر متنبہ کیا کہ اس طرح تو مرض دن بدن بڑھتا جائے گا۔ ہرگز سکون نہ ہو گا۔

صاحبو! یہ الٹا علاج معصیت تو ہے ہی مگر اس میں کفر کا بھی اندیشہ ہے

کیونکہ یہ شخص معصیت کو مضر نہیں سمجھتا بلکہ مفید سمجھتا ہے اور اس کو طاعت کا مقدمہ بناتا ہے اور مقدمۂ طاعت، طاعت ہے۔ تو اس نے گویا گناہ کو طاعت سمجھا اور یہ قریب کفر ہے۔ اسی لئے ایک بزرگ نے عوام کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ اگر تم غلطی کرتے ہو تو طاعات سے معاصی میں آتے ہو اور ہم غلطی کرتے ہیں تو ایمان سے نکل کر کفر میں جاتے ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ طریق نہایت لطیف ہے اور غذا جتنی لطیف ہوتی ہے اتنی ہی جلدی سڑتی ہے اور سڑنے کے بعد اس میں کثیف غذا سے زیادہ تعفن ہوتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس طریق میں کسی کو رہبر اور دست گیر بنایا جائے ورنہ کفر تک میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اور جس کو رہبر بنایا جائے اس کے اتباع کی ضرورت ہے۔ صرف بیعت کافی نہیں۔

مگر اب تو اس لئے بیعت ہوتے ہیں کہ آئے دن مقدمات وامراض وغیرہ میں تعویذوں کی ضرورت ہوتی ہے اور تعویذ گنڈے والے ہر دفعہ فیس طلب کرتے ہیں۔ تو انہوں نے ایک کو پیر بنا لیا تاکہ عمر بھر کے لئے مفت تعویذ لکھوانے کا ٹھکانا ہو جائے یا یہ نیت کرتے ہیں کہ مقدمات میں دعا کرنے کو اور اللہ میاں سے لڑنے بھڑنے کو ایک شخص کو پیر بنا لو۔ واقعی آج کل بہت لوگوں کا یہی خیال ہے کہ یہ مشائخ اللہ میاں کے رشتہ دار ہیں کہ بس جس بات کے لئے دعا کر دیں گے وہ ضرور ہو جائے گی اللہ تعالیٰ ان کے خلاف کر ہی نہیں سکتے۔ نعوذ باللہ!

شفاعت انبیاء اور پیر

بعض کا یہ خیال ہے کہ پیر آخرت میں ہمارے گناہ اپنے سر لادے گا۔ اور ہمیں بخشوا لے گا

پھر جو چاہو کرو۔ تو پھر پیر کیا ہوا بھنگی ہوا کہ تمہارا پاخانہ اٹھائے گا۔ استغفر اللہ! ارے میاں! قیامت کے دن انبیاء کا تو پتا پانی ہو جائے گا پیر بے چارہ کی تو کیا ہستی ہے۔ کیا تم کو شفاعت کی حدیث یاد نہیں کہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس اوّل جائیں گے کہ حق تعالیٰ سے اپنی اولاد کے لئے سفارش کر دیجئے۔ وہ کہیں گے نفسی نفسی۔ مجھے اپنی ہی فکر ہے۔ مجھ سے ایک قصور ہو گیا تھا۔ اگر آج سوال ہو گیا تو میں کیا جواب دوں گا۔ اس کے بعد پھر نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ تو سب نفسی نفسی کہیں گے۔ اور کچھ نہ کچھ عذر کر دیں گے۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا شفاعت کے لئے آمادہ ہو جانا اور کوئی عذر نہ کرنا اس وجہ سے نہ ہو گا کہ آپ خدا تعالیٰ سے ڈرتے نہیں ہیں (استغفر اللہ) آپ تو سب سے زیادہ خائف ہیں انا اعلمکم باللہ واخشاکم للہ مگر آپ کو اشارہ اور اذن ہو جائے گا اس لئے آپ عذر نہ کریں گے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کے یہاں بدون اذن کے کوئی شفاعت نہیں کر سکتا۔ نص موجود ہے۔ من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ۔ اس لئے ماننا پڑے گا۔ کہ آپ اذن کے بعد شفاعت فرمائیں گے اور اذن کے بعد جو شفاعت ہو گی اس کی تو یہ حالت ہو گی ؎

ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو   ایمنی از تو مہابت ہم ز تو

اور ؎

ما چو چنگیم و تو زخمہ مے زنی   زاری از ما نے تو زاری میکنی

جب وہ خود کہہ دیں گے کہ تم شفاعت کرو ہم قبول کریں گے۔ تو پھر یوں کہنا چاہیئے کہ وہ خود ہی بخشنا چاہتے ہیں۔ بخشوانے کا نام ہی نام ہوگا۔ باقی اگر وہ بخشنا نہ چاہیں تو انبیاء بھی کسی کو نہیں بخشوا سکتے۔ پھر بے چارہ پیر تو کس شمار میں ہے۔

پس یہ خیالات تو محض لغو ہیں اور اس نیت سے بیعت ہونا کچھ مفید نہیں بلکہ اس طریق میں شیخ کے وجود کی مصلحت یہ ہے کہ وہ غلطیوں پر متنبہ کرتا ہے مقدمات میں دعا کرنے اور تعویذوں کے واسطے نہیں ہے۔ نہ وہ قیامت میں بخشوانے کا ذمہ دار ہے۔ ان خیالات کو قلب سے نکال دینا چاہیئے! اور شیخ کو بھی یہ سمجھنا چاہیئے کہ نہ معلوم آخرت میں پیر مرید کو بچائے یا مرید پیر کو بچائے شیخ اپنے کو مریدوں سے بڑا نہ سمجھے۔ کیا معلوم خدا تعالیٰ کے یہاں کون بڑا ہے اس لئے شیخ کو بھی چاہیئے کہ اپنے چھوٹوں سے مشورہ کرتا رہا کرے اور معاملات میں اُن سے رائے لیا کرے اور عام مسلمانوں سے دُعا بھی کرائے۔

حرص کا صحیح علاج

غرض حضور صلے اللہ علیہ وسلم حرص کا صحیح علاج بتاتے ہیں۔ جس کے ساتھ ساتھ تمہارے علاج کی غلطی بھی معلوم ہوگئی کہ زیادہ مال جمع کرنا حرص کو کم نہ کرے گا۔ اس سے تو مال کی حرص اور زیادہ ہوگی کم نہ ہوگی۔ دوسرے زیادہ مال ہونے سے پھر اس کی حفاظت کی حرص ہوگی۔ اور اس سے مال کے ساتھ تعلق بڑھے گا۔ ہر وقت اسی دھن میں رہو گے کہ اس روپیہ کو کہاں رکھوں کس طرح بڑھاؤں۔ پس زیادتی مال

سے تو پریشانی دن بدن بڑھے گی کم نہ ہو گی۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

جان ہمہ روز از لگد کوب خیال — میشود مجروح و خستہ و پائمال

نے صفا میماندش نے لطف و فر — نے بسوئے آسماں راہ سفر

اور یہ تعلقات بلندی کو تو بہت ہی مضر ہیں۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نواب محمود صاحب رئیس چھتاری کو لکھا تھا کہ آپ مکہ میں بہ نیت ہجرت آنا چاہتے ہیں تو یہاں رہ کر اپنے صرف اتنی رقم منگانے کا انتظام کیجئے جو آپ کے خرچ کے لئے کافی ہو تقسیم کے واسطے نہ کوئی رقم ساتھ لانا نہ وہاں سے منگانے کا انتظام کرنا حالانکہ یہ صدقہ تھا جو موجب ثواب ہے۔ مگر بلندی کو یہ بھی مضر ہے کہ ان جھگڑے میں پڑے کہ صدقہ کس کو پہنچا اور کون رہا اور رقم اب تک کیوں نہیں آئی۔ کہاں دیر ہوئی اور اپنے آپ کو دینے والا اور دوسروں کو اپنا محتاج سمجھے۔

ہاں حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے اقویاء کو یہ تعلقات مضر نہیں۔ ان کی نسبتیں راسخ تھیں۔ اس لئے ان تعلقات سے اُن کی توجہ الی اللہ کم نہیں ہوتی تھی ــــ!

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بڑا ساز و سامان تھا۔ سلطنت جیسے ٹھاٹ تھے مگر مال سے بے تعلقی کی یہ حالت تھی کہ ایک فقیر نے آپ کا امتحان لینا چاہا کہ دیکھوں ان کو مال سے کتنا تعلق ہے۔ اس نے ایک دن خواجہ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت میرا جی چاہتا ہے کہ اس سال

آپ کے ساتھ حج کروں۔ اس نے دل میں سوچا ہوگا کہ خواجہ صاحب انتظام ریاست کا عذر کر کے کچھ طویل میعاد مقرر کریں گے۔ مگر وہاں کیا دیر تھی۔ خواجہ صاحب فوراً رومال جھاڑ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا بہت اچھا چلو۔ فقیر نے کہا حضرت ریاست کا تو کچھ انتظام فرما دیجئے۔ فرمایا یہ تو خدا کا مال ہے، وہ خود اس کی حفاظت کر لیں گے۔ میں تو ایک برائے نام محافظ ہوں۔ اگر میں نہ ہوں گا، تو وہ کسی دوسرے کو میری جگہ مقرر کر دیں گے۔ مجھے انتظام کی ضرورت نہیں۔ اس نے کہا، اچھا میں ذرا کمبل اور کپڑے گھر سے لے آؤں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا بس اسی پر اپنے کو دنیا سے بے تعلق سمجھتے ہو۔ مجھے تو اتنی بڑی ریاست کی بھی فکر نہ ہوئی اور تمہارا دل ابھی تک کمبل اور کپڑوں ہی میں اٹکا ہوا ہے۔ درویش اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ باوجودیکہ سلطنت کرتے تھے مگر اس سے ایسے بے تعلق تھے کہ اپنے بعد کے لئے کسی کو خلیفہ بھی نامزد نہیں کیا۔ نہ اس کا مرتے ہوئے کچھ تذکرہ کیا۔ نہ یہ فکر ہوئی کہ میرے بعد سلطنت کا کیا حال ہوگا۔ صرف دو وصیتیں فرمائی تھیں۔

ایک یہ کہ خلافت چھ آدمیوں کے مشورہ پر ہے۔ یہ جس کو چاہیں، خلیفہ منتخب کریں۔

دوسرے یہ کہ عبداللہ بن عمر کا خلافت میں تو کوئی حق نہیں مگر خلیفہ کو اُن سے مشورہ کرتے رہنا چاہیے۔ لانہ رجل صالح کیونکہ وہ نیک آدمی ہیں۔

تو جو شخص ان تعلقات میں مبتلا ہو کر اُن سے ایسا بے تعلق ہو اس کو تو

ضرر نہیں ہوتا۔ ورنہ عام طور پر تعلقات مضر ہیں۔ ان سے قلب میں ظلمت پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت تو یہ بات تقلیداً مان لی جائے۔ پھر جب آپ کو تعلق مع اللہ کے نور کا احساس ہوگا اس وقت ان تعلقات کی ظلمت کا بھی احساس ہو جائے گا۔ غرض حرص کا یہ علاج تو غلط ہے اور اس سے ہرگز ہوس نہیں بھرتی۔

اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ہم نے ایک دفعہ وسوسہ گناہ کے بعد جی بھر کے گناہ کر لیا تھا۔ پھر توبہ کر لی تھی تو پھر اس کے بعد واقعی ہم کو اس گناہ کی ہوس نہیں ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک دفعہ جی بھر کے گناہ کر لینے سے ہوس بھر جاتی ہے۔ تو وہ علاج غلط نہ ہوا۔

سالکین اس کا جواب کان کھول کر سن لیں کہ یہ نفع جی بھر کے گناہ کرنے کا نہیں بلکہ وہاں دو چیزیں تھیں، ایک جی بھر کے گناہ کرنا۔ دوسرے یہ ارادہ کرنا کہ پھر نہ کروں گا۔ تو یہ برکت اس عزم ترک کی ہے جس کو تم جی بھر کے گناہ کرنے کا اثر سمجھتے ہو۔ اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک دوا گلے سے نیچے نہ اترتی تھی۔ مریض نے پانی کے ساتھ اس کو نگل لیا تو گلے سے اتر گئی اور اس سے نفع ہوا۔ اب وہ بے وقوف یہ سمجھنے لگا کہ یہ نفع پانی سے ہوا ہے اور اُسے مفید سمجھ کر خوب پینے لگا۔ تو ظاہر ہے ایک دن مرے گا اور اس بیوقوف سے ہر عاقل یہی کہے گا کہ میاں نفع تو دوا سے ہوا تھا۔ پانی کو اس میں کچھ دخل نہ تھا اُس نے محض گلے سے اتارا تھا اور اگر تم ہمت کر کے ویسے ہی نگل جاتے جب بھی نفع ہو جاتا۔ تمہارا پانی کو مفید سمجھنا حماقت ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھو

کہ یہ نفع محض عزم ترک کا ہے۔ گناہ کرنے کو اس میں کچھ دخل نہیں۔

اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ کچھ ہی سہی مگر نفع تو ہوا اور جی بھر کے گناہ کرنے سے تقاضا تو رفع ہوا۔ چاہے عزم ترک کے ہی اقتران سے سہی۔

تو میں تقسیم کہتا ہوں کہ اقتران کو نفع میں کچھ دخل نہیں بلکہ محض عزم ترک ہی کو دخل ہے بلکہ اس عزم کے ساتھ گناہ کے منضم ہو جانے سے نفع دیر میں ہوا اگر گناہ منضم نہ ہوتا تو نفع جلدی ہوتا دبلکہ انضمام گناہ کے ساتھ عزم ترک سے کچھ نفع ہو جانا شاذ و نادر ہے ورنہ زیادہ تر یہ ہے کہ ارتکاب گناہ سے پہلے تو عزم ترک بعض میں ہوتا ہے مگر گناہ کر لینے کے بعد باقی نہیں رہتا۔ گناہ سے اکثر یہ عزم ضعیف و معدوم ہو جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ شاذ پر کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ اگر کسی کو اتفاقاً زہر نقصان نہ دے تو اس سے زہر کو نافع نہیں کہہ سکتے۔ خوب سمجھ لو)

اب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ازالہ حرص کا صحیح علاج بتاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے ویتوب اللہ علے من تاب اس میں توبہ کو علاج حرص بتلایا گیا ہے جس کے معنی ہیں توجہ الی اللہ۔ اور اس کا حرص کے لئے علاج ہونا ایک قاعدہ فلسفہ سے سمجھ میں آجائے گا۔ وہ قاعدہ یہ ہے۔

النفس لاتتوجہ الی شیئین	کہ نفس ایک وقت میں دو
فی آن واحد	چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا

اور ظاہر ہے کہ حرص کی حقیقت توجہ اور میلان الی الدنیا ہے۔ اب اس توجہ کو کسی دوسری شے کی طرف پھیر دیا جائے تو توجہ الی الدنیا باقی نہ رہیگی

پھر جس چیز کی طرف توجہ کو پھیرا جائے اگر وہ طبعاً بھی محبوب ہو تو اس کی طرف توجہ اشد ہو گی اور اس سے توجہ الی الدنیا کا ازالہ بھی قوی ہو گا اور اگر ایسی شئے کی طرف توجہ کی جائے جو طبعاً محبوب نہ ہو تو اس صورت میں یہ توجہ کمزور ہو گی

تعلق باللہ اب سمجھو کہ حق تعالیٰ سے ہر شخص کو فطری تعلق ہے اور ذات حق کی طرف ہر اک کو میلان طبعی ہے۔ فقط مسلمان ہی کو نہیں بلکہ کافر کو بھی۔ کیونکہ انسان کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے تو کسی سبب سے ہوتی ہے اور وہ اسباب یہ ہیں۔ حسن و جمال یا جود و نوال یا فضل و کمال۔ اور جس میں یہ اسباب قوی ہوں گے۔ اس سے محبت بھی قوی ہو گی۔ اور یہ معلوم ہے کہ یہ اوصاف بالذات حق تعالیٰ ہی میں ہیں۔ دوسری اشیاء میں بالعرض ہیں۔ پس یوں کہنا چاہیئے کہ محبت اور میلان حقیقت میں خدا تعالیٰ ہی کی طرف ہوتا ہے اور دوسری اشیاء کی طرف میلان محض اس وجہ سے ہے کہ ان میں صفات حق کا ظل ظاہر ہو رہا ہے۔ لیکن ان چیزوں پر نظر کا منحصر ہو جانا اس لئے ہے کہ لوگوں کو یہ خبر نہیں ہے کہ یہ اوصاف حقیقت میں حق تعالیٰ کے اندر ہیں۔ جس وقت یہ معلوم ہو گا کہ حضرت حق ہی محسن و منعم ہیں اور وہی حسین و جمیل اور صاحب فضل و کمال ہیں اور مخلوقات میں محض ان کا ظل ہے اس وقت ہر شخص حق تعالیٰ ہی کی طرف مائل و متوجہ ہو گا۔

پس حضورؐ کے علاج کا حاصل یہ ہوا کہ اپنی توجہ کو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دو اور چونکہ حق تعالیٰ سے طبعی تعلق ہے اس لئے یہ توجہ اشد و اکمل ہو گی تو جتنی توجہ الی اللہ کی طرف ہو گی اتنی ہی دنیا سے توجہ ہٹے گی۔ کیونکہ دو چیزوں

کی طرف نفس متوجہ نہیں ہو سکتا۔

مگر اس علاج میں ایک غلطی ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ جب بندہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو عجب وناز میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے کو صاحب کمال سمجھنے لگتا ہے کہ میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر کامل ہو گیا ہوں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح حدیث کے عنوان ہی سے کر دی ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے یہاں پر توجہ الی اللہ نہیں فرمایا۔ یتوب اللہ علیٰ من تاب فرمایا ہے جس میں من تاب میں تو حرص کا علاج مذکور ہے کہ توجہ الی اللہ اس کا علاج ہے۔ اور یتوب اللہ بڑھا کر یہ بتلا دیا کہ محض تمہاری توجہ سے یہ مرض زائل نہ ہوگا بلکہ علّت تامہ کا جزو اخیر ایک اور چیز ہے۔ وہ یہ کہ تمہاری توجہ کے بعد حق تعالیٰ بھی تم پر توجہ فرمائیں گے۔ تب یہ مرض زائل ہوگا اور جب خدا تعالیٰ کی توجہ علّت تامہ کا جزو اخیر ہے تو اصل علاج خدا کی توجہ ہے محض تمہاری توجہ کافی نہیں۔ اس میں عجب وناز کا علاج ہو گیا کہ اپنی توجہ اور طاعات پر ناز نہ کرنا کیونکہ اس سے کچھ نہیں ہوا بلکہ کام تو خدا کی عنایت سے بنا ہے اب اس مختصر حدیث میں چار مضمون بیان ہو گئے۔

ایک یہ کہ حرص مرض ہے۔

دوسرے یہ کہ اس کے مقتضا پر عمل کرنے اور اس میں زیادتی کرنے سے تقاضا فرد نہ ہوگا بلکہ دونا بڑھے گا۔

تیسرے یہ کہ اس کا علاج توجہ الی اللہ ہے۔

چوتھے یہ کہ اصل علاج خدا کی توجہ ہے جو عادۃً بندہ کی توجہ پر مرتب

و متفرع ہو جاتی ہے۔

توجہ الی اللہ جب حرص کا صحیح علاج معلوم ہو گیا تو اب سمجھئے کہ توجہ الی اللہ کیا چیز ہے۔ بس اسی پر میں بیان ختم کر دوں گا۔ بعض نے تو یہ سمجھا ہے کہ توجہ الی اللہ یہ ہے کہ نماز پڑھے، روزہ رکھے اور احکام شرعیہ بجا لائے۔ ان لوگوں نے ظاہری اعمال پر اکتفا کیا۔ یہ لوگ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہونے کو ضروری نہیں سمجھتے۔ مگر پھر وہ سوچتے ہیں کہ باوجودیکہ ہم سب کچھ کر رہے ہیں لیکن اس میں برکت اور نورانیت کیوں نہیں پیدا ہوتی تقاضائے معصیت مضمحل کیوں نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپ بہت سے نمازیوں کو گناہ میں مبتلا پائیں گے۔

بعض نے یہ کہا کہ توجہ الی اللہ کے معنی صرف یہ ہیں کہ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہو۔ یہ لوگ ذکر و شغل اور مراقبات ہی کو لے بیٹھے۔ انہوں نے نماز روزہ اور تلاوت قرآن اور نظر بد کا بچانا وغیرہ سب چھوڑ دیا۔ مگر ان کو بھی برکت اور نورانیت حاصل نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ لوگ بھی معاصی میں مبتلا ہو جاتے اور دل میں گناہوں کا تقاضائے شدید پاتے ہیں۔

تو سنو! کہ توجہ الی اللہ کی حقیقت تو یہی ہے کہ خدا کی طرف دل سے متوجہ ہو مگر ہر حقیقت کی ایک صورت بھی ہوتی ہے اور توجہ الی اللہ کی صورت وہی ہے جو شریعت نے بتلائی ہے۔ پس دونوں کو جمع کرنا چاہئے کہ دل سے حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رہو اور ظاہر سے اعمال شرعیہ کے پابند رہو۔ طاعات کو بجا لاؤ اور معاصی سے بچنے کا اہتمام کرو۔ نگاہ کو روکو اور نامحرموں کی باتیں

بھی نہ سنو۔ اس کے بعد بھی اگر نورانیت حاصل نہ ہو تو ہم پر ہنسنا۔ اس وقت میں وہی کہتا ہوں جو ایک صاحب طریق نے کہا ہے ؎

چشم بند و لب بہ بند و گوش بند　　گر نہ بینی نورِ حق بر ما بخند

اس وقت غلطی یہ ہو رہی ہے کہ بعض تو اعمال ظاہرہ کے تارک ہیں اور بعض اعمال باطنہ کے تارک ہیں۔ اس لئے توجہ الی اللہ کامل طور سے حاصل نہیں ہوتی دونوں کو جمع کرنا چاہیئے۔ پھر انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔ اب میں دونوں کی قدرے تفصیل بتلاتا ہوں۔

اعمالِ ظاہرہ

اعمال ظاہرہ میں سب سے اہم نماز ہے۔ اس میں خصوصاً عورتیں بہت کوتاہی کرتی ہیں۔ بعض تو پڑھتی ہی نہیں ہیں اور ایسی ہی زیادہ ہیں۔ اور بعض پڑھتی ہیں مگر ان کا قرآن صحیح نہیں ہے۔ اور نہ تصحیح کا اہتمام ہے۔ اور بعض کا قرآن بھی صحیح ہے لیکن وہ وقت کو بہت تنگ کر دیتی ہیں۔ ظہر کی نماز عصر کے وقت اور عصر کی مغرب کے وقت پڑھتی ہیں (حالانکہ مردوں کے لئے تو بعض اوقات میں تاخیر مسنون بھی ہے مگر عورتوں کے لئے تو سب نمازیں اوّل وقت پڑھنا افضل ہے مگر یہ اوّل تو اوّل اخیر میں بھی نہیں پڑھتیں بلکہ اکثر قضا پڑھتی ہیں) بعض ان نمازوں کو قضا نہیں کرتیں جو ہر مہینے میں ان سے غسل کی تاخیر کے سبب فوت ہو جاتی ہیں۔ اگر احتیاط کریں اور مسئلہ کو اچھی طرح معلوم کر لیں تو اوّل تو ایسی نوبت ہی نہ آئے اور جو غلطی سے ایسا ہو جائے تو جلدی قضا کرنا چاہیئے۔ غرض اعمال ظاہرہ میں نماز سب سے زیادہ اہم ہے اس کی اچھی طرح پابندی کرنا چاہیئے اور دل لگا کر نماز پڑھا کریں۔

جلدی جلدی سر سے بیگار نہ اتاریں۔

باقی روزہ میں تو عورتیں بڑی بہادر ہیں۔ چاہے بیماری ہو یا تکلیف ہو اور حکیم بھی افطار کی اجازت دے دے مگر یہ روزہ قضا نہیں کرتیں لیکن اس کے ساتھ روزہ میں غیبت بھی بہت کرتی ہیں۔ کیونکہ صبح سے شام تک کچھ کام تو ہوتا نہیں بس بیٹھی ہوئی اِدھر اُدھر کی باتیں بناتی رہتی ہیں۔ اس لئے ان میں وہ عورتیں بہت اچھی ہیں جن کو تمباکو کی عادت کی وجہ سے روزہ بہت لگتا ہے۔ اگرچہ تمباکو برا ہے۔ کیونکہ وہ روزہ کو الگ رکھ ایک طرف کو نامیں سر ڈالے پڑی رہتی ہیں۔ ان سے بغیر پان کھائے بات تک نہیں ہو سکتی تو وہ ان قصوں سے یعنی غیبت شکایت سے محفوظ رہتی ہیں۔ مگر اب جاڑوں کے روزے آرہے ہیں۔ اس لئے جن کو روزہ بہت لگتا ہے اب ان کو بھی کم لگے گا۔ بہر حال روزہ رکھنے کی ترغیب دینے کی ان کو ضرورت نہیں۔ اس کو تو عورتیں خود بہت شوق سے کر لیتی ہیں۔ البتہ روزہ کے حقوق ادا کرنے کی ہیں انکو تاکید کرتا ہوں کہ فضول اور گناہ کی باتوں میں روزہ کو برباد نہ کیا کریں بلکہ قرآن پڑھا کریں۔ بزرگوں کی حکایات دیکھا سنا کریں اور یہ بھی نہ ہو تو ایک طرف پڑ کر سو رہا کریں

ایک بات عورتوں کے متعلق یہ کہنے کی ہے کہ یہ پردہ میں احتیاط کم کرتی ہیں جن عزیزوں سے شرعاً پردہ ہے ان کے سامنے آتی ہیں۔ نیز کافر عورتوں سے جیسے بھنگن اور چماری وغیرہ سے بدن چھپانے کا اہتمام نہیں کرتیں حالانکہ شرعاً ان سے بھی پردہ ہے گو ایسا گہرا پردہ نہیں۔ جتنا مردوں سے ہوتا ہے۔ بلکہ کافر عورتوں کے سامنے صرف منہ اور ہاتھ گٹوں تک اور پیر کھولنے کی اجازت ہے

باقی سر اور سر کے بال اور بازو اور کلائی اور پنڈلی وغیرہ کھولنا جائز نہیں اس کا بہت خیال کرنا چاہیئے۔

ایک کوتاہی عورتیں رسوم کے بارہ میں کرتی ہیں۔ شادی وغیرہ کی رسوم میں بہت بے احتیاطی کی جاتی ہے بے پردگی کی بھی اور فضول مال ضائع کرنے کی بھی اور تفاخر و نام و نمود چاہنے کی بھی۔ یہ وہ گناہ ہیں جن میں آج کل عورتیں بہت مبتلا ہیں۔ ان سے اچھی طرح احتیاط لازم ہے۔ باقی جن گناہوں میں آج کل مرد مبتلا ہیں اُن سے عورتیں اکثر محفوظ ہیں۔ اُن کی نگاہ بہت کم بہکی ہوتی ہے بلکہ اس بارہ میں اُن کی وہی شان ہے۔ قاصرات الطرف (کہ نگاہ کو اپنے شوہر تک منحصر رکھتی ہیں) جیساکہ شروع میں بیان کیا گیا ہے۔

مفید مستحبات

اب بعض مستحبات کا بیان کرتا ہوں جن کی برکات بہت ہیں اور جن سے توجہ الی اللہ کو قوت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ نماز روزہ کے ساتھ کچھ ذکر اللہ بھی کرنا چاہیئے۔ اس سے دل کو خدا تعالیٰ کے ساتھ لگاؤ ہوتا ہے اور نماز میں دل لگتا ہے۔ مگر عورتوں میں ذکر اللہ کا رواج بہت ہی کم ہے۔ اسی لئے ان میں کوئی شیخ نہیں ہے ہاں شیخزادیاں بہت ہیں مگر شیخ بمعنی پیر کوئی نہیں ہے۔ گو عورتوں نے کسی کسی عورت کو پیرنی کا لقب تو دے دیا ہے اگرچہ وہ شیطان کی بنائی کیوں نہ ہو۔ سو ایسی پیرنیوں کی ضرورت نہیں بلکہ ایسی عورتوں کا تو وجود ہی مضر ہے۔ غرض یہ ہے کہ ضرورت شیخ کی ہے جو خدا کا راستہ بتلائے۔ عورتیں اپنے مردوں کے ذریعہ سے کسی شیخ کامل سے ذکر کا طریقہ پوچھ کر آپس میں اس کا رواج دیں کیونکہ اُن کی طبیعتوں کو ذکر اللہ سے بہت مناسبت

ہے اس لئے کہ ذکر اللہ کا اثر اُن پر زیادہ ہوتا ہے جن کے قلوب میں سکون اور یکسوئی کی حالت ہو اور عورتوں کو یہ بات خاص درجہ میں حاصل ہے۔ اُن کے قلوب میں تشتت و تفرق نہیں ہے اور یہ پردہ کی برکت ہے کہ عورتیں گھر کی چار دیواری میں مقید رہتی ہیں اس لئے اُن کے قلوب میں یکسوئی بہت ہے مگر آج کل کے جنٹلمین اس کے دشمن ہو رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح آزاد پھرا کریں اور وہی علوم پڑھیں جو مرد پڑھتے ہیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر عورتوں کی یہ جمعیت و سکون نہ رہے گا۔ جو پردہ میں بیٹھ کر علوم دنیا سے بے خبر ہو کر اس وقت حاصل ہے۔

ایک دفعہ کانپور میں میرا بیان ہوا تو میں نے کہا کہ بعض لوگ آج کل عورتوں کو جغرافیہ پڑھاتے ہیں۔ میری سمجھ میں اس کی حکمت نہیں آئی۔ مردوں کو تو اس کی اس لئے ضرورت ہو سکتی ہے کہ وہ ضروریات معاش کے لئے اِدھر اُدھر سفر کرتے ہیں تو مختصر شہروں کے حالات جاننے سے ان کو آسانی ہو گی۔ مگر عورتوں کو جغرافیہ پڑھانے میں سوا اس کے کہ ان کو گھر سے بھاگنے کا رستہ بتانا ہے اور کیا فائدہ ہے کیونکہ اب تک عورتیں گھر میں مقید ہیں۔ ان کو کچھ خبر نہیں کہ اپنے شہر میں کتنی گلیاں اور کتنی سڑکیں ہیں اور اسٹیشن کس طرف ہے اور یہاں سے اگر دہلی جانا چاہیں تو کس طرف کو جائیں۔ مگر جغرافیہ پڑھ کر یہ سب باتیں اُن کو معلوم ہو جائیں گی۔ تو اب وہ نہایت سہولت سے بھاگ سکتی ہیں۔

یہ مضمون میں نے ویسے ہی بطور عموم کے بیان کیا تھا۔ کسی خاص شخص کی طرف اشارہ نہ تھا مگر اتفاق سے اس مجلس میں ایک صاحب ایسے موجود تھے

جو اس مرض میں مبتلا تھے بعد بیان کے وہ مجھ سے ملے اور کہنے لگے کہ جغرافیہ کے اس مفسدہ پر میری نظر نہیں گئی تھی میں نے یہ سمجھا تھا کہ یہ بھی ایک علم ہے اس کے پڑھانے میں بھی کچھ حرج نہیں اس لئے میں نے اپنی بیوی کو جغرافیہ شروع کرادیا تھا لیکن اب مجھے آپ کے کہنے سے اس کے مفسدہ کا علم ہو گیا۔ انشاءاللہ اب نہ پڑھاؤں گا۔

واقعی عورتوں کو علوم جدیدہ کی تعلیم دینا ان کو تباہ و برباد کرنا ہے۔ بس ان کو تو قرآن شریف اور بقدر ضرورت مسائل دینیہ کی تعلیم دینا چاہیے۔ لکھنا بھی نہ سکھائیں تو اچھا ہے کیونکہ عورتوں کے لکھنے سے بعض جگہ قصے ہو گئے ہیں اور اگر لکھنا سکھایا جائے تو اس کی بہت نگہداشت رکھی جائے کہ وہ از خود کسی کو خط نہ بھیج سکیں بلکہ جہاں خط لکھیں پہلے گھر کے مردوں کو دکھلا لیا کریں اور پتہ وہ خود نہ لکھیں بلکہ مرد اپنے قلم سے لکھے۔

مجھ سے ایک جنٹلمین جنٹ ملے وہ اس نکتہ کو سمجھ گئے تھے۔ چنانچہ کہتے تھے کہ میں لڑکوں کو تو سب علوم پڑھاتا ہوں قدیم بھی اور جدید بھی مگر لڑکیوں کو قرآن و حدیث و فقہ کے سوا کچھ نہیں پڑھاتا۔ کیونکہ ان کے اندر جو صفات حمیدہ ہیں وہ انہی علوم سے محفوظ رہتی ہیں۔ علوم جدیدہ سے ان کی حالت بگڑ جاتی ہے عورتوں کے اندر یہ صفت یکسوئی اور سکون و جمعیت کی بہت ہی اچھی ہے جو محض پردہ کی برکت سے ہے۔ اس حالت میں اگر یہ ذکر اللہ کرنے لگیں تو بہت نفع ہو۔ اس لئے ان کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے اور دل لگا کر ذکر اللہ کرنا چاہیے اور کچھ وقت تلاوت قرآن کے لئے بھی نکالیں۔ عورتیں قرآن کم پڑھتی ہیں حالانکہ

اس سے دل بہت صاف ہوتا ہے اور نیک کاموں کی طرف رغبت وشوق بڑھتا ہے۔ اس کا بھی اہتمام چاہیئے۔ اور اس کے بعد تھوڑا سا وقت موت کی یاد کے لئے مقرر کریں جس میں اپنا ایک دن مرنا اور قبر میں دفن ہونا اور دنیا سے رخصت ہونا ذہن میں مستحضر کریں اور دنیا کے کاموں میں بھی موت کا دھیان کرلیا کریں بس پھر یہ حالت ہوگی کہ آدمی چلتا ہوا کام رکھے گا۔ زیادہ بکھیڑا نہ رہے گا۔ یہ ہے کامل علاج حرص کا۔ اس کو کرکے دیکھیں۔ انشاء اللہ چند ہی روز میں حرص کم ہوجائیگی

حج اور تجارت

اب ایک یہاں طالب علمی شبہ ہے اس کا جواب دے کر میں ختم کئے دیتا ہوں۔ شبہ یہ ہے کہ اس حدیث سے تو زیادت مال کے حرص کی مذمت معلوم ہوتی ہے اور نص قرآنی سے اجازت معلوم ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم۔ یہ آیت احکام حج کے متعلق ہے۔ جاہلیت میں لوگ حج کو ایک میلہ سمجھتے تھے۔ اس لئے حج کے زمانہ میں باہر کے لوگ تجارت کی نیت سے مکہ آیا کرتے تھے۔ جب اسلام آیا اور مسلمانوں کو خلوص کی تعلیم دی گئی تو صحابہ کو شبہ ہوا کہ شاید سفر حج میں مال تجارت کا ساتھ لے جانا خلاف خلوص ہو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اس میں کچھ گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا رزق جو تفسیر ہے فضل کی طلب کرو۔ جس میں تجارت کی بحالت حج اجازت دی گئی۔ حق تعالےٰ کی بھی کتنی بڑی رحمت ہے کہ خاص اپنے دربار کی زیارت کو آتے ہوئے بھی تجارت کی اجازت دے دی۔

بھلا اگر تم کسی بادشاہ یا ادنیٰ حاکم سے ملنے جاؤ اور ساتھ میں تجارتی مال

بھی لے جاؤ تو اس کو یہ بات معلوم کر کے کتنا ناگوار ہوگا۔ اس کے دل میں تمہاری
ں ملاقات کی کچھ بھی وقعت نہ ہوگی۔ بلکہ کان پکڑ کے دربار سے نکال دیئے
ؤ گے کہ تم ہم سے ملنے نہیں آئے تھے بلکہ سوداگری کو آئے تھے مگر حق تعالیٰ
ے اجازت دے دی کہ سفر حج میں تجارت کرنا گناہ نہیں۔ یہاں تو اباحت ہی
ہے مگر قواعد فقہ سے ایک صورت میں یہ تجارت مستحب بھی ہے جب کہ یہ نیت
اکہ اس سے رقم بڑھے گی تو سفر حج میں سہولت ہوگی فقراء کی امداد کریں گے۔
رہا یہ کہ اس صورت میں خلوص ہوگا یا نہیں اس کے جواب میں تفصیل ہے۔ وہ یہ
اگر اصل مقصود حج ہو اور تجارت تابع ہو جس کی علامت یہ ہے کہ تجارت کا سامان
ہوتا جب بھی ضرور حج کو جاتا۔ تو اس صورت میں خلوص محفوظ ہے اور ثواب حج
ں کم نہ ہوگا۔ اور اگر حج اور تجارت دونوں کی نیت برابر درجہ میں ہے، تو اس
الت میں تجارت جائز تو ہے مگر خلوص کم ہوگا۔ اور جواز کی وجہ یہ ہے کہ اس نے
ں کے ساتھ ایک فعل مباح ہی کو منضم کیا ہے فعل حرام کو تو منضم نہیں کیا اور اگر
جارت اصل مقصود ہے اور حج تابع ہے تو اس صورت میں گناہ ہوگا اور یہ شخص ریا
ار ہوگا کیونکہ یہ مخلوق کو دھوکا دے رہا ہے کہ جاتا ہے تجارت کے لئے اور
ظاہر کرتا ہے کہ میں حج کو جارہا ہوں۔
رہا یہ کہ اگر اصل مقصود حج ہو اور تجارت تابع ہو تو اس صورت میں مال
تجارت لے جانا افضل ہے یا نہ لے جانا افضل ہے۔ تو اگر زادِ راہ بقدرِ کفایت
وجود ہے تو افضل یہ ہے کہ تجارت کا سامان نہ لے جائے کیونکہ اس میں خلوص
زیادہ ہے۔ اور اگر زادِ راہ بقدرِ ضرورت ہی ہے بقدرِ کفایت نہیں اور نیت

تجارت تابع ہے تو اس نیت سے کہ سفر میں سہولت و اعانت ہو گی مال تجارت
لے جانا موجب ثواب ہے۔

اب اصل سوال کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں اور اس آیت میں تعارض
کچھ نہیں کیونکہ حدیث میں طلب معاش سے منع نہیں کیا گیا جو اول ہے
کا بلکہ انہماک اور زیادت حرص سے منع کیا گیا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت میں طلب مال کی مطلقاً اجازت نہیں بلکہ
قید سے اجازت ہے کہ وہ ابتغاء فضل کا مصداق بھی ہو اور ابتغاء معاش ا
فضل میں اسی وقت داخل ہو سکتا ہے جب کہ اس میں ابتغاء رضا بھی ہو جس کا ق
یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ابتغاء فضل کے ساتھ بعض جگہ ذکر اللہ کو بھی بڑھایا
سورہ جمعہ میں فرماتے ہیں۔ وابتغوا من فضل اللہ واذکروا اللہ کثیرا۔
واذکر اللہ کو بڑھانا بتلا رہا ہے کہ طلب معاش کو ابتغاء فضل جبھی کہہ سکتے ہیں
کہ اس کے ساتھ ذکر اللہ ہو ورنہ وہ ابتغاء فضل نہیں بلکہ ابتغاء فضول ہے بلکہ طل
نقصان ہے۔ اور جو شخص طلب معاش میں ابتغاء رضا کر رہا ہے وہ گناہ کا مرتکب
نہیں بلکہ ثواب کا کام کر رہا ہے اور حدیث میں اس طلب کی ممانعت ہے
حد سے متجاوز ہو۔ خوب سمجھ لو۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی
علیہ وسلم نے حرص مال کی مذمت بیان فرمائی ہے اور حرص کے کم کرنے
جو تدبیر غلط فہموں نے سمجھی تھی اس کی غلطی ظاہر فرمائی ہے۔ پس لوگوں کو چاہئے
اس تدبیر کو استعمال نہ کریں۔ جیسے بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ذرا بیٹے کی شادی ہو

نکاح سے فراغت کرلیں تو پھر دنیا کے دھندوں کو الگ کرکے اللہ اللہ کرینگے
حضورؐ فرماتے ہیں کہ اس طرح کبھی یہ حرص کم نہیں ہو سکتی بلکہ اور بڑھے گی یہی حالت
کی جیسے خارش والا کہا کرتا ہے کہ ذرا سا کھجلا لوں پھر نہ کھجلاؤں گا۔ مگر وہ جتنا کھجلاتا
ہے اتنی ہی خارش بڑھتی ہے۔ ایسے ہی آج تو آپ ایک بیٹی کی شادی کا بہانہ
کرتے ہیں۔ کل کو نہ معلوم کتنی بیٹیاں ہو جائیں گی اور تمہاری نہ ہوں تمہاری اولاد کی
ہو جائیں گی۔ تو یہ سلسلہ تو کبھی ختم نہ ہوگا۔ اور وہی حال ہو جائے گا ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم
باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

صاحبو! اس کا علاج وہی ہے جو اس حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ بس اسی
وقت ان دھندوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ اور اگر توجہ الی الدنیا
ترک کرنے پر اس وقت قدرت نہیں اور ان تعلقات کو نہیں چھوڑ سکتے تو پھر صورت
یہ ہے کہ اس سلسلہ کو بھی چلنے دو اور اس کے ساتھ دوسرا سلسلہ توجہ الی اللہ کا بھی
شروع کر دو۔ انشاء اللہ تعالیٰ ناکامی نہ ہوگی۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرمائیں وصلے
اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین واخر دعونا
ان الحمد للہ رب العلمین۔

نوٹ :۔ درمیان وعظ میں بارش آنے لگی تھی اس لئے حضرت مولانا اور
اکثر سامعین باہر سے مکان کے اندرونی حصہ میں آ گئے۔ پھر ذرا بارش کم ہوئی تو
حضرت مولانا کی وجہ سے پھر باہر تشریف لے آئے۔ اس آمد و رفت کی وجہ

سے ذہن مشوش ہو گیا۔ اس لئے بیان جلدی ختم فرما دیا۔ ۱۲ جامع

اشرف علی!
۱۴۔ رجب سنہ ۱۳۵۱ھ

وعظ میرٹھ

ہدیٰ و ہویٰ کے متعلق یہ وعظ ۲۸ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۲ھ بعد مغرب
محلہ کوٹلہ میرٹھ میں فرمایا ——— ۲/۱ ۲ گھنٹہ میں ختم ہوا

خطبۂ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل
علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیأت اعمالنا
من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ
ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد
ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ
باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھویٰ
فان الجنۃ ھی الماویٰ۔

طلب اور ذریعہ یہ آیت سورہ والنازعات کی ہے۔ اس میں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے ایک ایسی چیز کے حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے جس کا ہر شخص خواستگار ہے جس کو ذرا بھی اطلاع اُس کی ہو جائے وہ مفتون ہو جائے۔

مگر پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ کسی چیز کی خواہش معتبر جب ہی ہوتی ہے کہ جب اُس کے ذرائع میں بھی سعی کی جائے۔ جو شخص کسی شئے کا طالب ہو مگر اُس کے اسباب حاصل نہ کرے اُس کو اس شئے کا طالب نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً کوئی مالدار ہونا چاہیے تو جب اُس سے کہیں اُن علوم کو حاصل کر جو اکتساب روپیہ کے لئے ضروری ہیں پھر کسی واقف کار کی صحبت میں رہ کہ ان علوم پر عمل یعنی اکتساب میں مہارت ہو پھر کوئی کام شروع کر اور آمدنی اور خرچ کا حساب رکھ کہ خرچ آمدنی سے کم رہے تاکہ کچھ پس انداز ہو اور تھوڑا تھوڑا جمع ہو کر ایک رقم ہو جاوے اور تموّل حاصل

ہو تو کہتا ہے واہ صاحب مجھ سے علوم میں محنت نہیں ہوتی کسی کے نخرے کیوں اٹھائے جانے لگے۔ پھر پابندی کا بار خواہ مخواہ اپنے اوپر کیوں لوں اور خرچ کو محدود کر کے دل کو کیوں ماروں۔ جتنا جی چاہے گا خرچ کروں گا۔ اس شخص کو تمول کا طالب نہیں کہتے۔ اس کو بوالہوس کہتے ہیں۔

یا کوئی شخص جامع مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے مگر ان راستوں کو نہیں اختیار کرتا جن سے جامع مسجد میں پہنچے اور قدم نہیں بڑھاتا یہ شخص جامع مسجد میں کیسے پہنچے گا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ثواب کا طالب ہے۔

یا کوئی شخص چاہتا ہے کہ غلہ اس کے پاس آجائے اور جب کہتے ہیں کھیتی کر زمین میں بیج ڈال، پانی دے، کھیت کی نگہداشت کر، تو کہتا ہے کون کھیتی کرے اور سینچائی کس سے ہو سکتی ہے۔ کون گھر چھوڑ کر حفاظت کے لئے جنگل میں جا کر پڑے۔ مجھے تو غلہ چاہئے۔ یہ شخص احمق ہے اور غلہ کا طالب ہی نہیں ہے۔

یا جیسے کوئی اولاد چاہے اور جب کہا جائے نکاح کر اولاد ہو جائیگی تو کہتا ہے کون بکھیڑے میں پڑے۔ نکاح میں ایک رقم صرف کروں۔ پھر نان و نفقہ کا مطالبہ ہو۔ مکان چاہئے، مہر کی فکر ہو اور طرح طرح کی مصیبتیں کون مول لے۔ نکاح تو کرنے کا نہیں۔ بس میں تو لڑکا چاہتا ہوں۔ یہ احمق ہی ہے اللہ میاں نے اس فعل خاص کو ولد کے لئے سبب قرار دیا ہے۔ اس کو اختیار کرو اولاد بھی مل جائے گی۔

یا جیسے کہ کوئی چاہے کہ پیٹ بھر جائے اور جب کہیں کھانا کھاؤ لقمہ

کو چباؤ اور نگلو پیٹ بھر جائے گا، تو کہتا ہے کہ صاحب ہیں تو یہ کرنے کا نہیں۔ ظاہر ہے کہ محض احمق ہے۔

توضیح کے لئے یہ کئی مثالیں دی گئیں تاکہ یہ مقدمہ ذہن نشین ہو جائے۔ میں آگے انشاء اللہ اس سے کام لوں گا۔ غرض طالب اگر ذرائع کو اختیار کرے، تو طالب ہے ورنہ بوالہوس ہے۔ ایسا آدمی ضرب المثل ہو جاتا ہے۔ دیکھنے اور سننے والے کہا کرتے ہیں کہ آدمی تو معقول ہیں مگر خبط ہو گیا ہے۔ دیکھئے پڑھ لکھ کر دماغ خراب ہوا ہے۔ نکاح تو کرتے نہیں اور اولاد کی دھن ہے۔ کیسا افسوس ہے۔ وجہ یہی ہے کہ مسلم ہے کہ اگر سعی نہ کرے ذرائع میں تو پاگل ہے۔ پس اب تعجب یہ ہے کہ یہ قاعدہ دنیاوی امور میں تو ہر کس و ناکس، عالم جاہل، بڑے اور چھوٹے سب کے نزدیک تسلیم کیا ہوا ہے۔

اسباب اور آخرت

جب دین کا معاملہ آ پڑتا ہے تو بڑے بڑے عقلا احمق بن جاتے ہیں وہاں مقصود کی زبانی طلب کو ہی طلب کہنے لگتے ہیں اور اطمینان رہتا ہے کہ بڑے طالب ہیں اور اس طلب پر نتیجہ ضرور مرتب ہو گا۔ اگر ایسا ہے تو زبان سے اولاد اولاد کہنے والے کو بھی طالب ولد کہنا چاہئے اور امید رکھنی چاہئے کہ اس کے اولاد ہو گی (معلوم نہیں کس طرح ہو گی۔ شاید مرد کے بچہ ہو گا)

معلوم نہیں کیا بات ہے فرق کی کوئی وجہ نہیں۔ دنیا میں تو اسباب کو دخل ہو اور آخرت میں نہ ہو بلکہ معاملہ برعکس معلوم ہوتا ہے کہ دنیاوی اسباب کو اتنا دخل اپنے مقاصد میں نہیں ہے جتنا کہ آخرت کے اسباب کو مقاصد آخرت

میں ہے۔ یہ بات ظاہراً مشکل معلوم ہوتی ہو گی کیونکہ ذہن نشین یہی ہو رہا ہے کہ دنیوی کام تو اختیاری ہیں اور اخروی نہیں۔ جو لوگ ذرا عقلمند ہیں وہ اتنا اور کہہ لیتے ہیں کہ ہوتا تو سب کچھ تقدیر ہی سے ہے مگر اسباب حق تعالیٰ نے مقرر فرما دیئے ہیں۔ مسئلہ تقدیر کو سمجھا مگر غلط سمجھا۔ چاہے فاسق ہوں یا فاجر ہوں۔ اگر تقدیر میں جنت ہے تو جائیں ہی گے۔ دنیا میں بھی یوں ہی کیوں نہ کہا کہ اسباب کو حاصل کریں یا نہ کریں اگر تقدیر میں مسبب لکھا ہے تو ملے ہی گا۔ نہ کوئی پیشہ کریں نہ کھیتی کریں نہ کمائیں۔ اگر قسمت میں تمول اور غلہ اور پیٹ بھرنا لکھا ہے تو ہو ہی جائے گا۔

بلکہ جیسا یہ خیال ہے کہ فسق و فجور کر کے اطمینان سے بیٹھے ہیں کہ جنت ملے ہی گی۔ غلطی یہی ہے کہ دنیا کو اختیاری سمجھا اور آخرت کو نہیں۔ یا تو دونوں کو اختیاری سمجھا ہوتا یا دونوں میں تقدیر پر بیٹھے رہے ہوتے۔ ذرا غور سے سمجھ میں آ جائے گا کہ واقعی بات کیا ہے۔

عقائد کا مسئلہ ہے کہ ہر سبب پر جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ باذنہ تعالیٰ ہے جلانا آگ کا لگانا اثر دائمی اور متفق علیہ ہے مگر جب تک اذن نہ ہو احتراق مرتب نہیں ہو سکتا۔ سب جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لوگوں نے نہایت تیز آگ میں ڈالا۔ مگر باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے کہہ دیا ٹھنڈی ہو جا کچھ بھی صدمہ نہ پہنچا اور احتراق مترتب نہ ہوا۔ اگر یہ اثر آگ کے لئے ذاتی ہوتا یا جزو ماہیت یا لازم ماہیت ہوتا تو کیوں منفک ہوتا۔ کیا آگ آگ نہ رہی اور یہی قصہ اعمال صالحہ میں بھی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ کوئی اپنے عمل کی

وجہ سے جنت میں نہ جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ عمل نافیر بالذات نہیں کہ کسی کو جنت میں لے جائے۔ مشیت ایزدی شرط ہے۔ (جس کا مطلب یہ سمجھ رکھا ہے کہ عمل دخول جنت میں کچھ بھی دخل نہیں رکھتا) عمل کو وہی دخل ہے دخول جنت میں جو آگ کو ہے احراق میں۔ آگ کے احراق کے لئے بھی مشیت شرط ہے اور دخول جنت کے لئے بھی۔ بہرحال ایک آیت اور ایک حدیث سے ثابت ہو گیا کہ کسی چیز میں تاثیر بالذات نہیں ہے اگرچہ اثر کیسا ہی یقینی اور دائمی ہو مگر ذات میں کسی چیز کی داخل نہیں کہ اثر کرے۔ سب مشیت باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ حق تعالیٰ کے مرتب کرنے سے سبب مرتب ہوتا ہے۔ تو اب اس کی تحقیق باقی ہے کہ آیا اسباب دنیویہ پر مرتب کرنے کا حق تعالیٰ نے یقینی وعدہ کیا ہے یا اسباب اخرویہ پر اس کے مرتب کرنے کا یقینی وعدہ کیا ہے۔ تو نصوص و واقعات دونوں سے دیکھئے کہ دنیوی اور دینی دونوں اسباب میں سے کس پر ترتب اثر یقینی ہونے کا وعدہ ہے باری تعالیٰ کا اور تجربہ سے بھی کون یقینی ہے۔ سو کہیں نہیں فرمایا گیا، نصوص میں کہ اسباب دنیوی پر اثر ضرور مرتب ہو گا اور تجربہ و واقعات سے بھی یہی نکلتا ہے۔ بسا اوقات کھیتی کرتے ہیں اور ایک دانہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

اسباب اور اثر

یہی حال جاہ و ثروت کا ہے۔ بہت سی تدبیریں کی جاتی ہیں مگر عمر گزر جاتی ہے اور عسرت ہی رہتی ہے اور کبھی بے تدبیر مالدار ہو جاتا ہے۔ اگر آپ غور کریں گے تو کبھی نہ کہیں گے کہ جاہ و ثروت تدبیر پر ہے۔ میں نے خود ایسے واقعات دیکھے ہیں کہ جن کی اوقات کسی وقت

میں دو آنے کی تھی آج وہ لاکھ پتی ہو گئے۔ اگر آپ کہیں کہ انہوں نے تدبیر سے اس قدر مال حاصل کیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ آپ ان کے پاس جائیے اور اول سے آخر تک ان کی سوانح عمری لکھیے اور ان کی کل تدبیریں بھی لکھیے کہ پہلے ان کے پاس دو آنے تھے اس کا انہوں نے فلاں سودا خریدا اور صبح سے شام تک پھیری کر کے بیچا۔ اس میں ایک آنہ نفع ہوا۔ ایک آنہ میں سے نصف کھایا اور نصف اصل میں شامل کر دیا۔ اگلے دن اڑھائی آنے کا سودا لے کر پھیری کی۔ ساڑھے تین آنے یا چار آنے ہو گئے۔ اسی طرح راس المال بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جب تعداد آنوں سے نکل کر روپوں میں آ گئی تو کچھ پس انداز کرنے لگے۔ جب ایک کافی رقم جمع ہو گئی تو جائداد خرید لی۔ پھر اس کی آمدنی کو بقدر ضرورت خرچ کیا اور کچھ داخل خزانہ کرتے گئے۔ یہاں تک کہ خزانہ بڑھتے بڑھتے لاکھ تک پہنچ گیا۔ لکھ پتی ہو گئے۔ اس کو مفصل لکھیے بلکہ تمام تغیرات کو تاریخ وار قلمبند کیجیے۔ اب اگر یہ تدبیر سبب ہے ان کے جاہ و ثروت کی تو آپ بھی ایسا ہی کیجیے۔ جیسا انہوں نے کیا کہ دو آنہ کا سودا لیجیے اور پھیری کیجیے اور نفع کو شامل راس المال کرتے جائیے بعد چندے کچھ پس انداز کیجیے اور جائداد خرید لیجیے۔ پھر خزانہ بڑھائیے یہاں تک کہ لکھ پتی بن جائیے۔ میں کہتا ہوں کہ کبھی بھی تو ان تدبیروں سے آپ ان کے برابر نہیں ہو سکتے۔ کیا وجہ ہے کہ تدبیر سے اس نے حاصل کیا اور تم نہیں کر سکتے وجہ یہی ہے کہ سب کچھ باری تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے پس ثابت ہو گیا کہ اسباب دنیا پر ہمیشہ اللہ اثر مترتب نہیں فرماتے۔

میرے دعوے کا ایک جز ثابت ہو گیا کہ اسباب دنیوی پر نتیجہ کا مترتب

ہونا ضروری اور دائمی نہیں۔ رہا دوسرا جزو یعنی آخرت سو دیکھئے فرماتے ہیں۔

من اراد الاخرۃ وسعی لہا سعیہا وھو مؤمن فاولئک

کان سعیہم مشکورا

یعنی جو کوئی آخرت کا طالب ہو اور کوشش کرے تو اس کی سعی ضائع نہ جائے گی۔ بلکہ فرماتے ہیں نزد لہ فی حرثہ یعنی اس کا نتیجہ بقدر عمل ہی نہیں زیادہ دیا جائے گا۔ دیکھ لیجئے وعدہ کے یقینی ہونے سے نتیجہ مترتب ہونا ضروری اور یقینی ہوا یا نہیں۔

میرا مدعا ثابت ہو گیا کہ اسباب دنیوی پر اثر مترتب ہونے کا کہیں وعدہ نہیں اور اسباب اخروی کے لئے وعدہ ہے۔ پھر تعجب ہے کہ دنیا میں جس چیز کا ارادہ کرتے ہیں وہ اکثر جتنا چاہتے ہیں نہیں ملتی مگر پھر اکتساب ذرائع سے کوئی غفلت نہیں کرتا اور غفلت کرنے والا احمق سمجھا جاتا ہے اور آخرت میں اس قدر ملتا ہے جس کا ارادہ بھی نہیں کیا جاتا اور پھر اکتساب ذرائع سے غفلت ہو اور غفلت کرنے والے کو کوئی احمق نہ کہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

فلا تعلم نفس ما اخفی لہم من قرۃ اعین۔

طلب جنت کا ذریعہ

حدیث قدسی میں فرماتے ہیں۔ اعددت لعبادی الصالحین ما لاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر قلب بشر۔ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیز تیار کی ہے کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی نہ کسی کے دل میں اس کا خیال تک گزرا۔ حالانکہ خیال بڑی وسیع چیز ہے۔ مگر بروئے حدیث

وہ چیزیں اسباب آخرت پر متفرع ہوتی ہیں جو خیال میں بھی نہ آسکیں۔ اب سوچئے کہاں تک سوچیں گے۔ جمال، باغ، نہریں، خادم، ماکولات و مشروبات وغیرہ جہاں تک بھی آپ کا خیال پہنچے۔ پھر ایک مرتبہ ایسا نکالئے کہ خیال سے بھی باہر ہو اور عقل اس کے ادراک سے قاصر ہو مگر وہاں ملے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ اگر فضل ہوا آخرت میں ترتب اثر تو کیا اس اثر کا وعدہ ہے کہ سبب سے اور اس سے کچھ نسبت بھی نہیں۔ جمال اور باغ وغیرہ میں بھی ایسے مراتب نکل سکتے ہیں کہ خیال سے باہر ہوں اور بعض تیجے وہاں کے وہ ہیں کہ ان کا صرف لفظ ہی سنا ہے ماہیت تو عقل میں بھی نہیں آتی۔ وہ رویت الٰہی ہے۔ غرض ترتب اثر یقینی ہوا کیونکہ وعدہ فرمایا ہے باری تعالیٰ نے کہ اثر ہم ضرور متفرع کریں گے تم ذرائع کو حاصل کرو۔

لوگوں کے خیال میں یہ جما ہوا ہے کہ آخرت بے اختیاری ہے اور دنیا اختیاری ہے۔ اسی نے لوگوں کو بٹھا دیا۔ کچھ نہیں کرتے اور دنیا کے معاملات میں یہ حال ہے کہ جب چاہتے ہیں دنیا حاصل کرنا اسباب کو جمع کرتے ہیں حالانکہ بارہا اسباب کے تخلف کو بھی مقاصد سے دیکھ چکے ہیں۔ تعجب ہے کہ جن اسباب کو دخل نہیں وہ تو جمع کئے جائیں اور جن کو دخل ہے ان کو نہ اختیار کیا جائے۔ کیسے کہا جائے کہ ایسا شخص جنت کا طالب ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تعجب ہے جنت سے کہ اس کا طالب کیسے سوتا ہے۔

اس سے اور سابق سے ثابت ہو گیا کہ جو اسباب کو حاصل نہ کرے اس

اُس کے دماغ میں خلل ہے۔ طلب صرف معتبر نہیں بلکہ طلب صادق ضروری ہے اور اُس کے لئے کسب ذرائع لازم ہے جیسا کہ بسط کے ساتھ اب تک بیان کیا گیا۔ سو اس آیت میں اللہ میاں نے جنت کے طلب کا ذریعہ بتایا ہے جس کے سب لوگ مشتاق ہیں۔

حال و کمال یہاں ایک بات اور قابل تحقیق ہے۔ وہ یہ کہ اس آیت سے جنت کا مطلوب ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ میں بعض ایسے گزرے ہیں جن کے کلام میں یہ مضمون پایا جاتا ہے کہ نہ ہم کو جنّت کی طلب ہے نہ دوزخ کا خوف ہے تو یا تو جنّت مطلوب نہیں یا وہ لوگ مخالف قرآن ہیں۔

جیسے ایک صاحب حال کی نقل ہے (یہ قصہ حضرت رابعہ بصریہؒ کا ہے) کہ ایک روز غلبۂ حال میں ایک ہاتھ میں آگ اور ایک ہاتھ میں پانی لے کر نکلیں۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت یہ کیا۔ کہا تمام عالم کو جنت اور دوزخ ہی کے خیال نے تباہ کر دیا۔ میرے مالک کا نام کوئی نہیں لیتا۔ آج میں فیصلہ کئے دیتی ہوں۔ پانی سے دوزخ کو ٹھنڈا کروں گی اور آگ بہشت میں لگاؤں گی۔

سو بات یہ ہے کہ یہ اقوال و حکایات اہل حال کے ہیں اور غلبۂ حال سے ان کو معذور سمجھا جاوے گا۔ ہم سوالوں کو تو ان لوگوں کے اقوال کو نقل کرتے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ایسی بات جذب میں کوئی کہہ جائے باقی قصداً کہنا یا اُس کو کمال سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ خوب یاد رکھئے کہ جذب کوئی کمال نہیں اور نہ وہ اختیاری چیز ہے۔ جو لوگ اختیار سے ایسے لفظ کہتے ہیں سراسر ناو کلا

جو اعلیٰ و ادنیٰ کسی درجہ میں بھی وہ شمار ہوں۔ غلبہ کے تو معنی ہی بے اختیاری کے ہیں پھر بے اختیاری کا اختیار سے ہونا کیا معنی۔ آج کل لوگوں نے اسی کو کمال سمجھ رکھا ہے۔ جو کوئی واہی تباہی کلمات بلیا کا نہ بکتا ہو اُس کو بڑا پہنچا ہوا سمجھتے ہیں کہ فلاں بزرگ مست ہیں۔ سو خوب سمجھ لیجئے کہ جن بزرگوں سے ایسے کلمات منقول ہیں اُن کے لئے بھی یہ حالت کچھ کمال کی نہ تھی۔ ہاں غلبۂ حال کی وجہ سے معذور تھے۔ کوئی الزام اُن پر عائد نہیں ہوتا۔ اور رہے نقال سو وہ تو کسی طرح معذور ہی نہیں ہو سکتے۔ اُن کے اقوال کے دعوے کے ساتھ نقل سخت بیہودگی ہے۔ غرض اُن لوگوں کی یہ ایک حالت معذوری کی تھی ورنہ جس چیز کا مطلوب ہونا قرآن سے ثابت ہو اور جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طلب فرماویں۔ اللھم انی اسالک الجنۃ وما قرب الیھا من فعل او عمل اُس کی نسبت دوسرے کا کیا منصب ہے کہ ایسا کہے۔ آیات و احادیث میں صاف طور پر طلب جنت کی فضیلت آئی ہے۔ اہل حال معذور تھے حال کی وجہ سے اور اب تو لوگوں میں حال ہی نہیں رہا۔ نقل ہی نقل رہ گئی۔ اسی کو فرماتے ہیں مولانا ؎

حرف درویشاں بدزدد مرد دُوں تا بہ پیش جاہلاں خواہد فسوں

جن میں کچھ ہے نہیں وہ اُن کے دعووں کی نقل کر کر کے جاہلوں میں بزرگ بنتے ہیں۔

مجھ کو ایک شخص اسی سفر میں ملے کہ وہ کچھ مالی اعانت چاہتے تھے ادھر اُدھر کی باتوں میں اپنی محویت بھی ظاہر کی لمبی لمبی باتیں کرنے لگے۔ کیا پردا ہے

جنت کی اور کیا خیال ہے۔ دوزخ کا۔ میں نے کہا میاں بیٹھے بھی رہو۔ چار روپیہ کے لئے تو گھر چھوڑے پھرتے ہو جنت کی طرف التفات بھی نہ کرو گے۔ ان نقالوں میں رنگ البتہ اصل سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ سو ہر چیز میں تجربہ کر لیجئے کہ اصلی میں نقلی کی سی آب و تاب نہیں ہوتی۔ رنگ و روغن کو دیکھ کر شیفتہ ہو جانا اس امر کی دلیل ہے کہ اس شخص نے اصل چیز نہیں دیکھی اور محض ناواقف ہے غرض اہل حال تو بحث سے مستغنی ہی نہیں اور جنت کا مطلوب ہونا بحالہ باقی رہا

حصول جنت کے طریقے

البتہ یہ ضرور ہے کہ مشہور تقسیم میں اس کے مطلوب ہونے کی دو صورتیں ہیں اور میرے نزدیک ایک تیسری صورت اور بھی ہے۔

ایک تو یہ کہ اس کی نعمتوں کو مقصود سمجھ کر کھانے کو، پینے کو، باغوں کو، مکانات کو، نہروں وغیرہ کو غرض اصلی جان کر طلب کیا جائے۔ مذاق مختلف ہوا کرتے ہیں کسی کو مکانات کا شوق ہے کسی کو دل کش فضاؤں کا، کسی کو پھولوں کا، کسی کو حسن و جمال کا، کسی کو ماکولات و مشروبات کا اور جنت میں سب کچھ ہے۔ تو جو چیز جس کو مرغوب ہو ملے گی۔

حدیث شریف میں ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ ایک شخص تمنا کرے گا کہ وہ کھیتی کرتا۔ اللہ میاں فرمائیں گے ابن آدم کا پیٹ ہی نہیں بھرتا اور دم کے دم میں سب چیز موجود ہو جائے گی۔ بات کہنے میں ہرا بھرا کھیت، پھر انبار کے انبار غلہ تیار ہے تو کتنی کھیتی چاہیے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ بچہ طرح طرح کی ضدیں کیا کرتا ہے اور سب پوری کی جاتی ہیں۔ والدین

جانتے ہیں کہ باوَلی ضدیں ہیں مگر جو مانگتا ہے دیتے ہیں۔ تو بعض لوگ جنت کو اس لئے طلب کرتے ہیں۔

دوسری قسم کے لوگ ہیں جو جنت کو اللہ میاں کی لقاء کے لئے طلب کرتے ہیں۔ یہ لوگ طالب درحقیقت اللہ میاں کے ہیں مگر اُن کو معلوم ہوا ہے کہ لقاء اور رضا خاص جنت میں ہو گی۔ اس لئے چاہتے ہیں کہ جنت میں پہنچ جائیں تاکہ مقصود اصلی حاصل ہو۔ غرض نعمت کے طالب نہیں بلکہ منعم کے ہیں۔

مثال اس کی یہ ہے کہ ایک محبوب نے باغ میں لوگوں کو بلایا جس میں ہر قسم کا عیش و نشاط موجود ہے۔ جو میوے کہیں نہیں ہیں وہ وہاں موجود۔ وہ مکانات جن کا نقشہ تک کسی کے خیال میں نہ گزرا ہو۔ وہاں نیاز نہریں، حوض، دلکش فضائیں، خادم، غلام غرض جملہ چیزیں موجود ہیں۔

بعض جانے والے ایسے ہوں گے جو غسل کرنے اور حوضوں میں غوطہ لگانے کی غرض سے جائیں گے اور بعض تازہ بتازہ ہواؤں کا لطف اٹھانے کے لئے اور بعض میووں سے لذت حاصل کرنے کے لئے وعلیٰ ہذا۔ اور ایک جانے والے وہ ہیں کہ اُس محبوب پر عاشق ہیں اور باغ میں اس واسطے جاتے ہیں کہ اُن کو معلوم ہوا ہے کہ ہمارا محبوب باغ میں ہے۔ یہ سُن لیا ہے اور باغ کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل باغ کو نہیں ڈھونڈتے، باغ والے کے شیدائی ہیں اس وقت چونکہ محبوب باغ میں ہے۔ اس واسطے باغ کی طرف جاتے ہیں اور وہ اگر جنگل میں آجائے تو باغ کا خیال بھی اُن کے ذہن میں کبھی نہ گزرے۔ باغ کی طرف جانے والے یہ دو قسم کے لوگ ہوئے۔ ایک وہ کہ نفس باغ کے طالب

ہیں دوسرے وہ کہ نہ انہیں باغ کا خیال ہے نہ جنگل کا۔ محبوب کی طرف نگاہ ہے۔

مشہور قسمیں طالبان جنت کی تو یہی دو ہیں اور میرے نزدیک تیسری قسم اور ہے لیکن ذرا دقیق ہے۔ وہ یہ کہ طالب تو نعمت کے ہیں لیکن نہ حظ کی وجہ سے بلکہ اپنے تذلل اور عبدیت کی وجہ سے اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ بلاواسطہ طالب منعم کے ہوں۔ اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ ان کے کوچہ کا ایک گوشہ مل جاوے۔ یہ تیسری قسم ہوئی۔ پس طالب نعمت کا مبتدی ہے اور طالب منعم کا متوسط ہے اور طالب نعمت للعبدیۃ کا کہ واقع میں طالب کامل منعم کا ہے منتہی ہے اور صاحب حال بحث سے خارج ہے۔

خلاصہ یہ کہ لوگوں کا خیال مطلقاً یہ ہے کہ طلب جنت سے عدم طلب کا درجہ بڑھ کر ہے۔ حالانکہ غور کرنے سے اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے کہیں آیات ونصوص میں اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ عدم طلب کوئی شئے حسن ہے۔ بہت سے بہت یہ کہہ سکتے ہیں کہ عدم طلب والا معذور ہے۔ سو معذوری میں فضیلت کہاں!

خلاصہ یہ کہ طالب جنت کی تین قسمیں ہوگئیں کہ یا مبتدی ہے یا متوسط یا منتہی۔ سو متوسط کا حال تو اکثر ممتاز ہوتا ہے لیکن مبتدی اور منتہی کا حال بہت متشابہ ہوتا ہے مگر واقع میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ مبتدی ایک کام میں لگا ہوا ہے گو حقیقت نہیں پہچانتا مگر آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے کبھی حقیقت شناس بھی ہو جائے گا۔ ذرا سی بات میں وجد میں آجانا، ڈھاڑیں مارنا مغلوبوں کا کام ہے

جو صاحب کمال ہے وہ حال پر نہ آنسو ٹپکا سکتا ہے نہ حال اس کے بدن میں حرکت پیدا کر سکتا ہے۔ نہ حال اس کی زبان سے بیساختہ کلمات نکلوا سکتا ہے۔ شاہ عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔

"منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد۔ ایں جا مردانند کہ دریاہا فرو برند و آروغ نزنند"

منتہی کی حالت بالکل مبتدی کی سی ہوتی ہے مگر چونکہ منتہی رامنتہ طے کئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس واسطے ہر مقام پر اس کے افعال سے واقفیت ٹپکا کرتی ہے اور مبتدی مقلدانہ چلتا ہے۔

اسی طرح جنت کے مانگنے والوں میں جو مبتدی یا منتہی ہیں ان میں فرق ہے کہ مبتدی طالب ہے مزہ کے لئے اور منتہی مزہ سے گزرا ہوا ہے۔ پھر جنت کی طلب جو کرتا ہے سو وہ محبوب کے حکم سے ہے۔ گویا منتہی عبدیت ظاہر کرتا ہے کہ جو حکم ہو اس کی تعمیل کے لئے تیار ہوں اور مبتدی کی فنا میں کمی ہے۔ اس کا التفات مزہ کی طرف ہنوز باقی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایسی چیز طلب کا حکم ہوتا کہ مزہ اس میں نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ اس صورت میں مبتدی پیر اکھڑ جاتے اور منتہی جما ہوا ہے اس کی لغزش کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ مزہ کا طالب ہی نہیں جس کے رہتے نہ رہنے پر اس کی طلب کا دارومدار ہو۔ چونکہ طلب کا حکم پایا ہے اس واسطے تعمیل کر رہا ہے۔ فلیتنافس المتنافسون امر کا صیغہ ہے۔ شخص زبان حال سے کہہ رہا ہے ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں | خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

جب اُدھر سے ہی طلب کا حکم ہے تو طلب نہ کرنا عدول حکمی ہے۔ مطیع اطاعت میں ایسا محو ہوتا ہے۔ جیسے کسی کو شراب پلادیں (شراب دو ہیں حلال اور حرام شراب محبت حلال ہے۔ شراب پی کر آدمی سب طرف سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو بندہ ہے وہ امتثال امر میں مخمور ہوتا ہے۔

محویت اور بیخودی

یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ محویت بیخودی نہیں ہے۔ بعض ناواقف اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اگر نماز میں محویت ہوجائے تو رکوع و سجود کیسے ہوں۔ محویت کے معنی یکسوئی کے ہیں۔ صرف باری تعالیٰ کی طرف خیال ہوتا ہے۔ اس صورت میں عبادت بطریق احسن ہوگی رکوع وسجود نہ ہونا کیا معنی۔

عام لوگ محویت اس کو سمجھتے ہیں کہ کچھ واہی تباہی کلمات زبان سے نکال دیں یا آئندہ کی باتوں پر دعویٰ کے ساتھ حکم لگا دیا کریں۔ اس کو بڑا کمال سمجھتے ہیں اور کہا کرتے ہیں اللہ میاں پر ایسا ناز ہے کہ جو منہ سے نکل گیا، پورا ہو کر رہتا ہے۔ یہ مسلّم سہی کہ دُعا قبول ہوتی ہے مگر ہر چیز کو مانگ بیٹھنا اور دعویٰ سے حکم لگا دینا۔ انہیں سے ہو سکتا ہے جو بے خود ہیں۔ یہ محویت محمود نہیں محویت محمود میں حق سبحانہ تعالیٰ سے نہایت قرب ہوتا ہے اور جتنا جس کو قرب ہوتا ہے اتنا ہی عظمت کا اس پر ظہور ہوتا ہے۔ اور اتنا ہی اپنے نفس کا تذلل کھل جاتا ہے۔ پھر جس پر محبوب کے اعلیٰ درجہ کی عظمت اور اپنی ذلت کھل گئی ہو اس کی نسبت کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جہاں چاہے بے دھڑک قدم اٹھا بیٹھے گا۔ بادشاہ کے دو بچے ہیں ایک ناسمجھ اور ایک سمجھ دار۔ ناسمجھ تو جب آتا ہے

سیدھا گود میں جگہ لیتا ہے۔ نہ آداب مجلس کی کچھ خبر نہ اراکین کا لحاظ نہ بادشاہ کا ادب۔ نہ شاہی پوشاک کا خیال۔ پیر صاف ہیں یا خاک آلودہ آئے اور زانو پر چڑھ بیٹھے۔ اور ہوشیار بچہ جب آتا ہے تو نیچی نگاہ کئے ہوئے۔ چہرہ پر اراکین کا لحاظ ظاہر۔ مجلس کا رعب چھایا ہوا اور نہایت ادب سے پاؤں پکڑ کر حاضری کی اجازت مانگ کر مؤدب کھڑا ہوتا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ سمجھ دار کو عظمت شاہی کی خبر ہے اور ناسمجھ کو نہیں۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ ناسمجھ بچہ بادشاہ کے نزدیک زیادہ مرتبہ رکھتا ہے کہ اس قدر قرب اس کو حاصل ہے کہ شاہی پوشاک پر میلے پیروں سے جا چڑھتا ہے اور جو الٹی سیدھی ضدیں کرتا ہے پوری کی جاتی ہیں۔ نہیں! قرب زوری اس کو حاصل ہے اور قرب حقیقی سمجھ دار کو۔ اگرچہ سمجھ دار گود میں نہیں ہے اور کسی قدر فصل سے کھڑا ہے۔ میلے پیروں سے کپڑوں پر جا چڑھنا اور الٹی سیدھی ضدیں کہ ناگستاخی ہے باعث فضیلت نہیں زائد سے زائد یہ ہے کہ بچہ ان حرکات میں معذور سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح اہل حال کہہ اٹھتے ہیں کہ نہ دوزخ، نہ بہشت نہ اس کا خوف ہے نہ اس کی خواہش۔ ان دونوں میں سے کسی کی خبر ہی نہیں۔ یہ کامل نہیں ہیں ان پر ابھی عظمت کا انکشاف پورا نہیں ہوا۔ اس وجہ سے اتنی جرات ہے کہ قرب کے اعلیٰ درجہ کا دعویٰ ہے۔

دیکھئے ایک نہایت ذلیل شخص کسی عالیشان محبوب کی طرف جانا چاہتا ہو تو اول تو بہ سین چاہیے۔ اس کوشش کے لئے کہ کسی طرح راستہ کے موانع رفع ہوں۔ دربان و چوبدار وغیرہ سے ساز ہو جائے تب توقع کی جائے کہ

اُن کی درخواست محبوب تک پہنچ سکے گی۔ اگر اس میں کوشش اُن کی چل گئی کہ درخواست محبوب تک پہنچ گئی اور پھر قسمت کی یاوری سے محبوب نے بہت ہی لطف فرمایا کہ حاضری کی اجازت دے دی۔ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ دربار میں جاتے وقت ان کی بڑی سی بڑی آرزو کیا ہوگی۔ یہ تو کبھی خیال بھی نہ جائے گا کہ مجھے محبوب بنالیں۔ بڑا حوصلہ یہ ہوگا کہ چوکھٹ کو بوسے دینے کی اجازت مل جاتے۔ اس کا یہ حوصلہ کرنا کیا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ چوکھٹ کا طالب ہے بلکہ اپنی حالت کو دیکھ کر اس سے زیادہ کی ہمت نہیں کرتا تھا کہ اگر اس کو چوکھٹ سے بڑھانا چاہیں تو پیروں میں رعشہ پڑ جائے گا۔ سو منتہی اسالک الجنۃ کہے گا۔ نہ اس واسطے کہ جنت کا طالب ہے بلکہ طالب محبوب حقیقی ہی کا ہے مگر اس سے بڑھ کر حوصلہ اپنی ذلت اور اُن کی عظمت کو دیکھ کر نہیں کر سکتا۔

مبتدی اور منتہی کا فرق

معلوم ہو گیا ہوگا کہ طالب تین قسم کے ہیں مبتدی یعنی طالب جنت کے حظ کے لئے اور منتہی یعنی طالب جنت عظمت محبوب کی وجہ سے اور متوسط الحال۔ مبتدی اور منتہی میں فرق مشکل ہے اور متوسط الحال کا حال ممتاز اور ظاہر ہوتا ہے۔ حال سے مغلوب ہوتا ہے۔ گو ایسا مغلوب نہ ہو کہ حد شرع کی حفاظت نہ کر سکے۔ کیونکہ ایسا شخص تو جیسا اوپر عرض کیا گیا مبحث سے خارج ہے لیکن مغلوب ہونے سے صرف اس قدر مراد ہے کہ ذرا بات پر رونے لگتا ہے۔ ذرا بات پر وجد آجاتا ہے۔ زبان سے بلے اختیارانہ کلمات نکلنے لگتے ہیں۔ اس کو

عوام کمال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ کمال نہیں ہے۔ کمال یہ ہے کہ حال پر غالب آ جائے اور حال کوئی تغیر اس میں نہ پیدا کر سکے۔ ایسے شخص کے پہچاننے کے لئے بڑی بصیرت چاہیے۔ اس کی حالت بالکل مبتدی کی سی ہوتی ہے۔ عام لوگ دونوں میں فرق نہیں کر سکتے۔ منتہی کا پہچاننا کچھ آسان کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متوسط اولیا کو تو لوگوں نے پہچان لیا اور اولیاء کاملین اور انبیاء علیہم السلام کو نہ پہچان سکے۔ قالوا ان انتم الا بشر مثلنا۔ متوسط اولیاء میں تو جوش و خروش دیکھتے ہیں اور اولیائے کاملین اور انبیاء علیہم السلام کی حالت بالکل معمولی سی معلوم ہوتی ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد — کم کسے از ستر حق آگاہ شد
گفت اینک ما بشر ایشاں بشر — ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور
ایں ندانستند ایشاں از عمے — درمیاں فرقے بود بے منتہا
ایں خورد گردد پلیدی زو جدا — واں خورد گردد ہمہ نور خدا

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

مگر ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ پہچانے جائیں۔ صاحب کمال کو ایک عجیب استغنا ہوتا ہے۔ دنیا کا ذرا سا کمال کسی کو حاصل ہو جاتا ہے تو کسی کی طرف التفات نہیں کرتا۔ یہ لوگ تو وہ کمال رکھتے ہیں کہ اس کی ماہیت بھی کسی کو معلوم نہیں ہے۔ قصداً اظہار تو کہاں ان کو تو غیرت آتی ہے کہ کسی پر اظہار ہو۔ کیمیاگر کبھی اپنے آپ کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ ہاں البتہ کمالات دکھلانے

پھرتے ہیں۔ پھر دیکھ لیجئے کہ یہ کمالات شعید سے ہی ہوتے ہیں۔ جس کے اندر کچھ ہے وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا اور جو دکھاتا پھرتا ہے اس میں کچھ ہے ہی نہیں۔ ان لوگوں کو تو کبھی اپنے آپ سے بھی غیرت آجاتی ہے۔ قلندر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

میری آنکھ آپ کی طرف دیکھے۔ میرا کان آپ کی بات سنے۔ یہ لوگ امتثال امر میں لگے ہوتے ہیں۔ کوئی ان کو پہچانے یا نہ پہچانے کچھ پروا نہیں۔ نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ اپنی طرف سے کبھی اظہار کا تصور نہیں کرتے۔ ہاں اللہ میاں کبھی ظاہر کر دیتے ہیں۔ اس وقت یاد رکھنے کی بات ہے کہ اخفاء بے ادبی ہے کیونکہ اطاعت تعمیل حکم اور رضا ہے جس طرح رکھیں بندہ کو اسی طرح رہنا چاہیے جب کہیں خاموش رہو خاموش ہو جائے اور جب کہیں کھل جا تو بلا تامل کھل جائے یہ کھل جانا بھی طاعت ہے۔ اس وقت اخفاء اتباع نفس ہے۔ اس وقت اس کو اظہار میں وہی لذت ہوگی جو پہلے اخفاء میں تھی۔

غرض صاحب کمال اپنے قصد کو کبھی دخل نہیں دیتا نہ اخفاء میں نہ اظہار میں۔ بس فنا ہوتا ہے تعمیل حکم میں۔ اور جو کوئی بالقصد اپنے آپ کو ظاہر کرتا پھرتا ہے وہ اب تک فنا ہی نہیں ہوا۔ جب صاحب کمال سرتاپا محو ہوا امتثال امر میں تو اس کو اس طرف توجہ ہی نہیں ہوتی کہ میں ظاہر ہوں یا نہ ہوں بلکہ معمولی سی حالت ہوتی ہے۔ اگر طلب کا حکم نہ ہوتا تو طلب بھی نہ کرتا۔ مگر حکم ہے اس لیے بغرض اس کی تعمیل کے طلب کرتا ہے۔ مبتدی بھی طلب کرتا ہے اور منتہی بھی

طلب میں دونوں شریک ہیں اور کسی بات سے حالت ظاہر نہیں ہوتی تو پھر فرق کیا جائے تو کس طرح۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام　　پس سخن کوتاہ باید والسلام

مبتدی اور منتہی میں فرق بڑا مشکل ہے۔

طلب جنت کا گر

بالجملہ طالبوں کی تین قسمیں ہوئیں اور جنت مطلوب بہرحال ٹھہری اور اُس کی طلب مامور بہ اور فرض ہے۔ اب وہ مقدمہ بھی یاد ہو گا کہ ذریعہ کا اکتساب ضروری ہوا۔ جنت جب ہر شخص کی مطلوب ہے تو اُس کے ذرائع کی طلب بھی ہر ایک کے ذمہ ہے ورنہ وہی بوالہوسی ہو گی۔ اس ذریعہ اور طریق کو فرماتے ہیں

واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوی

فان الجنۃ ھی الماوی

سبحان اللہ! کلام الملوک ملوک الکلام۔ جنت اتنی بڑی چیز اُس کی طلب کا خلاصہ فرما دیا تاکہ طالبوں کو آسانی ہو۔ اتنے بڑے مطلوب کے لیے جس قدر ذرائع اور طرق ہوتے کم تھے مگر حق سبحانہ تعالیٰ نے ایک ایسی بات بتا دی جیسے گر ہوتا ہے۔ گر اس لئے ہوا کرتا ہے کہ کثیر التعداد افراد کو جن کو بالاستقلال ایک ایک کو یاد رکھنا دشوار ہو اس کے ذریعہ سے یاد رکھیں جیسے کوئی خادم کو محفل کے دروازہ پر بٹھا دے اس غرض سے کہ غیر آدمیوں کو اندر نہ آنے دے تو اُس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ زید و عمر و بکر و خالد وغیرہ ایک سو نام اس کو بتا دیئے جائیں کہ ان میں سے جو کوئی آئے منع کرنا۔ اس میں کسی قدر دقت تو

خادم کو پیش آئے گی کہ ایک فہرست بنائے گا جس میں یہ سب نام درج ہوں اور ہر آنے والے سے نام پوچھ کر اوپر سے نیچے تک ساری فہرست میں تلاش کریگا کہ یہ نام اسمائے مندرجہ فہرست میں سے ہے یا نہیں۔ ہر بار ساری فہرست دیکھنی پڑے گی۔ نیز کسی قدر وقت آنے والوں کو ہو گی کہ ہر شخص کو اتنی دیر ٹھہرنا پڑے گا کہ جب تک وہ تمام فہرست کو دیکھے۔ سہولت اسی میں ہے کہ مختصر سی بات بتا دی جاوے کہ جس کو تو پہچانتا ہو اس کو آنے دینا۔ اس سے نہ فہرست کی ضرورت رہے گی نہ کچھ اور دقت پیش آئے گی۔ اسی کو گر کہتے ہیں۔

جنت کے حصول کے لئے بہت سے طریق ہیں جن کا فرداً فرداً یاد رکھنا نہایت دشوار تھا۔ اس لئے حق سبحانہ تعالیٰ نے ایک ایسا امر بتا دیا کہ جب اس کی رعایت رکھی جاوے تو جو فعل بھی کیا جائے گا وہ وہی ہو گا کہ اس کو کچھ نہ کچھ دخل ہے جنت میں۔ اللہ میاں کے کلام کی قدر اسی کو آتی ہے جو طالب ہے جب کسی کے جنت پیش نظر ہو تو انتہا درجہ کا شوق پیدا ہو گا اور جب بتایا جاوے کہ اس کی طلب کے فلاں فلاں طریق ہیں (اور چونکہ جنت بڑی چیز ہے اس کے طرق بھی کثیر ہی ہوں گے) ان کی کثرت کو دیکھ کر یہ شخص گھبرا اٹھے گا۔ مگر چونکہ شوق انتہا درجہ کا پیدا ہو چکا ہے، اس لئے یہ تو ہو گا نہیں کہ چھوڑ بیٹھے بلکہ ایک حالت سخت اضطراب کی پیدا ہو گی۔ اس شخص کے سامنے اگر کوئی قاعدہ کلیہ پڑھ دیا جائے جو جامع ہو تمام طرق کو تو ہر کوئی اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کی کیا حالت ہو گی۔ وجد کی سی کیفیت ہو جائے گی۔ اس کو قدر آئے گی کہ کلام باری تعالیٰ کیا چیز ہے۔ اس گر کو فرماتے ہیں۔

واما من خاف مقام ربہ ونہی النفس عن الھوی

اس میں دو کام فرماتے ہیں جو تمام طرق کو جامع ہیں۔ ایک اپنے مالک کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف۔ دوسرا ونہی النفس عن الھوی۔ الف لام عوض مضاف الیہ ہے اے عن ھواھا نفس کو اس کی خواہشوں سے روکنا۔ یہ دونوں عمل جملہ طرق حصول جنت کو جامع ہیں۔

ہر چند کہ یہ دونوں عمل افراد بہت سے رکھتے ہیں اور تفصیل کرتے وقت افراد میں کچھ کمی نہ ہوگی مگر اس انحصار کی منفعت یہ ہے کہ جب یہ دونوں مضمون ذہن نشین ہو جائیں تو ہر فرد عمل میں اس کی رعایت رکھنے سے نیک و بد میں تمیز سہولت سے ہو جائے گی۔ گو میں یہی ہوا کرتا ہے کہ افراد کم نہیں ہو جاتے صرف طریق شناخت میں انحصار و سہولت ہو جاتی ہے۔

دیکھئے کتنی سہولت ہو گئی۔ جب آدمی کے دل میں خوف ہوگا کہ مجھے ہر ہر عمل پر حق سبحانہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہوگا تو ہر کام کو تامل کے ساتھ کرے گا اور خیال رکھے گا کہ یہ کام کہیں خلاف مرضی باری تعالیٰ نہ ہو۔ اس سے ایک بصیرت پیدا ہو جائے گی کہ ہر بُرے عمل کو پہچان لے گا۔ اور اس سے بچ جائے گا۔ اور جو سمجھ میں نہ آوے گا اُس خوف کی وجہ سے اس کو علماء سے پوچھے گا۔ اس طرح سے کوئی فرد معصیت اس کی نظر سے نہ چھوٹ سکے گا۔ ورنہ جنت جیسی بڑی چیز کے لئے کثرت سے ذرائع ہونی چاہئیں۔ ظاہر ہے ان کا ابتداءً ذہن میں منضبط کرنا امکان سے بھی باہر معلوم ہوتا ہے۔

افراطِ خوف اور کفر

آپ نے جان لیا کہ طرق طلب جنت کا حاصل دو امر ہیں۔ اب یا تو ایک دونوں میں سے اصل ہے اور دوسرا معین یا دونوں اصل ہیں۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے اپنے مذاق سے کہ اصل نہی النفس ہے اور خوف اس کے لئے معین ہے۔ میں یہ اپنے دل سے نہیں کہتا ہوں بلکہ اس حدیث سے کہ نسألک من خشیتک ما تحول بہ بیننا وبین معاصیک۔ دعا مانگتے ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ اے اللہ ہم مانگتے ہیں خوف ہیں سے اس قدر کہ حائل ہو جاویں آپ اس سے ہم میں اور معصیت میں۔

تعلیل سے یہ بات نکلتی ہے کہ خشیت معصیت سے بچنے کے لئے مطلوب ہے بالذات مقصود نہیں ورنہ نسألک خشیتک مطلقاً فرماتے کیسی چیز کی حد مقرر کرنے سے صاف یہی بات مفہوم ہوا کرتی ہے کہ اس سے زیادہ مطلوب نہیں۔ خوف کی حد فرمادی کہ اس قدر چاہتے ہیں کہ معصیت سے مانع ہو۔ معلوم ہوا کہ اگر خوف اس سے زیادہ ہو جائے تو محمود نہیں۔ خوف مع الرجا ہی ہے اور اگر خوف ہی خوف ہو کہ رجا نہ رہے اور ناامیدی تک نوبت پہنچ جائے تو یہ کفر ہے اس سے معصیت چھوٹتی نہیں بلکہ آدمی یہ سمجھ کر کہ طاعت سے کیا ہوگا زیادہ معصیت میں پڑ جاتا ہے۔ میں نے خود دیکھا ایک مغلوب کو تب معلوم ہوا کہ شریعت میں جو توسط ہے اس میں یہ مصلحت ہے۔

ایک وکیل صاحب تھے نماز روزہ کے خوب پابند تھے۔ خوف غالب

ہوا تو عجیب حالت ہوئی پریشان ہوگئے۔ ایسی حالت تھی کہ زبان سے بات ٹھیک نہیں ادا ہوتی تھی۔ قریب تھا کہ نماز بھی چھوڑ دیں اور یہ سب کچھ ہوا تھا ایک کتاب کو دیکھ کر۔

کتابوں کو بطور خود دیکھنے میں یہ خرابی ہے۔ لوگ کہتے ہیں استادوں کے نخرے کون اٹھائے۔ عبارت اردو ہوتی ہی ہے اس کے سمجھنے میں کیا دقت ہے کیونکہ اردو ہماری زبان مادری ہے۔ اگر یہی بات ہے، تو ہر شخص جس فن کا چاہے بلا استاد پورا عالم بن سکتا ہے۔ کتابیں ہر فن کی موجود ہیں حالانکہ مشاہدہ اور تجربہ اس کے خلاف ہے۔ ع

جائے استاد خالی است۔

وجہ یہ ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ کتاب میں ایک جگہ نہیں لکھی جاسکتیں۔ ہر بات علیحدہ علیحدہ لکھی جاتی ہے۔ ابواب وفصول اسی لئے مقرر کیے جاتے ہیں اور اگر ایک جگہ متفرق باتیں لکھ دی جائیں تو کتاب کی ترتیب میں فرق آجائے اور ڈھونڈنے والوں کو بڑی دقت پیش آئے۔ کوئی خاص مضمون کہاں تلاش کریں۔ مثلاً نماز و روزہ و زکوٰۃ کے مسائل کتب فقہ میں بلا تفصیل ابواب کیفما اتفق جمع کر دیئے جائیں تو کس قدر دقت ہو جائے کہ ایک ذرا سے مسئلہ کی ساری کتاب پر نظر ڈالنی پڑے۔ جملہ علوم وفنون میں یہی حالت ہے کہ کتاب میں متفرق مضامین ایک جگہ نہیں لکھے جاسکتے۔ تو بطور خود کتاب دیکھنے والے کو اگر کوئی شبہ واقع ہو تو اگرچہ حل اس کا کتاب میں کہیں مذکور ہو مگر چونکہ اس کو اطلاع نہیں ہے کہ وہ حل کہاں مذکور ہے اس لئے دل میں وہ اشکال

جم جاتا ہے اور بسا اوقات یہ خیال ہو جاتا ہے کہ کتاب میں غلط لکھا ہے مصنف خود نہیں سمجھا۔ حالانکہ کتاب میں غلطی نہیں ہے سمجھ کا قصور ہے۔ جو شبہ ذہن میں آیا ہے وہ کسی دوسری بحث کے مناسب کتاب میں اس باب میں اس کا حل ہوگا۔ اور پڑھانے والا تمام کتاب پر حاوی ہوتا ہے۔ متعلم کے شبہ کرنے سے یا از خود تنبیہاً ہر موقع پر اس کی ضروریات کو بتاتا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں سبقاً سبقاً پڑھنا چاہیئے اور فنون کی کتابوں سے زیادہ تصوف میں خاص کر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بلا استاد کبھی مطالعہ نہ کرے۔ دیگر فنون میں تو یہ ہے۔ بہت سے بہت بطور خود دیکھنے سے وہ فن نہ آئے گا اور تصوف میں خطرہ ہے کہ آدمی ہلاکت میں پڑ جائے اور ایمان جاتا رہے ؂

گر روی صد سال در راہِ طلب　　راہبر نبود چہ حاصل زاں تعب

گر ہوائے ایں سفر داری دلا　　دامن رہبر بگیر و پس برآ

در ارادت باش صادق اے فرید　　تا بیابی گنج عرفاں را کلید

بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق
عمر بگذشت او نہ شد آگاہ عشق

ان وکیل صاحب نے احیاء العلوم کی کتاب الخوف کو دیکھا تھا اور ایک مقام کو ناتمام سمجھے اس سے ایسا خوف دل میں بیٹھا کہ بات نہ کر سکتے تھے اور نیند اڑ گئی۔ مگر یہ خیریت تھی کہ آپ ہی آپ کوئی رائے قائم نہیں کی جیسا کہ آج کل عادت ہے کہ بزرگوں کے اقوال کتابوں میں دیکھ کر کسی واقف کار سے ان کے سمجھنے کی کوشش تو کرتے نہیں، اپنی طبیعت سے جو چاہتے ہیں

حکم لگا دیتے ہیں حتیٰ کہ اُن بزرگوں سے بدعقیدہ ہو جاتے ہیں اور واہی تباہی کلمات بکنے لگتے ہیں یا اس کے موافق غلط عقیدہ رکھ کر خراب ہوتے ہیں میرے پاس آئے کہ کچھ امید نہیں کچھ ہی کرے کہ جنت ملے گی۔ تمام عمر کوشش کرے اور دنیا کو تلخ کر دے مگر کتاب کا لکھا ہوا اگر سچ ہے تو خاتمہ ذرا میں بگڑ سکتا ہے جس وقت میرے پاس کتاب لے کر آئے تو یہ حالت تھی کہ ہاتھ کانپتے تھے زبان لڑکھڑاتی تھی۔ کتاب کی عبارت نہ پڑھی جاتی تھی۔ جیسے کسی کو پھانسی کا حکم سنا دیا جائے۔ اس وقت یہ بات سمجھ میں آئی کہ حد سے زائد غلبۂ خوف اچھی چیز نہیں۔ میں نے اور مقام اسی کتاب کے دکھلائے۔ بحمد اللہ! اُن کے سب شبہے حل ہو گئے اور قلب کو سکون ہوا۔ کہنے لگے آپ نے مجھے بچا لیا۔ جانے کیا ہوتا میری جان نہ رہتی یا ایمان جاتا۔ لکھا کتاب ہی میں سب کچھ ہے مگر دوسرے سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ لکھنے والوں نے حتی الامکان سہولت اس قدر کر دی ہے کہ اکثر جگہ شبہات بھی حل کر دیئے ہیں لیکن پھر بھی استاد کی ضرورت باقی ہے۔

خوفِ محمود

اس سے بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات کسی حقیقت کا زیادہ انکشاف بھی مضر ہو جاتا ہے۔ جیسا اُن وکیل صاحب پر استغنائے حق زیادہ متجلی ہوا اور یہ حالت ہو گی۔ اسی واسطے بزرگانِ دین نے فرمایا ہے کہ جیسے تجلی رحمت ہے استتار بھی رحمت ہے۔ واللہ! اگر تجلی تام ہو جائے تو فنائے عالم ہو جائے یا جان جاتی رہے یا ایمان جاتا رہے۔ میں نے خود دیکھا وکیل صاحب کو کہ قریب تھا کہ نماز تک چھوڑ دیں۔ وجہ کیا تھی صرف غلبۂ خوف

اس واسطے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خشیتک ماتحول بہ بیننا دبین معاصیک۔ صرف اتنا خوف چاہتے ہیں کہ معصیت کو مانع ہو اتنا نہیں چاہتے کہ ہم متحمل نہ ہوں۔ معلوم ہوا کہ خوف محمود وہی ہے جو معصیت سے روکے اور جو خوف خود باعث معصیت ہو جائے وہ معصیت کی طرح بُرا ہے۔

اسی واسطے لکھا ہے کہ بڑھاپے میں امید غالب رکھے اور جوانی میں خوف بوڑھے آدمی سے ویسے ہی کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر اور خوف غالب ہو جائیگا تو رہے سہے بھی ہاتھ پیر پھول جائیں گے اور امیدیں کچھ نہ کچھ کئے ہی جائے گا اور جوانی میں قوت ہوتی ہے خوف کا تحمل ہو سکتا ہے جتنا خوف زیادہ ہوگا نفس کو تنبیہ ہوگی۔ معصیت سے اجتناب ہوگا۔ اور اعمال حسنہ کی کوشش کرے گا۔ ہر وقت کے واسطے تدبیر جدا گانہ ہے۔ باطن طب بھی ظاہری طب کی طرح ہے۔ کبھی دوا سرد دیتے ہیں کبھی گرم۔ کبھی تنقیہ کرنا پڑتا ہے کبھی تقویت۔ اسی طرح باطنی امراض کی تدبیریں بھی مختلف ہیں۔

معلوم ہو گیا ہوگا کہ خوف معین ہے اور ترک خواہشات اصل۔ اب صاف ہے کہ خاف مقام ربہ ذریعہ ہے اور مقصود نہی النفس ہے۔ ذریعہ اسی حد تک محمود ہوتا ہے کہ مقصود تک پہنچائے اور اگر ذریعہ کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ مقصود فوت ہونے لگے تو یہ مذموم ہے کیونکہ ذریعہ ذریعہ نہ رہا۔ خوف اسی قدر چاہیے کہ نفس کو تنبیہ ہو۔ پس خلاصہ طریق کا ترک ہوا ہے اور خوف اس کا معین اور یہی حاصل ہے اس گر کا۔

ضرورت غور وفکر

اب دیکھو کہ تو گویہ بتا دیا کہ ناشناسا کو اندر نہ آنے دینا کہتے ہیں ذرا سا ہے کرتے ہیں بہت ہے جو کام کہ فہرست بتانے سے نکلتا وہی اس سے نکلتا ہے بلکہ فہرست میں تو افراد محدود ہو جاتے۔ اگر ان کے سوا کوئی ناشناسا آنے والا ہوتا تو اس کو منع کر سکتا اور اس لفظ کے بعد ایک کے منع سے بھی چارہ بر آ نہیں ہو سکتا اور کسی تعداد تک ناشناساؤں کی حد نہ رہی۔ اسی طرح حق سبحانہ تعالیٰ نے گر بتا کہ اگر سوچے تو ولی ہو جائے۔ ایک فرد بھی نافرمانی کا اس سے خارج نہیں دیکھئے نافرمانی ہوتی کیوں ہے۔

مثلاً نماز پڑھی یا تاخیر کر کے پڑھی یا بے توجہی ہوئی۔ حضور قلب کے ساتھ ادا نہ ہوئی۔ اگر غور کیا جائے تو سبب اس کا ضرور ایسا نکلے گا کہ منجملہ افراد خواہش نفسانی کے ہوگا۔ فرض کیجئے کہ نماز نہ پڑھنے کا سبب یہ ہوا کہ نیند آ رہی تھی۔ عشاء کا وقت ہوا مگر آرام میں خلل گوارا نہ ہوا۔ سو کر صبح کر دی۔ آرام اور تن پروری خواہش نفسانی ہی ہے۔ تاخیر بھی اکثر جب ہی ہوتی ہے کہ آدمی دوسرے کسی کام میں لگا ہوا ہو۔ اس کام کے ادھ بیچ میں رہ جانے سے نقصان مال کا اندیشہ ہوتا ہے اس نقصان کو گوارا نہ کیا اور نماز میں تاخیر کر دی۔ یہ حب مال ہے کہ منجملہ خواہشات نفسانی ہے۔ اسی طرح نماز میں بے توجہی بھی جب ہی کہ جب توجہ دوسری طرف ہو۔ توجہ کا ایک طرف نہ رہنے دینا بھی نفس ہی کا کام ہے۔ اس کی خواہش سے ہوتا ہے۔

غرض کسی نے ترک طاعت کیا یا ارتکاب معصیت تو طرف نفس

خواہش سے۔ اس کے اندر سبھی کچھ آگیا۔ ہر چیز میں خیال رکھے کہ نفس کی خواہش ہے یا نہیں۔ جب اس پر کوئی محافظت کرے گا تو ممکن نہیں کہ اس سے معصیت ہو سکے۔ تھوڑے دنوں عادت ڈالنے سے اس کا نفع معلوم ہو سکتا ہے۔ ہر کام کو کرتے وقت سوچ لیا کیجیے کہ اس میں نفس کو لذت آتی ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ ضرور ایک فرد معصیت کا ہے۔ پھر اس لذت سے مغلوب نہ ہو جائیے اور اس کی مضرت کو پیش نظر رکھئے۔ اکثر گناہوں میں سب جانتے ہیں کہ مضرتیں ہیں مگر پھر خواہش نفسانی سے مغلوب ہو کر اس کو کرتے ہیں۔

مثلاً غیبت کرنے والا جانتا ہے کہ اگر اس شخص کو خبر پہنچ گئی تو مجھ سے لڑائی ضرور ہوگی اور بہت سے نقصان پہنچیں گے۔ نفع تو کوئی مرتب نہ ہوگا مگر پھر کرتا ہے اور کرنے سے طبیعت کو سکون ہوتا ہے جیسے کسی سے بدلا لے لیا۔ یہ خواہش نفسانی ہی ہے جس کے سامنے مضرت کا خوف بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ ایسے بھی پرہیزگار ہیں کہ خود غیبت نہیں کرتے مگر سننے میں مزہ آتا ہے بہت کیا تو جب کسی نے غیبت کی، (دفع الزام کے لئے کہہ دیا، میاں جانے دو اور پھر رغبت کے ساتھ سن رہے ہیں، دل میں سمجھ رہے ہیں کہ میں غیبت سے محفوظ ہوں۔ بہت احتیاط کرتا ہوں۔ دوسرے کو بھی منع کر دیتا ہوں زبانوں برتاؤ اللہ میاں سے) جناب اللہ میاں کو دل کی بھی خبر ہے ؂

کار با او درست باید داشتن	رایت اخلاص و صدق افراشتن

فریب نفس اور اتباع نفس

فقط زبانی باتوں سے کیا کام چلتا ہے اگر ان کے باپ کو کوئی گالیاں دینے لگے

تو کیسے لڑنے لگیں گے۔ ممانعت اس کو کہتے ہیں۔ اس وقت یہ نہ ہو گا کہ ایک دفعہ اُسے منع کر دیں اور پھر بیٹھے سنتے رہیں۔ حضرت اس منع سے برائت نہیں ہوتی۔ غیبت میں یہ بھی شامل ہے۔ دیکھئے کہ بعد ممانعت کے اگر وہ خاموش ہو جائے تو اُن کے دل میں اشتیاق و انتظار رہتا ہے۔ ظاہراً غیبت نہ کی سہی، ظاہر بینوں کی نگاہ میں پرہیزگار بن جائیں مگر باطن میں تو یہ مرض موجود ہے نفس نے جو خواہش کی تھی اُس کا ظاہر تک اثر نہ آیا سہی قلب میں تو اُس سے التذاذ اور اُس کی طرف میلان عزم کے ساتھ موجود ہے۔ یہی اتباع نفس ہے غرض سوچنے والا سمجھ سکتا ہے کہ معصیت کس حد تک ہو گی۔ جہاں تک خواہش نفسانی پائی جائے۔ یہ ایسا جامع لفظ ہے۔ کوئی فرد معصیت اس سے باہر نہیں جا سکتا۔ جب کوئی معصیت ہو گی خواہش نفسانی سے۔ بُرائی باوجودیکہ ظاہر ہے مگر نفس کی چال میں بڑے بڑے ہوشمند آ جاتے ہیں۔ کوئی چیز رشوت میں مثلاً ملنے لگے تو نفس ضرور بتاتا ہے کہ فلاں فلاں کام تجھے کرنے ہیں اُن کے لئے اتنے خرچ کی ضرورت ہے اور ساتھ ساتھ تاویل ذہن میں آتی ہے کہ یہ شخص خوشی سے دیتا ہے اور تجھے ضرورت ہے ہی اس وقت لے لینا چاہیے۔ پھر اللہ میاں کریم ہیں یہ ضرورتیں بھی رفع ہو جائیں گی اور پھر تو بہ سے گناہ بھی نہ رہے گا۔ کیسی اچھی بات ہے۔ حضرت یہ سب تدبیریں ہیں جن سے نفس جال میں پھانستا ہے اور اس تاویل کی ضرورت اُس وقت ہوتی ہے کہ جب دل میں خوف ہوتا ہے ورنہ تاویل کی بھی کون سی ضرورت ہے اور اتنی دیر کب گوارا ہے۔ گردن پکڑ کر حکم دے دیا کہ رقم ہرگز جانے نہ پائے

بس اُس کی تعمیل ہو گئی۔ ہاں جن کو حفاظ پاتا ہے اُن کے لئے خواہ مخواہ کی ضرورتیں پیدا کر دیتا ہے اور سمجھا دیتا ہے کہ ان کو پورا کرنا ہے۔ حالانکہ یہ اسراف ہے مگر ضرورتیں ایسی تراش لیتے ہیں کہ اس کو اسراف بھی نہیں سمجھتے آج کل کے عقلمند اس مرض میں بہت مبتلا ہیں۔

مجھے ایک شخص ملے اور خوش خبری سنائی کہ لڑکا نائب تحصیلدار ہو گیا میں نے کہا بڑی اچھی بات ہے اب ذرا صاحبزادہ کو یہ تنبیہ کیجئے کہ اسراف نہ کریں۔ کہا جناب کچھ سامان تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کی آمدورفت ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چار بھلے مانس آ کر بیٹھیں اور میز کرسی لیمپ وغیرہ گھٹیا رکھے ہوں یا مکان شاندار نہ ہو

اسراف اور فیشن

یہ اسراف ہے جسے ضروری سمجھ رکھا ہے حالانکہ ضرورت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک واقعی اور ایک فرضی۔ واقعی ضرورت کی تو انتہا ہو سکتی ہے اور فرضی ضرورت کی کہیں انتہا نہیں ظاہر ہے کہ فرضی میں بے انتہا گنجائش ہے۔ فرض میں محالات تک بھی آ سکتے ہیں۔ جب فرضی ضرورت کی کوئی انتہا نہیں تو اُس کے رفع کے لئے کون سی رقم کافی ہو سکتی ہے۔ دنیا میں جو بھی رقم لی جائے گی متناہی ہو گی۔ پھر متناہی لامتناہی کے برابر کیسے ہو سکتی ہے۔ اسراف معصیت تو ہے ہی اور وبال اُخروی تو آخرت میں ہو گا مگر دنیا میں بھی اس کا نتیجہ دیکھ لیجئے کہ خاندان کے خاندان اس کی بدولت تباہ ہو گئے۔ ایک شادی بھی جس نے کی اُس میں فرضی ضرورتیں پوری کیں تو نقدی اور جائداد اور مال و متاع سب اس کی نذر کر دیا

اور پھر بھی پورا نہ ہوا قرض لے کر بمشکل آبرو بچائی۔ پھر اس قرض کے بعد چندے آبرو بھی گئی۔ ذرا سا ختنہ ہے یا بسم اللہ ہے اور اس کے لئے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں سے آنی چاہیئے خواہ رشوت لے کر ہو یا سودی قرض لے کر ہو یا گھر بیچ کر۔ ایسا نہ ہو کوئی رسم رہ جاوے۔ یہ سب فرضی ضرورتیں ہیں۔ بیوی کے کان میں پانچ سو کا زیور ہو خواہ میاں کی اوقات دو ہی پیسہ کی کیوں نہ ہو۔ کہیں سے پانچ سو لاؤ تب منہ دکھاؤ۔ میز کرسی پوشاک سب قاعدے ہوں۔ ایسا نہ ہو کوئی بڑا آدمی انہیں چھوٹا کہہ دے۔ حضرت بڑے آدمی کو یہ بھی تو معلوم ہو گا کہ میاں کی اوقات صرف پچاس ہی روپیہ کی ہے پھر بڑا کیسے کہہ دے گا۔ یہ ضرورت نہیں صرف فیشن ہے۔

لطف یہ ہے کہ علماء رسموں کو منع کرتے ہیں تو یہ لوگ ان کے شریک ہو جاتے ہیں اور بڑے شکر گزار ہوتے ہیں کہ صاحب یہ تو آپ بڑا کام کرتے ہیں کہ فضولیات کو چھڑاتے ہیں۔ کیا ضرورت ہے کہ اتنا سونا لاد لیا جائے جس سے کان کٹ پڑیں۔ یہ روپیہ کسی ایسے کام میں کیوں نہ لگایا جائے جس سے راس المال محفوظ رہے اور چار پیسے اور ملنے لگیں۔ تجارت کی جائے یا جائداد خرید لی جائے۔ شادی کی رسمیں مطلقاً چھوڑ دی جائیں۔ اس روپیہ سے لڑکی کے لئے کوئی صورت بسر اوقات کی کیوں نہ کر دی جائے۔ آتشبازی وغیرہ سے ذرا سی دیر کا حظ نفس نہ ہوا نہ سہی۔ غرض علماء کی تائید کرتے ہیں البتہ پرانی وضع کے لوگوں کو ضرور شاق ہوتا ہے۔ اور ان نئے فیشن کے لوگوں کو جب ترک دین آسان ہوا تو رسم دنیا کیا۔ یہ لوگ ساتھ دیتے ہیں اور بھولے

پیسے سے لوگ خوش ہوتے ہیں کہ یہ بھی علماء کے ہم خیال ہیں۔ بُری باتوں سے منع کرتے ہیں۔ چوری اُن کی پکڑی گئی کہ رسموں سے بیوی کو روکتے ہیں اصلاح میز و کرسی کے لئے نہ اس کے لئے کہ اسراف نہ ہو یا روپیہ کسی منفعت کے کام لگے۔ بلکہ اس لئے کہ اُدھر سے روپیہ بچے تو اپنے فیشن کو درست کریں میز و کرسی سے کمرہ سجائیں۔ ہارمونیم باجا منگائیں کوئی نیلام سے خالی نہیں جاتا بیوی پر تو تقاضا ہے کپڑا کم پہنو۔ سال بھر کے لئے صرف دو جوڑے کافی ہیں اپنے گھر میں سب طرح بسر ہو سکتی ہے۔ بہت کرو کہیں جانے کے لئے ایک اُجلا جوڑا بنا لو۔ زیور جو کچھ میکہ سے لائی ہو وہی کیا تھوڑا ہے۔ بہت ہوس اچھی نہیں ہوتی۔ سادگی کے بھی خلاف ہے۔

ایک صاحب نے بیوی سے کہا ہم کماتے کماتے مرے جاتے ہیں اور تمہیں ذرا خیال نہیں۔ جتنا آتا ہے سب خرچ ہو جاتا ہے ایک پیسہ نہیں بچتا۔ خرچ میں کمی نہیں کرتی۔ بیوی نے کہا، میرے یہاں کوئی بازار کی چاٹ نہیں آتی۔ کوئی چیز ضرورت سے زائد نہیں منگاتی۔ کسی کو ایک پیسہ تمہاری بلا اجازت میں نہیں دیتی۔ جو کچھ خرچ ہے تمہارا ہی ہے۔ میں کس چیز میں زیادہ خرچ کرتی ہوں۔ اور کون سے خرچ میں کمی ہو سکتی ہے۔ کہا نہیں تم نے خرچ بڑھا رکھا ہے۔ اگر ماما نہ رکھو تو اس کی تنخواہ اور خوراک بچے یا نہیں۔ ہم ایک چکی خرید دیں خود پیس لیا کرو اور روز کی پسنہاریوں کی وقت نہ رہے اور پسائی کے دام بچیں اس میں تمہارا ایک اور بھی نفع ہے کہ تندرستی اچھی رہے گی۔ ریاضت کرنا آدمی کے لئے بہت ضروری اور مفید ہے۔ گھر کی لیپ پوت بھی خود کر لیا کرو ذرا

ذرا سے کاموں کے لئے مزدور ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ ان سب ترکیبوں سے ایک کافی رقم بچ سکتی ہے۔ تھوڑا ہی تھوڑا کر کے بہت ہو جاتا ہے مگر جب تمہیں خیال ہو۔

غرض بیوی کو سب مدّوں میں تخفیف کی تدبیریں بتائی جاتی ہیں۔ وہی بیچاری گلا گھونٹنے کے لئے ہے۔ ہر طرح بسر کر سکتی ہے۔ مگر تمہاری کسی مد میں ذرّہ بھر کمی نہ ہو۔ کمرہ میں معمولی لیمپ سے کام نہ چلے برقی لیمپ ہونا ضروری اور وہ بھی بقدر ضرورت نہیں بلکہ دس پانچ رکھے رہیں۔ نازک چیز ہے شاید کوئی ٹوٹ جائے تو دوسرا موجود رہے۔ اور ان میں بھی آج ایک نئی ایجاد ہو جائے تو پہلے خریدے ہوئے سب ردّی ہیں۔ اب نئے طرز کے خریدنے جائیں وعلیٰ ہٰذا۔

بیوی کے لئے تو زیور بھی اسراف ہے اور آپ کے لئے کوئی چیز بھی اسراف نہیں۔ بیوی کا اسراف ایک طرح کا ہے پرانے فیشن کا اور میاں کا اسراف دوسری طرح کا ہے نئے فیشن کا۔ دونوں کو چھوڑو و ترکت الالف والعزہ جمیعا۔ یہ سب فضولیات ہیں جن کو نفس ضروری بتا کر طلب کرتا ہے۔ ان کی تکمیل خواہش نفس کی تعمیل ہے جس میں بڑے بڑے عقلمند گرفتار ہیں۔ معلوم نہیں عقل کس طرح روا رکھتی ہے کہ اپنے آپ کو دشمن کے ہاتھ بار دے دیا جاوے جس کی دشمنی دنیا میں بھی ظاہر ہو چکی۔ اسراف کے نتائج آپ نے دیکھ ہی لئے۔ مسلمان کا کام تو یہ تھا کہ ہر کام میں پوچھتا کہ حق تعالیٰ کا کیا حکم ہے بجائے اس کے ہر کام میں شیطان اور نفس سے پوچھا جاتا ہے

کہ سرکار کا کیا حکم ہے اور جو اُس نے کہہ دیا بے دھڑک کر ڈالا خواہ اللہ کے خلاف یا رسول سے کہے۔

احسانات اور کفران نعمت

مسلمانوں کیا جواب ہو گا اگر پوچھا جائیگا۔

الم اعہد الیکم یا بنی آدم ان لا تعبدوا الشیطان انہ لکم عدو مبین وان اعبدونی هذا صراط مستقیم ولقد اضل منکم جبلا کثیرا افلم تکونوا تعقلون هذه جهنم التی کنتم بہ توعدون ۵

پوچھیں گے اے بنی آدم کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا دشمن ہے۔ میری عبادت کرنا یہ سیدھا راستہ ہے اور دیکھ چکے تھے کہ بہتوں کو اس نے گمراہ کر دیا تھا۔ کیا تمہیں عقل نہ تھی اب یہ جہنم موجود ہے۔

میں کہتا ہوں اگر صرف پوچھا ہی جائے اور دوزخ نہ بھی ہو تو یہ کیا تھوڑا ہے کہ کہا جائے کیوں صاحب ہمارا عہد یاد ہے۔ ہم سے تعلق قطع کر کے باوجودیکہ ہم ہر وقت مہربان تھے اس سے جوڑا جو ہر وقت دشمن تھا۔ اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ خجالت اٹھانی پڑے۔ دنیا میں تو قاعدہ مسلمہ ہے کہ بھلائی کا بدلہ بھلائی مگر اللہ میاں کے ساتھ معاملہ برعکس کیا جاتا ہے۔ جس قدر اس طرف سے احسانات زیادہ ہوتے ہیں اسی قدر اس طرف سے کفران نعمت ہوتا ہے جس قدر ادھر سے ساتھ دیا جاتا ہے اسی قدر ادھر سے قطع کیا جاتا ہے اور بمقابلہ محسن کے دشمن کی پیروی ہوتی ہے۔ دشمن نے

جس چیز کا حکم کر دیا اس کو کہا جاتا ہے کہ اس کی ضرورت ہے اور اللہ میاں نے جس کا حکم کیا وہ قدرت سے باہر ہے اور ترقی سے روکنے والا ہے۔ حضرت یہ چیزیں جن کو نفس ضروری ثابت کرتا ہے ان میں انہماک سے حق تعالٰے سے بُعد بڑھتا ہے اور غفلت پیدا ہوتی ہے۔

عاقبت سازد ترا از دیں بری ایں تن آرائی و ایں تن پروری

با ہوا و آرزو کم باش دوست چوں یضلک عن سبیل اللہ اوست

تا ہوا تازہ است ایماں تازہ نیست

چوں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست

دیکھو ایک جگہ کیا شکایت فرماتے ہیں۔ ارایت من اتخذ الٰھہ ھواہ اس شخص کو بھی دیکھا تم نے جس نے اپنا معبود خواہش نفسانی کو بنایا۔ ہم کو چھوڑ کر اپنے دشمن کی اطاعت اختیار کی۔ تعجب ہے کہ اللہ میاں نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا احکام کی مصلحتیں بتائیں اور سمجھایا اور خاک نہ سنا۔ اور نفس نے اندر سے ایک شترہ چھوڑ دیا کہ افعل کذا۔ بس ایسی بیعت کی ہے کہ کوئی ضرورت نہیں دل کی اور کچھ حاجت نہیں مصلحت دریافت کرنے کی جو حکم ہوا، فوراً تعمیل۔ اللہ میاں کے احکام میں کبھی ہر ہر بات کی علت ڈھونڈی جاتی ہے اور اس کی مصلحت پوچھی جاتی ہے۔ حالانکہ شرائع میں علل اور مصالح ضرور ہیں مگر ہر شخص کی عقل نارسا کی رسائی تو وہاں تک نہیں۔ پھر ہم کو علت نکالنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جب دلیل صحیح سے ثابت ہو گیا عمل کر لیا۔ کبھی اس میں گنجائش نکالی جاتی ہے کہ کیوں صاحب اس کے خلاف کرنے میں کچھ

اسلام سے تو خروج نہیں ہوتا۔ پس جب اسلام سے خروج نہیں ہوتا اور نفس کا حکم خلاف پر ہے ہی جس کو ضرورت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، پھر کیوں نہ کیا جائے۔ یہ حالت بھی ان لوگوں کی ہے جن کو اسلام کا کسی قدر پاس ہے اور دعویٰ ہے کہ ہم شریعت کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا چاہتے (خلاف شریعت شاید منحصر فرد واحد ہے یعنی وہ عمل جس میں خروج عن الاسلام ہی لازم آجائے۔) اور جو لوگ کہ پورے آزاد ہیں اُن کو تو دلیل غیر دلیل سے بحث ہی نہیں۔ اُن کے نزدیک گویا خود احکام کا خلاصہ ہوائے نفس ہی ہے اللہ میاں کے احکام کوئی چیز ہی نہیں۔

جو لوگ اسلام کا پاس رکھتے ہیں اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ کیوں صاحب جس قدر حجتیں اللہ میاں کے احکام میں ہوتی ہیں اگر نفس کے حکم میں ہوتیں تو کیا حرج تھا۔ اتنی حجت تو کیا اگر نفس سے خواہش کے وقت صرف اتنا ہی پوچھ لیا کریں کہ اس میں کیا مصلحت ہے جس کی وجہ سے اختیار کیا جائے اور پھر مصلحت میں غور کر لیا کریں کہ واقعی ہے یا فرضی تب بھی تو بہت سی برائیوں سے حفاظت ہو جائے۔ مگر کہاں؟ اُس کے تو ہاتھ میں ایسی باگ دی ہے کہ جب وہ کہے چل چلنا پڑتا ہے اور جب کہے ٹھہر ٹھہرنا پڑتا ہے۔ نفس اگر خندق میں گرلے تو خندق ہی میں گرنا پسند ہے اور اگر آسمان پر چڑھائے تو آسمان پر چڑھنا قبول ہے اللہ میاں نے ایک حکم کیا کہ اس میں مصلحت تھی۔ اُس کو نہ کیا اور نفس نے ایک خواہش کی جس میں سراسر مضرت تھی اُس کو کر ڈالا۔

ایک تاجر سے کوئی سو کا مال پچیس اوپر سو کو خریدتا تھا مگر نہ دیا اور دیا کہاں

جہاں دو پیسے اور کم ملے۔ نہ معلوم اوّل خریدار سے اس کو اتنی منافرت کیوں ہے۔ اس کو اتنا خیال کہ پیسے زیادہ دیتا ہے گویا اپنا نقصان کرتا ہے کہ تجارت میں کچھ اس کے پلے پڑ رہے اور ان کو ایسی ضد کہ اپنا مال پھینکیں گے اور خسارہ ہی دیں گے مگر تمہاری مخالفت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ افسوس!

معصیت کی دنیاوی مضرتیں

خواہش نفسانی وہ بری چیز ہے کہ دنیا کی بھی خرابی اور دین کی بھی صد معصیتیں ہیں کہ ان میں دنیاوی نقصان ہیں۔ معصیت میں دنیا کی بھی مضرتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ میاں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ آدمی اسباب کو جمع کرتا ہے مگر وہ اسباب مودی الی المسبب بہت کم ہوتے ہیں۔ ہر کام میں پریشان رہتا ہے بعض آدمی ذرائع کم رکھتے ہیں اور کام زیادہ نکلتا ہے۔ اس کے برعکس اس کو ذرائع زیادہ رکھنے پڑتے ہیں اور کام اتنا بھی نہیں ہوتا۔

ایک یہ کہ رزق میں تنگی ہوتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ ہم پر تو تنگی نہیں میں کہتا کہ رزق سے مقصود کیا ہے؟ اطمینان! یہ معصیت کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا۔ اطمینان فراغ قلب کا نام ہے۔ ناجائز طریق سے کتنا ہی مال حاصل کر لیجئے مگر جو نشاط اور بے فکری قلب کو تھوڑے حلال کے مال سے ہوتی ہے وہ ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسی بات ہے کہ تجربہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے وجدانی سی بات ہے ؎

پرسید یکے کہ عاشقی چیست گفتم کہ چو ما شوی بدانی

عنین شخص کو کتنا ہی سمجھاؤ کہ عورت کی یہ لذت ہوتی ہے مگر وہ ہرگز

نہ سمجھے گا اور الٹا تمہیں کو بیوقوف بنائے گا۔ اگر اُس کو سمجھانے کی کوئی تدبیر ہے تو بس یہ کہ اُس کا علاج کرو۔ جب قوت رجولیت پیدا ہو جائے گی آپ بیوقوفی اور عقلمندی کو سمجھ لے گا۔ معصیت کو چھوڑ کر طاعت اختیار کرو۔ دیکھو قلب میں کیا بات پیدا ہوتی ہے۔ آشکارا ہو جائے گا کہ اطمینان یہ چیز ہے۔

اس پر دلیل فلسفی بھی ہے۔ وہ یہ کہ معصیت کرنے والا غیر اللہ کا طالب ہے۔ اور اس تک پہنچ جانا اور اُس کو پا لینا ضروری نہیں اور مطیع طالب ہے اللہ میاں کا اور وہ ہر وقت اس کے پاس ہیں۔ ادھر سے ذرا سی کوشش چاہیئے اُدھر سے خود کرم فرماتے ہیں غیر اللہ کی طلب پر۔ چونکہ نتیجہ کا ترتب ضروری نہیں اس لئے کامیابی نہیں ہوتی اور دل کو فراغ حاصل نہیں ہوتا اور اللہ میاں کی طلب پر نتیجہ مترتب ہو جاتا ہے اس لئے قلب کو راحت ملتی ہے۔ اسی کا نام اطمینان اور فراغ ہے۔ طاعت وہ چیز ہے کہ اُس کی لذت وہی جانتا ہے جو پاتا ہے

؎ سالہا تو سنگ بودی دل خراش ۔۔۔ آزموں را یک زمانے خاک باش

اے غافل پتھر تو برسوں رہا ہے امتحان کے لئے ذرا دیر خاک ہو کر بھی دیکھ۔

پھر تو پتھر ہونے کا نام بھی نہ لے گا۔ خاک ہونا وہ چیز ہے کہ خاک ہو کر پتھر ہونا کسی نے قبول نہیں کیا۔ اور پتھر بہتیرے خاک ہو گئے۔ طاعت وہ چیز ہے کہ جب تک کسی نے کی نہیں جبھی تک وہ علیحدہ ہے۔ جہاں تھوڑی سی بھی کی پھر طاعت خود اس کو نہیں چھوڑتی۔ وہ چھوڑنا چاہتا ہے مگر یہ دوڑ دوڑ کر

لیتی ہے۔ کر کے دیکھو۔ امتحاناً ہی سہی۔

طاعت کا اثر میں کہتا ہوں امتحان کرنے سے تو اثر کیا بھولے سے بھی طاعت اگر ہو گئی تو اثر ضرور کرے گی۔ کپڑا بھولے سے رنگ میں گر جائے تو گو وہ بات نہ آئے گی کہ اگر کوئی قصداً رنگتا مگر دھبے تو ضرور ہی پڑ جائیں گے۔ تجربہ ہوا ہے کہ لوگوں کو دھوکے سے طاعت ہو گئی اور اثر ہو گیا۔

قصہ مشہور ہے کہ ایک چور بادشاہ کی لڑکی پر عاشق تھا۔ ایک روز کہیں چوری کے ارادہ سے بادشاہ کے یہاں پہنچ گیا۔ وہاں بادشاہ اور بیگم میں اسی لڑکی کی شادی کی نسبت گفتگو تھی بادشاہ کہہ رہے تھے کہ میں تو اس کی شادی کسی ایسے شخص سے کروں گا کہ نہایت عابد و زاہد اور متقی ہو۔ یہ چور صاحب چوری تو بھول گئے اور بہت غنیمت سمجھا کہ آج خوب کام بنا۔ وہاں آکر ایک مسجد میں جا بیٹھے اور دن رات عبادت کرنا شروع کی تہجد بھی، اشراق بھی، چاشت بھی، غرض عبادت ہی سے کام تھا۔ لوگوں میں شہرہ ہوا کہ ایک بڑے عابد صاحب تشریف لائے ہیں۔ رفتہ رفتہ تمام شہر میں ان کی شہرت ہو گئی۔ ادھر بادشاہ نے آدمی تعینات کر رکھے تھے کہ دیکھو شہر میں سب سے زیادہ عابد و پرہیزگار کون ہے۔ ان مخبروں نے خبر دی کہ ایک عابد صاحب فلاں مسجد میں قیام رکھتے ہیں۔ ان سے زیادہ متقی و پرہیزگار کوئی نظر نہیں آتا۔ بادشاہ نے خاص وزیر کو ان کے پاس پیغام دے کر بھیجا۔ اور یہاں کام ہو چکا تھا۔ انہوں نے التفات بھی نہ کیا۔ غرض وزیر نے نہایت ادب سے پیغام شاہی سنایا۔ کہا در اصل نیت تو میری فاسد تھی ابھی

غرض سے عبادت شروع کی تھی مگر حق سبحانہٗ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا۔ اب مجھے نہ آپ کی بیٹی کی ضرورت ہے نہ آپ کے جاہ وحشم کی۔ پس تشریف لے جائیے اور میرا وقت ضائع نہ کیجئے۔

طاعت ایسی ہی چیز ہے کہ بعض اوقات گو اس میں غرض صالح نہ ہو۔ مگر انجام کار اسی سے درستی ہو جاتی ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ بہت لوگ اغراض فاسد سے اسلام قبول کرتے ہیں لیکن آخر کو وہی اسلام کامل ہو جاتا ہے۔ ایسوں کے اسلام کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہیئے۔ بعض لوگ نا اہل نادان کہتے ہیں کہ ان بھکاریوں کو مسلمان نہ کرنا چاہیئے۔ ان لوگوں نے پیشہ کر لیا ہے۔ اُن کے مسلمان کرنے کا نتیجہ ہی کیا ہے۔ سوائے اس کے کہ مسلمانوں سے روپیہ ٹھگتے پھریں۔ کوئی کہتا ہے کہ میرے ذمہ اتنا قرضہ تھا۔ مسلمان لوگ مل کر ادا کر دیں۔ کوئی کہتا ہے مجھے روزہ نماز سیکھنے کے لئے فلاں فلاں کتاب کی ضرورت ہے مسلمان لے دیں اس میں اسلام کی بدنامی ہے کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں۔

مجھ سے ایک صاحب یہی فرماتے تھے۔ میں نے اُن کو جواب دیا کہ اگر ایسی بدنامی کی وجہ سے اخراج عن الاسلام کریں، تو آپ میں بھی ایسے عیوب ہیں جن سے اسلام بدنام ہوتا ہے۔ اُن کی وجہ سے آپ کو اسلام سے کیوں نہ نکال دیں۔ نیا مسلمان تو خواہ جنید بغدادیؒ ہی ہو یا موروثی شیطان ہی ہو تو پروا نہیں ہے۔

ریا اور عبادت

میں تجربہ سے کہتا ہوں کہ بعض اوقات مسلمان کسی طمع سے ہوتا ہے۔ مال کی طمع ہو یا اور کسی چیز کی۔ مگر اسلام وہ چیز

ہے کہ خود دل میں جگہ کر لیتا ہے۔ ایک بزرگ کا قول ہے۔

تعلمت العلم لغیر اللّٰہ — میں نے علم سیکھا تو تھا غیر اللہ

فابی العلم الا ان یکون للّٰہ — کے لیے مگر علم نے خود نہ مانا اللہ ہی کا ہو کر رہا۔

آگ جلاؤ اور یہ قصد نہ کرو کہ لکڑی جلے۔ تھوڑی دیر میں لکڑی راکھ ہو جائیگی آگ میں یہ اثر کہ لکڑی خود گھس جاتی ہے، آپ کے قصد پر موقوف نہیں۔ کسی بزرگ سے کسی نے کہا، دیکھئے صاحب فلاں آدمی دکھلاوے کا ذکر کیا کرتا ہے کہا تو دکھلاوے کا بھی نہیں کرتا۔ وہ دکھلاوے کا کرتا ہے مگر کرتا تو ہے۔ کبھی نہ کبھی ذکر اس کے دل میں جگہ کر ہی لے گا اور تجھے کیا امید ہے۔

ہمارے حضرت فرماتے تھے عبادت اوّل ریا ہوتی ہے۔ چند روز میں عادت ہو جاتی ہے۔ پھر عبادت اور اخلاص۔ واقعی یہ بات بالکل صحیح ہے دیکھ لیجئے کہ بچپن میں آدمی نماز پڑھتا ہے اس وقت کیا حالت ہوتی ہے۔ پھر سن شعور میں اور کیفیت ہوتی ہے اور بڑی عمر میں کچھ اور ہی بات پیدا ہو جاتی ہے بچپن میں استاد یا والدین کے خوف سے پڑھی جاتی ہے۔ اگر کسی وقت ان کی نگرانی نہیں ہوتی تو ٹال بھی دی جاتی ہے یا بے وضو ہی اڑا دیتے ہیں یہ ریا ہی ہے۔ پھر پڑھتے پڑھتے سن شعور میں پہنچ کر طبیعت مانوس ہو جاتی ہے اور جیسا کہ اور امور ضروری کا تقاضا ہوتا ہے ایسا ہی نماز کا ہونے لگتا ہے تا وقتیکہ ادا نہ کر لی جائے طبیعت پر بار رہتا ہے۔ اگر نفس کبھی ٹالنا چاہتا ہے تو زیادہ سے زیادہ تاخیر کی نوبت آتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ قضا کر دیں۔ یہ مرتبہ عادت کا

ہے۔ اس کے بعد تو بحمد اللہ یہ کیفیت ہوتی ہے کہ بلا نماز چین ہی نہیں پڑتا۔ یہ مرتبہ اخلاص کا ہے۔

غرض عبادت ابتداءً کسی کیفیت کے ساتھ ہو مگر کبھی نہ کبھی خود دل میں جگہ پکڑ لیتی ہے۔ اس کا تجربہ مدرسہ میں رہ کر اچھی طرح ہوا۔ بہت سے طلبا کو دیکھا کہ اوّل اُن کی نیت اچھی نہیں ہوتی مگر فارغ ہوتے ہی مخلص بن جاتے ہیں بالکل حالت پلٹ جاتی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ اوّل اگرچہ نیت ٹھیک نہ تھی مگر شروع ایسی چیز کو کیا ہے کہ وہ خود ٹھیک کر لیتی ہے۔

یہی بات ہے کہ اس کو جو لوگ نہیں جانتے ہیں وہ طالب علموں کی ابتدائی حالت دیکھ کر طرح طرح کے اعتراض کیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ بالکل جاہل ہوتے ہیں۔ دنیا سے تو ناآشنا ہیں ہی دین میں کیا کمال پیدا کیا۔

معصیت اور مضرت

میں کہتا ہوں ابھی ان کی حالت کیا دیکھتے ہو۔ پڑھتے رہو۔ انہیں میں مقتدا لوگ ہوں گے اور انہیں میں غزالی وقت بھی ہوں گے۔ طالب علموں سے اگر ذرا سا قصور ہو جاتے تو تمام شہر میں سن لیجئے اسلامی مدرسہ والوں نے یوں کیا۔ کس قدر منافرت اس لفظ سے ٹپکتی ہے۔ آپ کو ان سے تعلق رکھنا چاہئے یا قطع کرنا۔ یہ تمہارے دین کے حامل ہیں۔ ان سے قطع کرنا کس سے قطع کرنا ہے۔ آپ کو ان سے تعلق ہی رکھنا چاہئے۔

اگر آپ کا بچہ بازار میں کسی سے لڑ آئے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو جائے کہ سراسر زیادتی اسی کی تھی تو آپ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے۔ اگر لڑائی

کے وقت آپ پہنچ جائیں گے تو لڑکے کی زیادتی اور عدم زیادتی کی طرف تو خیال بھی نہ ہوگا۔ اس وقت تو اسی کی حفاظت کریں گے اور جس طرح ممکن ہوگا اس کی بات نیچی نہ ہونے دیں گے۔ پھر اس غصہ کے فرو ہونے کے بعد علیحدگی میں بچہ کو فہمائش کریں گے کہ آئندہ ایسی زیادتی نہ کرنا (یہ بھی جب ہے کہ آپ بہت ہی حق پسند ہوں ورنہ باطل ہی کی پیروی ہوگی اور اس کو کچھ ملامت وغیرہ نہ ہوگی) اور اگر کوئی غیر آدمی پوچھے گا کہ میاں کیا بات تھی تو یا تو اپنے بچہ کو بے قصور کہیں گے اور اگر بالکل ہی صریح خطا ہوگی تو کہہ دیں گے کچھ نہیں بازار میں ایک آدمی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ لڑکا تیز مزاج ہے، دبتا کسی سے ہے نہیں بات بڑھ گئی۔

اپنے بچہ کے عیب کو کیوں مشہور نہ کیا۔ اس کا عیب عیب نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ اس سے آپ کو طبعی تعلق ہے۔ اس کی بدنامی اپنی بدنامی ہے بچہ سے طبیعت کے حکم سے تعلق ہے، طالب علم سے حق تعالیٰ کے حکم سے تعلق رکھا ہوتا۔ اس کے قصور کو بھی اپنے بچہ کے قصور کی طرح دبایا ہوتا۔ بچہ کی بدنامی میں اپنی بدنامی سمجھی تھی، طالب علم کی بدنامی میں اپنے دین کی بدنامی سمجھی ہوتی بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اگر ان کے قصور نہ پکڑے جائیں تو ان کو تنبیہ کیوں کر ہو۔ میں کہتا ہوں اپنی طبیعت سے ہی انصاف کر لو کہ جس طرح اپنے بچہ کو تنبیہ کرتے ہو اسی طرح طالب علم کو کرتے ہو یا نہیں۔

فرض کر لو کہ تمہارا بچہ اس قدر شریر ہو کہ باوجود فہمائش کے بھی نہ مانے اور بد سے بدتر حرکتیں کرے جس سے خاندان بھر پر دھبہ آ جائے۔ ننگ و ناموس

کو بٹہ لگ جائے تب آپ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہیں۔ کیا اس سے بالکل قطع تعلق کر دیتے ہیں۔ قطع نہیں کرتے۔ اور اگر کوئی قطع بھی کر دے، تو دل پر وہ صدمہ رہتا ہے کہ موت سے بدتر ہے۔ باوجود قطع کے تمام عمر یہی چاہتے ہیں کہ کاش یہ احمق اپنی حرکتیں چھوڑ دے۔ خود سمجھانے سے جب اثر نہیں ہوتا تو جن کا وہ لحاظ کرتا ہے اُن سے فہمائش کرائی جاتی ہے۔ طالب علم کے کسی بڑے جرم پر تو کیا ایک چھوٹے سے قصور پر بھی میں پوچھتا ہوں کہ اسی طرح مشفقانہ تنبیہ ہوتی ہے یا اجنبیانہ۔ اگر اسی طرح مشفقانہ تنبیہ آپ کرتے ہیں تو الحمد للہ و ہوالمقصود اور اگر ایسا نہیں ہے تو میں پھر کہتا ہوں کہ ان سے آپ نے قطع کیوں کیا۔ کیا وہ آپ کے دین کے محافظ نہیں ہیں یا آپ کے ذمہ دین کی حفاظت نہیں ہے۔ ایک کے قصور پر آپ سب کو بدنام کرتے ہیں کیا آپ کے سب بچے ایک ہی سے صالح ہوتے ہیں یا بچپن ہی سے آپ کے بچے تمیزدار ہوتے ہیں۔ ان میں بھی اگر ایک کم سمجھ ہے تو بڑے بڑے سمجھدار بھی تو ہیں۔ آج اگر یہ کم استعداد ہیں تو کل امام وقت اور غزالی وقت بھی تو انہی میں سے ہوں گے۔ ابتدائی حالت دیکھ کر ان پر اعتراض نہ کرو ہر طاعت کی ابتدائی حالت ایسی ہی ہوتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ طاعت ہونی چاہیے خواہ کسی طرح ہو پھر طاعت آدمی کو خود درست کر لیتی ہے اور طاعت ایسی چیز ہے کہ اس میں دینی اور دنیاوی دونوں نفع ہیں۔ رزق میں کشائش ہوتی ہے۔ اگرچہ آدمی چنداں مالدار نہ ہو، مگر طاعت کے ساتھ عجیب طرح کا اطمینان اور فراغ قلب ہوتا ہے اور برعکس

اس کے معصیت سے رزق میں تنگی ہوتی ہے اور اطمینان قلب نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اور بھی مضرتیں ہیں جو معصیت پر متفرع ہیں۔

ایمانداری کی مثال

غرض فرمانبرداری سے ہمیشہ مسرت ہوتی اور معصیت سے مضرت اور یہ تو لازمی مضرتیں ہیں۔ اکثر مضرتیں متعدی ہو جاتی ہیں جیسے کہ غیبت کہ جب ایک آدمی کسی کی غیبت کرے گا دوسرے کو خبر پہنچے ہی گی پھر وہ کیوں نہ کرے گا۔ بلکہ اس سے زیادہ کرے گا اس سے دونوں میں عداوت پیدا ہو گی۔ پھر عداوت وہ چیز ہے کہ جب دل میں پڑ جاتی ہے تو دونوں کا نماز روزہ سب عداوت ہو جاتی ہے۔ اٹھنے میں، بیٹھنے میں، سونے میں ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ کسی طرح دوسرے کو نقصان پہنچے۔ نیت نماز کی باندھ رکھی ہے اور دل میں دوسرے کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچی جا رہی ہیں۔ یہ کیا نماز ہوئی شغل قلب ہوا اور کیا ہے سے حرام چیز ہے۔ منہ میں روزہ ہے اور زبان دوسرے کی غیبت سے آلودہ ہے۔ دل میں خوش ہیں کہ روزہ ہے۔ یہ خبر نہیں کہ روزہ میں ان چیزوں کو تو چھوڑا جو فی نفسہ حلال تھیں یعنی کھانا پینا اور جو چیز ہمیشہ حرام ہے اُس کو نہ چھوڑا تو کیا روزہ ہوا۔

غرض یہ عداوت اسی غیبت کی بدولت ہوئی اور عداوت وہ چیز ہے کہ قلب کو ایک ہی طرف کا کر لیتی ہے اور صرف ایک کام کا رہ جاتا ہے مضرت رسانی۔ آپ جانتے ہیں کہ چھوٹا سا لفظ کس قدر شر کو جامع ہے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اظہر من الشمس ہے۔ یہ اتحاد کا ضد ہے۔ جتنی چیز دنیوی و دینی اتحاد میں ہے اتنا ہی شر بمقابلہ اس کے اس میں ہے۔ یہ سب کا ہے سے ہوا صرف ذرا سی

غلبت سے ۔ یہ معصیت کی متعدی مضرت کی مثال ہوئی ۔ یہ بھی خواہش نفسانی کا ایک فرد ہے۔

خواہش نفسانی کی ایک اور خرابی سنیئے میرا اور آپ کا جائداد پر مقدمہ ہے ہر شخص کی خواہش ہوئی کہ مجھ کو ہی پورا مل جاوے ۔ بس لڑائی ہو گئی ۔ اگر دونوں یہ کہتے کہ ہمیں کچھ نہیں چاہیئے تو طول کاہے کو کھنچتا ۔ مقدمہ بازی کی نوبت کیوں آتی اور باہمی نفاق اور عداوتیں کیوں پیدا ہوتیں ۔

چنانچہ حدیث شریف میں ایک قصہ ہے (امم سابقہ میں بھی بڑے بڑے اچھے لوگ ہوتے ہیں) ایک شخص نے دوسرے کے ہاتھ ایک مکان بیچا مشتری نے جب دخل لیا تو اس میں ایک گھڑا سونے کا بھرا ہوا پایا ۔ وہ گھڑا لے کر بائع کے پاس آیا کہ لو اپنا گھڑا لے لو ۔ تمہارے مکان میں سے نکلا ہے ۔ اس نے کہا میں تو مکان کی قیمت لے چکا ۔ میرا اس میں کیا ہے ۔ اس نے کہا میں نے تو قیمت مکان کی دی ہے ۔ اس پر عقد ٹھہرا ہے ۔ یہ گھڑا عقد میں شامل نہیں میں کیسے لے لوں ۔ ایمانداری اسے کہتے ہیں ۔ اگر آج کل گھڑا نکل آئے ، تو مزہ آجائے ۔

کانپور میں دو آدمیوں نے کہیں سن لیا تھا کہ شب برات میں جو کچھ دعا مانگی جائے وہ قبول ہوتی ہے ۔ شب برات کو دونوں ایک مٹی کا بڑا ڈھیلا لے کر بیٹھے اور اس پر ایک رومال ڈھانک دیا اور دعا مانگنی شروع کی کہ یا اللہ یہ مٹی سونا ہو جائے ۔ تمام رات جاگے اور اسی دعا میں رہے ۔ جوں جوں صبح قریب ہوتی تھی اشتیاق بڑھتا جاتا تھا کہ اب یہ سونے کا ہو جائے گا ۔ بمشکل صبح پکڑی

اور جلدی سے اُس کو کھولا، دیکھا تو وہی مٹی۔ ساری آرزوئیں خاک ہو گئیں اور دل مرگیا کہ شب قدر بھی خالی گئی جس پر بڑا اعتماد تھا۔ طرح طرح کے شیطانی خیال دل میں آئے کہ دُعا کو ویسے بھی سنا کرتے تھے کہ قبول ہوتی ہے اور آج تو شب قدر تھی۔ اسی تردد میں بیٹھے تھے خیریت ہوئی کہ بندۂ خدا ایک درزی آگیا۔ یہ کچھ اہل علم کی صحبت پائے ہوئے تھا۔ اُس نے پوچھا، کیسے سُست ہو۔ اُنہوں نے سارا قصہ بیان کیا۔ کہا بھائی شکر کرو۔ اسی میں کچھ حکمت ہوگی ایک ذرا سی بات تو مجھے معلوم ہوتی ہے کہ اللہ میاں تمہارے بدخواہ نہیں ہیں تم نے تو یہ سمجھا کہ مٹی سونا بننے میں تمہارا نفع ہے مگر تھا نقصان۔ ابھی جب صبح تم نے ڈھیلے کو کھولا اگر وہ سونے کا نکلتا تو تم دونوں میں لڑائی تو ابھی ہوتی پھر جانے کہاں تک طول کھینچتا۔ ممکن ہے کہ ڈھیلا کسی تیسرے کا ہو جاتا اور تم دونوں میں لڑائی مفت میں بندھ جاتی۔ آدمی سمجھ دار تھے دونوں کی تسکین ہوگئی موہوم سونے کے لئے تو اتنی محنت کی کہیں سونے کا گھڑا نظر پڑ جاتے تو جانے کیا ہو۔ اُن کو دیکھئے کہ گھڑا مالک مکان کو دینے آیا اور مالک کو دیکھئے کہ لینے سے انکار کر دیا۔ وہ لوگ ایسے تھے۔

ایثار کی نادر مثال

صحابہ کا ایک قصہ کتاب میں آتا ہے کہ ایک غزوے میں بہت سے آدمی شہید ہوئے۔ چند آدمی نزع کی حالت میں تھے۔ موت کے وقت تشنگی کا غلبہ ہوتا ہے۔ ایک شخص نے آواز دی کہ کوئی میرے حلق میں ذرا سا پانی ڈال دے تو بڑا کام کرے ایک بندۂ خدا کا سر میں پانی لے کر پہنچے اور چاہتے تھے کہ ان کے

منہ میں ڈالیں کہ اسنتے میں ایک طرف سے اور آواز آئی کہ ذرا سا پانی کوئی پلاتا اُنہوں نے پڑے پڑے کہا کہ پہلے اُن کو پلاؤ، پھر مجھے پلانا۔ یہ شخص پیالہ لے کر اُن کے پاس پہنچے۔ پلانا ہی چاہتے تھے کہ اسی طرح اور ایک آواز آئی۔ غرض مقتل میں چھ سات جگہ اسی طرح پانی لئے پھرے اور سب یہی کہتے رہے کہ پہلے میرے بھائی کو پلاؤ۔ اخیر میں جن کے پاس پہنچے اُن کو پلانے کی نوبت نہ آئی تھی کہ دم آخر ہو گیا۔ یہ شخص واپس ہوئے اور پہلوں کے پاس پانی لائے جس کو دیکھا دم آخر ہو چکا ہے۔ ایک نے بھی پانی نہ پیا اور پیالہ بھرا ہوا لے کر چلے آئے۔ ایثار اس کو کہتے ہیں۔

پانی وہ چیز ہے کہ سفر حج میں دیکھا ہے کہ باپ بیٹے کو پیاس میں چھوڑ دیتے ہیں۔ موت کے وقت کی پیاس کا کیا حال ہوگا۔

انباع ہوا

غرض ہم میں جو بجائے ایثار کے کشا کشی اور نزاع وجدال ہے اس کی وجہ ہی اتباع ہوا ہے۔ یہی باہم اتفاق نہیں ہونے دیتا آج کل سب نے یاد کر لیا ہے، اتفاق اتفاق۔ یہ خبر نہیں کہ اتفاق کاہے سے ہوتا ہے۔ اتفاق ہوتا ہے خواہش نفسانی کو روکنے سے۔ دو شخصوں میں جب جھگڑا ہوگا کسی ایسی چیز پر ہوگا کہ ہر ایک ان میں سے اس کی خواہش رکھتا ہوگا اگر وہ دونوں اپنی خواہش کو روک لیں اور اس چیز کی طلب چھوڑ دیں تو پھر جھگڑا کیسا اور نا اتفاقی کہاں۔ اتفاق اتفاق کہتے رہتے اور نفس کو روکتے نہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے۔

غرض جملہ شروں کی جڑ اگر ہے تو خواہش نفسانی ہی ہے۔ خواہش نفسانی

روکنے کی چیز ہے۔ دیکھئے اگر روکا نہ جائے نفس کو تو کیا انجام ہوتا ہے۔ اس نکتہ کو سب ہی نے سمجھا حتیٰ کہ حکام میں سے ان لوگوں نے جن کو مذہب سے علاقہ بھی نہیں۔ حاکم کیا کرتا ہے بعض افعال سے روکتا ہے اور بعض کی اجازت دیتا ہے۔ جن افعال سے روکتا ہے وہ وہی تو ہیں جن کو لوگ کرنا چاہتے ہیں مگر اس کے نزدیک باعث مضرت ہیں۔ معلوم ہوا کہ دنیاوی مصلحتوں کا مقتضا بھی یہی ہے کہ ہر شخص کو اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت نہ دی جائے اگر حاکم ان افعال سے نہ روکے تو دیکھئے کیا ہو۔ ڈاکوؤں کو ڈاکہ ڈالنے دے، چوروں کو چوری کرنے دے، زبردستوں پر زبردستوں کو ظلم کرنے دے، غرض ہر شخص کو مخلےٰ بالطبع کر دے کہ اپنی خواہش کے موافق جو چاہو کرو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس حالت میں کس لطف سے زندگی بسر ہوگی۔

قانون کیا ہے ملک کے افعال کی ایک حد قائم کرنے والی چیز ہے یا کوئی اور۔ جو کوئی حد سے گزرے اس کو جزاء سزا ہوتی ہے۔ جب اس کرنے میں کچھ برائی سمجھی گئی ہے تب ہی تو اس پر جزا اور سزا ہے۔ سب کو مخلےٰ بالطبع کیوں نہ چھوڑ دیا گیا۔ فرض کیجئے کسی کو روپیہ کی ضرورت ہے یا ضرورت نہیں بھی ہے یوں ہی کسی سے چھیننے کو جی چاہتا ہے تو اس کو کیوں منع کرتے ہو اور اگر چھین لے تو چالان کیوں ہوتا ہے۔ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے ضرورت ہے یا میرے جی کو کیوں مارتے ہو۔ خواہش پوری کرنے دو۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اجازت دینے میں کوئی ایسی مضرت ہے کہ اس کے مقابلے میں ضرورت کا بھی خیال نہیں کیا جا سکتا۔

محبتِ الٰہی اور مصلحتِ دنیوی

دنیاوی انتظاموں کو بھی دیکھ کر یہ بات صاف نکلتی ہے کہ خواہش نفسانی روکنے ہی کی چیز ہے۔ اگر خواہش نفسانی روکنے کی چیز نہیں ہے تو اپنے گھروں بی بی کو کیوں روکتے ہو۔ اس کو تو طرح طرح سے سمجھاتے ہو زیادہ زیور فضول ہے پوشاک میں زیادہ تکلف سے کیا فائدہ مگر اپنے نفس کو نہیں روکتے۔ اگر آزادی ہی پسند ہے تو بی بی کو بھی آزادی دو جس طرح چاہے خرچ کرے اور اگر آزادی میں نقصان ہے تو جس طرح بی بی کو بے فائدہ کاموں سے روکتے ہو اپنے نفس کو بھی پابند کرو۔ مگر دونوں کے آزاد ہونے کو تو کوئی پسند نہ کرے گا تو لامحالہ دوسری ہی شق رہ گئی کہ دونوں پابند ہوں۔ پابندی وہ چیز ہے کہ کسی کو اس سے چارہ نہیں۔ فرق اتنا ہے کہ جو عقلمند ہیں بالاختیار کرتے ہیں اور کم عقل جبراً اور قہراً پابند بنا دیئے جاتے ہیں۔ آپ نفس کو بالکل آزاد کسی طرح نہیں کر سکتے اگر قانون خداوندی سے آزاد کر دیا اور اللہ میاں نے دنیا میں کچھ نہ کہا، تو قانون دنیاوی پابند بنانے کے لئے موجود ہے اور دست بدست سزا تیار ہے۔ بہت سی خواہشیں ہیں کہ قانون کی وجہ سے چھوڑ دینی پڑتی ہیں کیونکہ ان پر عمل کرنے سے سزا ہوتی ہے۔

اے مسلمانو! قانون کی وجہ سے تم نے خواہش نفسانی کو چھوڑ دیا اور اللہ رسولؐ کے حکم سے نہیں چھوڑتے۔ کیا غضب کی بات ہے۔ اگر قانوناً ممانعت ہو جائے تو ایک بھی حیلہ باقی نہ رہے اور اللہ میاں اگر کسی کام کی ممانعت کریں تو اس میں حیلے نکالے جائیں اور ایسی ایسی تاویلیں کی جائیں کہ تاویل کے

مرتبہ سے نکل کر تحریف تک پہنچ جائیں اور اگر بالکل ہی صریح حکم ہو تو اس کا مقابلہ ضرورت سے کیا جاتا ہے کہ حکم تو یہی تھا مگر اب ضرورت ہے قانون کے مقابلہ میں یہ ضرورتیں کہاں چلی جاتی ہیں۔ افسوس محبت الٰہی مصلحت دنیوی کے برابر بھی نہ ہوئی ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود　　گوئے گشتن بہر او اولٰے بود

ایک مردار عورت اگر کہے رات بھر کھڑے رہو تو کھڑے رہیں اور اللہ میاں کے حکم سے عشا کی نماز بھی بھاری ہے۔

اتباع حق کی ضرورت

ایک شخص کا قصہ ہے (یہ ایک بزرگ ہیں۔ پہلے حالت ایسی ہی تھی بعدہٗ بڑے شخص ہو گئے ہیں) ایک عورت سے تعشق تھا۔ بڑی تمناؤں کے بعد ایک دن کہیں شام کو بات کرنے کا موقع مل گیا اور صورت یہ تھی کہ کھڑکی کے نیچے بات کرنے کھڑے ہوئے تھے۔ ایسے محو ہوئے کہ تمام رات اسی طرح گذر گئی۔ عشاء کی نماز بھی فوت ہوئی۔ جب مؤذن نے صبح کی اذان دی تو حضرت کیا کہتے ہیں بھلے مانس تجھے بھی آج ہی عشاء کی اذان سویرے کہنی رہ گئی تھی۔ کسی نے کہا جناب خبر بھی ہے صبح ہو گئی۔ صبح کی اذان ہے۔ منہ پھیر کر دیکھا تو واقعی صبح ہے۔ دل پر اثر ہوا بہت روئے۔ ایک عورت کے خیال میں حق سبحانہٗ تعالیٰ کا فرض قضا ہوا۔ ایک بزرگ کے ہاتھ پر توبہ کی اور اس خیال کو چھوڑا۔ پھر صاحب کمال ہوئے اور سبھی کچھ ہوا۔

ایک عورت کی محبت میں یہ حالت ہوتی ہے۔ غور کریں تو آج کل

احکام الٰہی کی اتنی بھی تو قدر نہیں جتنی کہ ایک کسی کے احکام کی۔ احکام الٰہی خواہ کیسے ہی سہل ہوں اور سراسر مفید اور حکمت ہی حکمت ہوں مگر شاق ہوتے ہیں اگر کبھی اہی احکام کو کہے جن کو اللہ میاں نے فرمایا تو کچھ تکلیف نہ رہے بلکہ اگر کبھی ان احکام کو بھی کہے جو اللہ میاں کے خلاف ہیں تب بھی کچھ شاق نہ ہوں معلوم ہوا کہ احکام فی نفسہ شاق نہیں صرف محبت کی کسر ہے۔ مسلمان کی شان تو یہ تھی کہ اللہ میاں کے سامنے کا تعلم لی بیل اکا تب ہونا اور غیر کے سامنے لوہے اور پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتا۔ انصاف کی بات ہے کہ اللہ میاں کی طرف سے بندہ پر کس قدر انعام و افضال ہر وقت ہوتے ہیں اور غیر اللہ کی طرف سے خاک بھی نہیں ملتا۔ پھر اپنے منعم کے سامنے نرم ہونا چاہیے یا اپنے جیسے عاجز بلکہ دشمن کے سامنے۔ ظاہر ہے کہ منعم ہی کے سامنے ہونا چاہئے ؎

چونکہ بر میخت بہ بندد بستہ باش　　چوں کشاید چابک و برجستہ باش

ہمچو کلکم درمیان اصبعین　　نیستم در صف طاعت بین بین

مسلمان کو اللہ میاں کے سامنے ایسا ہونا چاہیے، جیسے کاتب کی انگلیوں میں قلم کہ اس کو کچھ عذر نہیں۔ کاتب کو اختیار ہے جس طرف چاہے چلائے اور چلائے یا نہ چلائے۔ کیا غضب ہے کہ اللہ میاں کے ہاتھ میں تو ایسے نہ ہوں اور ہوں کس کے ہاتھ میں نفس کے۔ بت پرستی کو منع کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہر شخص کی بغل میں بت ہے۔ ظاہر کی بت پرستی پر تو طرح طرح کے طعن کئے جاتے ہیں اور ان کو احمق بتایا جاتا ہے اور اپنے آپ باطنی بت

پرستی میں مبتلا ہیں اور عقلمندی کا دعوے ہے کسی نے ایک بت کو پوجا کسی نے دوسرے کو۔ کیا فرق ہے لات کو پوجنے والے ہیں اور عزیٰ کو پوجنے والے ہیں۔ جہاں ظاہری بت پرستی چھوڑی ہے باطنی بھی چھوڑ دو۔ اپنی باگ نفس کے ہاتھ میں مت دو۔ حق تعالیٰ اپنے منعم حقیقی کے تصرف میں ہمہ تن اپنے آپ کو دے دو۔ احکام الٰہی کے سامنے سر جھکاؤ۔ اتباع تو وہی ہے کہ آدمی اپنے ارادے کو چھوڑ دے اور دوسرے کے ارادے کے تابع ہو جائے۔ دیکھ لیجئے قانون کے سامنے کیا حال ہوتا ہے کہ اپنی خواہش چھوڑنی پڑتی ہے اور حاکم کے حکم کو ماننا پڑتا ہے۔ اب لوگوں نے حق سبحانہ تعالیٰ کے حکم کا اتباع تو بالکل چھوڑ ہی دیا اوروں ہی کا اتباع اختیار کر لیا۔

اتباع کی چیزیں

اتباع کے کرنے کی دو چیزیں تھیں۔ عقائد اور اعمال اعمال میں تو یہ گنجائش نکالی گئی ہے کہ ہم مجبور ہیں اور یہ احکام مصلحت وقت کے موافق نہیں۔ مگر اب عقائد میں بھی خواہش نفسانی کو ترجیح ہونے لگی ہے۔ اعمال کو پہلے ضروری تو سمجھتے تھے مگر تکلیف سمجھ کر اُن کے ادا میں قصور کرتے تھے۔ اب ان کی ضرورت ہی ذہن سے اڑ گئی۔ ادائے اعمال کو تو چھوڑا تکلیف کی وجہ سے مگر ان کے وجوب کے عقیدہ میں کیا تکلیف تھی۔ ہاں اس میں بھی ایک تکلیف تھی۔ وہ یہ کہ نفس نے دیکھا اگرچہ میں نے ادائے اعمال سے روک دیا مگر تاوقتیکہ ان کے وجوب کا عقیدہ اس کے ذہن میں ہے ممکن ہے کہ پھر کبھی ادا پر مستعد ہو جائے۔ اس وقت پھر مجھے کوئی تدبیر اس کے روکنے کی کرنی پڑے گی اور احتمال ہے کہ رکنے سے نہ رکے۔ اس لئے

اس احتمال کے قطع کرنے اور اپنی بار بار کی تکلیف بچانے کے لئے نفس نے یہ تدبیر نکالی۔ سرے سے ان کے وجوب کا عقیدہ ہی اڑا دینا چاہیئے۔ عقائد اعمال کے لئے بمنزلہ جڑ کے ہیں۔ جڑ کاٹ دینے سے احتمال ہی نہیں رہتا کہ شاخیں پھر ہری ہوں گی۔ عقائد کے بدلنے سے نفس بہت سی تکلیفوں سے بچ گیا۔

ایک صاحب فرمانے لگے کہ دین میں جو کچھ حارج ہے وہ نماز ہے غیر مذہب کے بہت سے آدمی اس وقت اسلام میں آنے کو تیار ہیں مگر یہ خیال مانع ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد نماز پڑھنی ہو گی۔ پانچ وقت کی پابندی سر پڑے گی۔ مولوی لوگ نماز کی قید اٹھا دیں تو آج ہی دیکھئے کتنے کافر مسلمان بنتے ہیں اور مسلمانوں کی جماعت کتنی بڑھ جاتی ہے (نماز ایسی مولویوں کی ہے کہ معاف کر دیں)

ایک صاحب کہتے ہیں سود کی ممانعت سے افلاس آگیا اور قومیں سود ہی کے ذریعہ سے ترقی کر تی جاتی ہیں۔ غرض جو جس کی سمجھ میں آتا ہے احکام الٰہی میں اصلاح دینے کو تیار ہے۔ گویا اللہ میاں کو یہ بات بتائی جاتی ہے کہ ہم سے رائے لے کر کیوں احکام مقرر نہ کئے تھے۔ کثرت رائے پر کیوں فیصلہ نہ کیا۔

ہم لوگوں کا کیا حال ہے۔ عقائد میں یہ حال، اعمال میں یہ حال۔ صورت میں آزادی۔ آمدنی میں حلال حرام کی خبر نہیں۔ زمینداروں نے طرح طرح کے ناجائز ابواب باندھ رکھے ہیں۔ بیع و شرائع میں عقد کے صحت و بطلان کی پروا نہیں۔ آم کی بہار بکتی ہے حالانکہ آم کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ یہ بیع باطل ہے۔ بیع باطل میں

مال مشتری کی ملک نہیں ہوتا۔ اس کا رد واجب ہے۔ بیع کے بعد دیگرے جہاں تک سلسلہ چلا جائے کسی کی ملک نہ ہوگا۔ گناہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ غرض معاملات کی صفائی کی طرف اصلاً خیال نہیں۔

صحیح طریق تعلیم

زبان غیبت میں اور طعن میں مبتلا۔ قلب حرص میں اور طمع میں گرفتار۔ اونٹ سے کسی نے پوچھا، اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ کہا کوئی بھی نہیں۔ ایسی ہی ہم لوگوں کی ہے۔ ظاہر کی طرف دیکھئے وہ ٹھیک نہیں، باطن کی طرف نظر کیجئے وہ درست نہیں حالانکہ حق تعالیٰ نے صرف احکام ہی نازل نہیں کئے بلکہ ایک انسان نبی بھیج کر یہ بھی بتا دیا کہ اس نمونے کے ہو کر آؤ۔

تعلیم کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی شئے کی پیمائش زبانی بتا دی جائے اور کہہ دیا جائے کہ اتنی لانبی اتنی چوڑی اتنی موٹی بنا کر لاؤ۔ اور ایک طریقہ ہے کہ اس کا ناپ تول بتانے کے ساتھ بنا ہوا نمونہ بھی دکھا دیا جائے کہ آخری صورت ایسی پیدا ہونی چاہیئے۔ یہ نہایت ابلغ ہے۔

خوشنویس لکھنے والوں کو بتاتا ہے کہ الف تین نقطہ کا لکھو اور اوپر کی نوک ایسی ہو اور نیچے کی ایسی۔ مگر یہ بتانا کافی نہیں۔ لکھنے والوں کو ہرگز الف بنانا نہیں آسکتا تاوقتیکہ استاد اس کی صورت بھی اپنے ہاتھ سے کھینچ کر نہ دکھائے۔ اگر ہاتھ سے لکھ کر دکھانے کی ضرورت نہ ہوتی تو استاد کے نخرے اٹھانے کی کیا ضرورت رہتی۔ کتابوں میں سب حرفوں کی پیمائش لکھی ہے، اسی کو پڑھ کر خوشنویس بن جاتے حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ سو احکام

ظاہر و باطن کی تحدید کا نام ہے جس سے ظاہر و باطن کی ایک خاص صورت پیدا ہوتی ہے جس طرح کہ تین قطرے سے الف کے طول کی حد قائم ہو اور نصف قطر یا کم و بیش سے اس کے عرض کی انتہا مقرر ہو کر ایک خاص صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ممکن تھا کہ اللہ میاں صرف احکام نازل فرما دیتے جو ظاہر و باطن کی ناپ تول ہیں اور یہ فرما دیتے کہ یہ ناپ تول ہیں۔ ان کو پورا پورا درست کرو یہاں تک کہ وہ صورت پیدا ہو جائے جو ہماری مرضی کے موافق ہو۔ اس وقت معلوم ہوتا کہ ہم لوگ کس قدر حرج میں پڑ جاتے اور کیسی کیسی دقتیں پیش آتیں۔ تمام عمر احکام کی پابندی کرتے اور پھر اطمینان نہ ہوتا کہ وہ صورت پیدا ہو گئی جو حق تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہے۔

مگر نہیں حق سبحانہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ احکام بھی نازل فرمائے اور محض اپنی رحمت سے نمونہ بھی دکھا دیا کہ اصلاً تردد نہ رہے کہ احکام کی پوری پوری تعمیل ہو گئی یا نہیں۔ اپنی صورت کو نمونے سے ملا کر دیکھ لو۔ ذرا سا بھی فرق ہو تو معلوم ہو جائے گا کس حکم کی تعمیل میں کسر رہ گئی۔ مگر اس رحمت کی کیا قدر ہوتی ہم کس قدر نمونہ کے موافق بن کر آئے۔

اگر درزی کو اچکن سینے کو دو اور وہ ساری اچکن بہت ٹھیک اور خوبصورت بدن کے موافق سیئے۔ کہیں جھول تنگ نہ رہے۔ سلائی کہیں ٹیڑھی نہ ہو۔ غرض سب طرح ٹھیک ہو۔ صرف ایک آستین کو چار انگل چھوٹا کر لائے تو کیا آپ اس کو لے لیں گے اور کیا یہ بات اس کی سن لیں گے کہ جناب ساری اچکن تو ٹھیک ہے۔ آستین بھی دو ہیں۔ صرف ایک آستین چار انگل کم رہ گئی تو

کیا ڈر ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ اس اچکن کو آپ اُس کے سر دے ماریں گے اور اگر
اُس نے قصداً ایسا کیا ہے تو قیمت واپس لینے پر بھی اکتفا نہ ہوگا۔ کچھ جرمانہ
بھی لیا جائے گا۔ حالانکہ نمونہ سے صرف چار انگل مخالفت ہے۔

یہاں نمونہ سے چار انگل بھی مطابقت نہیں۔ اللہ میاں کا حکم تھا کہ نمونہ کے
مطابق ہو۔ ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ ما انا
علیہ واصحابی۔

نئی تراش خراش

افسوس مسلمانوں نے ہر بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کے خلاف کیا۔ جو وضع بتائی اُس کے خلاف
وضع تراشی، نکاح نیا تراشا، اخلاق نئے اختیار کئے، اب عقائد میں بھی تراش
خراش ہونے لگی۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ دعویٰ ہے اتباع کا۔ معلوم نہیں کہ
اتباع کس چیز کا نام ہے۔ اگر کوئی ایسے لوگوں کو دیکھے تو کیا کہہ سکتا ہے کہ
یہ قوم اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گروہ سے ہے۔ گروہ میں ہونے کے
لئے کسی بات میں بھی مطابقت نہیں بلکہ جان بوجھ کر مخالفت کی جاتی ہے
اس گروہ میں ہوتا تو کہاں اب تو اس گروہ کے لوگوں سے ملنا بھی نہیں چاہتے
کیونکہ اس گروہ میں ترقی نہیں ہے۔

ایک شخص نے مجھ سے لکھنؤ میں بیان کیا کہ آج کمیٹی ہوئی جس میں ان
اسباب پر بحث کی گئی جو مسلمانوں کو ترقی سے روک رہے ہیں۔ بہت سے
اسباب بیان کئے گئے۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ مذہب مانع ہے ترقی سے
اس کو چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ نوبت پہنچ گئی ہے۔

اس لا متناہی ترقی ہی نے خرابی ڈالی ہے جو کچھ ڈالی ہے۔ کہیں اس ہوس کی انتہا بھی ہو گی۔ حالانکہ یہ ترقی ہرگز اطاعت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی کیونکہ اطاعت میں کچھ نہ کچھ پابندی ضرور کرنی پڑے گی۔ اور یہ ترقی مطلق العنانی کو چاہتی ہے۔ یہ ترقی یہی حاصل کر سکتا ہے کہ نہ یہ دیکھے کہ روپیہ حق سے آیا نہ یہ دیکھے کہ ناحق سے آیا۔ چوری سے وہ نڈر رہے ظلم سے اسے خوف نہ ہو۔ روپیہ حاصل ہو جس طرح ہو۔ حالانکہ قطع نظر خلاف دین ہونے ہے ایسا مال دنیا ہی میں فلاح نہیں دیتا، بلکہ جس راہ سے آیا تھا اسی راہ جاتا ہے۔ اس میں برکت مطلق نہیں ہوتی۔ رشوت کے ہزار اور حلال کے سو برابر ہیں۔

جو غرض ہے روپیہ سے وہ حاصل نہیں ہوتی جیسا کہ بیان کیا گیا، تو اب سوچو اپنے اوپر ایسی چیزیں کیوں لازم کر لیں جن کے لئے کوئی تعداد روپیہ کی کافی نہیں ہوتی اور کسی مرتبہ ترقی پر بس نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چیزیں لازم کس نے کیں۔ اسی ہوائے نفس نے۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے اسی کا علاج بتایا ہے۔ اب میں اس پر بیان کو ختم کرتا ہوں۔

خواہش نفسانی کا علاج

غرض سارا فساد خواہش نفسانی سے ہوا ہے سو علاج کیا ہے کہ نفس کو خواہش سے روکو مرض کا علاج یہی ہوتا ہے کہ اس کے مادہ اور سبب کو قطع کیا جائے جب سبب جاتا رہے گا مرض بھی نہ رہے گا۔ مسلمانو! نفسانی خواہشوں کو چھوڑ دو اور حق سبحانہ تعالیٰ کی اطاعت کرو۔ کیا اللہ میاں کا کچھ حق نہیں ہے آپ لوگوں

پر۔ دیکھئے اللہ میاں ایسے ایسے امراض کا علاج بتاتے ہیں جن کو تم اپنے آپ کسی طرح سمجھ نہ سکتے اور وہ اندر ہی اندر تمہارا کام تمام کر ڈالتے۔ تعجب ہے کہ طب اکبر کی قدر ہو مگر احکام الٰہی کی قدر نہ ہو۔ جانتے ہیں کہ طب اکبر کے خلاف کریں گے تو صحت محفوظ نہ رہے گی اور مرض گھیر لے گا۔ صاحبو! طب اکبر پر عمل کرنے سے صحت جسمانی میں خرابی آتی ہے اور احکام الٰہی پر عمل نہ کرنے سے قلبی اور روحانی صحت برباد ہوتی ہے۔ پھر جو شرف قلب اور روح کو جسم پر ہے وہی اس کی صحت کو اس کی صحت پہ اور اس کے محافظ کو اس کے محافظ پر ہونا چاہئے۔ اس سے سمجھ لیجئے کہ احکام الٰہی کی کیا عظمت ہونی چاہئے۔

اللہ میاں کا بتایا ہوا علاج کس قدر قابل قدر چیز ہے۔ وہ علاج ہے ہوائے نفس کا چھوڑنا ہے۔ اس کا آسان طریق میں بتلائے دیتا ہوں۔ چند روز کرنا پڑے گا۔ بہت ہی تھوڑے دنوں میں انشاء اللہ تعالیٰ نفع معلوم ہوگا۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ ہر کام ابتداءً تکلیف سے ہوتا ہے پھر کرتے کرتے اس میں ملکہ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے۔ سو آپ اس کا التزام کر لیجئے کہ کوئی قول کوئی شغل معاً دل میں آتے ہی نہ کر ڈالا کیجئے کہ وہ خواہش نفس کے موافق ہوگا بلکہ ہر کام سے پہلے ذرا سوچنا چاہئے۔ اس کی عادت ڈالنی چاہئے کہ جو کام کیا جائے پہلے سوچ لیا جائے کہ یہ کام حق تعالیٰ کے خلاف تو نہیں۔ یہ میرے لئے مفید ہے یا مضر۔ بے دھڑک ہو کر کام کرنے کی عادت بالکل چھوڑ دی جائے۔ اوّل اوّل یہ ذرا شاق ہوگا مگر تھوڑے دنوں

میں عادت ہو جائے گی۔ اس کا ہر کام میں خیال رکھو۔ یہ حالت ہو جائے کہ بات منہ سے نکالتی ہے مگر رک گئے کہ حق تعالیٰ کا امر کیا ہے اور نفس کی خواہش کیا ہے۔ جس بات میں نفس کی خواہش پائی اس کو زبان سے نہ نکالا۔ نہ اس پر عمل کیا۔

رہی یہ بات کہ تمیز کیوں کر ہو، حق تعالیٰ کے امر نفس کی خواہش ہیں اس کے لیے علم دین کی ضرورت ہے۔ تھوڑا علم ضرور چاہیے۔ کتاب نہیں پڑھ سکتے ہو تو پوچھ لو۔ چند روز یہی عادت ڈالو۔ اس سے کسی قدر آپ کے بولنے میں کمی ہو گی اور کسی قدر آپ کے کھانے میں کمی ہو گی۔ مگر جس وقت لذت اس کی حاصل ہو گی تو آپ پھر تھوڑے کو بہت پر ترجیح دیں گے۔ تھوڑی چیز ہو اور اچھی ہو وہ بہتر ہے۔ اس سے کہ بری ہو اور بہت ہو غلیظ کتنا ہی ہو ایک چمچہ فیرینی پر اس کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔ جب طاعت میں کسی کو لذت آنے لگتی ہے تو معصیت کی خفارت اُس کے ذہن میں بیٹھ جاتی ہے۔ پھر معصیت کا کرنا اس سے زیادہ دشوار ہونے لگتا ہے جتنا کہ پہلے طاعت کرنا تھا۔ (مسلمان پر طاعت کرنے میں عادی ہونے سے پہلے بھی جو بار ہوتا ہے وہ ایک کلفت ہوتی ہے کہ نیا کام کرنے میں محسوس ہوتی ہے جیسا کہ دیگر امور عادیہ میں تغیر ہونے سے معلوم ہونے لگا کرتے ہیں ورنہ طاعت کو کر کے تو مسلمان کو ہمیشہ نشاط اور فرحت ہی ہوتی ہے) عادی ہو جانے کے بعد تو معصیت سے نفرت ہو جاتی ہے اور اگر احیاناً معصیت ہو بھی گئی تو طبیعت شکست رہتی ہے اور کسی طرح چین نہیں آتا تاوقتیکہ استغفار

نہ کرے۔

طاعت کی لذت

طاعت میں عجیب لذت ہے کہ آدمی لاکھ روپیہ پر ایک نماز کو ترجیح دیتا ہے۔ کوئی بات تو ہے کہ اگر مسلمان سے کہیں کہ لاکھ روپیہ لے لے اور آج ظہر کی نماز نہ پڑھ تو روپیہ نہ لے گا اور ظہر پڑھے گا۔ ضرور کوئی ایسی چیز پاتا ہے کہ لاکھ روپیہ سے زیادہ ہے۔ حالانکہ ہماری نماز کچھ نماز نہیں۔ اوّل سے اخیر تک کوئی رکن بھی قابل اعتبار نہیں۔ نیت نماز کی باندھ رکھی ہے اور دل ادھر اُدھر ہے۔ زبان سے قرأت کر رہے ہیں مگر مطلق خبر نہیں کہ اللہ میاں سے کیا کہہ رہے ہیں۔ خیریت یہ ہے کہ زبان الفاظ پر حاوی ہو گئی۔ آپ ہی آپ قرأت کر لیتی ہے ورنہ باعتبار احکام ظاہری بھی عدم صحت کا فتویٰ دیا جاتا اور اعادہ واجب ہوتا۔ سر سجدہ میں ہے مگر خیال اور ہی کہیں ہے۔ اس حالت پر بھی آدمی لاکھ روپیہ سے زیادہ کوئی چیز اس میں پاتا ہے کہ لاکھ روپیہ پر اس کو ترجیح دیتا ہے اور اگر نماز نماز ہو جائے تو اندازہ کر لیجئے کہ کیا اثر رکھے۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند   صاف گر باشد ندانم چوں کند

واقعی طاعت وہ چیز ہے اگر اس میں ایک لحظہ کا لطف بھی میسر ہو جائے تو آدمی دنیا و مافیہا کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔ خواہش نفسانی کا تو دشمن ہو جائے۔ نفس کے پھندے میں آدمی جب ہی تک آتا ہے جب تک کہ طاعت کی لذت سے واقف نہیں ہوا۔ عادت ڈالئے پھر لذت آنے لگے گی اور کچھ کلفت نہ رہے گی۔ ابتدا میں کسی قدر کلفت ضرور ہوتی ہے

غرض یہ عادت ڈالنی چاہیئے کہ ہر کام کو سوچ کر کرے۔ اگر وہ کام خواہش نفس سے ہو تو نہ کیا۔ اس طرح معصیت چھوٹ جائے گی اور طاعت ہی طاعت رہ جائے گی۔ اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ترک ہوائے نفس کے لئے معین ہے خوف۔ اور یہ ظاہر بھی ہے۔ جس کام سے بھی کوئی باز رہتا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف خوف سے باز رہتا ہے جسمانی سزا کا خوف ہو یا مال کے نقصان کا یا ہم چشموں میں سبکی کا یا جس چیز کا بھی ہو مگر ہوگا خوف ہی۔ ڈاکو ڈاکہ کیوں نہیں ڈالتا، سزا کے خوف سے۔ بچہ شرارت سے کیسے رکتا ہے پٹنے کے خوف سے۔ بہت سے جرائم سے لوگ باز رہتے ہیں جرمانہ کے خوف سے محفل میں آدمی تہذیب سے کیوں بیٹھتا ہے اور خلاف متانت حرکات سے کیوں باز رہتا ہے سبکی کے خوف سے وعلیٰ ہذا۔ خوف ہی تو اٹھ جاتا ہے جو ملک میں امن قائم نہیں رہتا اور غدر ہو جاتا ہے۔ خوف ہی ہے کہ جملہ برائیوں کی جڑ کاٹنے والا ہے۔ خوف ہی ہے کہ جملہ طاعت کا ذریعہ ہے۔

البتہ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ خوف تو ہر مومن کو ہے پھر کیا وجہ کہ ہوائے نفسانی نہیں چھوٹتی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ خوف کا استحضار نہیں! اور استحضار نہ ہونے کی وجہ صرف ایک ہے عذاب کا نہ سوچنا پس نتیجہ اس کے معالجہ یہ سوچنا ہوا۔ اس سے خوف کا غلبہ و استحضار ہوگا جو ترک ہوا کے لئے کافی ہو جاویگا

طاعت کی تدبیر

اب صرف اس کا طریق سہل بتائے دیتا ہوں کہ سوچنا شروع کیجئے اور اس کے لئے ایک

وقت مقرر کیجئے۔ مثلاً سونے کا وقت۔ اس وقت آپ کے کسی دنیا کے کام میں بھی حرج نہ ہوگا۔ دنیا کے لئے تو سارا وقت دیا ہے اللہ میاں کے لئے نکما ہی وقت دو۔ اتنا تو کرو۔ اللہ میاں اس میں تمہارا کام بنا دیں گے۔ وہاں تو بہانہ ڈھونڈتے ہیں کہ بندہ ذرا ادھر کو منہ کرے اور رحمت کے انبار اس پر بکھیر دیں۔ پندرہ بیس منٹ دیر میں سوئے لیٹ کر یا بیٹھ کر یاد کیا کیجئے کہ آج کیا کیا گناہ کئے۔ فہرست گناہ تیار کیجئے۔ پھر دل میں خیال جمائیے۔ گویا میدان قیامت موجود ہے اور میزان کھڑی ہے۔ اپنا مددگار کوئی بھی نہیں۔ دشمن پہرے ہیں۔ حیلہ کوئی چل نہیں سکتا۔ زمین گرم تانبے کی طرح کھول رہی ہے۔ آفتاب سر پر۔ دوزخ سامنے ہے اور ان گناہوں کا حساب ہو رہا ہے۔ کوئی جواب معقول بن نہیں پڑتا۔ یہ سب حالات پیش نظر ہوں گے تو بے اختیار ہاتھ جوڑ کر حاکم کے روبرو معذرت کرے گا کہ بے شک خطاوار ہوں۔ کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر کچھ سہارا ہے تو صرف حضور کے رحم کا۔ اسی کو استغفار کہتے ہیں۔ رات کو یہ کیجئے پھر صبح اٹھ کر یاد رکھئے کہ کل فلاں فلاں گناہ کئے تھے اور رات ان سے استغفار اور عہد کیا ہے۔ سو آج وہ گناہ نہ ہونے پائے۔ اس سے اگر اسی دن تمام گناہ یک لخت نہ چھوٹ جائیں گے تو کمی تو ہو ہی جائے گی۔ اور چند روز میں تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ گناہ رہ سکیں۔ یہ ایسی تدبیر ہے کہ چند ہی روز کرنے سے آدمی معاصی سے بالکل محفوظ ہو جاتا ہے اور دل میں گناہ کے وقت خود ایک ہراس پیدا ہو جاتا ہے۔

پھر اس کے لئے علم کی ضرورت ہوگی کہ معلوم ہو یہ کام معصیت ہے

اور یہ طاعت۔ سو علم دین حاصل کیجئے اور اگر کم فرصتی کا عذر ہے تو چند کتابیں اردو میں منتخب کر دی گئی ہیں۔ ان کو کسی سمجھ دار سے سبقاً سبقاً پڑھ لیجئے۔ رفع ضرورت کے لئے کافی ہے۔ کتابوں کو خود نہ پڑھئے کہ اس سے طبیعت میں پہلے سے جو اشکال ہوتے ہیں وہ حل نہیں ہوتے بلکہ بسا اوقات نئے اشکال پیدا ہو جاتے ہیں اور باعث مضرت ہوتے ہیں۔

حاصل سارے وعظ کا یہ ہوا کہ جنت مطلوب ہے اور اس کا ذریعہ ہے ترک ہوا اور اس کا معین ہے خوف اور اس کا طریق ہے مراقبہ۔ جب مراقبہ کیا خوف پیدا ہوا۔ اس سے خواہش نفسانی چھوٹ گئی۔ اس پر نتیجہ مرتب ہوا۔ فان الجنۃ ھی الماویٰ۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ فہم اور توفیق عمل کی عطا فرماویں۔

اشرف علی!
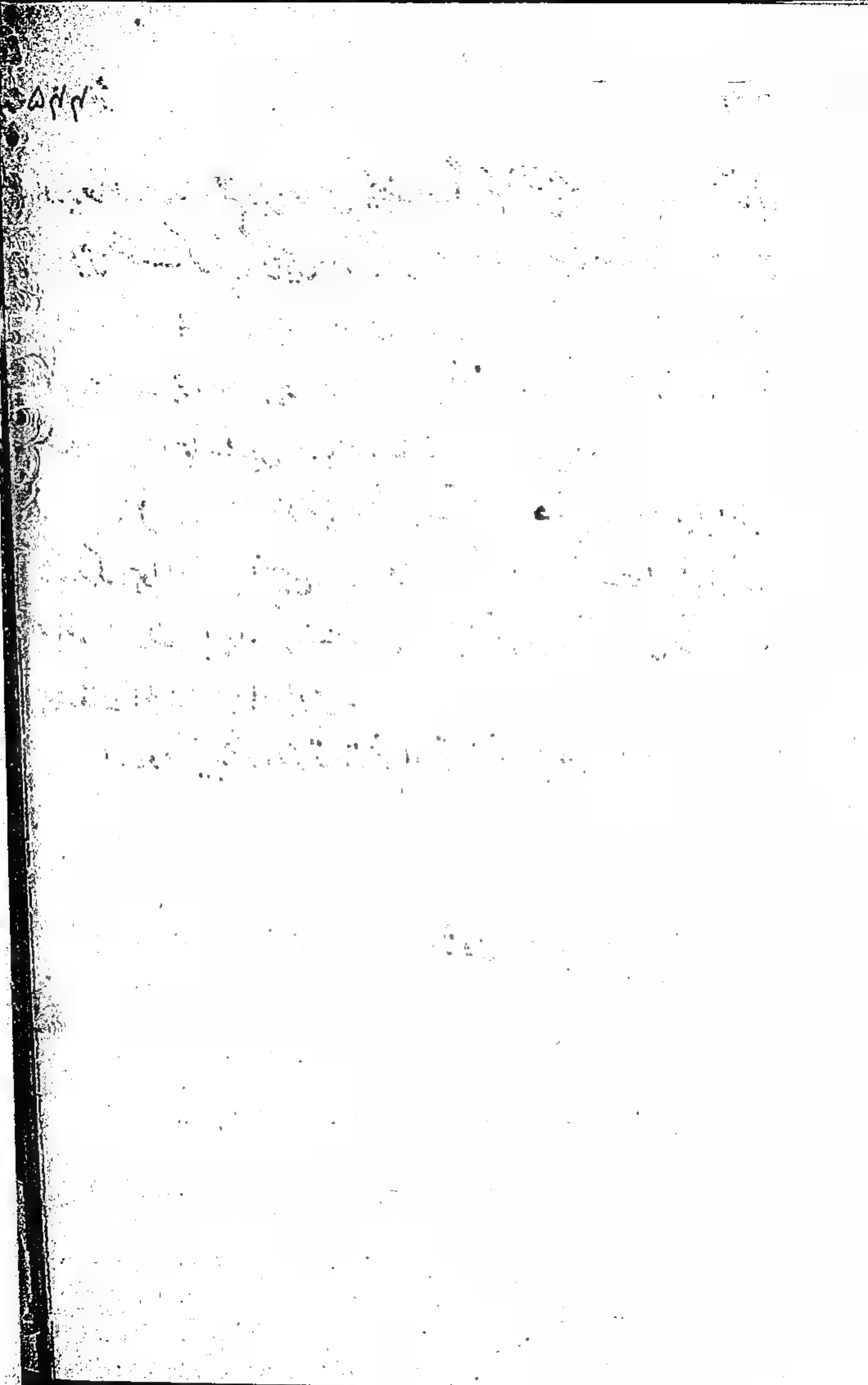
وعظ الحیوٰۃ

آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے کے متعلق یہ وعظ ۱۲ رجب سنہ ۱۳۳۷ھ کو مولوی محمد انوار الحسن صاحب رئیس کاکوری ضلع لکھنؤ کے مکان پر تخت پر بیٹھ کر فرمایا۔ سامعین تخمیناً ایک ہزار مستورات کا مجمع بھی تھا۔ ۴ گھنٹہ میں ختم ہوا۔ حکیم محمد یوسف بجنوری نے قلمبند کیا

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم بل تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا والاٰخرۃ خیر وابقیٰ۔

فلاح کا طریقہ

اس آیت کے اختیار کرنے کی وجہ جیسے یہ ہے کہ اس میں ایک ضروری مضمون مذکور ہے ایسے ہی اختیار کرنے کا معین یہ امر بھی ہے کہ قریب ہی زمانہ ہوا کہ اس کے قبل اس سے پہلے کی آیات کے متعلق بیان ہو چکا ہے چونکہ یہ اسی سلسلہ میں ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس مضمون کو پورا کر دیا جائے۔ اس لئے اس وقت اس آیت کو اختیار کیا گیا۔ حق تعالیٰ نے اس آیت میں ایک ضروری مضمون ارشاد فرمایا ہے اور اس کے قبل بھی ایک ضروری مضمون بیان ہو رہا ہے جو مرتبط اس جملہ سے ہے۔

وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے اس کے قبل فلاح کا طریقہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاح کامل کا طریقہ یہ ہے کہ ایک تو تزکیہ ہو کر اس کو برے عقائد اور اخلاق ذمیمہ سے پاک کرے۔

دوسرے ذکر ہو کہ خدا تعالیٰ کا نام لیا کرے اور ذکر زبان کی عبادت ہے جیسے کہ تزکیہ عقائد فاسدہ اور اخلاق ذمیمہ سے قلب کی عبادت ہے تیسرے صلوٰۃ ہے کہ اس کو مع اس کے حقوق کے ادا کرے کیونکہ نماز کامل وہی ہے جو مع حقوق کے ادا کی جائے۔

غرض تین چیزیں ہیں۔ فلاح کا طریقہ، قلب و نفس کا پاک کرنا اور زبان سے ذکر کرنا اور جوارح سے اعمال کرنا اور اگر زبان کو جوارح سے مانا جائے تو دو چیزیں نکلیں گی۔ ایک قلب و نفس کا پاک کرنا جو باطن کے متعلق ہے۔ دوسرے جوارح کو اعمال ظاہری سے آراستہ کرنا۔ یہ ظاہر کے متعلق ہے خلاصہ یہ کہ ظاہر و باطن دونوں کو درست کرنا یہ ہے فلاح کا طریقہ۔

اس مضمون کا مفصل بیان ہو چکا ہے۔ اس لئے اب بقیہ مضمون جو اس آیت کے اندر مذکور ہے بیان کیا جاتا ہے تاکہ اس مضمون کی تکمیل ہو جائے۔

میں نے یہ آیت تلاوت کی ہے۔ بل تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا بل اس میں اضراب کے واسطے ہے جس کے معنی ہیں اعراض کرنا ایک بات سے دوسری بات کی طرف۔ جیسے یوں کہیں جاء زید بل عمرو۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ زید کی طرف جو نسبت آنے کی تھی اس سے رجوع کر کے نسبت عمرو کی طرف کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فلاح کا طریقہ تو وہ ہے جو بتلایا گیا۔ تمہیں اسی طریقے کو اختیار کرنا چاہیئے تھا۔ اس کے اختیار کرنے سے فلاح حاصل ہوتی مگر اس کو اختیار نہیں کرتے۔ بل تؤثرون حیٰوۃ

الدنیا۔ بلکہ تم اس سے اعراض کر کے اور اس کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہو۔ جس سے فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس میں مدعیان عقل کی غلطی بیان کر رہے ہیں کہ فلاح کا طریقہ وہ ہے جو ہم نے بیان کیا ہے نہ وہ جس کو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ یوں فلاح تو سب کو مطلوب ہے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں مقصود اصلی سب کا یہی ہے باقی اس کے طریقے میں اختلاف ہے۔ مدعیان عقل تو فلاح کا طریقہ اور بتاتے ہیں اور حق تعالیٰ دوسرا طریقہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ اور بتلاتے ہیں کہ اس طریقہ کو اختیار کرو گے تو فلاح ہو گی۔ نہ اس طریقہ سے جس کو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ فلاح تو مطلوب عام ہے یعنی سب اسی کو چاہتے ہیں کسی کو بھی اس میں تردد نہیں مگر اس کے طریقہ تعیین میں غلطی واقع ہوئی ہے

ذکر اللہ اور دنیا

اس آیت میں دو دعوے ہوئے ایک تو یہ کہ تم لوگ ترجیح دے رہے ہو دنیوی زندگی کو آخرت پر۔ دوسرے یہ کہ اس سے فلاح حاصل نہ ہو گی۔ پہلا دعویٰ تو بدیہی بلکہ حسی ہے۔ چنانچہ لوگوں کے معاملات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ شب و روز دنیا ہی میں منہمک اور اسی کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں۔ یہاں تک دین سے بے تعلقی ہے کہ اگر دین کو بھی اختیار کرتے ہیں تو اس میں بھی دنیا کی آمیزش ہوتی ہے حالانکہ مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہیے تھی کہ دنیا میں بھی دین ہی کی شان ہوتی چنانچہ اہل ایمان کی شان کو ایک موقع پر حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ

لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللّٰہ واقام الصلوٰۃ
وایتاء الزکوٰۃ

یعنی ان کی یہ شان ہے کہ تجارت اور بیع ان کو ذکر اللہ سے
غافل نہیں کرتی ــــــــــ!

تجارت تو اس کو کہتے ہیں جو بڑا معاملہ ہو اور بیع چھوٹے اور بڑے
معاملہ دونوں کو شامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ بڑا معاملہ ان کو ذکر اللہ سے
غافل کرتا ہے اور نہ چھوٹا معاملہ غافل کرتا ہے۔ سو یہ شان ہوا کرتی ہے اہل
ایمان کی اور اس پر کچھ تعجب نہ کیجئے کہ ذکر اللہ اور دنیا میں اجتماع کیسے ہو
سکتا ہے کیونکہ اس کے نظائر موجود ہیں۔

مثلاً کسی کو کسی سے محبت ہو جائے اور مدت کے بعد اس کی تمنا
پوری ہو کہ محبوب اُسے ملنے کے لئے بلائے تو وہ چاہے گا کہ ایسا بن کر
جاؤں کہ اُس کے نزدیک بے قدر نہ ہوں۔ آدمیوں کی شکل سے جاؤں کیونکہ
اس میں محبوب کی بے قدری ہے کہ چماروں کی طرح اس کے سامنے چلا جائے
ظاہر ہے کہ جب محبوب کے سامنے انسانیت کی شکل اور آدمیت کے جامہ
میں ہو کر جانا چاہے گا تو اول خط بنوائے گا۔ غسل کرے گا۔ خط بنوا کر پاک
صاف ہو کر اور اچھے کپڑے پہن کر تب اُس کے سامنے جاوے گا پس وہ
صورۃً تو غیر محبوب میں مشغول ہے مگر حقیقتاً محبوب ہی کی یاد میں مشغول ہے
اس واسطے کہ وہ سارے کام محبوب ہی کے واسطے کر رہا ہے۔ جو شخص
ناواقف ہے وہ یوں خیال کرے گا کہ یہ عاشق نہیں ہے اور کہے گا کہ یہ

کیسا عاشق ہے۔ اگر واقعی عاشق ہوتا تو جب محبوب نے بلایا تھا فوراً دوڑ پڑتا ذرا بھی تامل نہ کرتا۔ اس کی کیا حالت ہے کہ محبوب کو چھوڑ کر سنگار میں مصروف ہے۔ اور یوں کہے گا کہ شاید یہ محبوب کو بھول گیا ہے محبوب کا دھیان نہیں رہا۔ اس پر محبت کا غلبہ نہیں۔ لیکن اس بات کو عاشق جانتا ہے کہ وہ ہر حالت میں محبوب ہی کی یاد میں لگا ہوا ہے۔ خط بنوا رہا ہے تو وہ بھی محبوب ہی کے واسطے اور غسل کر رہا ہے تو وہ بھی محبوب ہی کے لئے۔ اور سنگار کر رہا ہے تو وہ بھی محبوب ہی کی خوشی کے واسطے۔ غرض ہر فعل اس کا محبوب ہی کے لئے ہے۔ ہر کام میں اس کی یاد ہے۔ کوئی کام اس کا اپنے نفس کے لئے نہیں۔ اس کا تو کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں کہ جس میں یہ کہہ سکیں کہ یہ شخص محبوب سے غافل ہے۔ گو ظاہر میں وہ ایسے کام کر رہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محبوب سے غافل ہے۔ مگر واقع میں ذرہ برابر بھی اس کو محبوب سے غفلت نہیں ہے۔

جب یہ بات ادنیٰ سے عشق میں ممکن ہے کہ نہ خط بنوانا محبوب کی یاد سے غافل کرتا ہے نہ غسل اور سنگار کرنا غافل بناتا ہے۔ پھر کیا تعجب کی بات ہے کہ حق تعالیٰ کے عاشق کو تجارت اور بیع اُس کی یاد سے غافل کرے خدا تعالیٰ کا عاشق تجارت کرتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے واسطے اور بیع کرتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے واسطے۔ جیسے عاشق مجازی ہر کام محبوب کے تعلق سے کرتا ہے اسی طرح یہ بھی ہر کام محبوب حقیقی کے تعلق سے کرتا ہے۔ یہ کوئی کام اپنے نفس کے لئے کرتا ہی نہیں۔ پس اس کی تو نظیر دنیا میں موجود ہے۔ بہر حال

مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہیے کہ دنیا کا کام کرے تو اس میں بھی دین ہی ملحوظ ہو۔۔۔!

نیت کی اہمیت

ایک حکایت ہے کہ کسی بزرگ کے ایک مرید نے مکان بنوایا تھا۔ جب بن کر تیار ہو گیا تو شیخ کو مکان دکھانے لے گئے۔ اس مکان میں روشندان کھلے ہوئے تھے شیخ نے پوچھا کہ یہ روشندان کس غرض سے رکھے گئے ہیں۔ مرید نے کہا کہ اس واسطے رکھے ہیں کہ مکان میں روشنی آیا کرے۔ یہ سن کہ شیخ نے ایک آہ کھینچی اور کہا کم بخت اگر بنانے کے وقت ہی نیت کر لیتا کہ ان سے اذان کی آواز آیا کرے تو تیرا مقصود تو جب بھی حاصل ہو جاتا کیونکہ روشنی کا آنا تو اس کی نیت کرنے پر موقوف نہیں ہے اور اس کے ساتھ جب تک روشندان باقی رہتے اجر بھی ملتا۔

آخر یہ کیا بات تھی جو یہ بزرگ روشنی کی نیت سے روشن دان بنانے پر خفا ہوئے۔ بات یہ ہے کہ مسلمان کو دنیا میں بھی دین ہی مطلوب ہونا چاہیے واقعی اگر دنیا میں دین مطلوب ہو تو اس سے منافع دنیوی منقطع تھوڑا ہی ہو جاوینگے کہ دنیا کے وہ منافع تو حاصل ہوتے ہی ہیں مگر نیت درست ہونے سے دین کا بھی بھلا ہو جاتا ہے۔

مثلاً نکاح دنیا کا قصہ ہے اور کوئی اسلام کے ساتھ خاص نہیں ہے دین محض تو وہ ہے جو اہل اسلام کے ساتھ مخصوص ہو اور نکاح کافر و مسلم دونوں میں مشترک ہے۔ بظاہر اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف دنیا کا قصہ ہے

مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نیت یہ ہونا چاہیئے کہ اس سے عفت محفوظ رہے اور طبیعت منتشر نہ ہو اور جمعیت خاطر کے ساتھ عبادت ہو سکے۔ اگر اس نیت سے کریگا تو نکاح عبادت ہو جاوے گا۔

اس سے بڑھ کر اور لیجیئے۔ کھانا پینا اور پہننا ہے دنیا ہی کا کام کافر بھی کھاتے پیتے اور پہنتے ہیں۔ اس میں دنیا ہی کا تو نفع ہے مگر اس میں بھی مسلمان کی شان وہ ہونی چاہیے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو یہ نیت رکھنا چاہیئے کہ میں اس لیئے کھاتا پیتا ہوں کہ طاعت پر قوت ہو۔ حق تعالیٰ کی نعمت کا تذکرہ ہو۔ پس اس نیت سے کھانا پینا بھی عبادت ہو جاوے گا اسی طرح سے جتنے دنیوی امور ہیں ان سب میں دین کی نیت ہو سکتی ہے۔

اسی واسطے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ یعنی جو فرائض شرعیہ ہیں نماز روزہ وغیرہ ان کے بعد کسب حلال بھی فرض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس کو فرض فرماتے ہیں تو پھر یہ دین کیسے نہ ہوگا۔

فرض کا تو دین کے اندر سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ دین کے اندر بہت سے درجے ہیں واجب اور سنت اور فرض۔ ان سب میں فرض اعلیٰ درجہ ہے لہٰذا کسب حلال اعلیٰ درجہ کی فرد ہوئی دین کی۔ جب کہ اس میں نیت ہو کہ اہل وعیال کی خدمت کریں گے۔ حقوق کو ادا کریں گے۔

حدیث میں یہاں تک آیا ہے کہ انسان جو بی بی کے پاس جاتا ہے اس سے بھی ثواب ملتا ہے۔ کسی نے کہا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ تو

اپنی خواہش کا پورا کرتا ہے۔ اس پر کیوں ثواب ملتا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ اگر اپنی خواہش کو بے محل صرف کرتا تو گناہ ہوتا یا نہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہاں یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ آپ نے فرمایا تو جب حلال موقع میں صرف کرتا ہے تو ثواب بھی ملنا چاہیئے۔

غرض مسلمان اس بنا پر دنیادار ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے یہ محاورہ چھوڑ دینا چاہیئے کہ ہم دنیا دار ہیں مسلمان تو دیندار ہی ہے۔ مسلمان کی دنیا بھی دین ہی ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ نیت کر کے اس کو دین بنانا چاہیئے

لیجئے اس سے زیادہ کیمیاگر کون ہوگا جس کو تانبے کا سونا بنانے کی ترکیب بتادی گئی ہے۔ متعارف کیمیا میں اوّل تو حکما کا بھی اختلاف ہے کہ تانبے کا سونا بننا ممکن بھی ہے یا نہیں۔ پھر اگر ممکن بھی ہو تو اس کا حاصل ہونا دشوار ہے۔ مگر یہ کیمیا کیسی سستی اور آسان ہے کہ دنیا کا تانبا تھوڑی سی انگوٹھی سے جس کا نام نیت ہے سونا بن جاتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایسی کیمیا عطا فرمائی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم اس سے منتفع نہیں ہوتے ذراسی بات میں ہم دنیا کو دین بنا سکتے ہیں۔

دنیا کی دھن ہماری شان تو یہ ہونی چاہیئے تھی کہ ہر امر میں دین ہی مقصود ہوتا۔ مگر حالت یہ ہے کہ ہم دین کو بھی دنیا بنا رہے ہیں چنانچہ بڑی چیز ہے علم اور عبادت۔ ہم عالم اور عابد ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو اس نیت سے کہ ہماری آبرو اور عزت ہو۔ ہماری طرف لوگوں کا اعتقاد ہو۔ لیجئے اللہ اللہ کرنے والے سب سے بڑے طبقہ میں شمار ہیں جن کو صوفیا

لقب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں بھی کثرت سے وہ لوگ ہیں جن کو کیفیات مقصود ہوتی ہیں۔ کیفیات کیا ہیں اغراض دنیویہ ہی تو ہیں۔ پس عام طور پر یہی حالت ہے کہ دین کو دنیا بنا رکھا ہے۔

بہرحال میں نے یہ تفریع اس پر کی ہے کہ مسلمانوں کو یہ محاورہ چھوڑ دینا چاہیئے کہ ہم دنیا دار ہیں۔ مسلمان تو دنیا دار ہو ہی نہیں سکتا۔ دنیا دار تو اور ہی لوگ ہیں۔ اور یہیں سے اس شعر کے معنی بھی حل ہو گئے کہ

اہل دنیا کافران مطلق اند　　روز و شب در زق زق و در بق بق اند

ظاہراً تو یہ بہت سخت حکم معلوم ہوتا ہے کہ سارے دنیا دار کافر ہیں۔ کیونکہ اکثر مسلمان بھی تو دنیا دار ہیں۔ پس اس سے لازم آتا ہے کہ وہ بھی کافر ہوں۔ مگر ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں جو لوگ سمجھتے ہیں۔ لوگوں نے اس شعر کی ترکیب سمجھنے میں غلطی کی ہے کہ اہل دنیا کو مبتدا اور کافران مطلق کو خبر قرار دیا ہے بلکہ اس کی ترکیب برعکس ہے یعنی کافران مطلق مبتدا مؤخر اور اہل دنیا خبر مقدم ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اہل دنیا کون لوگ ہیں کافر مطلق ہیں۔ اہل دنیا کا مصداق بس کفار ہی ہیں۔ مومن چاہے کیسا ہی ہو وہ حقیقتاً اہل دنیا نہیں۔ اس معنی کا قرینہ خود آگے موجود ہے کہ فرماتے ہیں

ع　روز و شب در زق زق و در بق بق اند

کیونکہ یہ شان تو کفار ہی کی ہے کہ دن رات دنیا کی زق زق اور بق بق میں مبتلا ہیں اور شب و روز دنیا ہی کی ان کو دھن ہے۔ کسی وقت بھی خدا کی یاد اُن کی زبان اور دل میں نہیں آتی۔ چنانچہ تجربہ سے دیکھ لیجئے کہ جب ذکر کرنے بیٹھے

تو تجارت اور دنیا ہی کے جھگڑوں کا ذکر کریں گے۔ ریلوں میں دیکھئے تو یہی دنیا کے قصے لے کر بیٹھیں گے کہ تمہارے یہاں گیہوں کیا بھاؤ ہیں فلاں چیز کا نرخ کیا ہے۔ یہی باتیں ہر وقت زبان پر رہتی ہیں اور اس کے سوا کوئی ذکر ہی نہیں اور مسلمان چاہے کیسا ہی ہو اس کی یہ حالت ہرگز نہیں ہوتی۔ اس کی کوئی نہ کوئی ساعت ایسی ضرور ہوگی کہ جس میں وہ حق سبحانہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوگا۔ مسلمان کبھی نہ کبھی وقت ضرور گھبرائے گا اور خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا۔ اگر زبان سے نہیں تو قلب میں تو ضرور خدا کو یاد کرے گا۔

طاعون میں دیکھئے کیا حالت تھی۔ حق تعالیٰ اور آخرت کی طرف کیسی توجہ تھی۔ اگر مسلمانوں کے دل میں آخرت بسی ہوئی نہیں ہے تو اس کی یاد کیسے ہوتی ہے۔ بہرحال دنیا دار کسی مسلمان کو نہیں کہہ سکتے۔ مسلمان تو اہل دین ہی ہوگا۔

راحت قلب

ہاں اہل دین کے مراتب مختلف ہیں کوئی کم کوئی زیادہ جیسے عربی مدرسہ میں طلبا ہوتے ہیں۔ کوئی میزان پڑھنے والا ہے۔ کوئی مشکوٰۃ پڑھتا ہے، کوئی شمس بازغہ مگر ہیں سب عربی پڑھنے والے۔ پس جتنے اہل اسلام ہیں سب اہل دین ہیں۔ کوئی کم کوئی زیادہ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہیے کہ دنیا کو بھی دین ہی بنائے مگر ایسا کرتے نہیں۔ چنانچہ اپنی حالت کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کام بھی ہم کرتے ہیں اس میں کوئی نہ کوئی آمیزش دنیا کی ہوتی ہے اور اس میں زیادہ مقصود دنیا ہی ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی یہ حالت کر رکھی ہے اور اس کو نتیجہ

لیے ہیں کہ یہی طریقہ ہے فلاح کا۔ جب ہی تو رات دن دنیا میں کھپے ہوئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کسی کو سلطنت حاصل ہو جائے۔ اعلیٰ درجہ کی ترقی ہو کر بادشاہ ہو جائے مگر حقیقت میں جس کا نام کامیابی ہے وہ اس کو بھی میسر نہیں۔ ہاں اللہ والے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو کامیابی میسر ہے۔

میں مختصرا کامیابی کا ذکر کئے دیتا ہوں کہ وہ ہے کیا چیز۔ اوّل مقصود کا تعین ہونا چاہیے کہ مقصود کیا چیز ہے۔ تب معلوم ہوگا کہ وہ کس کو حاصل ہے تو وہ کامیاب ہے اور کس کو نہیں۔ سو وہ مقصود ہیں ایک چیز ہے۔ وہ کیا ہے راحت۔ جو بھی کوشش کرتے ہیں کامیابی کی اس سے مقصود سب کا راحت قلب ہے۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو اب مشاہدہ کر لیجئے۔ بادشاہ کی حالت دیکھ لیجئے۔ اُن کو راحت بھی نصیب ہے یا نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اُن کو راحت میسر نہیں ہے۔

راز اس کا یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مقاصد متعین کر رکھے ہیں جن کے کچھ تو اسباب ہی اختیار میں نہیں اور بعض گو اختیاری تو ہیں مگر ان پر مقاصد کا ترتب یقینی نہیں دکہ جب وہ پائے جائیں تو مقصود بھی ضرور پایا جائے بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اسباب کو جمع کرتے ہیں مگر ثمرہ مرتب نہیں ہوتا سو وہ لوگ چونکہ اپنے خیال میں اوّل ایک ثمرہ متعین کر لیتے ہیں کہ ایسا کرنے سے یہ ثمرہ حاصل ہوگا اور اس کی توقع پر ان اسباب کو مہیا کرتے ہیں اور پھر اکثر اس توقع کے خلاف پیش آتا ہے اور ان کی امید پوری نہیں ہوتی ا اس لئے پریشان ہوتے ہیں۔ کیونکہ پریشانی کا حاصل کیا ہے۔ امید کا پورا نہ ہونا ہیں

جب وہ امید پوری نہیں ہوتی تو قلق ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے ان لوگوں کی پریشانی کی۔ بخلاف اہل دین کے کہ اُن کا اصلی مقصود صرف آخرت ہے۔ سو وہ اُس کے اسباب مہیا کرتے ہیں اور اس کے جتنے اسباب ہیں وہ سب یقینی ہیں کہ ثمرہ کا اُن پر مرتب ہونا لازمی ہے۔ تخلف ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی نماز پڑھے اور خدا تعالیٰ خوش نہ ہوں۔ یا کوئی اسلام لائے اور جنت نہ ملے رہی یہ بات کہ شاید اسلام پر خاتمہ نہ ہونے کی وجہ سے جنت نہ ملے۔ سو یہ اس کے یقینی ہونے کے منافی نہیں۔ کیونکہ منافات اس وقت ہوتی جب کہ اسلام تو پایا جاتا اور پھر جنت نہ ملتی اور اس صورت میں تو اسلام ہی نہ رہتا اور وہ بھی اپنے اختیار سے۔ کیونکہ اسلام اس وقت تک نہیں جاتا جب تک کہ خود ہی اُس کو نہ چھوڑے۔ چونکہ اسباب آخرت پر ثمرہ کا ترتب یقینی ہے اس لئے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اُن کی امید پوری نہ ہو۔ پس اُن کو پریشانی کیوں ہوگی کیونکہ پریشانی کی حقیقت تھی امید کا پورا نہ ہونا اور اس کا یہاں احتمال ہی نہیں اور اگر کسی موقع میں اُن کو دنیا بھی مقصود ہوتی ہے تب بھی اُن کو پریشانی نہیں ہوتی کیونکہ گو اس کے ثمرہ کا تخلف اسباب سے ممکن ہے مگر ان کا مذاق یہ ہے کہ وہ اس پر مصر نہیں ہوتے کہ اسباب پر ثمرہ ضرور ہی مرتب ہو جائے اگر ثمرہ مرتب نہ ہو تو وہ اس پر بھی راضی رہتے ہیں۔

اُن کی حالت یہ ہے کہ وہ جس وقت کسی مریض کا علاج کرتے ہیں تو وہ گو یہ چاہتے ہیں کہ اچھا ہو جائے مگر قلب کو اس کے ساتھ ایسا متعلق نہیں کرتے کہ اگر صحت نہ ہو تو پریشان ہو جائیں۔ اگر صحت نہ بھی ہو تب بھی وہ راضی ہی

رہا کرتے ہیں۔

اہل حال و اہل مقام

اب رہی یہ بات کہ یہ رضا عقلی ہے یا طبعی، تو سمجھ لینا چاہیئے کہ رضا طبعی تو ضروری نہیں۔ البتہ رضا عقلی ضروری ہے۔ ان حضرات کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مریض کی صحت پر بھی راضی ہوتے ہیں اور عدم صحت پر بھی۔ اگر مریض مر بھی جائے تو طبعاً ذرا ایک قسم کا حزن ہوتا ہے مگر عقلاً اس پر بھی راضی ہوتے ہیں اور بعضوں کو طبعاً بھی کچھ اثر نہیں ہوتا چنانچہ بعض اولیاء اللہ کی حکایت سنی ہے اور کتابوں میں موجود ہے کہ وہ اولاد کے مرنے پر ہنس دیئے۔ اُن کو اس میں لذت ہوئی۔

میں نے خود ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ سخت تکلیف میں مبتلا تھے کسی نے پوچھا کہ کیسا مزاج ہے۔ تو اس کو سن کر ہونٹوں پر تبسم تھا اور یوں کہا کہ خدا تعالیٰ کا شکر ہے۔ ہنستے تھے۔ حالانکہ سخت تکلیف میں مبتلا تھے۔

بعض اہل حال کی یہ حالت بھی ہوتی ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا کہ ایسے لوگوں کو اعلیٰ ترقی ہو گئی ہے بلکہ ان سے آگے اور مرتبہ کے لوگ ہیں جو اُن کے مرتبہ کو پہنچ کر اور آگے بڑھ گئے ہیں۔ گو اُن کی ظاہری حالت بڑھی ہوئی نہیں معلوم ہوتی اور عوام اُن کو کچھ نہیں سمجھتے۔

اس کو ایک مثال میں سمجھئے کہ ایک دریائے عظیم الشان ہے اور اُس کے اس کنارے پر ایک شخص ہے۔ اور ایک شخص اس کنارے پر اتر گیا ہے اور ایک تیسرا شخص دریا کے درمیان میں ہے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ زیادہ کامل کون ہے۔ عبور اور عدم عبور کے اعتبار سے مقام کس کا بڑھا ہوا

سے ہے۔ ظاہر ہے کہ جو دریا کو عبور کر گیا ہے وہ بڑھا ہوا ہے اور کامل الیہ ہی ہے جو دوسرے کنارے پہنچ گیا ہے۔ مبتدی کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اس کنارہ پر کھڑا ہے۔ اور اہل حال کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو دریا کے بیچ میں ہے۔ یہ شخص متوسط الحال ہے اور اہل مقام کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دریا سے پار ہو گیا ہے۔ یہ شخص منتہی ہے۔ بظاہر تو مبتدی کی حالت میں اور اس کی حالت میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ دونوں کی حالت یکساں معلوم ہوتی ہے۔ جو شخص ناواقف ہو گا وہ اس شخص کو جو پار اتر گیا ہے اس کنارے والے کی مثال سمجھے گا۔ کیونکہ جیسے یہ کنارہ پر ہے ایسے ہی وہ بھی کنارہ پر ہے اس لئے ممکن ہے کہ اسے یہ گمان ہو کہ وہ اس کنارہ پر آنا چاہتا ہے اور جو شخص واقف ہے اور جانتا ہے کہ وہ دریا سے گزر کر اس جگہ آیا ہے تو وہ اس کو افضل سمجھے گا۔

بس تین قسم کے لوگ ہوئے۔ مبتدی، متوسط، منتہی۔ منتہی کی حالت ظاہر میں مبتدی کے مشابہ ہوتی ہے۔ اس لئے عوام کو دونوں میں امتیاز نہیں ہوتا اور اہل حال کی حالت سے ممتاز۔ اس لئے عوام ان کو بہت بڑا سمجھتے ہیں حالانکہ وہ ابھی درمیان میں ہیں۔ چونکہ منتہی کی حالت مشابہ ہوتی ہے مبتدی کے اس لئے جیسے مبتدی کو بیٹے کے مرنے سے رونا آتا ہے منتہی کو بھی آتا ہے گو کہ اس کے رونے اور اس کے رونے میں زمین آسمان کا فرق ہے مگر ظاہری صورت دونوں کی یکساں ہوتی ہے۔

دیکھئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے صاحبزادہ حضرت ابراہیم

کے انتقال پر روئے اور جب بعض صحابہ نے اس پر تعجب کیا تو فرمایا کہ یہ رونا تو رحمت ہے۔ ترحم اور شفقت سے رونا آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کامل ہوگا اور آپ کی حالت یہ تھی کہ آپ کو صاحبزادہ کے انتقال پر رونا آیا۔ پس معلوم ہوا کہ رونا کمال کے منافی نہیں۔ جو کامل ہوتا ہے اُس کو ایسے واقعات میں ضرور رونا آتا ہے اور یہ شخص صاحب مقام ہوتا ہے۔

البتہ صاحب حال نہیں روتا۔ عوام اہل حال کو کامل سمجھتے ہیں مگر واقع میں کامل وہی شخص ہے جو بیٹے کے مرنے پر روتا ہے۔ بظاہر تو اس کا رونا مبتدی کے مشابہ ہے مگر واقع میں مشابہ نہیں۔ مبتدی کا رونا تو محض داعیہ نفس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ منتہی کا رونا ترحم کی وجہ سے ہوتا ہے اس کے اور اُس کے رونے میں بہت فرق ہے اور صرف رونے ہی میں نہیں بلکہ اس کے اور اُس کے کھانے پینے اور ہر بات میں بہت فرق ہے۔ گو ظاہری صورت دونوں کی یکساں ہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے عوام نے انبیاء کو نہیں پہچانا اور اُن کو ظاہری نظر سے اپنے ہی مثل سمجھے۔ کیونکہ اُن کی ظاہری حالت کوئی ممتاز نہ تھی۔ اسی واسطے تو حضرت ہودؑ کے بارہ میں اُن کی قوم نے کہا تھا۔

ما ھذا الا بشر مثلکم یاکل مما تاکلون منہ ویشرب مما تشربون۔

نہیں ہیں یہ مگر ایک بشر تمہاری مثل۔ وہی کھاتے ہیں جو تم کھاتے

ہو اور وہی پیتے ہیں جو تم پیتے ہو۔

غرض کہ اہل حال کو اہل مقام سے افضل سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ پس اہل حال کی رضا طبعی ہوتی ہے اور اہل مقام کی رضا عقلی۔ رضا ان میں بھی ہوتی ہے مگر وہ طبعی رضا سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ پس یہ درجہ میں اہل حال سے زیادہ ہیں۔

تفویض اور راحت

یہاں ایک شبہ اور ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ جب اہل حال کو رونا نہیں آتا اور اہل مقام کو رونا آتا ہے تو اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل حال طبیعت کی پاکیزگی میں اہل مقام سے بڑھے ہوئے ہیں کہ قضائے حق سے ان کی طبیعت پر بھی ناگواری نہیں ہوتی۔

بات یہ ہے کہ اہل حال کی طبیعت چونکہ حال کے غلبہ کی وجہ سے بالکل مغلوب ہو جاتی ہے اس لئے ان کی طبیعت نہ واقعات کا پورا ادراک کرتی ہے اور نہ ان سے متاثر ہوتی ہے اور اہل مقام پر چونکہ حال کا غلبہ نہیں رہتا اس لئے ان میں امور طبعیہ پھر عود کر آتے ہیں مگر عقلی قوت ان کی طبعی قوت سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لئے بمقتضائے طبع ان کو رونا آتا ہے مگر از جا رفتہ نہیں ہوتے۔ حد کے اندر رہتے ہیں۔ اور جب ان کی طبیعت مغلوب نہیں ہے تو پھر رونا کیوں نہ آوے۔ طبیعت تو اسی واسطے ہے کہ اس کو ادراک ہو اور ادراک نہ ہونا یہ تو اس کا نقص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام واقعات سے متاثر ہوتے ہیں کیونکہ ان کا ادراک کامل ہوتا ہے

پس معلوم ہوا کہ لطافت طبع میں بھی اہل مقام ہی بڑھے ہوئے ہیں کہ اُن پر واقعات کا اثر ہوتا ہے۔ اور اہل حال کی طبع میں چونکہ اس درجہ لطافت نہیں اس لئے اُن پر اثر نہیں ہوتا۔ اہل مقام نے تو دو حق ادا کئے۔ طبیعت کا حق بھی ادا کیا اور وہ یہ کہ اُن کو رونا آیا) اور عقل کا بھی حق ادا کیا (کہ حد سے تجاوز نہیں کیا) اس لئے یہ اہل حال سے زیادہ ہیں۔

بہر حال یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ اُن کو اصرار نہیں ہوتا کسی ثمرہ پر کہ فلاں عمل کا ثمرہ مرتب ہو ہی۔ اگر ثمرہ مرتب نہ بھی ہو تو بھی راضی ہیں۔ البتہ الحاح سے دعا کریں گے کہ یا اللہ ایسا کر دیجئے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ حق تعالیٰ ہی کا ان کو ارشاد ہے۔

ان اللہ یحب الملحین فی الدعاء ۔ کہ اللہ میاں دعا میں ہٹ کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں۔

اس وجہ سے وہ الحاح کے ساتھ دعا کرتے ہیں۔ مگر نہ اس طرح کہ اگر دعا قبول نہ ہو تو وہ ناراض ہوں بلکہ وہ اس وقت بھی راضی ہی رہتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اُن کو ثمرہ پر اصرار نہیں ہوتا۔ ہاں اصرار بایں معنی ہوتا ہے کہ اُن کی حاجت ہے۔ اس کو پیش کرتے ہیں۔ اظہار عبدیت کے لئے حق تعالیٰ کے سامنے مچلتے ہیں کہ ہم ضرور لیں گے۔ جس کی دو وجہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ کی رضا اس میں سمجھتے ہیں۔ دوسرے اس میں عبدیت کا اظہار ہے۔ اس سے وہ اپنی عبدیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ سو اُن کا اصرار اس معنی کر ہے۔

باقی اصرار کی نفی جو کی ہے کہ اُن کو ثمرہ پر اصرار نہیں ہوتا تو وہ اس معنی

کرہے کہ ان کو ثمرہ نہ ملنے سے پریشانی نہیں ہوتی۔ یہ نہیں ہوتا کہ اگر ثمرہ نہ ملے تو وہ ناراض ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شکایتیں پیدا ہونے لگیں کہ سمجھا کچھ تھا اور ہو گیا کچھ۔ اُن کی دعا تو یہ ہوتی ہے کہ ادھر ان کو دعا کے قبول نہ ہونے کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ معاً ہی اُن کے قلب میں یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ خیر یہی ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے واقع ہوا۔ گو کہ ہم اُن کے خلاف کو خیر سمجھے ہوئے تھے۔ بس یہ سمجھ کر وہ اسی پر خوش ہو جاتے ہیں جو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ ایسی حالت نہیں ہوتی جیسی کہ اہل دنیا کی ہوتی ہے کہ کوئی مر جائے تو یہ ارمان کرتے ہیں کہ اگر چار برس اور زندہ رہتا تو لڑکے کی تعلیم پوری ہو جاتی اور یہ کام ہو جاتا اور وہ ہو جاتا۔ یہ ارمان اللہ والوں کو پیدا نہیں ہوتے۔ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ ایسے ارمان سننے کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے کسی سے کفر کا کلمہ سنیں۔ انہیں یہ بات اتنی گراں معلوم ہوتی ہے۔ جیسے کسی نے اُن کے کان میں کفر کا کلمہ ڈال دیا۔ گو مروت کی وجہ سے وہ اس کو ظاہر نہ کریں مگر اُن کو اس سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ میں اس امر کا یقین کیسے دلاؤں۔ اگر کہنے والے کو آپ سچا سمجھیں تو اس کا یقین کر لیجئے۔ اُن کی حالت تو تفویض کی ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنے لئے کچھ تجویز ہی نہیں کرتے کہ بس یہ کام اسی طرح ہو۔

اور اس سے بڑھ کر لیجئے ان حضرات کی تفویض اس قدر کامل ہوتی ہے کہ اگر اس میں راحت معلوم ہوتی ہے تب کہتے ہیں کہ کہیں اس میں نفس کا شائبہ نہ ہو۔ وہ اس کو بھی گوارا نہیں کرتے کہ تفویض راحت کی وجہ سے کی جائے

یہ چاہتے ہیں کہ خالص تفویض ہو اور کسی نفسانی غرض کا شائبہ بھی نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل اللہ میں تفویض ہوتی ہے اور تفویض کے اندر ایک راحت ہوتی ہے۔ کیونکہ جب کوئی شے بھی مقصود نہ رہے گی تو اب جو بھی واقع ہوگا، اُس پہ یہ راضی ہوں گے تو پھر پریشانی کہاں۔ پس تفویض کے اندر بڑی راحت ہے کہ تمام پریشانیوں سے نجات ہو جاتی ہے مگر تفویض سے ان کو راحت بھی مقصود نہیں ہوتی۔ بعض لوگ اس میں غلطی کرتے ہیں وہ یہ کہ ایسی نیت سے خدا تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں کہ اس میں چین ہے (گویا مقصود ان کا تفویض سے چین ہے) ایسے لازم کو ملتزم کر لیتے ہیں (راحت تو تفویض کے لئے لازم ہے۔ یہ نیت کر کے اس کو ملتزم اور مقصود بنا لیتے ہیں) یہ بڑی غلطی ہے۔ محققین اس کو شرک سمجھتے ہیں۔ وہ تو یوں کہتے ہیں کہ تفویض خدا تعالیٰ کا حق ہے۔ پس اس کو محض رضا حق کے لئے کرنا چاہیئے اور یہ شخص اس کو اپنی غرض کے لئے کرتا ہے۔ سو اُس نے حق تعالیٰ کے ساتھ اپنی غرض کو شامل کر لیا۔ یہی شرک ہے۔ اس لئے محققین اس کو بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ ایسی تفویض سے پناہ مانگتے ہیں۔ وہ تو یوں سمجھتے ہیں کہ ہم بندے ہیں اور حق تعالیٰ مالک ہیں۔ ان کے حقوق عظمت میں سے ایک حق تفویض بھی ہے۔ وہ حق عظمت سمجھ کر تفویض کرتے ہیں۔ نہ اس غرض سے کہ راحت ہو۔ وہ تو اگر اس کا شائبہ بھی ہو تو پناہ مانگتے ہیں۔

یہ لوگ کس درجہ کے ہوتے ہیں کہ عبادت کے اندر راحت کی نیت سے بھی بچتے ہیں۔ غرض کہ اصلی نیت تو ان کی خدا تعالیٰ کی عظمت کا حق

ادا کرتا ہے۔ ہاں راحت اُس کو لازم ہوتی ہے مگر وہ اس طرف التفات نہیں کرتے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص دھوپ میں جا رہا ہو اور اُس نے کسی جانور کے سایہ کو زمین پر دیکھا اور وہ اس کو پکڑنا چاہتا ہے۔ اب وہ اُس کے پیچھے دوڑتا ہے مگر ہاتھ نہیں آتا۔ کسی عاقل نے راستے تلائی کہ کم بخت یہ کیوں نہیں کرتا کہ جانور کو پکڑ لے سایہ خود تیرے پاس آجائے گا نادان ہے وہ شخص جو سایہ کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اس کو چاہئے کہ پرند کو پکڑ لے۔ سایہ تو خود اُس کے ساتھ ساتھ ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص پرند کو پکڑے گا وہ سایہ کی طرف التفات نہ کرے گا۔ لیکن سایہ خود اُس کے ساتھ ہو گا۔

تو جیسے اس شخص کے ہاتھ میں پرند ہے اور باوجود سایہ کی طرف التفات نہ ہونے کے سایہ اس کو لازم ہے۔ اسی طرح تفویض کے لئے راحت لازم ہے۔ تفویض کو اختیار کرو۔ اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کا حق عظمت ادا ہو۔ پھر راحت تو خود ہی حاصل ہو جاوے گی۔ نادان ہے وہ شخص جو راحت کی غرض سے تفویض کو اختیار کرے۔ غرض یہ کہ جس شخص میں تفویض ہو اُس کو کسی طرح پریشانی نہیں ہو سکتی۔ دنیا کی پریشانی تو کیا چیز ہے جو اصلی وقت ہے پریشانی کا جس کا نام فزع اکبر ہے اس میں بھی ایسے لوگوں کو پریشانی نہ ہو گی۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لایحزنهم الفزع الاکبر۔ اس دن میں ان لوگوں کو ذرہ برابر رنج نہ ہو گا۔ پھر دنیا کی پریشانی تو کیا چیز ہے وہ تو اُن کے نزدیک

کھیل اور دل لگی ہے پس ایسا شخص دنیا میں کیا رنجیدہ ہوگا۔

نعمتِ دنیا و آخرت

اب میرا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ اہل سلطنت کو بھی راحت نصیب نہیں ہو سکتی۔ کسی جگہ پناہ ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ اگر پناہ ہے تو اس میں ہے جس کو حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب کہ دلوں کو راحت اللہ کے ذکر ہی سے نصیب ہوتی ہے۔

میرے بیان سے معلوم ہو گیا کہ فلاح اور کامیابی کا کون سا طریقہ ہے کامیابی کا وہی طریقہ ہے جو خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے نہ وہ جو ہم لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ اسی واسطے لفظ بل لا کر فرمایا بل تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا کہ جو حقیقۃً طریقہ فلاح ہے اس کو چھوڑ کر تم نے دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے کہ آخرت پر دنیا کو ترجیح دیتے ہو۔ سو یہ طریقہ نہیں فلاح کا بلکہ دوسرا طریقہ ہے۔ پس ہم لوگوں میں جو یہ مرض ہے کہ حیات دنیا کو آخرت پر ترجیح دے رہے ہیں۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی ہے۔ یہ مرض ہمارے اندر عام ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اس وقت اس آیت کو لیا ہے۔ چنانچہ ہر وقت ہمیں یہی فکر ہے کہ کسی طرح سے دنیا ہو۔ مال و دولت بڑھے دنیا کا طرح طرح کا ساز و سامان ہو۔ دن رات اس میں مبتلا ہیں۔ ہماری یہ حالت ہے۔ ع

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

جس وقت دیکھو یہی دھن ہے یہی فکر ہے۔ آگے وجہ شکایت کی بیان فرماتے ہیں۔

والاخرۃ خیر وابقٰی کہ آخرت بہتر اور ابقیٰ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان حیات دنیا کو ترجیح دیتا ہے۔ حالانکہ آخرت بہتر اور باقی تر ہے۔ ترجیح اس کو دینا چاہئے اور زیادت دو قسم کی ہوتی ہے کمًّا اور کیفًا۔ اس لئے خیر سے تو آخرت کا کیفًا زائد ہونا بیان کیا ہے اور ابقیٰ سے کمًّا زائد ہونا مطلب یہ ہے کہ آخرت دنیا سے کمًّا بھی زائد ہے اور کیفًا بھی زائد ہے۔

کمًّا تو اس لئے کہ آخرت چونکہ زمانہ کے اعتبار سے ابقیٰ ہے اور اس کی شان ہے لا تقف عند حدٍ کر وہ غیر محدود ہے کہ اس کی نہایت ہی نہیں اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا کب تک رہے گی ظاہر ہے کہ غیر محدود چیز کا اندازہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے وہ کمًّا زائد ہے اور کیفًا اس لئے زیادہ ہے کہ نعمائے آخرت اور نعمائے دنیا میں لذت وغیرہ کے لحاظ سے بھی کوئی نسبت نہیں۔ حاصل یہ کہ آخرت دونوں اعتبار سے بڑھی ہوئی ہے مگر تم پھر بھی دنیا کو ترجیح دے رہے ہو۔ یہ وجہ ہے شکایت کی۔

ترجیح دنیا کی مذمت

اس مضمون کو سن کر لوگوں کو یہ شبہ ہوا کرتا ہے کہ مولوی بھی عجیب ہیں کہ دنیا کو چھڑانا چاہتے ہیں۔ ایک تو مسلمان مفلس ہیں ہی سواری ان کے پاس نہیں۔ گھر ان کے پاس نہیں۔ یہ اور بھی تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ مثل مشہور ہے مرتے کو مارے شاہ مدار

پر چاہتے ہیں کہ اور بھی مفلس ہو جائیں۔ میں نے اس وجہ سے بھی اس مضمون کو اختیار کیا ہے تاکہ یہ بتلادوں کہ شارع علیہ السلام کا مقصود کیا ہے۔ آیا دنیا کا چھوڑانا مقصود ہے یا کچھ اور مقصود ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو اس مقام پر تؤثرون ارشاد فرمایا تطلبون یا تکسبون ارشاد نہیں فرمایا۔ یعنی یہ نہیں فرمایا بل تطلبون الحیٰوۃ الدنیا کہ تم حیات دنیا کو طلب کرتے ہو یا تکسبون الدنیا کہ تم دنیا کماتے ہو بلکہ یہ فرمایا کہ تم ترجیح دیتے ہو حیات دنیا کو۔ سو اور الفاظ کو چھوڑ کر جو تؤثرون فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا چھوڑائی نہیں جاتی۔ دنیا کمانے کو منع نہیں کیا جاتا۔ قرآن شریف میں تو خود ہی ایسا لفظ موجود ہے جس سے اشارہ ہو گیا اس طرف کہ دنیا کا طلب کرنا مذموم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جو مذمت کر رہے ہیں تو دنیا کی ترجیح دینے پر کر رہے ہیں۔ نہ دنیا کی طلب اور اس کی تحصیل پر۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک شخص ہے جس نے جیب میں گنیاں اور پیسے بھر رکھے ہیں۔ سو اس پر تو اس کو ملامت نہ ہو گی کہ پیسوں کو گنیوں کے ساتھ کیوں جمع کر رکھا ہے۔ اب سنئے کہ اس نے یہ کیا کہ جیب میں سے گنیاں تو پھینکنی شروع کر دیں اور اس کی بجائے اور پیسوں کو بھر لیا۔ اس پر اس کو ملامت کی جائے گی۔ پس اس نے جو گنیوں سکے ہوتے ہوئے پیسے حاصل کئے اس پر ملامت نہ ہو گی بلکہ ملامت ایثار پر ہو گی کہ گنیوں کو تو چھوڑا اور پیسوں کو حاصل کیا۔ بس اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ دنیا طلب کرنے اور کمانے پر

ملامت نہ ہو گی۔ بلکہ دین کی گنیوں کے پھینک دینے اور دنیا کے بیسیوں کو اختیار کر لینے پر ملامت ہو گی۔ حق تعالیٰ نے تؤثرون کا لفظ ارشاد فرما کر اس شبہ کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

حاصل یہ کہ دنیا کے ارادہ کرنے کے دو درجہ ہیں۔ ایک ایثار اور ایک محض طلب ایثار جائز نہیں۔ رہی طلب اس میں حرج نہیں۔ اگر دنیا کا طلب کرنا ہی مذموم ہوتا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ کیوں فرماتے کہ

طلب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ — کہ طلب کرنا حلال کا فرض ہے بعد اور فرائض کے۔

دوسرے موقع پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کیسے بلیغ الفاظ سے ارشاد فرمایا ہے۔

حب الدنیا راس کل خطیئۃ — کہ دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی جڑ ہے۔

یوں نہیں فرمایا کہ کسب الدنیا راس کل خطیئۃ کہ دنیا کمانا تمام خطاؤں کی جڑ ہے۔ کسب کا لفظ چھوڑ کر حب کا لفظ اختیار کیا۔ اس کی کیا وجہ؟ اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ حُبِ دنیا اور چیز ہے اور کسب اور چیز۔ اگر کسی کو کسبِ دنیا کی ضرورت پیش آئی اور اس نے اسباب اختیار کر لئے تو کوئی حرج نہیں۔

علامت حُبِ اللہ

مگر ایک شرط ہے کہ اس کی محبت غالب ہو بلکہ محبت حق تعالیٰ ہی کی غالب ہو۔ جس

کی علامت یہ ہے کہ یہ دیکھنا چاہئے کہ تعارض کے وقت یہ شخص کیا کرتا ہے
آیا دین کو ترجیح دیتا ہے یا دنیا کو۔ اگر دین کو ترجیح دیتا ہے تو سمجھا جاویگا
کہ حبِ دین غالب ہے اور اگر دنیا کو ترجیح دیتا ہے تو سمجھا جائے گا کہ
حبِ دنیا غالب ہے۔

(مثلاً کوئی شخص تجارت کرتا ہے اور اس میں کوئی معاملہ خلاف شرع
پیش آیا اور اس کے کرنے سے اُس کو دنیا کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر
شریعت اُس کو منع کرتی ہے تو اب تعارض ہوا دین میں اور دنیا میں۔ اب
اگر اُس نے نفع دنیا پر خاک ڈال دی اور دین کو اختیار کیا تو سمجھا جائیگا
کہ محبتِ الٰہی اس میں غالب ہے۔ اور اگر دنیا کو لے لیا اور شریعت کو
پس پشت ڈال دیا تو سمجھا جائے گا کہ حبِ دنیا غالب ہے۔)

اب اپنی حالت کو دیکھئے کہ جب دنیوی معاملات واقع ہوتے
ہیں تو ہم کیا کرتے ہیں۔ بعض لوگ تو دنیا کو ترجیح دیتے ہیں خواہ آخرت کا
نقصان ہو جائے۔ یوں کہتے ہیں کہ ہم گنہگار ہیں۔ ہم دنیا دار ہیں۔ یہ پرہیز ہم
سے نہیں ہو سکتا۔ بس باتیں بنا کر اور تاویلیں کر کے دنیا کو ترجیح دیتے ہیں،
دین پر یہ علامت ہے اس کی کہ یہ لوگ محب دنیا ہیں۔ گو معتقد دنیا نہیں
معتقد تو دین ہی کے ہیں۔ ورنہ اپنے کو گنہگار کیوں کہتے۔ مگر نرا اعتقاد
اطاعت کے لئے کافی نہیں۔ جب تک محبت نہ ہو۔ اسی کو تو عراقی
کہتے ہیں ؎

ستمارو قند رستردار من نمائی ‌ ‌ ‌ ‌ کہ درانداز و دردیدم نہ و رسم پایش

رہ قلندر کے معنی ہیں رہ محبت۔ رہ قلندر اور رہ پارسائی میں جزو کل کی نسبت ہے نہ یہ کہ رہ قلندر رہ پارسائی کا متباین ہے۔ جیسے آج کل لوگ قلندری اسی کا نام سمجھتے ہیں کہ احکام شریعت سے بالکل آزاد ہو جاوے بس مطلب یہ ہوا کہ رہ قلندر جو جامع ہو محبت اور پارسائی کو وہ مجھ کو دکھا کیونکہ بدون محبت کے صرف رہ پارسائی دور و دراز ہے۔ جب تک محبت نہ ہو پارسائی ہو ہی نہیں سکتی۔ واقعی محبت ایسی چیز ہے۔

دیکھیے بادشاہ کی ایک اطاعت تو ہوتی ہے قانونی کہ قانون کی رو سے جتنا کام ذمہ تھا اس کو پورا کر دیا اور ایک بادشاہ کا عاشق ہے اور وہ محبت کی وجہ سے اطاعت کرتا ہے۔ اس میں اور پہلے شخص میں بڑا فرق ہے سو یہ مطلب ہے اس شعر کا۔ نہ وہ جیسا کہ بعض نے غضب ڈھایا ہے کہ نماز روزہ بالائے طاق اور داڑھی اور مونچھ صفا چٹ کر کے بیٹھ گئے ہیں اور اپنے آپ کو قلندر سمجھتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ اس میں انہدام ہے تمام شریعت کا۔ خلاصہ یہ ہے کہ بدون محبت نرا اعتقاد کافی نہیں تو بس دنیا داروں کو نرا اعتقاد ہے محبت نہیں اور محبت نہ ہو تو پھر طاعت اس قسم کی ہوتی ہے کہ

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند　　　　تو بیرون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا بر آمد　　　　کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

یعنی بدون محبت کے کامل اطاعت نہیں ہوتی اور جس کو محبت ہوگی وہ طاعت میں تو کیا کمی کرے گا وہ تو مصائب سے بھی نہ گھبرائے گا۔ کوئی مصیبت اس کو پریشان نہیں کر سکتی۔ اس کی تو یہ حالت ہوگی جیسے کہ عراقی

کہتے ہیں ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

یعنی وہ عبادت سے تو کیا گھبراتا وہ تو ہلاکت سے بھی نہیں گھبراتا۔ سو یہ کا ہے کا اثر ہے۔ محبت ہی کا تو ہے۔ پس طریق محبت ایسی چیز ہے اور چونکہ ان لوگوں کو آخرت کی محبت نہیں ہے اس لئے دنیا کو ترجیح دیتے ہیں آخرت پر۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت بل تؤثرون۔ الخ میں ترجیح کی مذمت ہے اور جہاں دنیا کے ارادہ پر مذمت آئی ہے تو اس سے مراد خاص ارادہ ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا ما نشاء لمن نرید ثم جعلنا لہ جھنم۔

یعنی جو دنیا کا ارادہ کرتا ہے تو ہم اس کو جس قدر چاہیں دے دیتے ہیں۔ پھر ہم اس کا ٹھکانا جہنم کو بناتے ہیں۔

اس آیت میں مطلق ارادہ مراد نہیں بلکہ ارادہ خاص مراد ہے کیونکہ آگے فرماتے ہیں۔ ومن اراد الاٰخرۃ الایہ۔ پس معلوم ہوا کہ وہ ارادۂ دنیا ہے جو مقابل ہے من اراد الاخرۃ کے۔ یعنی جس میں ارادۂ آخرت نہ ہو۔ پس ارادہ دنیا کی دو صورتیں ہوئیں۔ ایک وہ ارادۂ دنیا جس کے ساتھ لم یرد الاخرۃ ہو۔ پس اس آیت میں پہلا ارادہ مراد ہے۔ ایک اور موقع پر ہے

من کان یرید حرث الاخرۃ نزدلہ فی حرثہ ومن کان یرید حرث الدنیا نؤتہ منھا ومالہ فی الاخرۃ من نصیب۔

یہاں بھی یہی معنی ہیں کہ من کان یرید حرث الدنیا ولم یرد حرث الاخرۃ۔ تقابل قرینہ ہے اس کا۔ اگر کسی مقام پر قرینہ مذکور ہو تو اس کو بھی اس آیت سے مقید کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک موقع پر ارشاد ہے۔

من کان یرید الحیٰوۃ الدنیا وزینتھا نوف الیھم اعمالھم فیھا وھم فیھا لا یبخسون اولئک الذین لیس لھم فی الاخرۃ الا النار وحبط ما صنعوا فیھا وبٰطل ما کانوا یعملون۔

گو کہ یہاں لفظوں میں تقابل نہیں مگر اس کو بھی دوسری آیت کی وجہ سے مقید کریں گے کہ مراد یہ ہے من کان یرید الحیٰوۃ الدنیا وزینتھا ولم یرد الاخرۃ۔ پس یہ معلوم ہو گیا کہ دنیا کو دین پر ترجیح دینا مذموم ہے اور کسب دنیا مذموم نہیں۔ سو جن صاحبوں کا یہ گمان ہے کہ مولوی دنیا ہی کو چھوڑانا چاہتے ہیں میرے بیان سے اُن کے خیال کا غلط ہونا ثابت ہو گیا۔

میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ دنیا کے ہم اتنے معتقد ہیں کہ معترض بھی اتنے معتقد نہیں۔ آپ تو دنیا کو جائز ہی کہہ رہے ہیں اور ہم اس کو ضروری کہتے ہیں۔ لہذا ہم آپ سے دنیا کے زیادہ معتقد ہوئے۔ مگر ضروری ہونے کے ساتھ دوسرا مسئلہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ

کہ ضروری چیز بقدر ضرورت اختیار کی جاتی ہے۔ سو دنیا ہے ضرورت کی چیز مگر بقدر ضرورت ہی اس کو اختیار کرنا چاہیئے۔ بس بقدر ضرورت اس کو حاصل کر لو۔ اس کو کون منع کرتا ہے اور زینت میں کوئی ضرورت ہے نہیں اس لئے وہ قابل ترک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ طالب ہیں زینت کے تو وہ دنیا کو ضرورت سے زیادہ چاہ رہے ہیں جو قاعدہ مذکورہ کی بنا پر قابل ترک ہے۔ آیت میں بھی وزینتھا کا لفظ جو بڑھایا ہے اس سے بھی اس کا مذموم ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس پر وعید فرمائی ہے۔

بس طلب کے دو درجے ہوئے ایک طلب بقدر ضرورت یعنی دنیا کی طلب اس قدر جس سے ضرورت رفع ہو جاوے اور ایک طلب زینت یعنی دنیا کی طلب اس قدر جو ضرورت سے زائد ہو۔ سو اوّل کی مذمت نہیں، ثانی کی مذمت ہے کیونکہ اصلی مقصود رفع ضرورت ہے۔ اب جو دنیا اس کے لئے حاصل کی جائے گی وہ مقصود بالغیر ہوگی اور جو اس سے آگے بڑھیگا تو وہ مطلوب بالذات ہوگی اور دنیا کو مطلوب بالذات بنانا ہی قابل مذمت ہے۔

اعمال کی حقیقت

اس بیان سے ایک اور آیت کی تفسیر نہایت پاکیزہ ہو گئی۔ قرآن شریف میں اُحد کے واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اس واقعہ میں بعض صحابہ سے لغزش ہو گئی تھی کہ وہ غلطی اجتہادی تھی۔ صحابہ کو اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے۔ یہ گمان نہ کیجئے کہ جیسے ہم لوگ قصداً مخالفت کرتے ہیں، وہ بھی قصداً مخالفت کرتے تھے۔ وہ حضرات حضورؐ کے

سچے محب تھے۔ گو زبان سے محبت کے دعوے زیادہ نہ کرتے تھے مگر ان میں اطاعت کامل درجہ کی تھی۔ اور ہم لوگ زبان سے تو محبت کے بہت دعوے کرتے ہیں مگر ہم میں اطاعت خاک نہیں۔ ہماری اور اُن کی محبت میں یہ فرق ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گرچہ تفسیر زباں روشن گرست　　　لیک عشق بے زباں روشن ترست

عشق زبان کو روشن گر اور عشق بے زبان کو روشن تر فرمارہے ہیں عاشق کامل وہ ہے کہ اپنے دعوئے عشق کو بھی فنا کردے کیونکہ فنا عشق کے لوازم سے ہے۔ محبوب کے سامنے دعوے کو فنا ہی کردینا چاہیے۔ سو محبت وہی ہے جس میں فنا ہو اور دعویٰ نہ ہو۔ صرف دعوے کرنے کا نام تو محبت نہیں۔ آخر اس کی کوئی علامت بھی ہے۔ کیا عشق کی یہ علامت ہے کہ محبوب ایک راستہ پر لے چلے اور یہ دوسرے راستہ پر چلے۔ ہرگز نہیں۔ عاشق تو وہ ہے کہ محبوب کے راستہ پر ہولے۔ پس ہم لوگ جو عشق کا دعوےٰ کرتے ہیں اور حضور کے طریقہ پر نہیں چلتے۔ سو یہ کیسا عشق ہے۔ عاشق کو تو محبوب کے سامنے مٹ جانا چاہیے۔

اس کی تو یہ حالت ہوگی جیسے کہ ایک عابد کی حکایت ہے کہ وہ کسی صومعہ میں رہتے تھے۔ شب و روز عبادت میں مشغول تھے۔ ایک روز آواز آئی کہ تمہاری عبادت قبول نہیں، خواہ کچھ بھی کرو۔ مگر وہ پھر بھی عبادت ہی میں مصروف رہے۔ اُن کے ایک مرید نے کہا کہ تمہیں کیا مصیبت آئی ہے کہ وہ تو رُخ پھیرتے ہیں اور تم اس قدر مشقت اٹھاتے ہو۔ وہ تو خفا

ہیں اور تم پلٹے جاتے ہو۔ آخر غیرت بھی کوئی چیز ہے۔ اس پر وہ رونے لگے اور کہا کہ یہ تو میں جب کروں کہ اور کوئی در ہو کہ اس در کو چھوڑ کر دوسرے در پر چلا جاؤں ؎

توان از کسے دل بپرداختن   کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

اب تو میرا یہ مذہب ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی رضائے تو
جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

خلوص و صدق خالی تھوڑا ہی جاتا ہے۔ بس فوراً آواز آئی ؎

قبول ست گرچہ ہنر نیستت   کہ جز ما پناہے دگر نیستت

جواب بھی دیا اور اس میں ایک چر کہ محبوبانہ بھی لگا دیا کہ گو تم اس قابل تو ہو نہیں مگر خیر آ جاؤ۔ واقعی یہ ہے کہ ہمارے اندر کمال ہی کون سا ہے۔ ہماری کوئی حالت کمال ہو ہی نہیں سکتی۔ ہمارے پاس بڑی چیز اعمال ہیں۔ سو اول تو ان میں ویسے ہی ہزاروں نقصان ہیں۔ پھر اگر کامل بھی ہوتے تو یہ دیکھئے کہ وہ پیدا کہاں سے ہوتے۔ ظاہر ہے کہ قوت ارادیہ سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ ان ہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ ہاتھ پاؤں اور جتنی چیزیں اعمال کے لئے شرط ہیں وہ بھی ان ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔ ہماری ہے ہی کیا چیز!

ان اعمال کی ایسی مثال ہے۔ جیسے ایک شخص ہو کھیت بھی اسی کا، ڈوکر بھی اسی کے، پانی بھی اسی کا، زمین بھی اسی کی، بیج بھی اسی کا، غلہ بھی اسی کا۔ یہاں تک کہ کھیتی پیدا ہوئی۔ اب کوئی دعویٰ کرے کہ کھیتی کا میں مالک ہوں

تو کیا اُن کا یہ دعویٰ صحیح ہوگا۔ مالک یہی کہے گا کہ یہ بتلاؤ کہ تم کون سے قاعدہ سے مالک ہو۔ ظاہر بات ہے کہ غلّہ اسی کی ملک ہے جس کے اسباب ہیں اسی طرح آپ صاحب تب میں ہیں۔ آپکے ہاتھ پاؤں جو بمنزلہ نوکر اور غلام کے ہیں خدا کی ملک ہیں۔ آپ کی قوت ارادیہ حق تعالیٰ کی ملک ہے۔ اس مجموعہ سے جو ثمرہ ہوگا وہ دیکھ لو کس کی ملک ہوگا۔ اگر ہمارے اعمال کامل بھی ہوتے تو اس میں ہمارا کیا کمال ہوا۔ اب اس پر جو انعام ہم کو ملے گا وہ مبادلہ تھوڑا ہی ہوگا مبادلہ کے معنی تو یہ ہیں کہ اُن کی چیز لے لیجئے اور اپنی نادر دے دیجئے اور یہاں اپنا کچھ ہے ہی نہیں پھر مبادلہ کیسا۔ فرمائیے کہ پھر کوئی کیا ناز کر سکتا ہے کہ میں کچھ کر سکتا ہوں۔

عبدیت اور رسالت

اس لئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ کوئی شخص عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائے گا اس پر حضرت عائشہؓ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور آپؐ بھی نہیں یا رسول اللہ؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں بھی عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جاؤں گا۔ ہاں اگر حق تعالیٰ اپنی رحمت میں مجھ کو ڈھانپ لیں اور اس میں یہ بھی تصریح فرما دی کہ میں بھی خدا تعالیٰ کی رحمت کا محتاج ہوں اور آپؐ کا یہ کمال ہے اور جتنا افتقار آپؐ کا خدا تعالیٰ کی طرف ثابت کیا جائے گا اسی قدر آپؐ کی فضیلت ہوگی۔ ایاز کے واسطے یہی فضیلت ہے کہ محمود سے وابستہ رہے اُس کی طرف حاجت مند رہے حتیٰ کہ جتنے کمالات بھی ہیں سب عبدیت کی فرع ہیں۔ بڑا کمال عبدیت ہے اسی لئے جس قدر عبدیت کامل ہوگی اسی قدر رسالت کامل

ہو گی کیونکہ عبدیت کی فرع رسالت ہے نہ کہ رسالت کی فرع عبدیت۔ عبدیت تو فطری ہے اور رسالت اس پر مرتب ہے۔ رسالت سے پہلے بھی آپ میں شان تھی اطاعت اور عبدیت کی۔ آپ خدا تعالیٰ کے ایسے عاشق تھے کہ جس وقت تک کچھ تبلایا بھی نہ گیا تھا اس وقت بھی آپ مطیع تھے۔ اسی عبدیت کاملہ کے صلہ میں آپ کو رسالت ملی تھی۔

عمل اور جنّت

کوئی یہ سن کر کہ اعمال کی وجہ سے حضورؐ جنت میں نہ جائیں گے یہ نہ سمجھ لے کہ حضورؐ کے اعمال میں کچھ نقصان تھا۔ بات یہ ہے کہ عمل کی وجہ سے جنت میں جانا یہ اعلیٰ درجہ نہیں ہے بلکہ رحمت کی وجہ سے جانا ہی اعلیٰ درجہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ثمرہ تابع سبب کے ہوتا ہے۔ اگر سبب ناقص ہے تو ثمرہ بھی ناقص ہوگا۔ اور اگر سبب کامل ہے تو ثمرہ بھی کامل ہوگا۔ جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب سمجھئے کہ عمل عامل کا کتنا ہی بڑا ہو اور کتنا ہی کامل ہو مگر وہ محدود ہی ہوگا۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ خدا کی رحمت کا کتنا ہی حصہ لے لیا جاوے وہ غیر محدود ہی ہوگا۔ غیر متناہی کا نصف بھی غیر محدود ہی ہوگا۔ رحمت حق کا اول تو تجزیہ ہو نہیں سکتا لیکن اگر بالفرض کسی درجہ میں کسی نسبت سے تجزیہ ہو بھی تو وہ بھی غیر متناہی ہوگا کیونکہ اگر اس کو متناہی مانا جاوے تو اس سے مجموعہ کا متناہی ہونا لازم آئے گا کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ مرکب متناہی سے بمراتب متناہیہ متناہی ہوتا ہے۔ بہرحال نصف وغیرہ بھی غیر متناہی کا غیر متناہی ہوتا ہے اور پہلے میں مقدمہ عرض کر چکا ہوں کہ سبب مسبب کے تابع ہوتا ہے (یعنی سبب ناقص

کو ثمرہ بھی ناقص اور سبب کامل تو ثمرہ بھی کامل۔) سو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا درجہ جنت میں اگر آپ کے عمل کی وجہ سے ہوگا، تو متناہی ہوگا۔ کیونکہ عمل متناہی ہے اور اگر رحمت کی وجہ سے ہوگا، تو غیر متناہی ہوگا کیونکہ رحمت غیر متناہی ہے۔ اس لئے رحمت کی وجہ سے جانا ہی اعلیٰ درجہ ہے۔

غرض آپؐ کا عمل محدود تو ہوگا مگر نعوذ باللہ ناقص نہیں پس عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل میں کوئی نقصان ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ آپ سے بڑھ کر کسی کا بھی عمل نہیں۔ حضور کے اعمال ہر طرح کامل ہیں مگر چونکہ رحمت حق کی وجہ سے جنت میں جانا اعلیٰ درجہ ہے۔ اس لئے آپ کے اعمال کو سبب نہیں بتایا گیا دخول جنت کا۔ بلکہ اعمال تو کسی حال میں بھی دخول جنت کا سبب نہیں ہو سکتے، چاہے کیسے ہی کامل ہوں کیونکہ خود اعمال کا کمال بھی تو رحمتِ حق ہی پر مرتب ہے پس جب اعمال کا کمال بھی اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت کا ثمرہ ہوا تو پھر بندہ کا کیا کمال ہوا جس کی وجہ سے وہ جنت میں داخل کیا جاوے۔ پس کسی کو کیا حق ہے کہ اپنے اعمال پر ناز کرے۔

خیال تو فرمائیے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کتنا بڑا درجہ ہے مگر پھر بھی آپؐ یوں فرما رہے ہیں کہ میں بھی جنت میں اپنے اعمال سے نہ جاؤں گا تو پھر ہمارا کیا منہ ہے کہ چار دن نماز پڑھ کر یہ سمجھنے لگیں کہ ہم جنت کے مستحق ہو گئے۔

خلاصہ یہ کہ بندہ کے اندر کوئی کمال نہیں ہو سکتا اگر اعمال بھی کامل ہوں

تب بھی بندہ کا کوئی کمال نہیں کیونکہ وہ اعمال بھی خدا تعالیٰ ہی کی رحمت پر مرتب ہیں۔ اسی واسطے حدیث میں ہے۔

لولا اللہ ما اھتدینا   کہ اگر اللہ میاں رحمت نہ فرماتے تو ہم ہدایت نہ پاتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر خدا تعالیٰ کی رحمت نہ ہوتی تو نہ نماز کی توفیق ہوتی نہ روزہ کی۔ ہم ہیں ہی کیا چیز۔ جب یہ ہے تو ہم اس عمل پر کیا ناز کر سکتے ہیں۔ بس رحمت ہی ہے کہ ہمیں عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ یہ مضمون تو استطراداً بیان ہو گیا۔

محبت اور اطاعت

اصل میں بیان یہ ہو رہا تھا کہ جب ہم حضور کے طریقہ پر نہیں چلتے تو ہمارا کیا منہ ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ کریں۔ بلکہ اگر کسی قدر ہم کو محبت بھی ہے تو وہ آپ ہی کی محبت کا عکس ہے۔ دیکھئے ہماری کوئی رات ایسی نہیں کہ درود شریف پڑھنے میں ختم کی ہو بخلاف حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے کہ ہمارے لئے ساری ساری رات کھڑے رہتے اور ہماری بخشش کی دعا کرتے تھے ہماری محبت کا تو صرف یہ حاصل ہے کہ زبان سے دعویٰ ہے محبت کا اور ایسے نافرمانی کرتے ہیں۔ صحابہؓ کی محبت ایسی نہ تھی۔ وہ زبان سے نہ کہتے تھے مگر کرتے تھے۔ صحابہ کو جب حضورؐ کے ساتھ یہ محبت تھی تو اگر صحابہ سے جنگ اُحد میں لغزش ہو گئی تو ضرور وہ اجتہادی غلطی ہوگی۔ قصداً ہرگز نہ ہوگی واقعہ یہ تھا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے پچاس آدمی تیراندازوں نگہبانی کو

گھاٹی پر مقرر کر دیئے باقی لشکر لڑنے لگا۔ جب ان تیر اندازوں نے فتح اور غلبہ دیکھا
تو چاہا کہ اس جگہ سے چلے آویں اور فتح میں شریک ہوں اور غنیمت لوٹیں۔ ان
کے امیر نے اس سے منع کیا وہ نہ مانے۔ وہاں صرف تھوڑے سے آدمی رہ
گئے۔ پس کافروں کی فوج پیچھے سے آپڑی جس کی وجہ سے مسلمانوں کو شکست ہوئی
اس میں خطا اجتہادی اُن کی یہ تھی کہ وہ لوگ اس مورچہ پر کھڑے رہنے کے حکم
کو اس وقت تک محدود سمجھے کہ جب تک غلبہ نہ ہو۔ جب مسلمانوں کا غلبہ ہوگیا
تو وہاں سے ہٹ گئے۔ اس وجہ سے کہ اب تو غلبہ ہو ہی گیا ہے اب یہاں
کھڑے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ غلطی اجتہادی اُن سے ہوئی۔ خدا تعالیٰ
نے اس قصہ کو بیان کیا ہے اور پھر فرمایا ہے۔ منکم من یرید الدنیا و
منکم من یرید الاخرۃ۔ یہ قرآن کا جملہ ہے اس پر شبہ ہوتا ہے کہ بعض
صحابہ دنیا کے بھی طالب تھے۔ اس کے علماء نے بہت سے جواب دیئے
ہیں۔ مگر سب سے اچھا جواب ابن عطاء اسکندری کا ہے۔

یہ کہ اگر ہم مان بھی لیں کہ بعض صحابہ دنیا کے طالب تھے تو جواب
ہے کہ ارادۂ دنیا مطلقاً مذموم نہیں۔ ارادۂ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ارادہ دنیا
للدنیا اور ایک ارادہ دنیا للآخرت۔ پہلا ارادہ مذموم ہے دوسرا مذموم نہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا جامی کا قصہ ہے کہ وہ خواجہ عبید اللہ احرار کی خدمت
میں بیعت کے ارادہ سے گئے۔ خواجہ صاحب کے پاس بڑی ثروت تھی
مولانا جامی چونکہ طالب تھے اور طالب بیباک ہوا ہی کرتا ہے۔ اس وجہ سے
اُن کی یہ حالت دیکھ کر مولانا جامی نے یہ مصرع پڑھا۔ ع

نہ مرد ست آنکہ دنیا دوست دارد

اور واپس چلے آئے اور مسجد میں آکر سو رہے۔ خواب میں دیکھا کہ میدان حشر برپا ہے۔ اسی حالت میں کسی صاحب معاملہ نے آکر ان کو پکڑ لیا اور کہا دو پیسے لاؤ۔ فلاں معاملہ میں دنیا میں تمہارے ذمہ رہ گئے تھے۔ اب یہ ہر چند پیچھا چھڑاتے ہیں وہ چھوڑتا نہیں۔ اتنے میں دیکھا کہ خواجہ صاحب کی سواری آئی آپ نے فرمایا کہ فقیر کو کیوں تنگ کر رکھا ہے۔ ہم نے جو یہاں خزانہ جمع کیا ہے وہ کس واسطے ہے ان کے ذمہ جتنا مطالبہ ہے اس میں سے ادا کر دو۔ ان کے کہنے سے انہیں رہائی ملی۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو دیکھا خواجہ صاحب کی سواری آرہی ہے۔ اب یہ بہت ہی محجوب ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ وہ مصرعہ تو پڑھو جو تم نے پڑھا تھا۔ اب یہ شرم کے مارے پڑھتے نہیں اصرار کرنے پر پڑھا۔ ع

نہ مرد ست آنکہ دنیا دوست دارد

آپ نے فرمایا کہ ابھی یہ ناتمام ہے۔ اس کے ساتھ یہ اور ہونا چاہیئے

ع اگر دارد برائے دوست دارد

دنیا اگر ہو بھی تو اپنے واسطے نہ ہو دوست کے واسطے ہو۔ ایسی دنیا میں کیا حرج ہے۔ ان حضرات کے پاس جو دنیا ہوتی ہے وہ حق تعالیٰ ہی کے لئے ہوتی ہے۔ انہیں کے حکم سے اس کو اپنے پاس رکھتے ہیں چنانچہ وہ اس میں مالکانہ تصرف نہیں کرتے بلکہ جہاں ان کا حکم ہوتا ہے وہاں صرف کرتے ہیں۔ آپ کچہری میں جا کر دیکھیں۔ وہاں خزانچی کا عہدہ ہے۔ اس کے

سپرد خزانہ کی حفاظت ہے وہ مالک نہیں ۔خزانہ میں سے بلا اجازت لے نہیں سکتا ۔اگر وہ خزانہ کو قفل نہ لگائے اور چوری ہو جائے تو اس پر مقدمہ قائم ہو ۔اسی طرح ان حضرات میں سے بعض کو دنیا کی مال و دولت حق تعالیٰ کی طرف سے سپرد کی جاتی ہے ۔اگر وہ اس کو انتظام سے نہ رکھیں تو حق تعالےٰ ان سے ناراض ہوں اور بعض کو یہ حکم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز اپنے پاس نہ رکھیں ۔اہل اللہ کی شانیں مختلف ہوتی ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است
بہ عندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں است

ہر ایک کے ساتھ حق تعالیٰ کا جدا معاملہ ہے ۔اسی طرح ہر نبی کی شان جُدا ہے ۔کسی کو کسی صفت سے کام لینے کا حکم ہے ۔کسی کو کسی صفت سے کام لینے کا حکم ہے ۔باقی اُن کے اندر تمام صفات ہوتی ہے ۔

کمالاتِ انبیاء آج کل بعض نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں کتاب لکھی ہے اور آپ کو جامع اوصاف کمالات قرار دے کر اُس کو آڑ بنایا ہے دوسرے انبیاء کی توہین کا ۔آپؐ کے تو کمالات ظاہر کئے ہیں اور دوسرے انبیاء پر حملہ کیا ہے ۔اُن کی تنقیص کی ہے لکھتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم میں سیاست تھی حکومت تھی ، ترحم تھا باقی اور انبیاء میں سے کسی میں سیاست نہ تھی ، کسی میں ترحم نہ تھا کسی میں یہ صفت نہ تھی اور کسی میں وہ صفت نہ تھی ۔گویا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی تو اپنے نزدیک مدح کی اور دوسرے انبیاء کی تنقیص کی ۔ان لوگوں کا حضور صلے اللہ علیہ وسلم

کے بھائیوں کے ساتھ یہ معاملہ ہے۔

اس کی مثال تو ایسی ہے کہ ہم باپ کی تو تعظیم کریں اور اس کو راضی کریں اور اس کے بھائی کی توہین کریں۔ تو ایسی مدح سے حضورؐ کب خوش ہو سکتے ہیں۔ اپنے دعوے کی شہادت پیش کی ہے۔ دیکھو نوحؑ میں ترحم نہیں ترحم کا مادہ کم تھا۔ عیسیٰؑ میں سیاست کا مادہ کم تھا۔ درویشانہ زندگی تھی۔ میرے سامنے یہ کتاب[1] لائی گئی۔ کاغذ اس کا نہایت عمدہ سفید قیمتی۔ خط نہایت نفیس پُر رونق۔ ظاہر تو اس کا ایسا اور اندر اس میں یہ خرافات بھری ہے کہ نوحؑ میں ترحم نہ تھا۔ عیسیٰؑ میں سیاست نہ تھی۔ کس قدر بے ادبی ہے انبیاء کی شان میں۔ اے صاحبو! یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان انبیاء میں یہ مادے نہ تھے۔ کیا مادہ کے لئے ظہور بھی لازم ہے۔

اگر ایک شخص کی بابت معلوم ہوا کہ بڑا سخی ہے۔ آپ اس کے پاس گئے۔ اس وقت دیکھا کہ وہ کچھ بھی خرچ نہیں کر رہا تھا۔ بس آپ نے حکم لگا دیا کہ یہ جھوٹ ہے کہ وہ بڑا سخی ہے۔ اس کو یہی کہا جاوے گا کہ جس وقت آپ گئے ظہور کا موقع نہ ہوگا۔ ظہور سخاوت کے موقع پر جا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا سخی ہے۔

ایسے ہی انبیاء میں سب کمالات موجود ہوتے ہیں مگر خدا تعالیٰ جس کے ظہور کا حکم فرماتے ہیں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ نوحؑ تو ایسے رحیم تھے کہ

---

[1] سیرۃ النبیؐ اس کا نام ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کی تصنیف ہے۔

نو سو پچاس برس تک قوم کے ہاتھ سے مصائب اٹھاتے رہے ہیں مگر بددُعا نہیں کی۔ اس سے زیادہ اور کیا ترحم ہوگا۔ کیا نظیر ہو سکتی ہے اس ترحم کی۔ پھر بددعا اُس وقت فرمائی جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آ گیا۔

انہ لن یومن من قومک الا من قد امن۔ کہ تمہاری قوم میں سے اب کوئی اور ایمان نہیں لائے گا۔

معلوم ہوا کہ اُن میں دونوں مشینیں تھیں۔ نو سو پچاس برس تک ترحم کی مشین چلائی اُس کے بعد حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ دوسری مشین کو بھی چلا دو اب جدھر اللہ تعالیٰ اُدھر وہ۔ دیکھو تو نوح میں ترحم کیسا تھا کہ نو سو پچاس برس تک قوم کی تکلیف پر صبر کیا اور بددُعا نہیں کی۔

ایک حضرت عیسیٰؑ مصنف صاحب کے تختۂ مشق بنے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بس وہ تو فقیر اور صوفی تھے۔ اُن میں تمدن اور سیاست کہاں تھی۔ اُن کی تو یہ تعلیم تھی کہ اگر کوئی ایک کلہ پر طمانچہ مارے تو دوسرا سامنے کردو۔ مصنف صاحب نے حضرت عیسیٰ کا یہ حق ادا کیا ہے۔

اوّل تو میں کہتا ہوں کہ مصنف صاحب مدعی ہیں اُن کے ذمہ دلیل ہے اور کیا دلیل ہے اس کی کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا۔ عدم ظہور سے تو عدم وجود لازم نہیں آتا۔ دوسرے حدیث سے ثابت ہے کہ آخیر زمانہ میں حضرت عیسیٰؑ سلطنت کریں گے۔ اُن کے سامنے ساری سلطنتیں مٹ جائیں گی۔ سارے عالم کا انتظام اُن کی مٹھی میں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب تک سیاست کا مادہ نہ ہو یہ باتیں اُن سے کیسے ہو سکتی ہیں۔ کون کہہ سکتا

ہے کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا۔

حضرت یہ حالت ہو رہی ہے جو جس کے جی میں آتا ہے لکھ مارتا ہے خوب سمجھ لیجئے کہ انبیاء میں سارے کمالات ہوتے ہیں مگر جس مادہ سے کام لینے کا حکم ہوتا ہے اسی کو کام میں لاتے ہیں۔

شانِ اولیاء

اسی طرح اولیاء اللہ کی حالت ہے۔ ہر ایک کی جدا شان ہوتی ہے جیسے دنیا کے عہدے ہیں۔ کوئی اہل قلم میں سے ہے اور کسی کو اہل سیف میں سے کیا ہے۔ اسی طرح اولیاء اللہ میں شانیں مختلف رکھی ہیں۔ کسی کو غریب اور کسی امیر بنا یا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہوتی ہے بعض اولیاء اللہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا دسترخوان بہت وسیع ہوتا تھا اور بعض تنگ دست ہوتے ہیں۔ ہر زمانہ میں ہر شان کے بزرگ پیدا کر دیتے ہیں اگر مختلف شانیں نہ ہوں تو کام نہ چلے۔

راز اس کا یہ ہے کہ طالبین مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے لئے اس کے مناسب حال شیخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی نسبت مجھ سے کہا کہ وہاں تو کچھ قدر نہیں ہوتی۔ ایسا پیر بتلاؤ جہاں قدر ہو۔ وہاں تو جا کر غلامی کرنی پڑتی ہے۔ سو طالب اس شان کے بھی ہوتے ہیں۔ اگر سارے بزرگ ایسی ہی شان کے ہوں تو بتلایئے ایسا شخص کہاں جاتے۔ اس لئے ضرورت ہے مختلف قسم کے بزرگوں کی۔ یہ تو خدا تعالیٰ کا باغ ہے۔ اس میں ہر قسم کے پھول ہیں۔ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست

کسی کو کسی سے مناسبت ہے اور کسی کو کسی سے۔ کسی کی گردن ایسی جگہ جھکتی ہے جہاں شان و شوکت ہو، اس لئے ایسے مشائخ کی بھی ضرورت ہے،
چنانچہ آج کل اکثر مشائخ کے یہاں بہت نرمی کی جاتی ہے اور میرے یہاں گو سختی کی جاتی ہے پس جس کو جو نسا مذاق پسند ہوتا ہے وہ وہاں چلا جاتا ہے
ایک شخص ایک بزرگ کی نسبت کہتے تھے کہ کیا اچھی شان ہے کہ ان کے یہاں کھانے کو خوب ملتا ہے۔ ایک شخص ایک بزرگ کی نسبت کہتے تھے کہ اگر ان کے یہاں لوگوں کا کھانا وغیرہ ہوتا تو میں ان کے یہاں کبھی نہ آتا۔ بس یہ سمجھتا کہ لوگ پیٹ کی خاطر یہاں آن پڑے ہیں۔
غرض کہ اہل اللہ مختلف رنگ کے ہوتے ہیں۔ کسی کے اندر امارت کی شان

لہ اسی طرح دوسرے مشائخ کے یہاں نہ بیعت میں تنگی ہے نہ مریدین کے افعال پر گرفت ہے نہ معمولات اور قواعد معین ہیں اور حضرت الا کے یہاں یہ سب باتیں ہیں اور ان کی ضرورت بھی ہے بعض طبائع کو یہ باتیں ناگوار ہوتی ہیں اور وہ اس کو سختی سمجھتے ہیں اور ناقدری خیال کرتے ہیں حالانکہ ان باتوں میں راحت ہی راحت ہے اور خانقاہ کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را با کسے کارے نباشد

ان امور کی قدر وہی جان سکتا ہے جس نے وہاں رہ کر دیکھا ہو۔ ان باتوں کے جو فوائد ہیں وہ بیان میں نہیں آ سکتے مشاہدہ کے متعلق ہیں

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۵۸۹)

ہوتی ہے اور کسی کے اندر فقر کا رنگ ہوتا ہے۔ بس اصل مشترک یہ ہے کہ غناء ہو تو وہ خدا تعالیٰ کے لئے اور فقر ہو تو وہ خدا تعالیٰ کے لئے۔

حضرت سلیمان اور سلطنت

حضرت سلیمان کے بارہ میں ارشاد ہوا۔ ھذا عطاؤنا فامنن او امسك بغیر حساب۔ یہ ہماری عطا ہے چاہے کسی کو دیجئے یا نہ دیجئے۔ آپ سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ آپ مواخذہ کے خوف سے جاہ و ثروت اور سلطنت سے گھبراتے تھے۔ اس پر یہ ارشاد ہوا۔ ھذا عطاؤنا ـــ الخ کہ تم سلطنت سے گھبراؤ نہیں۔ تم سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ آپ کو سلطنت دینے میں خدا تعالیٰ کی حکمت تھی۔ وہ یہ کہ اس وقت میں بڑے بڑے متکبرین اور جابر بادشاہ تھے ان کی گردنیں پست کرنے کے لئے آپ کو ایسی سلطنت دی کہ سب کی گردنیں پست ہوگئیں۔ سب کے دعوے کو توڑ دیا۔ سلطنت تو آپ کا معجزہ تھا۔ سو دیکھئے آپ کے ساتھ یہ برتاؤ تھا کہ آپ تو سلطنت سے گھبراتے تھے اور ادھر سے دلاسا دے دے کر سرکی جاتی تھی۔ بس جس کے لئے جو مناسب ہوتا ہے اس میں اس کو مقید کر دیتے ہیں۔

بہر حال دنیا اگر حد کے اندر ہو تو مذموم نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ارادۂ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ارادۂ دنیا للدنیا اور دوسری ارادۂ دنیا للآخرت۔ تو جو ارادۂ

(بقیہ حاشیہ از ۵۸۸) جب کہ عقل سے بھی کام لیا جائے ورنہ ظاہر میں تو سختی ہی سمجھے گا۔ ۱۲۔ جامع

دنیا آخرت کے لئے ہو اس میں کیا حرج ہے۔

ایمان اور تردد

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے حق تعالیٰ سے دعا مانگی کہ جتنا رزق تمام عمر کے اندر میری قسمت میں لکھا ہے وہ مجھے ایک دم سے مل جاوے۔ اس پر خطاب ہوا کیا ہمارے وعدہ پر وثوق نہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ وثوق تو پورا ہے مگر شیطان پریشان کرتا ہے۔ جب عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہوں تو کہتا ہے کہ تو کھائے گا کہاں سے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ دے گا۔ تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو سچ ہے کہ اللہ دے گا مگر یہ تو معلوم نہیں کہ کب دے گا۔ وہ مجھے پریشان کرتا ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ساری عمر کا ایک دم سے مل جاوے تو اس کو کوٹھڑی میں مقفل کر دوں۔ جب شیطان کہے گا کہاں سے کھائے گا فوراً کہہ دوں گا کہ اس کوٹھڑی کے اندر سے کھاؤں گا۔ بس پھر وہ وسوسہ نہ ڈالے گا۔ وہ بزرگ عقلاً تو غالب تھے شیطان پر لیکن طبعاً غالب نہ تھے۔

اس حکایت کو سن کر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہ کیسے بزرگ تھے کہ ان کو حق تعالیٰ پر اطمینان نہ تھا۔ یہ بات تو بزرگی کے خلاف ہے۔ مخلوق کے وعدہ پر تو ایسا وثوق ہو جاوے کہ وسوسہ بھی نہ آوے اور خدا تعالیٰ کے وعدہ پر اتنا بھی وثوق نہ ہو۔ یہ تعجب کی بات ہے۔ اور یہی شبہ اکثر واعظوں کی زبان پر عام مسلمانوں کے حق میں دائر ہوتا ہے کہ کوئی دعوت کر جاوے تو کیسے بھروسا کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے وعدہ پر ایسا بھروسا نہیں۔ مگر سمجھ لیجئے کہ یہ الزام ہے مسلمانوں پر۔ وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے وقت معین نہیں

ہے اور ابہام میں خاصیت طبعیہ ہے بے اطمینانی نہ کہ بے یقینی اور مخلوق کی طرف سے وقت معین ہوتا ہے اور تعین میں خاصیت طبعیہ ہے اطمینان چنانچہ اگر مخلوق کی طرف سے بھی وقت متعین نہ ہو۔ مثلاً کوئی اس طرح دعوت کرے کہ ہم جب دل چاہے ایک وقت کا کھانا بھیجیں گے تو ان کے وعدہ سے بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ مخلوق کی طرف سے تو اطمینان ہو جاتا ہے اور خدا کی طرف سے نہیں ہوتا۔ یہ کوئی الزام کی بات نہیں۔ یہ تو امر طبعی ہے ہاں اگر حق تعالیٰ کا وعدہ معین ہوتا پھر اگر کوئی یقین نہ کرتا تو الزام تھا۔

پس چونکہ خدا تعالیٰ کے وعدہ میں تین قسم کا ابہام ہے ایک یہ کہ کب ملے گا۔ ایک یہ کہ کس درجہ سے ملے گا۔ زراعت سے یا تجارت سے یا اور کسی طریقہ سے۔ ایک یہ کہ کتنا ملے گا پیٹ بھی بھرے گا یا نہیں چنانچہ کبھی کم ملتا ہے اور کبھی زیادہ ملتا ہے۔ اس واسطے تردد ہوتا ہے کیونکہ طبعی بات ہے کہ ابہام سے تردد ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ حق تعالیٰ پر وثوق نہیں اور یہ تردد ایمان کے منافی نہیں بلکہ کمال ایمان کے بھی منافی نہیں۔

سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کا ایمان ہے۔ وہ سب سے زیادہ کامل الایمان ہیں مگر حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں ہے کہ وہ عرض کرتے ہیں۔ ولکن لیطمئن قلبی۔ آخر لیطمئن کا کیا مطلب ہے خود واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ کو کسی درجہ کا تردد تھا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ میں دیکھ لوں۔ فرمایئے کہ ابراہیمؑ کو کون سا تردد تھا۔ ظاہر بات ہے کہ وہ تردد تو ہو نہیں سکتا جو منافی ایمان ہو۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ مطلق تردد منافی ایمان

سکے نہیں۔ ایک فرد تردد کی وہ بھی ہے جو منافی ایمان نہیں۔ تردد کی بہت سی قسمیں ہیں۔ یہ تردد جو حضرت ابراہیمؑ کو تھا ایمان کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے اوّل تو ابراہیمؑ کی شان ایسی ہے کہ اُن کی نسبت یہ گمان ہو ہی نہیں سکتا کہ ان میں ایسا تردد تھا جو کہ ایمان کے منافی ہے اور پھر قرآن میں اس کی تصریح بھی موجود ہے کہ جب اُن سے کہا گیا کہ اولم تومن کہ کیا تمہارا اس پر ایمان نہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ بلیٰ یعنی ایمان کیوں نہیں۔ میں تو صرف اس لئے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو اطمینان ہو جاوے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین آپ کو پورا تھا، شک ذرا بھی نہ تھا۔ ہاں تردد کا وہ زمانہ تھا جو اطمینان کے مقابل ہے اور وہ منافی ایمان نہیں۔

قرآن اور ترجمہ

اطمینان عربی کا لفظ ہے جس کے معنی سکون ہیں یہ یقین کا مرادف نہیں ہے البتہ اردو میں اطمینان بمعنی یقین مستعمل ہے۔ ممکن ہے کہ قرآن شریف کے کسی ترجمہ میں اطمینان کا لفظ دیکھ کر اس سے دھوکا ہوا ہو۔ اور آج کل تو ایسے ترجمے بھی ہو گئے ہیں کہ ان کے اندر ایسے دقیق فرقوں کا لحاظ نہیں کیا گیا یہی تو وجہ ہے کہ قرآن شریف کے ترجمہ میں بہت علوم جاننے کی ضرورت ہے کہ ہر شخص کو ترجمہ دیکھنا بھی نہ چاہیے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ اس آیت کے متعلق مجھ کو پوچھنا ہے مگر اوّل اس کا ترجمہ کر دیجئے۔ ووجدک ضالاً فھدیٰ وہ سمجھے ہوئے تھے کہ میں ضالاً کا ترجمہ گمراہ کروں گا۔ اور گمراہ فارسی میں تو

عام ہے۔ اس کو بھی جو واقفیت نہ رکھتا ہو اور اُس کو جو واقف ہو کر راہ سے بھٹکا ہو۔ لیکن اردو میں گمراہ اسی کو کہا جاتا ہے جو قصداً راہ سے الگ ہو گیا ہو کسی مترجم نے ضالاً کا ترجمہ لفظ گمراہ سے کر دیا ہے۔ پس اُس کو دیکھ کر دل میں اعتراض آیا ہوگا۔ میں نے کہا سنئے ترجمہ یہ ہے۔ پایا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ناواقف پھر واقف بنا دیا۔ اس کو سُن کر چپکے ہی تو ہو گئے۔

اسی وجہ سے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن میں بہت سے علوم کی ضرورت ہے۔ ترجمہ کے مطالعہ کے لئے صاحب کشاف نے مفسر کے لئے چودہ علوم کی ضرورت لکھی ہے۔ میں نے ایک موقعہ پر (فتح پور کے وعظ میں) ثابت کر دیا تھا کہ اگر نحو نہ جانتا ہوگا تو ترجمہ میں یہ غلطی کرے گا اور فلاں علم سے واقف نہ ہوگا تو یہ غلطی کرے گا۔ خوب واضح طور سے ثابت کر دیا تھا کہ اتنے علوم کی ضرورت ہے قرآن شریف کے ترجمہ کے لئے آج کل ہر شخص اپنے کو مجتہد سمجھتا ہے جیسے کہ لفظ گمراہ ہے۔ اسی طرح لفظ اطمینان بھی ہے یہ اُردو میں تو مرادف ہے ایمان کا مگر عربی میں اس کا مرادف نہیں بلکہ عربی میں اس کے معنی ہیں سکون قلب اور اس کا مقابل ہے تردد یعنی اضطراب قلب یعنی قلب میں حرکت سکون کی قسم کے خلاف ظاہر ہونا۔

وساوس اور اسباب

مطلب یہ ہے کہ اس کا تو یقین ہے کہ آپ زندہ کرنے پر قادر ہیں مگر یہ نہیں معلوم کہ کیسے کریں گے۔ یہ دکھا دیجئے۔ جیسے حضرت زکریا علیہ السلام نے عرض کیا تھا انیٰ یکون لی غلام کہ یہ تو یقینی ہے کہ آپ بیٹا دینے پر قادر ہیں مگر یہ بتلا دیجئے

کہ کس طرح ہوگا۔ آیا ہم میاں بیوی جوان کئے جاویں گے یا اسی حالت میں ہوگا۔ انی استبعاد کے لئے نہیں انی بمعنی کیف یعنی سوال عن الکیفیت کے لئے ہے۔

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ عرض کرتے ہیں۔ رب ارنی کیف تحی الموتی۔ کہ آپ کس کیفیت سے مردوں کو زندہ کریں گے۔ اس کی کوئی نظیر دکھا دیجئے۔ اس پر حکم ہوا۔ فخذ اربعۃ من الطیر ــــ الخ ان کو بلا لو پھر ذبح کرکے خوب ان کا قیمہ کرلو اور چار حصے کرکے چار جگہ رکھ دو۔ پھر ان کو پکارو سب دوڑے چلے آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور پکارا۔ بس سب زندہ ہوکر اُن کی طرف چلے آئے۔ ابراہیمؑ نے اپنی آنکھ سے تماشا دیکھ لیا بس اس سے معلوم ہوگیا کہ مطلق تردد نہ ایمان کے منافی ہے اور نہ کمال ولایت کے۔

یہ سالکین کے کام کی بات ہے اُن کو بعض اوقات وسوسے گھیرتے ہیں تردد پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے سمجھتے ہیں کہ پہلی حالت کی طرف عود ہوگیا ہم مردود ہوگئے۔ یہ غلطی ہے بلکہ بات یہ ہے کہ وساوس کے آنے میں بھی حکمت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ پہلے اطمینان کی حالت پیش آگئی تھی۔ اس وقت ناز ہونے لگا تھا۔ حق تعالیٰ اُن کی اصلاح کیواسطے تردد میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ تردد خطرات وسوا اس مطلق منافی نہیں کمال کے۔ یہ علامت ضعف کی نہیں۔

خیر اُن بزرگ کی حکایت یہ ہوئی کہ اُنہوں نے حق تعالےٰ سے عرض

کیا کہ یا اللہ مجھے ساری عمر کا رزق ایک دفعہ دے دیجئے تاکہ وسواس سے نجات ہو جاوے۔ تو یہ حضرت جمعیت قلب کے لئے اسباب دنیا اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک سال کا وظیفہ عیال کے لئے جمع کر لیتے تھے۔ آپؐ نے ہماری تعلیم کے لئے ایسا کیا۔ آپؐ کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ امت کے ضعف کی رعایت فرمائی۔ اگر آپؐ ایسا نہ کرتے تو امت یوں سمجھتی کہ جائز تو ہے مگر کمال کے خلاف ہے آپؐ نے عمل کر کے بتلا دیا کہ یہ کمال کے بھی خلاف نہیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے مذاق کے خلاف امت کے مذاق کی رعایت فرمائی۔ اگر آپؐ اسباب کو ترک فرما دیتے تو باوجود جائز ہونے کے بھی ذخیرہ رکھتے ہوئے بہت سے متبعین کی طبیعت رکتی ——— کیا ٹھکانا ہے اس شفقت کا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بڑا فصیح ہو اور وہ بچہ کی رعایت کر کے توتلا بولنے لگتا ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ضعف کی رعایت فرمائی۔ اسباب کو اختیار نہ فرماتے تو آپ کا کوئی ضرر نہ تھا۔ بس صرف شفقت تھی جس کی وجہ سے ایسا کیا۔ مگر آپؐ نے اسباب کو ایک حد کے اندر رکھا ہے۔

فضیلتِ آخرت

اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ ہمہ تن اسی کی طرف مصروف ہو جاویں۔ اور ان کو دنیا میں انہماک کا ایک بہانہ ہو جاوے۔ جیسا مشہور ہے کہ ایک

شخص نے کسی سے پوچھا تھا کہ تمہیں قرآن میں کون سا حکم پسند ہے تو کہا کلوا واشربوا کہ کھاؤ اور پیو۔ پھر پوچھا دعا کون سی پسند ہے، تو کہا ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء۔

اسی طرح بہت سے نئے تعلیم یافتوں کو صحابہ میں سے وہی حضرات پسند آئے ہیں جو مالدار تھے جیسے عبدالرحمٰن بن عوفؓ حضرت عثمان غنیؓ جہاں مال جمع کرنے کی مذمت ہوتی ہے تو فوراً کہہ دیتے ہیں کہ مال حاصل کرنا تو اچھی چیز ہے۔ دیکھئے یہ حضرات کیسے مالدار تھے اور جو مالدار نہ تھے وہ ان کو پسند نہیں۔ تو بات کیا ہے وہ اُن کے مذاق کے موافق ہیں اس لئے پسند ہیں۔

غرض یہ کہ ہمارے اندر کثرت سے بل تؤثرون الحیوٰۃ الدنیا کا قصہ ہو گیا ہے خاص کر عورتوں میں۔ میں تو عورتوں سے کہا کرتا ہوں کہ کبھی چوبیس گھنٹے میں کسی وقت تمہیں خدا تعالیٰ بھی یاد آتے ہیں۔ گوٹے پٹھے زیور کی دھن میں دن رات رہتی ہیں۔ یہ حالت ہے کہ آج ایک زیور بنایا ہے۔ کسی عورت کے پاس دوسرے نمونہ کا دیکھ لیا اب اس کو میاں سے ضد کر کے تڑوا رہی ہیں اور دوسرے نمونہ کا بنوا رہی ہیں۔ وہ سمجھاتا بھی ہے مگر ایک سمجھ میں نہیں آتی۔ جب تک بنوا نہ لیں چین ہی نہیں آتا خاوند کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ان میں غالب دنیا کی محبت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کو ترجیح دینا یہ شکایت کی بات ہے نہ کہ دنیا کو طلب کرنا۔ اسی لئے یوں ارشاد فرمایا بل تؤثرون الحیوٰۃ الدنیا

اور یہ نہیں فرمایا۔ بل تطلبون الدنیا۔ آگے فرماتے ہیں والآخرۃ خیر و ابقیٰ یعنی تم دنیا کو ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت خیر بھی ہے اور ابقیٰ بھی اس کو ترجیح دینا چاہیے نہ دنیا کو کیونکہ آخرت دو وجہ سے دنیا پر فضیلت رکھتی ہے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ خیر یعنی بہتر ہے دنیا سے کہ محل اعلیٰ درجہ کے باغ، نہریں بہتی ہوئی جن کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا، نہایت شیریں غرض ہر نعمت اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔

دوسرے اس وجہ سے کہ ابقیٰ ہوگی کہ یہ تمام نعمتیں ہمیشہ کے لئے ہوں گی۔ کبھی زائل نہ ہوں گی۔ تندرستی ایسی کہ کبھی سر میں درد تک نہ ہوگا۔

اگر ایک محل ہو نہایت ہی اچھا کہ جتنی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ وہ سب اس میں پائی جاتی ہیں مگر ہو ایک دن کے لئے تو وہ کچھ بھی نہیں اور ایک مکان ہو عمدہ نفیس اور ہو بھی عمر بھر کے لئے تو وہ بڑی دولت ہے۔ تو آخرت میں دونوں صفت جمع ہیں۔ خیر بھی ہے اور باقی بھی۔ واللہ دنیا اور آخرت میں اتنی نسبت بھی نہیں جتنی ایک قطرہ اور سمندر میں نسبت ہے فانی اور باقی میں نسبت ہی کیا۔

سو حق تعالیٰ نے شکایت اس کی فرمائی ہے کہ آخرت کو تو اختیار نہیں کرتے ہو اور دنیا کو اختیار کرتے ہو۔ یہاں سے فیصلہ ہو گیا اس کا کہ دنیا کے طلب کرنے کی شکایت نہیں بلکہ دنیا کو ترجیح دینے کی شکایت ہے

مومن اور دنیوی متاع

اب میں مخاطبین کو متوجہ کرتا ہوں کہ اپنا اپنا امتحان کر لیجیے۔ جانچ کر دیکھ لیجیے کہ مال و دولت اور دنیوی مشاغل میں آپ سے آخرت ترک ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر ترک ہوتی ہے تو ایسی دنیا قابل احتراز ہے اور اگر ترک نہیں ہوتی تو وہ حال ہے جیسے شیخ شیرازی فرماتے ہیں ؎

گریت مال و زر ہست زرع و تجارت
چو دل با خدا یست خلوت نشینی

غرض دنیا کو قلب میں سے نکال لیجئے، ہاتھ سے دنیا کو نہ نکالئے۔ ہاتھ سے نکالنے کو ہم نہیں کہتے۔ مولانا نے مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

آب در کشتی ہلاک کشتی ست — آب اندر زیر کشتی پشتی است

کیا عجیب مثال ہے۔ پانی اگر کشتی کے نیچے ہو تو اس کے جاری ہونے کا سبب ہے اگر وہ نہ ہو تو چل نہیں سکتی۔ اور جو کشتی کے اندر پہنچ جائے تو ہلاک کر دے۔ مال کی مثال پانی کی سی ہے۔ اگر دل سے باہر رہے تو دین میں معین ہے اور جو دل میں گھس جائے تو باعث ہلاکت ہے۔ مومن کو دنیوی متاع کی بھی ضرورت ہے مگر جب کہ باہر رہے قلب سے۔ اسی کی بابت مولانا فرماتے ہیں ؎

مال را گر بہر دیں باشی حمول — نعم مال صالح گفت آں رسول

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے نعم المال الصالح للرجل الصالح۔ مال سے مدرسہ بنا سکتا ہے، مساکین کی خدمت، طلباء کی اعانت

کر سکتا ہے، حقوق ادا کر سکتا ہے دوسری قوم کے مقابلہ میں اپنی قوم کی اس سے مدد کر سکتا ہے۔ کتنے نفع کی چیز ہے۔ کون کہتا ہے کہ مال مضر ہے البتہ حُبّ مال مضر ہے پس ہاتھ میں رہے قلب میں نہ رہے۔ یہ حالت ہو کہ دل بیار دست بکار۔

حاصل یہ ہوا کہ وہ شخص دنیا دار نہیں جس کے قلب میں تو محبت ہو خدا اور رسولؐ کی اور ہاتھ میں مال رکھتا ہو۔ جس کی علامت یہ ہے کہ اگر لاکھ روپے ملتے ہوں اور دین کا نقصان ہوتا ہو تو وہ دین کے مقابلہ میں لاکھ روپے پہ لات مار دے۔ سو ایسا شخص وہی ہو سکتا ہے کہ جس کے دل سے دنیا کی محبت نکل جائے۔ جب محبت دنیا کی دل سے نکال دے گا تو پھر دنیا دار نہ ہوگا۔

تارک الدنیا اور متروک الدنیا

اب اس مضمون کی تکمیل کی ضرورت ہے کہ دنیا کی محبت دل سے نکالے کیسے تاکہ ہر مسلمان اسی طریقہ کو اختیار کرے۔ جہاں بی، اے۔ ایم، اے کے پاس کرنے کی ضرورت ہے اس دوسرے بی، اے۔ ایم، اے کا بھی سامان کرنا پڑے گا۔ بس ایک پاس اور کرنا ہوگا۔ اگر کوئی کہے کیا فقیر بنا دو گے میں کہتا ہوں کہ آپ فقیر تو اب ہیں۔ اس وقت فقیر نہ ہو گے۔ اب یہ کیفیت ہے کہ مال تو ہے مگر چین نہیں۔ یہ کیا امارت ہے ہم ایسا امیر بنائیں گے کہ الغنی غنی النفس اس وقت حقیقی امیر ہو گے۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غریب تھے۔ آپ کے بارہ

میں جو مسکین کا لفظ آیا ہے اُن کے یہ معنی نہیں جیسے آج کل غریب مسکین ہیں کیا غریب کی یہ شان ہوتی ہے کہ قربانی میں سو اونٹ ذبح کر دے۔ سو سو اونٹ مساکین کو تقسیم کر دے۔ غریب اُسے کہتے ہیں کہ لینے پر مرتا پھرے اور نہ ملے۔ نہ یہ کہ ملتے ہوئے کو چھوڑ دے۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے منجانب حق پوچھا گیا کہ اگر آپ کہیں تو آپ کے لئے احد پہاڑ کو سونا کر دیں اور آپ کے ساتھ ساتھ رہا کرے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے اللہ مجھ کو تو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت ہو تو کھا کر آپ کا شکر بجالاؤں۔ اور جب نہ ہو تو آپ سے مانگوں۔ غریب متروک الدنیا ہوتا ہے آپ تارک الدنیا تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں سلطنت تھی۔ آپ کو سلطنت کے اختیارات تھے۔ سو اس کو غریب نہیں کہتے۔

غرض کہ آپ کو فقیر ہونے کو نہ کہا جاوے گا۔ یہ غلط ہے کہ مال و متاع دنیا کا ترک کرایا جاتا ہے۔ نہیں کمائیے کھائیے۔ ہاں طلب دنیا مذموم طریقہ سے نہ ہو۔

حُبِّ حق

یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ حُبِّ حق آپ کے اندر غالب ہو جہاں سب چیزیں حاصل کی ہیں ایک حُبِّ حق بھی حاصل کر دیں۔ یہ نہیں کہتا کہ حُبِّ حق آپ کے اندر بالکل نہیں آپ میں حُبِّ حق ہے مگر بہت کمزور ہے۔ اس وقت آپ کی ایسی مثال ہے جیسے چراغ میں تیل بھی ہے، بتی بھی ہے، سارا مصالحہ بھی موجود ہے مگر

اُس کو اُبھارنے کی ضرورت ہے۔ ذرا اُبھار دو گے تو روشنی ہو جائے گی
آپ کے پاس کمی نہیں کسی چیز کی۔ آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ کسی اور سے
لینے کی ضرورت نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

یک سبد پُر ناں ترا بر فرق سر　　　　تو ہمی جوئی لب ناں در بدر

سب کچھ ہمارے پاس ہے مگر اُسے بڑھانے کی ضرورت ہے
سو آپ میں حُبِّ حق تو ہے مگر غالب نہیں۔ حبِّ حق کا غلبہ ہونا چاہیئے اسکی
ضرورت ہے۔ شاید آپ یوں خیال کریں کہ تسبیح لینے کو یا مرید ہونے کو
کہے گا۔ میں اس کو نہیں کہتا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ تھوڑی سی مشقت کی ضرورت
ہو گی۔ یہ نہیں کہ تکلیف ہو گی۔ آپ کا کھانا یا سونا چھوڑا یا جائے گا مشقت
بایں معنی ہے کہ نفس ایک بات کو نہیں چاہتا اور یہاں اُس کو کرنا پڑے گا
پس مشقت صرف یہ ہے کہ نفس کے خلاف کرنا ہو گا۔

میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں جس سے اس کام کے اختیار کرنے
میں آسانی ہو گی۔ وہ یہ کہ آپ نے کبھی مسہل لیا ہو گا۔ اگر خود نہ لیا ہو گا تو
دیکھا تو ہو ہی گا۔ طبیب تھوڑے دنوں پرہیز کراتا ہے۔ منضج پلاتا ہے
پھر مسہل دیتا ہے۔ جس دن مسہل دیتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ گھر میں بیٹھے
چلئے پھریئے نہیں۔ مسہل میں نہ باتیں کرو، نہ سنو، نہ سوؤ۔ اگر ایسا کیا تو دست
نہیں آئیں گے۔ بس تم اس تصور میں بیٹھے رہنا کہ اب آیا دست، اب
آیا دست۔ وہ اس قدر پابندی کراتا ہے پھر بھی صحت کے بعد اُس کا
شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اُس سے یہ بھی نہیں کہتے کہ اب مقدمات کا وقت

ہے۔ اب فلاں کام درپیش ہے بلکہ سب چھوڑ چھاڑ کر اُس کے تابع ہو جاتے ہیں اور اُس کی مخالفت نہیں کرتے۔

بس اسی طرح مشائخ مسہل دیتے ہیں۔ تعجب ہے کہ اس مسہل کو تو ضروری سمجھتے ہیں اور اس کو ضروری نہیں سمجھتے۔ طبیب مسہل میں تھوڑی دیر کے لئے مشورہ خلوت کا بھی دیتا ہے۔ اُس کو بجان و دل منظور کرتے ہیں اور اگر شیخ اس کو کہے تو دم نکلتا ہے۔ طبیب تو بڑے بڑے پرہیز کراتا ہے اور یہاں شیخ تھوڑے سے پرہیز کا مشورہ دیتا ہے۔ یعنی معاصی کا پرہیز کراتا ہے۔ مگر اُن کے ساتھ لوگ اُلجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لو جی اتنے دن اپنے پاس رہنے کو ہی بتلا دیا۔ کوئی اتنی فرصت کہاں سے لائے۔ اتنے دنوں کی خلوت اور خاموشی تجویز کر دی۔ کوئی کہاں تک خاموش رہے۔ ان کی تجویزوں پر لوگ الجھتے ہیں اور طبیب کی تجویز پر کوئی نہیں اُلجھتا۔ طبیب کی تجویز پر بھی تو اُلجھنا چاہیئے کہ بس جی ہم باز آئے علاج سے مگر وہاں کسی کو شبہ نہیں ہوتا۔ یہاں شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو کام طبیب کرتا ہے وہی شیخ کرتا ہے۔ مگر شیخ کو تو الزام دیں اور طبیب کے ممنون ہوں۔ کیسے تعجب کی بات ہے! اگر کوئی کہے کہ تم ساری عمر رگڑتے ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تھوڑے دنوں پرہیز بتلائیں گے۔ ساری عمر نہ رگڑیں گے۔ پھر تو خود ہی چاٹ ایسی پڑ جاوے گی کہ چھوٹے ہی گی نہیں اور نیز جیسے کہ اپنی اصلاح ضروری ہے بچوں کی بھی ضروری ہے۔ پس خود اپنی بھی اصلاح کرو اور اپنے بچوں کی اصلاح

کی بھی ابھی سے فکر کرو۔ کیونکہ بچپن میں اخلاق زیادہ درست ہوتے ہیں اب اس کا طریقہ کیا ہے وہ میں بتلاتا ہوں۔

طریق اصلاح

وہ طریقہ ایک ہی چیز ہے۔ وہ کیا ہے صحبت اہل اللہ۔ اگر کوئی کہے کہ بچوں کے لئے اتنا خرچ کہاں سے آئے کہ اہل اللہ کے پاس بھیجیں اور وہاں اُن کو رکھیں۔ میں کہتا ہوں کہ کیا بچہ کے لئے اتا نہیں رکھتے۔ ماسٹر کو تنخواہ نہیں دیتے۔ اس کے لئے بائیسکل نہیں خریدتے۔ لندن نہیں بھیجتے۔ کیا سینکڑوں روپے خرچ نہیں کرتے۔ جہاں اور تمام باتوں کا انتظام کرتے ہو اللہ والوں کی صحبت کا بھی انتظام کردو۔

اس کی صورت بہت ہی آسان ہے کچھ مشکل نہیں۔ یہ علاج رُوحانی کے لئے دو عمل کی ضرورت ہے جس میں ایک جزو یہ صحبت بھی ہے ایک تو یہ کہ روزانہ کوئی وقت لے لو جس میں کسی کام کا حرج نہ ہو۔ تو سب سے زیادہ بیکار وقت سونے کا ہے یہی لے لو۔ بس اس میں سے تھوڑا سا وقت اس کام کے لئے لے کر اس میں یہ کرو کہ کوئی کتاب دین کی بچہ کو دیجئے کہ وہ خود پڑھے یا آپ اس کو سنا دیں۔ کوئی دن اس سے خالی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ کبھی کبھی دو دن چار دن جب زمانہ چھٹی اور اسکول کی تعطیل کا ہو صحبت اہل اللہ اختیار کریں بلکہ اگر تمام زمانہ چھٹی کا اس میں خرچ نہ کریں تو یوں کریں کہ اسکول میں مہینہ بھر کی چھٹی ہوتی ہے اس کے دو حصے کریں۔ ایک حصہ کھیل کود میں گذاریں اور ایک حصہ اہل اللہ کی صحبت میں۔ مگر یہ ضرور ہے

کہ پہلے انتخاب کسی محقق کا کر لیجئے اور وہ محقق ایسا ہو گا کہ اُن پر کچھ تشدد نہ کرے گا۔ حتیٰ کہ نماز وغیرہ کو بھی اُن سے نہ کہے گا۔ وہ ایسا طرز اختیار کرے گا کہ بلا کہے تمام باتوں کی اصلاح ہو جاوے گی۔ اُس کے پاس بیٹھنا ہی سب باتوں کی اصلاح کے لئے کافی ہو گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ روزانہ کا عمل تو وہ ہے کہ کتاب خود پڑھا کریں یا آپ سنایا کریں اور گاہے گاہے کا عمل یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کریں اوّل ہی سے ان بچوں کے لئے اس طریق کا التزام کر لیجئے۔ بس اس طریقہ کے اندر دو چیزیں ہوئیں۔ ایک یہ کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کریں۔ دوسرے مسائل دین اور احکام دین کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں۔ بس اس کا التزام کیجئے اور ابتداء ہی سے کیجئے۔ ابتداء سے کریں گے تو وہ آسانی سے پابند ہو جاویں گے۔ اور اس کے ساتھ عمل کی بھی نگرانی رکھیں۔ مثلاً اگر غیبت کریں تو روک دیجئے اور کہئے کہ بُری چیز ہے۔ اُن کو نفرت دلائیے۔ اُن سے کبر کی شان ظاہر ہو تو روک دیجئے اور بتلائیے کہ اس میں یہ خرابی ہے۔ جھوٹ بولے تو اس کی خرابی بتلائیے۔ جماعت کی نماز کے ترک پر تنبیہ کیجئے اگر سکول میں جماعت کی پابندی نہ ہو تو تعطیل کے ایام میں تو ضرور ہو۔

بچوں کی تربیت

اب تو خود مساجد کی حاضری ہی امراء میں متروک ہو گئی ہے جس کی ایک کھلی خرابی یہ ہے کہ ان حضرات کو مسجد کی ضروریات تک کی خبر نہیں رہتی۔

میں شاہجہان پور گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک مسجد میں گیا تو دیکھا کہ مسجد میں

مٹی کے تیل کی ڈبیا رکھی ہوئی ہے۔ اور اس کے دھوئیں سے تمام مسجد کالی ہو رہی ہے۔ اور مسجد کے قریب ہی ایک رئیس صاحب رہتے تھے اس وقت ان کے یہاں میری دعوت تھی۔ اُن کے یہاں جو گیا تو بجلی کی روشنی تھی میں نے ان کو اس پر شرم دلائی۔ اُن کے ہاں تو بجلی کی روشنی ہے اور مسجد میں ڈبیا جلتی ہے۔ تب انہوں نے تیل کا انتظام کیا۔

وجہ یہ ہے کہ مسجد میں جانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ نماز اپنے گھر پڑھتے ہیں۔ جب یہ حالت ہے تو مسجد کی طرف توجہ کیسے ہو۔ کسی چیز پر نگاہ پڑھنے سے بہت خیال ہوتا ہے۔

ایک رئیس صاحب تھے۔ میں نے اُن سے مسجد میں نماز پڑھنے کو کہا تو کہنے لگے کہ صاحب مسجد کی تو یہ حالت ہے کہ نہ فرش ہی ٹھیک ہے نہ وضو ہی کرنے کا انتظام ہے۔ مسجد میں کیا جاویں۔ میں نے کہا کہ یہ اعتراض تو اپنے ہی اوپر ہے۔ یہ قصور تو آپ کا ہے۔ آپ مسجد کی خبر نہیں رکھتے۔

تو بچوں کو ابتدا ہی سے اس کا پابند کیجئے کہ مسجد میں جماعت سے نماز پڑھا کریں۔ اسی طرح بچوں میں بچپن سے یہ بات پیدا کیجئے کہ اُن کو مسلمانوں سے اجنبیت نہ ہو۔ اُن کو غربا سے اختلاط کی تعلیم دیجئے۔ صاحبو! غربا کے ساتھ اختلاط میں دنیوی جاہ بھی ہے۔ اُن سے ملو گے تو وہ قدر کریں گے اور امیروں کے ساتھ اختلاط میں کچھ عزت نہیں ہوتی کیونکہ امراء تو خود ہی اینٹھے مروڑے رہتے ہیں۔ اُن کی نظر میں کسی کی وقعت نہیں ہوتی۔ پس یہ مادہ بچپن ہی سے پیدا کرو کہ غربا سے نفرت نہ ہو۔ یہ

باتیں بچپن سے پیدا ہوں گی بڑے ہونے کے بعد پھر ذرا دشوار ہے اسی طرح بچوں کو اس کی تاکید بھی کیجئے کہ لباس خلاف شرع نہ پہنیں۔ دوسری قوموں کی وضع نہ اختیار کریں۔ بعض لوگ تشبہ کے مسئلہ میں کلام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صاحب غیر قوموں کے ساتھ تشبہ میں حرج کیا ہے۔ کیا کافروں کے ساتھ مشابہ ہونے سے کافر ہو جاویں گے۔ میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی مرد زنانہ لباس پہنے تو اس کو کیا کہو گے۔ اگر تشبہ میں خرابی نہیں تو تشبہ بالنساء کیوں نہیں کرتے۔ کوئی عورت کا لباس پہن کر دکھا دے عورتوں کا لباس پہننے سے بھی تو عورت نہ ہوگا۔ پھر کیوں نہیں پہنتے۔ بس کچھ بھی نہیں دین کو اپنے تابع بنا رکھا ہے۔ یہ بھی تو نہیں کہ اُن کے پہننے پر عہدے موقوف ہوں۔ بعض اسلامی روش پر ہیں مگر بڑے بڑے عہدے اُن کو ملے ہوئے ہیں۔

حاصل یہ کہ بچوں کے لئے صحبت اہل اللہ کا بھی انتظام کیجئے اور تعلیم دین کا بھی سلسلہ رکھئے اور پھر اُس پر عمل بھی کرائیے۔ یہ اجمالی تدبیر ہے اصلاح کی۔ یہ تمام عمر کے لئے دستور العمل ہے۔

اہل اللہ کی صحبت

اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے کہ عمر کا ایک معتدبہ حصہ سال دو سال ایسا مل جاوے کہ اُس میں اہل اللہ کی صحبت متصل میسر ہو جاوے تو یہ بہت ہی نافع ہے۔ سال بھر نہ ہو تو چھ ماہ سہی۔ یہ بھی نہیں تو چالیس ہی دن سہی۔ حدیث میں اس عدد کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اسی کو حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

شنیدم کہ پیرے در سرز مینے   ہمیں گفت ایں معمّا باقرینے
کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف   کہ در شیشہ بماند اربعینے

بس چالیس دن نکال کر کسی شیخ کامل کے پاس رہ پڑے۔ مگر گھر بار اور جتنے تعلقات ہیں سب کا بندوبست ایسا کر کے جائے کہ قلب کو تشویش نہ ہو۔ نوکری میں رخصت لے لے۔ غرض بے فکری سے رہے۔ چالیس دن کے لئے اپنے کو بالکل شیخ کے سپرد کر دے۔ شیخ دو کام کرینگے کچھ تو اعمال بتلائیں گے کچھ اوراد۔ اور اس سے بے فکر رہئے کہ تحمل سے زیادہ نہ بتلائیں گے۔ اور وہاں کسی سے تعلق مت رکھو۔ کسی سے بلا ضرورت شدید بولو بھی مت۔ اصل کام ذکر اللہ اور اطاعت الٰہی رکھو۔ چالیس دن میں جو مادہ خبیث آپ کے اندر ہے حسد، غصہ، کبر، حب دنیا وغیرہ وہ سب نکل جائے گا۔ اور جو شبہ یا جو حالت پیش آئے بے تکلف شیخ کے سامنے پیش کر دو اور اطلاع کے بعد اپنے کو شیخ کے سپرد کر دو کہ جو اُن کی سمجھ میں آئے وہ کریں۔ علاج مشکل ہو یا آسان سب کو برداشت کرنا ہوگا تو آسان ہی مگر اوّل اوّل دشواری معلوم ہوگی۔ پھر کوئی دشواری نہ معلوم ہوگی۔

چنانچہ میں نے بھی ایک صاحب کا علاج کیا ہے۔ ویسے وہ عالم و فاضل ہیں۔ مگر مجھ کو آثار سے معلوم ہوا کہ ان میں کبر ہے۔ میں نے علاج یہ تجویز کیا کہ سب خانقاہ والوں کی جوتیاں جھاڑ کر سیدھی کر کے رکھا کریں تاکہ اُن کو پہننے میں سہولت ہو۔ اس کو سن کر اُن کی یہ حالت ہوئی جیسے گولی ماری

اور خیال ہوا کہ اُنہوں نے یہ کیا کام بتلایا مگر مجبور تھے کرنا پڑا۔ جوتیاں سیدھی توکیں مگر عشا کے وقت کہ کوئی دیکھے نہیں۔ یہ نفس کی خباثت تھی۔ پھر دن کو جوتیاں سیدھی کرنا شروع کیں۔ یہ حالت ہوگئی کہ اوّل تو وہ شرماتے تھے اب لوگ شرمانے لگے۔ بعض لوگ اُن کو منع کرتے۔ میں نے کہا کہ ان سے تعرض مت کرو۔ جیسے کریں کرنے دو۔ چند روز تک تو یہ رہا۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ نمازیوں کو وضو کے لئے پانی بھر بھر دیا کرو۔ یہ بھی کیا۔ جب ایک زمانہ گزر گیا تو میں نے کہا کہ بس چھوڑ دو۔ پہلے تو کرتے ہوئے تکلیف ہوتی تھی اب یہ حالت ہو گئی کہ چھوڑتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے ایک تو اس لئے کہ اُن کو اس سے ایک مناسبت سی ہو گئی تھی۔ دوسرے نفس کہتا تھا کہ سب کے سامنے ظاہر تو ہو ہی گیا اور لوگ بزرگی کے معتقد بھی ہونے لگے۔ اب یہ کام چھوڑا یا جاتا ہے۔ نفس نے کہا کہ اب اگر چھوڑوں گا تو لوگ سمجھیں گے کہ اب پھر انہیں تکبر ہو گیا۔ اب چھوڑنے میں ذلت ہے جیسے پہلے کرنے میں ذلت تھی۔ نفس چھوڑنے میں بڑے رنگ لایا۔ کہنے لگے کہ مجھ کو چھوڑنے کا حکم نہ ہو۔ میں نے کہا کہ بس اب اس کو چھوڑ دو۔ اب یہ کرو کہ نہ کسی سے ملو جلو، نہ بات کرو۔ تنہا حجرہ میں دروازہ بند کر کے بیٹھ جاؤ۔ پہلے تو کہتے تھے کہ اُنہوں نے یہ کیا کیا کہ جوتے سیدھے کرنے کو کہہ دیا۔ مگر پھر قسم کھا کر کہتے تھے کہ مجھ کو اس عمل سے اتنا بڑا نفع ہوا کہ سالہا سال میں بھی نہ ہوتا۔

جس کے اندر کبر ہو یہ تو اس کا علاج ہوا۔ اب فرض کرو کہ کسی میں

زینت بہت ہے۔ مانگ پٹی میں ہر وقت لگا رہتا ہے۔ اس کو اس سے فرصت ہی نہیں ہوتی۔ شیخ اس کا علاج یوں کرے گا کہ جھاڑو ہاتھ میں دیگا اور کہے گا سڑک پر جاؤ اور جھاڑو دو۔ مسلمانوں کو آرام پہنچے۔ اس عمل کے کرنے سے وہ شخص زینت کو چھوڑ دے گا۔

پہلے بزرگ اس طرح کرتے تھے۔ وظیفے زیادہ نہ بتلاتے تھے وظیفے نواب ہوئے ہیں کہ جہاں طالب نے کسی مرض کی شکایت کی بس ایک وظیفہ بتلا دیا۔ امراض کہیں وظیفوں سے جاتے ہیں۔ ان کا ازالہ تو اسی طرح ہوتا ہے۔ یا کسی میں حسد کا مادہ ہے تو شیخ محسود کے پاؤں دبانے کو کہے گا۔ سائنس کی رو سے اس کا راز یہ ہے کہ اس سے محسود کے دل میں اس کی محبت ہو گی۔ تو پھر اس کو بھی ہو گی اور جب اس کو اس کے ساتھ محبت ہو جاوے گی تو پھر حسد جاتا رہے گا۔ سو اس طریقہ سے ازالہ ہوتا ہے ان امراض کا۔

علم اور اصلاح

اب لوگ ان کے مذموم ہونے کے صرف علم کو کافی سمجھتے ہیں کہ جب اُن کی بُرائی معلوم ہو گئی تو خود ہی چھوٹ جائیں گے۔ خوب سمجھ لو کہ اصلاح کے لئے تنہا علم کافی نہیں۔ دو دو چلے کے سننے سے اصلاح نہیں ہوتی بلکہ عملی صورت سے اصلاح ہوتی ہے۔ اسی کو تو کہتے ہیں ؎

صوفی نشود صافی تا در نہ کشد جامی　　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

اخلاق کی درستی تو خبیث مادہ کے نکلنے ہی سے ہو گی۔ دیکھئے آپس کی نا اتفاقی سب جانتے ہیں کہ ساری خرابیوں کی جڑ ہے مگر پھر بھی اس کو نہیں

چھوڑتے وجہ یہ کہ مذموم ہونے کا علم صرف کافی نہیں۔ اس کے مادہ کو اپنے اندر سے نکالنے کی ضرورت ہے۔ پس سوچنا چاہیئے کہ اس کا مادہ کیا ہے جس سے یہ نااتفاقی پیدا ہوتی ہے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ کبر سے پیدا ہوتی ہے۔

حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ لوگ اتفاق اتفاق تو کرتے ہیں مگر ان کو اس کی جڑ معلوم نہیں۔ اس کی جڑ ہے تواضع۔ وہ یہ کہ ہر شخص اپنے کو دوسرے سے کم سمجھے۔ بس اتفاق ہو جائے گا۔ آج کل جو اتفاق نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اتفاق کے معنی سمجھ رہے ہیں کہ دوسرا میرے تابع رہے۔ میں تابع نہ ہوں۔ یہ حالت ہے کہ باپ بیٹوں میں لڑائی بلکہ پیر مرید میں لڑائی۔ یہ اسی وجہ سے ہے کہ ہر شخص اپنے کو بڑا بنانا چاہتا ہے۔ پس اس کی جڑ کبر ہے۔

ان خصائل کو برا تو سب کہتے ہیں مگر ان کو مٹاتے ہیں اہل اللہ۔ ان کے ازالہ کا علاج بس انہیں کو آتا ہے۔ ان کی تجویز پر عمل کرنا چاہیئے۔ وہ ان اخلاق ذمیمہ کو نکالیں گے۔ یہ رذائل مٹ گئے تو ساری سعادت کی کنجی ہاتھ میں آگئی۔ غرض یہ کہ ایک تو وہ یہ کام کریں گے اور دوسرے اوراد میں مشغول کریں گے۔ وہ بھی ایسے جو آپ سے ہو سکیں۔ اللہ کا نام لینے سے نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلق طبعی ہو جاوے گا اللہ سے۔ اس میں یہ خاصیت ہے۔

خلاصہ یہ کہ نفس و قلب کی اصلاح ہو جاوے گی۔ اس کے بعد گو حدود سے تجاوز نہ کرو گے۔ معصیت سے ایسی نفرت ہو جاوے

جیسے پاخانہ سے۔ اس وقت گناہ چھوڑنا مصیبت ہے۔ اُس وقت گناہ کرنا مشکل ہوگا۔ بس کسی قدم پر نافرمانی نہ ہوگی۔ اگر مال بھی ہوگا تب بھی یہ حالت ہوگی کہ جیسے کوئی محبوب اپنے عاشق کو کارخانہ سپرد کرتا ہے۔ عاشق کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اُس کے انتظام میں پھرتا ہے اور اُس کے اندر وہی تصرف کرتا ہے جس سے محبوب خوش ہو۔ اُس کی مرضی کے خلاف اس میں کوئی تصرف نہیں کرتا۔ خاص کر جب کہ یہ علم ہو کہ محبوب دیکھ بھی رہا ہے۔ ساری دنیا اُس کے پاس ہوگی مگر قلب میں سوائے محبوب کچھ بھی نہ ہوگا۔ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ اُن کے پاس بڑے بڑے کارخانے ہیں مگر وہ صغیرہ بھی نہیں کرتے۔ سو اصلاح کا ایک تو یہ اثر ہوگا کہ معاصی سے نفرت ہو جاوے گی۔ دوسرے اس کا یہ بھی اثر ہوگا کہ خلق کی نظر میں جاہ بڑھے گا۔

اہل اللہ کی قوتِ قلبیہ وجسمانیہ

ایک اور عجیب بات ہے کہ اس سے قوت جسمانی بھی بڑھتی ہے۔ اہل اللہ میں قوت جسمانیہ بھی زیادہ ہوتی ہے۔ گو کہ اُن کی ظاہری حالت یہ ہوتی ہے کہ راتوں کو جاگنے اور مجاہدہ کرنے سے دبلے پتلے ہوتے ہیں مگر روح میں افسردگی نہیں ہوتی۔ ہر وقت تازہ رہتے ہیں اور راز تازگی کا یہ ہے کہ اُن کو معیت ہے محبوب حقیقی سے۔ آپ محبوب مجازی کو دیکھ کر زندہ ہو جاتے ہیں۔ جب ادنیٰ سے محبوب کی معیت میں یہ اثر ہے اتو پھر خدا تعالیٰ کی معیت میں کیوں نہ اثر ہو۔ اسی واسطے وہ ہر حال میں خوش

رہتے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ اُن کو معیت ہے حق تعالیٰ سے ؎

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ جنت است آں گرچہ باشد قعرِ چاہ
ہر کجا دلبر بود خرم نشیں فوق گردوں است نے قعرِ زمیں

با تو دوزخ جنت است اے جانفزا
بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

یہ راز ہے اُن کے خوش رہنے کا اور خوش رہنے سے جسمانی قوت زیادہ ہوتی ہے۔ نیز چونکہ ان کو معیت ہوتی ہے محبوب سے ان کا قلب بھی قوی ہوتا ہے۔ آپ ایک ہزار کے جاتے رہنے سے دلگیر ہوں اور وہ لاکھ روپے کے بھی جاتے رہنے سے نہ ہوں۔ یہ حالت ہوتی ہے اُن کے قوت قلب کی بلکہ ان میں جو غریب ہیں اُن کی بھی یہ حالت ہوتی ہے۔

ہم نے ایک غریب کو دیکھا کہ وہ کھیتی کرتے تھے۔ ان کو روپے کی ضرورت ہوئی لیکن کہیں سے بلا سود نہ ملتا تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ میں سودی قرض نہ لوں گا چاہے کچھ بھی ہو۔ اب اُن کی اولاد ہے۔ اُن کا بھی وہی طریقہ ہے تھوڑی سی زمین میں کھیتی ہوتی ہے مگر اس قدر غلہ پیدا ہوتا ہے کہ اور کسی کے یہاں اس سے زیادہ زمین میں بھی نہیں ہوتا۔ اُنہوں نے ایک خراب زمین خریدی تھی۔ وہ ایسی اچھی ہو گئی کہ قصبہ میں ایک زمین بھی ویسی نہیں۔ انہوں نے اپنی اولاد کو یہ بھی نصیحت کی تھی کہ دودھ کا جانور نہ رکھا جائے کیونکہ اس کی وجہ سے جماعت نہیں ملتی۔ جو جماعت کا وقت ہوتا ہے وہی دودھ دوہنے

کا ہوتا ہے۔

ان ہی کی قوم میں ایک رسم یہ بھی تھی کہ لڑکیوں پر روپیہ لیا جاتا تھا۔ ان کو اپنے لڑکے کی شادی کرنی تھی۔ انہوں نے ایک جگہ پیغام دیا وہاں سے روپیہ کی طلب ہوئی۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ شرع میں ایسا روپیہ لینا حرام ہے۔ اس لئے میں ہرگز نہ دوں گا۔ چاہے شادی ہو یا نہ ہو۔ تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ان کی قوم کے لوگ ہاتھ جوڑتے آئے اور کہا لڑکیاں موجود ہیں ہم روپیہ نہیں لیتے۔

لوگ ہر بات کی سائنس ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ یہاں پر بھی وہ یہی کہتے ہیں کہ صاحب! اگر دین کے مقابلہ میں دنیا کے فائدہ کو چھوڑ دیا کریں گے تو دنیا کا کام کیسے چلے گا۔ میں کہتا ہوں کہ ہر بات میں خدا کو کیوں نہ دیکھو۔ انہیں بزرگ کو دیکھ لو کہ انہوں نے دین کے مقابلہ میں دنیا پر لات ماری تو خدا تعالیٰ نے ان کا کام کس طرح چلا دیا۔

خلاصہ یہ کہ جو دستور العمل میں نے بیان کیا ہے اس پر عمل کیجئے۔ پھر دیکھئے آپ کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس وقت آپ کی یہ حالت ہو گی کہ اگر دنیا کا زیادہ کاروبار بھی کریں گے تو دل اُس کے اندر مشغول نہ ہو گا۔ اس وقت تو آپ کو قدرت نہیں ہے کہ بڑے پیمانہ پر کام کریں اور قلب اس کے اندر مشغول نہ ہو۔ اور جب اصلاح ہو جاوے گی تو پھر بڑے پیمانہ پر بھی کام کرو گے تب بھی قلب مشغول نہ ہو گا۔ پس اہل اللہ کے پاس رہنے کے لئے چالیس دن تو ضرور نکال لینے چاہئیں۔ اس کے بعد کبھی کبھی کی صحبت کافی ہے

یہ ایسا آسان طریقہ ہے کہ ہر کسی کو موقع مل سکتا ہے۔ اس کے بعد اب گنجائش نہیں رہی، اس عذر کی کہ ہم دنیا میں مشغول تھے ہم دین کا کام کیسے کرتے چنانچہ لوگوں کا آج کل یہی گمان ہو گیا ہے اور واقع میں مذاق بگڑ گیا ہے کہتے ہیں کہ اگر دین حاصل کریں گے تو بھوکے مریں گے۔ یہ واقعات میں نے بیان کیئے ہیں۔ اس طریق میں یقینی کامیابی ہے۔ اب وہ لوگ بتلائیں تو سہی کہ میں نے کون سی نوکری چھڑائی۔ کون سی مشقت کے کام لئے۔ اس طریقہ پر عمل کرنے میں کون سی دشواری ہے۔ پس اب ہمت کر کے اس پر عمل شروع کر دیجئے۔ جب تم اس طریقہ پر عمل کرو گے تو یقیناً کامیابی ہو گی اور پھر تو تؤثرون الحیٰوۃ الدنیا کے مصداق نہ ہو گے۔

حیاتِ آخرت

اب ایک چھوٹی سی بات اس آیت کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ قرآن شریف میں دنیا کے ساتھ تو لفظ حیات لائے۔ مثلاً فرمایا الحیٰوۃ الدنیا اور آخرت کے ساتھ لفظ حیات نہ لائے۔ یوں نہیں فرمایا وحیٰوۃ الاخرۃ خیر وابقیٰ یہ کیا بات ہے؟

سو اس میں یہ بتلایا ہے کہ آخرت حیات ہی حیات ہے وہاں ممات کا کچھ کام نہیں۔ پس اس میں حیات کا لفظ لانے کی ضرورت ہی نہیں۔ حیات آخرت تو جب کہا جاوے گا جب کہ اس میں غیر حیات کوئی اور شے بھی ہو۔ پس جب کہ حیات آخرت ایسی چیز ہے اور لوگ پھر بھی اس کی طلب نہیں کرتے۔ تو اب میں کہہ سکتا ہوں کہ لوگوں نے آخرت کو پہچانا ہی نہیں

ورنہ اس کی طرف توجہ تام کرتے بلکہ دنیا کو بھی نہیں پہچانا ورنہ اس کی طرف رُخ بھی نہ کرتے۔ دنیا ہی کو پہچان لو۔ اسی کو سوچو۔ اگر اس کی پوری حقیقت سمجھو تو اس مردار کا نام بھی نہ لو۔ تم جو دنیا کے عاشق ہوئے ہو۔ ذرا اس کو دیکھو تو سہی۔

اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کسی بدہیئت عورت نے پوڈر مل رکھا ہو اور دو چار چند سے اس پر عاشق ہو جاویں۔ حضرت دنیا کی بالکل ایسی حالت ہے ؎

حال دنیا را بپرسیدم من از فرزانۂ !
گفت یا خوابے ست یا بادے ست یا افسانۂ
باز گفتم حال آنکس گو کہ دل درو ے بہ بست
گفت یا غولے ست یا دیوے ست یا دیوانۂ

حقیقت میں دنیا کی ایسی مثال ہے۔ اسی واسطے حق تعالیٰ نے شکایت فرمائی ہے۔ بل تؤثرون الحیوٰۃ الدنیا والآخرۃ خیر و ابقیٰ کہ دنیا ایسی رذیل چیز کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت خیر اور ابقیٰ ہے۔ ہر چند کہ عورتوں کے متعلق کوئی خاص مضمون ذکر نہیں ہوا۔ مگر جو مضامین بیان ہوئے وہ جیسے مردوں کے لئے نافع ہیں عورتوں کے لئے بھی مفید ہیں۔

کچھ عورتوں کے متعلق

خیر اب چند باتیں خاص ان کے متعلق بھی عرض کرتا ہوں۔ حُبِ دنیا میں یوں تو سب مبتلا مگر یہ زیادہ ہیں۔ ان کو علم کم ہے صلحاء کی صحبت کم۔ کیونکہ یہ گھر سے تو

نکل نہیں سکتیں لیکن ان کے لئے یہی تدبیر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ان کو اہل اللہ کی خدمت میسر نہیں تو ان کا کلام تو میسر ہو سکتا ہے۔ بزرگوں کے کلام اور ملفوظات تو موجود ہیں۔ اگر خود اُن سے وعظ نہیں سن سکتیں تو چھپے ہوئے وعظ تو ہیں۔ صورت یہ ہو سکتی ہے کہ عورتیں جمع ہوا کریں۔ جو اُن میں پڑھی لکھی ہو وہ پڑھا کرے اور سب سنا کریں جیسے اور دنیا کے کاروبار کرتی ہیں بس ایک اس کو بھی معمول کر لیں۔ جو برکت اہل اللہ کی خدمت میں حاصل ہو وہ اس طرح ان کو حاصل ہو جاوے گی۔

ایک یہ کہ ضروری مسائل کی کتابیں پڑھیں یا سنیں۔ اور خیال رکھیں کہ ان کے موافق عمل ہو۔ کوئی بات خلاف شرع نہ ہو۔

ایک یہ کہ اپنے عیوب کو ٹٹولیں اور اُن کا علاج کریں۔ کتابیں دیکھنے سے اس کا پتہ چل سکتا ہے۔ اگر کسی بات کا علاج معلوم نہ ہو اور کتاب میں نہ ملے تو اپنے مردوں سے خواہش کریں کہ وہ کسی بزرگ کے پاس لکھ کر بھیج دیا کریں۔ وہ تجویز کریں۔ اُس کے موافق عمل کریں۔

ایک تدبیر تمام معاصی کی مشترک تدبیر ہے۔ اس سے ہر معصیت کا مادہ ضعیف ہو جاتا ہے اور وہ تدبیر مرد اور عورت دونوں کے کام کی ہے۔ وہ یہ کہ جس فعل کا مادہ تقاضا کرے اُسے مت کرو۔ مثلاً پرائی عورت کے دیکھنے کو جی چاہا تو نگاہ کو روکو۔ ہرگز مت دیکھو۔ غصہ آئے تو روکو۔ غرض جس مادہ کا تقاضا ہو اُس کے خلاف کرو۔ مثلاً ایک شادی ہی ہے اس میں رسومات جو کی جاتی ہیں تو غرض یہ ہوتی ہے کہ نام ہو جاوے۔ مثلاً

اس کا کبر اور تفاخر ہے اور وہ ہے حرام۔ پس یہ رسومات بھی حرام ہوئیں۔ تو اُن کے مادہ کے مغلوب کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ رسومات کو مت کرو۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ناچ گانا ہی رسم ہے۔ ناچ گانے کے علاوہ بس اور کوئی رسم نہیں۔ کھانا کھلانا وغیرہ اس میں رسم کیا ہے۔ تو سمجھ لیجئے کہ ناچ گانے کی کوئی خصوصیت نہیں۔ جتنی باتیں نام کی وجہ سے کی جاتی ہیں وہ سب رسوم قبیحہ ہیں۔

علاج یہ ہے کہ ان فضولوں میں مت پڑو۔ جہیز دینے کو طبیعت چاہے خوب دو مگر ساتھ مت کرو، دکھاؤ مت۔ لڑکی کو خالی بھیج دو جب گھر واپس آوے تو اس کو ان تمام چیزوں پر قابض بنا دو۔ اب اُس کی مالک ہو گیا جب چاہے لے جاوے۔ اُسے مشورہ دو کہ جس چیز کی بالفعل ضرورت نہیں اُسے مت لے جا۔ جہیز کو مجتمعاً مت جانے دو۔ یہ ہے علاج کبر کا۔ نہ یہ کہ ان رسموں کو تو کرتے رہیں اور دل سے فخر اور نام کی نیت نکال دیں۔ یاد رکھو کہ جب تک اُن کو ترک نہ کرو گے، اس وقت تک دل سے فخر اور تکبر ہی نہیں نکل سکتا۔ تاوقتیکہ علاج طریقہ سے نہ کرو ہو ہی نہیں سکتا۔

مجھ کو ایک وقت میں تعجب تھا کہ علماء بیواؤں کے نکاح کی تاکید اس قدر کیوں کرتے ہیں۔ کیوں اتنا پیچھے پڑتے ہیں۔ بس سمجھا دیا کریں کہ نکاح سنت ہے یا مستحب۔ اصل مقصود تو عقیدہ کی اصلاح ہے اس کو بُرا نہ سمجھیں۔ ورنہ دوسرا نکاح کرنا واجب تو ہے نہیں۔ یہ شبہ کئی سال تک

رہا۔ اُس کے بعد یہ شبہ مٹ گیا اور سمجھ میں آگیا کہ واقعی اس پر عمل کرانے کی بھی ضرورت ہے۔ اگر اس پر عمل نہ ہوگا تو عقیدہ سے بھی اس کی بُرائی نہ نکلے گی۔ اس میں کامیابی جب ہی ہوگی کہ عمل کریں۔ اگر عمل نہ کریں گی تو عیب بھی سمجھیں گی اور جب اس کا رواج ہو جاوے گا تب اس کو عیب بھی نہ سمجھیں گی نہ صرف اس کا سمجھ لینا کہ نکاح کرنا چاہیے کافی نہیں تاوقتیکہ نکاح نہ کیا جاوے پس جب تک کہ عملی علاج نہ ہو اُس وقت تک عقیدہ کی بھی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

علاج شیخ کی اہمیت

اب اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ لوگ یا تو اپنا علاج خود تجویز کریں یا شیخ تجویز کرے۔ دو ہی صورتیں ہیں۔ مگر شیخ کے تجویز کرنے میں دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ شیخ طبیب ہے علاج کو خوب سمجھتا ہے۔ اس لئے اُس کا علاج تجویز کیا ہوا اعلیٰ درجہ کا ہوگا۔ دوسرے اپنے ہاتھ سے اپنے نفس پر چھری چلانا مشکل ہے۔ نشتر لگانا مشکل ہے۔ جیسے محسوس کے خود پاؤں دبانا مشکل ہے اور جب شیخ نے کہا کہ پاؤں دباؤ تو اب آسان ہو جاوے گا شیخ کے کہنے کے بعد اُس کے خلاف نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر طبع سلیم ہو تو خود بھی علاج سمجھ سکتا ہے۔ مگر پھر بھی شیخ کی تجویز میں جو برکت ہے، وہ کہاں سے لائے گا۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

شیخ فلسفی ہے مگر اس کا فلسفہ ظلمانی فلسفہ نہیں (جیسے اہل یونان کا فلسفہ ہے) بلکہ اُس کا نورانی فلسفہ ہے۔ اگر کوئی چار تدبیریں یاد کرلے تو شیخ تھوڑا ہی ہو جاوے گا۔ ؎

ہزار نکتۂ باریک تر زمُو اینجاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

خلاصہ یہ کہ ایک گُر سیکھ لو۔ وہ یہ کہ جس چیز کا تقاضا ہو اور ہو وہ معصیت اُسے چھوڑ دو۔ اس سے تقاضا معصیت کا ضعیف ہو جاوے گا ضعیف اس لئے کہا کہ یوں نہ خیال کیا جاوے کہ بالکل زائل ہو جاوے گا۔ بالکل ازالہ نہیں ہو سکتا۔ جیسے شریر گھوڑا کہ وہ پہلے بہت دق کرتا تھا اب بعد اصلاح کے دق نہیں کرتا مگر کبھی کبھی شرارت سے ہی آتا ہے۔ مگر فرق یہ ہوتا ہے کہ نفس پہلے بہ دشواری قابو میں آتا تھا اب آسانی سے آجاتا ہے۔ مثلاً نگاہ ہٹانا غیر عورتوں سے پہلے نہایت دشوار تھا۔ اب بعد اصلاح کے آسان ہو جاوے گا مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ نفس سے بالکل تقاضا ہی موقوف ہو جاوے ریاضت کا یہ طریقہ بہت عمدہ ہے کہ تقاضا معصیت کے خلاف کرے۔

مداومت کی ضرورت

یہ حاصل ہے سارے تصوف اور اصلاح نفس کا۔ میں سب کو فقیر نہیں بناتا صرف اس پر عمل کرنے کو کہتا ہوں۔ پھر اس میں سختی کیا ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ تہجد نہ پڑھے۔ مگر اللہ کا نام لیجئے اور معاصی کو چھوڑ دیئے لیکن پھر بھی اس میں نصرت حق کی ضرورت ہے اور وہ بوسائط ہوتی ہے کہ شیخ کی طرف

رجوع کرنے۔ اس لئے کہتے ہیں ؎

بلے عنایات حق وخاصان حق گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

بس تصوف ایک مرکب تدبیر ہے۔ وہ یہ کہ دواعی نفس کے خلاف کرو اور التجا کرو حق کی طرف۔ ذکر کرو چاہے پندرہ منٹ ہو مگر نبھاہ کر کرو جیسے کنواں ایک بالشت روزانہ بھی کھودو مگر کھودو نبھاہ کر تو سال بھر میں پانی نکل آئے گا۔ کام مداومت سے کرو۔ یہ نہیں کہ کبھی کیا اور کبھی نہ کیا۔

عورتوں کو یہ بھی چاہیئے کہ عمدہ کپڑا پہن کر کہیں نہ جائیں۔ جہاں جائیں انہیں کپڑوں سے چلی جائیں جو پہلے سے پہنے ہوئے ہوں۔ اس عمل سے جو حصہ تکبر کا ہے وہ ٹوٹ جائے گا۔ مگر ان کی یہ حالت ہے کہ جہاں جائیں گی لد پھند کر جائیں گی تاکہ شان ظاہر ہو۔ زیور بجتا ہوا دکھاوے کی یہ حالت ہے کہ کان اگر دوپٹہ سے ڈھکے ہوتے ہیں کہ کسی کی نظر نہیں پڑتی تو کھجلانے ہی کے بہانے سے ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے پاس اتنا ہے۔ اگر اپنے پاس نہ ہو تو مانگ مانگ کر زیور میں لدتی ہیں۔ اُن کا خیال زیور اور کپڑے پر رہتا ہے۔ جب اُن کا مجمع ہوتا ہے تو اوروں کے زیور اور کپڑے پر نگاہ رہتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ جب مردوں کا مجمع منتشر ہوتا ہے تو کسی کو بھی یاد نہیں رہتا کہ فلاں کی ٹوپی کیسی تھی کرتا کیسا تھا۔ بخلاف عورتوں کے کہ سب کا زیور اور کپڑا بتادیں گے اس لئے میں کہتا ہوں کہ اُن میں حُب دنیا کا غلبہ زیادہ ہے۔ علاج یہ ہے کہ خاوند کے روبرو خوب پہنا کریں

مگر حالت یہ ہے کہ برادری میں جائیں گی تو خوب بن ٹھن کر۔ اور جب آئیں گی تو فوراً اتار دیں گی۔ تاکہ جس حال میں خاوند نے پہلے دیکھا تھا اسی میں دیکھے اس کا علاج یہ ہے کہ خاوند کے سامنے پہنیں اور کہیں جائیں تو نہ پہنیں۔ ایسے ہی علاج غیبت کا ہے اس میں استغفار کافی نہیں بلکہ مغتاب سے کہو کہ میں نے تمہاری غیبت کی ہے تم معاف کر دو۔

خاوند کے حق میں گستاخی ہو جاوے تو توبہ کرو۔ اور اس سے معاف کراؤ تم خاوند کو برابر کا دوست سمجھتی ہو کہ اس کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتی ہو یاد رکھو کہ وہ جیسے دوست ہے حاکم بھی تو ہے۔ دوست تو اس واسطے ہے کہ اس کے حقوق ادا کر سکو۔ کیونکہ محبت میں جیسے حقوق ادا ہو سکتے ہیں بغیر محبت کے ادا نہیں ہو سکتے۔ نہ اس لئے کہ اس کے جوتیاں مارو۔ عورتیں اس میں بڑی کوتاہی کرتی ہیں۔ خوش خلقی کے لئے تو سب اور بدخلقی کے لئے شوہر۔ خاوند کی ناراضگی ایسی بری چیز ہے کہ اس سے فرشتے لعنت کرتے ہیں۔ عورتوں کی عادت ہے کہ شوہر کے سامنے زبان درازی بہت کرتی ہیں۔ بھلا اس کو اس طرح تکلیف پہنچانی چاہیے۔ اول تو ہر وقت ہی اس کا مزاج دیکھ کر بات کہو۔ ایسی بات نہ کہو جو اس کو ناگوار ہو۔ لیکن خاص کر جب وہ باہر سے گھر میں آوے تو اس وقت تو ضرور ہی اول اس کے مزاج کو دیکھ لو۔ کہیں کسی سے لڑ کر نہ آیا ہو۔ کسی وجہ سے غصہ میں نہ ہو۔ مگر ان کو ذرا صبر نہیں ہوتا۔ بس آتے ہی ٹانگ لیتی ہیں۔

اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں

اس کی شکایت فرمائی ہے کہ لوگ زندگی دنیا کو دین پر ترجیح دیتے ہیں حالانکہ آخرت بہتر اور ابقیٰ ہے۔ اس کے متعلق بقدر ضرورت مفصل بیان ہو گیا اور حجت الٰہی قائم ہو گئی۔ اب عمل نہ کرنے پر کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ جو مناسب حال تھا میں نے اپنی طرف سے سب پہنچا دیا۔ عمل کرنا آپ کا کام ہے۔

اب میں دعا کرتا ہوں اور حق تعالیٰ سے التجا کرتا ہوں کہ وہ عمل کی توفیق دیں۔ آمین یا رب العالمین۔

مظاہر الاموال

تزکیہ نفس کے متعلق یہ وعظ بروز اتوار ماہ شعبان المعظم ۱۳۳۵ھ سالانہ جلسہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں منبر پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا۔ جو ۳½ گھنٹے میں ختم ہوا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۲۰۰۰ تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے قلمبند فرمایا۔

خطبۂ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔

...ہیدا | اس آیت میں ایک ضروری مضمون کا بیان ہے۔ اس لئے
میں نے اس کو اختیار کیا ہے اور ہر چند کہ قرآن کی سب
...توں میں ایسے ہی مضامین ہیں جو سب ضروری ہیں اور خاص خاص ضرورتوں
...سلئے کافی ہیں مگر اس وقت خاص اس آیت کے اختیار کرنے کی دو وجہ
...ہیں۔ ایک یہ کہ میں ابھی دیوبند گیا تھا اور وہاں اس سے پہلی آیت

وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا
وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ
رَحِيمٌ

اور بعضے لوگ ہیں کہ اقرار کیا انہوں نے اپنے گناہوں کا
انہوں سے ایک کام نیک اور ایک بد۔ قریب ہے کہ اللہ معاف
کرے اُن کو۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

کی تقریر ہوئی تھی جس میں اعتراف خطا کا بیان ہے اور اہل علم میں یہ خطا عام
کہ اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے۔ بلکہ تاویلات و توجیہات کرنے لگتے ہیں۔
وجہ سے اس کو وہاں اختیار کیا تھا۔ اور یہ مرض طالب علمی ہی کے وقت سے
میں پیدا ہوتا ہے جس کا منشا یہ ہے کہ کتب درسیات میں بعض مصنفین سے
غلطی ہو گئی ہے شراح اور محشین اُن کی تاویلات و توجیہات کیا کرتے ہیں
مصنف سے اہل علم کو بدگمانی نہ ہو۔ اس سے طلبا کو تاویل و توجیہ کی عا
پڑجاتی ہے حالانکہ محشی اور شارح کی تاویل و توجیہ کا منشا تو اضع ہے
باوجود دوسرے کی غلطی معلوم ہو جانے کے اس کے کلام کو محمل حسن
کرتے اور اپنے مواخذہ کو ضعیف کر دیتے ہیں مگر طلبا نے اس سے
سبق سیکھا کہ اپنی خطاؤں میں خود ہی تاویل کرنے لگے۔ جس کا منشا
ہے جس کی اصلاح ضروری ہے۔ اس لئے میں نے وہاں اس مضمو
بیان کیا تھا۔

پھر چونکہ سہارنپور کا سفر اسی کے متصل ہوا تو خیال ہوا کہ جیسے
کا سفر دیوبند کے سفر کے متصل ہے تو بیان بھی وہاں کے بیان سے
یعنی مناسب یہ معلوم ہوا کہ یہاں بیان ایسی آیت کا ہو جو پہلی آیت
متصل ہو تا کہ اتصال صوری کے ساتھ اتصال معنوی بھی جمع ہو جا
خیال کے بعد جو اگلی آیت میں غور کیا تو وہ اس جلسہ کی حالت
ہی مناسب معلوم ہوئی۔ اس واسطے اس کو اختیار کر لیا گیا۔
یہ میں نے اس لئے کہا کہ شاید کوئی یہ سمجھے کہ بس یہاں جس

کا بیان کیا جا رہا ہے اُس کا منشا صرف یہی ہے کہ اس سے پہلی آیت کا بیان اس سے پہلے ہو چکا ہے اور فی نفسہٖ اس آیت کا بیان ضروری نہ تھا۔ تو یہ ایسا ہوا جیسے ایک وزیر نے ایک قاضی کو لکھا تھا

اَيُّهَا الْقَاضِي بِقُمْ قَدْ عَزَلْنَاكَ فَقُمْ — اے قاضی اٹھ جاؤ ہم نے تم کو معزول کر دیا پس اٹھ کھڑے ہو۔

اور اس نے خط دیکھ کر کہا تھا۔

وَاللّٰهِ مَا عَزَلَتْنِي إِلَّا هٰذِهِ السَّجْعَةُ۔ — خدا کی قسم تو نے مجھے معزول نہیں کیا بلکہ اس رقعہ نے معزول کیا ہے۔

سو یہ بات نہیں بلکہ واقع میں بھی اس آیت کا مضمون اس جلسہ کے لئے بہت مناسب ہے۔ چنانچہ تقریر آیت سے معلوم ہو جائے گا۔

مال اور مسلمان

دوسری وجہ اس آیت کے اختیار کی وہ ہے جو اَمْوَالِهِمْ کے سننے سے آپ کے ذہن میں آئی ہو گی چونکہ قرآن سے مسلمانوں کو عام طور پر مناسبت ہے۔ اس لئے وہ لوگ بھی جو عربی پڑھے ہوئے نہیں اجمالاً الفاظ ہی سے مقصود کو سمجھ لیتے ہیں۔ تو آپ نے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ہی سے سمجھ لیا ہو گا کہ میں آج انفاق مال کا ذکر کروں گا۔ اس کو سببیت اختیار میں اس لئے دخل ہے کہ آج کل مسلمانوں کو انفاق مال کے مضمون سے نہایت توحش ہے۔ اس کے سننے

سے بھی گھبراتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے میں اپنے بیانات میں مال کا ذکر بہت کم کرتا ہوں۔ مگر یہ ایک بڑی کوتاہی ہے میری بھی اور سامعین کی بھی۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو قرآن میں جا بجا ذکر فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نہایت تاکید کے ساتھ اس کو بیان فرمایا ہے۔ تو یہ بھی شریعت کا ایک جزو ہے۔ پس میری یہ کوتاہی ہے کہ میں اس جزو کا بیان بہت کم کرتا ہوں اور مسلمانوں کی یہ کوتاہی ہے کہ وہ اس سے متوحش ہوتے اور گھبراتے ہیں شریعت کے کسی جزو سے متوحش ہونا سخت مرض ہے جس کی اصلاح ضروری ہے۔ اور توحش کا علاج یہ ہے کہ جس مضمون سے توحش ہو اس کو بار بار سنا جائے۔

جیسا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے ایک حکایت سنی ہے کہ ایک ہندو ریاست کے راجہ سے پنڈتوں نے شکایت کی کہ مسلمانوں کی اذان سے ہمارے دیوتا بھاگ جاتے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں سے کہا جائے کہ اذان آہستہ کہا کریں۔ راجہ نے وزیر کو مخاطب کر کے کہا ہمارا ایک گھوڑا توپ کی آواز سے بدکتا تھا تو ہم نے اس کی جھجک اس طرح نکالی تھی کہ اس کو توپ کے پاس بندھوا کر توپ سے فائر کئے گئے تو اس میں اس طرح کرنے سے اس کی جھجک دور ہو گئی۔ اسی طرح ہمارے دیوتا مسلمانوں کی اذان سے بھاگتے ہیں تو بڑی مشکل کی بات ہے۔ اگر مسلمانوں کو یہ راز معلوم ہو گیا تو جب ہم دیوتاؤں سے کچھ کہنے جایا کریں گے مسلمان زور سے اذان دے دیا کریں گے۔ اور دیوتا ہماری بات بھی نہ سن سکیں گے

لازم ہے کہ ان کی اس وحشت کو دور کیا جائے جس کا یہی طریقہ ہے کہ مسلمانوں سے کہا جائے کہ وہ ہمارے دیوتاؤں کے پاس کھڑے ہو کر بہت زور زور سے اذان دیا کریں تاکہ ان کی چمک دور ہو۔ یہ طریقہ مناسب نہیں کہ مسجدوں کی اذان کو بند کیا جائے یا آہستہ کیا جائے۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں پر ہمارا راز کھلے گا۔

اسی طرح اس وقت مسلمانوں کو جو مضمون مال سے گھبراہٹ ہے، اس کے رفع کرنے کے لئے بھی اسی تدبیر کی ضرورت ہے کہ اس قسم کے مضامین بار بار بیان کئے جائیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ وحشت رفع کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ سے چندہ مانگا جائے ہرگز نہیں۔ نہ اس وقت میرا یہ مقصود ہے نہ میرا جی چاہتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے پاس مال ہی کہاں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے ان آیات کے صحیح معنی بیان کر دیئے جائیں تاکہ ان کی گھبراہٹ اور وحشت رفع ہو جائے۔ یہ جو آپ کو مال کے بیان سے وحشت ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو ان آیات و احادیث کے صحیح معنی معلوم نہیں جس میں انفاق مال کا حکم ہے۔ ہمارے بھائی مسلمانوں کو زیادہ تر کھال کھسوٹوں سے پالا پڑا ہے۔ اس لئے یہ مال کے ذکر سے گھبراتے ہیں۔ اب چاہے کوئی واعظ کھال کھسوٹ بھی نہ ہو اس سے بھی اگر مال کا ذکر سنتے ہیں تو گھبراتے ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے میرا ایک بھتیجا ایک بار میرے وعظ میں بیٹھ گیا۔ گرمی کا موسم تھا۔ اس کو پیاس لگی اور وہاں پانی کا انتظام نہ تھا وعظ

دیر تک ہوا اور اُن کا پیاس کے مارے بُرا حال ہوا۔ اُس روز سے وہ وعظ سے ہی ڈر گیا۔ اب جب کبھی اُن سے کہا جاتا ہے کہ وعظ میں چلو گے، کہتا ہے تا، پیاسا مرنا پڑے گا۔

ایسے ہی ہمارے بھائی یہ سمجھتے ہیں کہ جس وعظ میں مال کا ذکر ہوگا ہماری کھال کھسوٹی جائے گی۔ صاحبو! قرآن و حدیث میں جو انفاق مال کی ترغیب ہے اُس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ ہر وقت مال خرچ کیا کرو، جب کسی واعظ کو انفاق مال کا وعظ کہتے ہوئے سنو اس کے بعد ہر جلسہ مال دینا تمہارے ذمہ ضروری ہو جائے گا۔ بلکہ شریعت نے اس کے لئے حدود و قواعد مقرر کئے ہیں اُن حدود و قواعد کے سننے سے معلوم ہوگا کہ نہ ہمیشہ مال خرچ کرنا ضروری ہے نہ ہر وعظ اور ہر جلسہ میں ضروری ہے بلکہ خاص وقت و حالت میں دینا ضروری ہے۔ اب مسلمانوں کا ذکر مال سے گھبرانا اور یہ سمجھنا کہ ایسے مواعظ کے سننے سے مال دینا پڑے گا ایسا ہے جیسے کوئی شخص مسہل سے اس واسطے گھبرائے کہ اس کے پینے سے ہمیشہ دست جاری رہیں گے کبھی بند ہی نہ ہوں گے۔ بتلائیے اگر کوئی مسہل کو ایسا سمجھے اور اس وجہ سے ہمیشہ مسہل سے ڈرے تو وہ غلطی پر ہے یا نہیں۔ یقیناً غلطی پر ہے یہی آپ کی حالت ہے۔

طلبِ منصب

اس پر مجھے کانپور کا ایک واقعہ یاد آیا کہ وہاں جمعہ کے دن ایک بزرگ آئے۔ اور انہوں نے خود درخواست کی کہ جمعہ کی نماز میں پڑھاؤں گا۔ مسجد والوں نے اُن کی درخواست

منظور کر لی۔ اوّل تو یہی بے قاعدہ کام ہوا کہ طالب کو امامت دی گئی جو قانون شریعت کے خلاف ہے۔ اسلام کی تعلیم ہے اور ہم بڑے فخر سے اس کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

طَالِبُ التَّوْلِيَةِ لَا يُوَلّٰى کہ طالب منصب کو کوئی منصب نہ دو۔

کوئی قوم اس حکم کی نظیر پیش تو کرے۔ انشاءاللہ اسلام کے سوا کسی مذہب میں یہ تعلیم نہ ملے گی۔ آج کل ساری دنیا کے بادشاہوں کو بھی یوں ہی دیکھا جاتا ہے کہ وہ طلب کرنے والوں ہی کو عہدے دیتے ہیں۔ ہر عہدہ کے لئے ان کے پاس سینکڑوں درخواستیں پہنچتی رہتی ہیں۔ انہی میں سے کسی ایک کو عہدہ مل جاتا ہے۔ منجملہ ان مناصب کے ایک منصب مولویوں کے واسطے بھی رکھا گیا ہے یعنی شمس العلماء کا خطاب یہ بھی گورنمنٹ خود کسی کو نہیں دیتی بلکہ جو شخص کوشش کرتا اور بہت سی سفارشیں پیش کرتا ہے اور روپیہ خرچ کرتا ہے اس کو یہ خطاب مل جاتا ہے۔ دنیا میں کیسا کایا پلٹ ہوا ہے کہ لوگ اپنے واسطے خود ہی لمبے چوڑے لقب تجویز کرتے ہیں اور حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم کو یہ لقب دے دو۔ اور حکومت بھی ایسی سخی ہے کہ ان درخواست کرنے والوں ہی کو خطاب دے دیتی ہے۔ کسی کو شمس العلماء کر دیا کسی کو بدر العلماء خطاب دے دیا۔

پھر یہ لوگ خطاب ملنے کے بعد قوم کی اصلاح شروع کر دیتے ہیں مگر ویسی ہی اصلاح جیسے حجام کیا کرتے ہیں۔ وہ تو بالوں کو مونڈتا ہے اور

یہ مسلمانوں کے دین کو مونڈنا شروع کرتے ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ وہ زائد بال کو مونڈتا ہے اور یہ اعلیٰ اجزائے دین کو۔

وجہ یہ کہ جو لوگ خود اپنے لیئے القاب کی کوشش کریں گے ان کا دیندار ہونا تو معلوم۔ ان کی لیاقت و قابلیت بھی معلوم۔ جو شخص واقع میں صاحب کمال ہوتا ہے اس کو ہرگز یہ فکر نہیں ہوتا کہ کوئی مجھے کیا کہتا ہے۔ نہ وہ اپنے لیئے القاب و خطابات تجویز کرتا ہے۔ یہ کام انہی لوگوں کا ہے کو حقیقی کمال حاصل نہیں۔ مگر ان لمبے چوڑے خطابات سے عوام دھوکا میں پڑ جاتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ نے جب ان کو شمس العلماء کا خطاب دیا ہے تو یہ بہت ہی بڑا عالم ہوگا۔ وہ ان کی تحقیقات کو علمی اور شرعی تحقیقات سمجھتے ہیں حالانکہ علم دین اور شریعت سے ان کو مس بھی نہیں ہوتا۔ غالب حالت اہل خطاب کی یہی ہے۔ شاذ و نادر کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس کو بدون درخواست کے خطاب مل جاتا ہے اور وہ واقع میں اس خطاب کا اہل ہوتا ہے، ورنہ عام حالت یہی ہے کہ یہ خطاب اکثر نااہلوں کو ملتا ہے اور ان کی درخواست اور کوشش کے بعد ملتا ہے۔

چنانچہ ایک شمس العلماء نے آج کل حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری لکھی ہے جس پر ان کی جماعت کو فخر و ناز ہے اور نو تعلیم یافتہ مسلمان محض اس وجہ سے کہ اس کا مصنف ایک خطاب یافتہ شمس العلماء ہے اس کو بہت شوق سے دیکھتے اور منگاتے ہیں۔ مگر ان کو خبر نہیں کہ یہ خطاب ایک جال ہے جس میں تاواقفوں کو پھنسایا جا رہا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

زانکہ صیاد آورد بانگ صفیر ۔ تا کہ گیرد مرغ را آں مرغ گیر

مدح میں قدح

میں نے اس سوانحعمری کا صرف ایک مقام اتفاقاً دیکھا ہے بس اسی سے مجھ کو مصنف کے دین کا حال معلوم ہو گیا اور اسی سے قیاس ہو سکتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ سوانح کیسی ہو گی۔ عنوان تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی مدح کا اختیار کیا ہے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا تو نام ہی ایسا ہے کہ سنتے ہی ہر مسلمان جان دینے کو تیار ہو جاتا ہے مگر مدح نبوی کے عنوان میں مضمون ایسا لکھا گیا ہے جس سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زوج مبارک کو سخت ایذا دی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم جامع کمالات تھے۔ آپ میں نبوت کے ساتھ سلطنت و انتظام کا بھی کامل مادہ تھا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سلطنت کا سلیقہ نہ تھا اسی لئے وہ جنگلوں میں پھرتے تھے۔ نوح علیہ السلام میں ترحم کم تھا اسی واسطے غرق کی دعا فرمائی۔

صاحبو! کیا یہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی مدح ہے کہ دوسرے انبیاء کی تحقیر و توہین کی جا رہی ہے۔ انبیاء علیہم السلام سب بھائی بھائی ہیں اور یقیناً ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی کی تحقیر کو گوارا نہیں کر سکتا۔ خصوصاً دیندار بھائی، خصوصاً انبیاء علیہم السلام جو کہ نفسانیت سے بالکل مبرا ہیں وہ ہرگز اپنی ایسی مدح سے خوش نہیں ہو سکتے جس میں ان کے دوسرے بھائی کی تنقیص کی گئی ہو۔

رہا یہ کہ ہم کو یہ کیسے معلوم ہوا کیسے کہ فلاں مدح میں دوسرے حضرات

کی تنقیص ہے۔ سو اس کا معیار یہ ہے کہ ہر بات میں یہ سوچ لیا کرو کہ اگر اس جلسہ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام تشریف فرما ہوں تو کیا ہم اس بات کو سب حضرات کے سامنے کہہ سکتے ہیں۔ اس معیار کے بعد میں کہتا ہوں کہ کیا یہ شخص ایسے مجمع میں جس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم بھی ہوں اور نوح علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام بھی ہوں۔ یہ بات کہہ سکتا ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جامع کمالات ہیں اور نوح علیہ السلام میں نعوذ باللہ رحم کا مادہ نہ تھا اور عیسٰی علیہ السلام کو سلیقۂ تمدن وسلطنت نہ تھا۔ یقیناً ایسے جلسہ میں اس بات کی کسی کو جرأت نہیں ہوسکتی۔ پس لامحالہ یہ تنقیص و توہین انبیاء میں داخل ہے۔

کمالاتِ انبیاء افسوس اس شخص نے محض اس وجہ سے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو اپنے زمانہ میں سلطنت کا موقع نہیں ملا یہ نتیجہ نکال لیا کہ ان میں اس کا سلیقہ ہی نہ تھا۔ کیا اس کو یہ معلوم نہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام تمام کمالات کے جامع ہوتے ہیں۔ ان میں ناقص کوئی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض بعض سے اکمل ہیں لیکن ناقص ان میں کوئی نہیں۔ کوئی نبی رحم سے خالی نہیں اور نہ کوئی سلیقہ سلطنت سے خالی ہے۔ ہر ایک میں تمام کمالات حسنہ موجود ہیں۔ لیکن ان کا ظہور حق تعالیٰ کے اذن پر ہے۔ انبیاء علیہم السلام اپنے ارادہ و اختیار کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ میں فنا کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ جس وقت اللہ تعالیٰ جس کمال کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ اسی کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ اسی کو ظاہر کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

من چو کلکم درمیان اصبعین ۔۔۔ نیستم در صف طاعت بین بین

اور ؎

خستہ از اسوال دنیا روز و شب ۔۔۔ چوں قلم در پنجۂ تقلیب رب

اُن کی مثال ایسی ہے جیسے قلم کہ قلم سب کچھ لکھ سکتا ہے مگر کب؟ جب کہ کوئی دوسرا ہاتھ میں لے کر اُس کو چلائے۔ پھر وہ وہی لکھے گا جو یہ شخص لکھنا چاہے گا۔ اگر وہ عربی لکھوانا چاہے تو یہ عربی لکھے گا۔ فارسی لکھوانا چاہے تو فارسی لکھے گا۔ اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس قلم سے عربی لکھی گئی ہے وہ فارسی نہیں لکھ سکتا یا بالعکس۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہی کہا جائے گا کہ جس کے ہاتھ میں قلم تھا اُس نے عربی ہی لکھوائی تھی اگر وہ فارسی لکھواتا تو قلم میں اس کی بھی قابلیت تھی۔

یوں ہی انبیاء علیہم السلام کو سمجھو کہ اُن میں تمام اخلاق حمیدہ و ملکات فاضلہ موجود ہیں مگر حق تعالیٰ جس وقت جس ملکہ سے کام لینا چاہتے ہیں اس وقت وہ اسی ملکہ سے کام لیتے ہیں۔ اس سے دوسرے ملکات کی نفی پر استدلال کرنا اس مؤرخ کی عقلمندی ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اب تک حق تعالیٰ نے انتظام سلطنت کا کام نہیں لیا۔ اس لئے یہ ملکہ ظاہر نہیں ہوا لیکن جس وقت وہ آخر زمانہ میں تشریف لائیں گے اور بہت بڑی سلطنت کریں گے جس کی مدح و ثنا خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام میں سلطنت کا سلیقہ ایسا ہے کہ کوئی بادشاہت بھی اُن جیسی نہ ہوگی معلوم ہوا کہ انتظام سلطنت و تمدن کا سلیقہ اُن میں اُس

وقت بھی بدرجہ اُتم موجود تھا مگر ظہور نہیں ہوا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر کرنا نہیں چاہا۔ آخیر زمانہ میں اس کا ظہور ہو جائے گا۔

اگر عیسیٰ علیہ السلام میں اس وقت یہ ملکہ موجود نہیں تھا تو کیا آسمان میں رہ کر یہ سلیقہ حاصل ہو گیا۔ وہاں تو سارے فرشتے نیک ہی ہیں۔ نہ وہاں کوئی مفسد نہ چور نہ کافر نہ مشرک نہ وہاں ٹیکس کی ضرورت ہے نہ فوج کی، نہ محصول لینے کی نہ قواعد حرب سکھلانے کی۔ ایسی جگہ رہ کر سلطنت کا طریقہ کیونکر آ گیا اور اگر کہو کہ حق تعالیٰ نے سکھلا دیا یا فرشتوں نے بتلا دیا تو یہ بات تو ان کو زمین میں رہ کر بھی حاصل تھی۔ کیونکہ وہ نبی اولوالعزم ہیں جن کے پاس جبرئیل علیہ السلام ہمیشہ آتے رہتے تھے۔ پھر اس مؤرخ نے ان کو سلیقہ تمدن و سلطنت سے کیوں خالی مانا۔

اب بتلایئے اس سوانح عمری کا پڑھنا اور دیکھنا اور خریدنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ نص میں صاف حکم موجود ہے۔

إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا۔

جب (کسی محفل میں یا کسی جگہ) اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر انکار ہوتے ہوئے یا ہنسی مذاق ہوتے ہوئے سنو تو نہ بیٹھو ایسے لوگوں کے ساتھ یہاں تک کہ کسی دوسری بات میں مشغول ہوں (اگر ایسا نہ کرو گے) تو تم بھی انہی جیسے ہو گے۔ بیشک اللہ تعالیٰ منافقوں

اور کافروں کو دوزخ میں ایک جگہ اکٹھا فرمائے گا۔

یعنی جب آیات اللہ و احکام الہیہ کے ساتھ کفر و استہزا ہو رہا ہو تو تم وہاں نہ بیٹھو جب تک یہ بیہودہ گفتگو ختم ہو کر دوسری بات شروع نہ ہو اگر تم کفر و استہزار کی باتوں کو سنو گے تو تم بھی انہی کے مثل ہو گے جو کفر و استہزا کے مرتکب ہیں اور یہ حکم ان لوگوں کے لئے ہے جو ان باتوں کے بند کرنے پر قدرت نہ رکھتے ہوں۔ اور جس کو قدرت ہو اُن کے لئے یہ حکم ہے کہ ان لوگوں کا منہ بند کر دے اور ایسی کتابوں کی اشاعت روک دے اُن کو ضبط کر کے ضائع کر دے۔ مگر ظاہر ہے کہ ہم کسی کا منہ بند نہیں کر سکتے نہ کسی کتاب کو ضبط کر کے ضائع کر سکتے ہیں۔ یہ کام حکومت کا ہے۔ واقعی حکومت بھی عجیب چیز ہے۔ ہمارے مولانا کا ارشاد ہے ؎

اَلْوَعْظُ یَنْفَعُ لَوْ بِالْعِلْمِ وَالْحِکَمِ
وَالسَّیْفُ اَبْلَغُ مِنْ وَاعِظٍ عَلَی الْقِمَمِ

حقیقت میں سیف سب سے بڑا واعظ ہے مگر جب یہ نہیں تو اب وہی حکم ہے کہ ایسی باتوں کو سنو ہی نہیں اور جن کتابوں میں ایسی خرافات ہوں ان کو دیکھو نہیں نہ خریدو نہ اُن کی اشاعت کرو۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج کل حالت یہ ہے کہ طالبوں کو عہدے اور خطاب دیئے جاتے ہیں۔ اس پر گفتگو طویل ہو گئی اور شریعت کا قانون یہ ہے کہ جو شخص عہدہ کا طالب ہو اُس کو ہرگز مت دو۔ کیونکہ وہ خود غرض ہوگا۔ تو کانپور کی جامع مسجد میں اوّل تو یہی کام بے قاعدہ ہوا کہ طالب کو

امامت دی گئی مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ بزرگ طالب امامت ہونے کی وجہ سے بزرگ نہ رہے۔ نہیں وہ واقعی بزرگ تھے۔

بزرگوں کی قسمیں

مگر بزرگ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو کامل نائب رسول صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ حضرات بھولے نہیں ہوتے بلکہ ہوشیار ہوتے ہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام سب ہوشیار تھے۔ کوئی نبی بھولے نہیں ہوئے انبیاء علیہم السلام کا اعقل الناس ہونا کفار کو بھی مسلّم ہے بلکہ وہ ہم سے زیادہ انبیاء کی عقل کے معتقد ہیں کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے جو کچھ کارنمایاں ہوئے ہم تو ان کو خدا تعالیٰ کا کیا ہوا سمجھتے ہیں اور مخالف سارا کام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا سمجھتا ہے اور سب کارناموں کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی عقل و تدبیر کا نتیجہ بتلاتا ہے۔ تو وہ ہم سے زیادہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی عقل و دانشمندی کا معتقد ہے۔ ہم تو قرآن کو جو عقول کو حیران کرنے والا کلام ہے اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھتے ہیں اور مخالف اس کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی تصنیف بتلاتا ہے۔ تو بتلائیے وہ ہم سے زیادہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی عقل کا معتقد ہے یا نہیں؟

ایک بزرگ وہ ہیں جو مقام نبوت کے وارث نہیں بلکہ مقام ولایت کے وارث ہیں۔ ان میں بعض بھولے ہوتے ہیں بعض مجذوب بھی ہوتے ہیں۔ گو وہ بزرگ بھولے تھے۔ انہوں نے سادگی کے طور پر امامت کی درخواست کی تھی۔ تکبر اس کا منشا نہ تھا اور گرمی سخت پڑ رہی تھی اور بزرگ صاحب نے سورۂ قٓ کی تلاوت نماز میں شروع کر دی۔ پھر بعض لوگ تو ایسی روانی سے

پڑھتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دریا بہتا ہوا جا رہا ہے۔ ایسے شخص کی طویل قرأت بھی گراں نہیں ہوتی بلکہ لذیذ ہوتی ہے مگر بزرگ صاحب نے ایسی ترتیل کی کہ لفظ لفظ کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے۔ آخر لوگوں کی یہ حالت ہوئی کہ بعض کو تھے ہو گئی۔ کسی کو چکر آ گیا۔ اور ایک آدمی کا عجیب قصہ یہ ہوا کہ وہ نیا نمازی تھا اس کو بعض لوگ گھیر گھار کر نماز کے لئے لائے تھے۔ جب بزرگ صاحب نے سورۂ ق شروع کی اور کھڑے کھڑے دیر ہو گئی تو وہ نیت توڑ کر یہ کہہ کر چل دیا کہ اسی واسطے تو ہم نماز نہیں پڑھتے۔

تو جیسے یہ نیا نمازی ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ کر سب کو انہی پر قیاس کر کے نماز ہی سے ڈر گیا اسی طرح ہمارے بھائی کھال کھسوٹوں کے بیانات چندہ کے متعلق سن کر سب سے ڈر گئے۔ اور اب وہ کسی کی زبان سے اتفاقیہ اس کا مضمون سننا نہیں چاہتے اور واقعی جن واعظوں سے ان کا پالا پڑتا ہے ان کا بیان ہے ہی ڈرنے کے قابل۔ یہ لوگ اس بری طرح سے مسلمانوں کے پیچھے پڑتے ہیں کہ سامعین کو خواہ مخواہ ذلیل ہونا پڑتا ہے

چنانچہ ایک جلسہ میں ایک مولوی صاحب نے چندہ کے لئے بڑی کوشش اور تقریر میں بہت ہی زور لگایا مگر کسی نے کچھ بھی نہ دیا۔ تو مولانا کیا کہتے ہیں کہ افسوس علماء کی قدر رنڈی کے برابر بھی نہیں۔ اگر اتنی دیر کوئی رنڈی ناچتی گاتی تو اس کے اوپر ہزاروں روپیہ نثار کیا جاتا۔

آہ! بھلا غور تو کیجئے۔ کیا یہ مضمون تہذیب سے خارج نہ تھا۔ کیا اس میں اس شخص نے علماء کو اور مسلمانوں کو ذلیل نہیں کیا۔ اب ایسے بیانات سن کر عوام

اگر چندہ کے نام سے نذریں تو گیا کریں۔ عوام کا کچھ قصور نہیں۔ اس میں زیادہ قصور ایسے معززوں کا ہے جو یوں تہذیب سے باہر ہو کر چندہ مانگتے ہیں۔ البتہ عوام کا اتنا قصور ضرور ہے کہ انہوں نے سب علماء کو اپنی کھال کھسوٹوں پر قیاس کر لیا اور بعض تو شریعت کے اس حکم انفاق سے ہی ڈر گئے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے دلوں سے یہ خوف نکالا جائے اور ایک حکم شرعی سے جو ان کو انقباض ہو گیا ہے اُس کو نکالا جائے۔ جس کی صورت صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے احکام شرعیہ کے صحیح مطالب بیان کئے جائیں۔

ترغیبِ انفاق

میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر احکام شرعیہ اپنی اصلی صورت میں پیش کئے جائیں تو ہرگز کسی مسلمان کو اُن سے انقباض نہیں ہو سکتا۔ بھلا جس نبی کی یہ تعلیم ہو۔

اَلَا لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسٍ مِنْهُ۔ کہ کسی مسلمان کا مال بدون اس کے طیب قلب کے لینا حلال نہیں ہے۔

اُن کے احکام سے کسی کو وحشت اور گھبراہٹ کیونکر ہو سکتی ہے اور جس خدا کا یہ ارشاد ہے۔

وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا یُؤْتِکُمْ اُجُوْرَکُمْ وَلَا یَسْئَلْکُمْ اَمْوَالَکُمْ

یعنی اگر تم ایمان اور تقویٰ اختیار کرو تو تم کو اجر و ثواب دیا جائیگا اور اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے مال نہیں مانگیں گے۔

اُن کے احکام سے کون منقبض ہو سکتا ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ ہمارے اپنے

پتز سے لکھو لیتے ہیں۔

يَسْئَلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے مال مانگنے لگیں پھر اصرار کے ساتھ مانگیں تو تم بخل کرنے لگو۔ اور (اس وقت) اللہ تعالیٰ تمہاری ناگواری ظاہر کر دے پس اس سے بے فکر رہو۔

اللہ تعالیٰ تم سے تمہارا مال زور ڈال کر نہیں مانگتے اور صدقات واجبہ کی مقدار اتنی قلیل ہے کہ اُن میں ناگواری کا احتمال ہی نہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہے

هَاۤ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ۔

تمہاری تو یہ حالت ہے کہ تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے سو اس پر بھی بعضے تم میں سے بخل کرتے ہیں

یعنی تم سے لپیٹ کر سوال نہیں کیا جاتا۔ صرف ترغیب دی جاتی ہے جس کا نفع تمہاری ہی طرف عائد ہوتا ہے۔ چنانچہ شریعت نے جن مصارف میں صرف کی ترغیب دی ہے اُن کے معلوم ہونے کے بعد اس کا یقین ہو جائے گا کہ آخرت کا نفع تو جدا رہا دنیا میں بھی ان مواقع میں صرف کرنا نافع ہے۔ پھر بھی بہت لوگ بخل کرتے ہیں۔ آگے نہایت استغنا سے فرماتے ہیں۔

وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ۔ کہ جو کوئی انفاق فی سبیل اللہ سے بخل کرتا ہے وہ (درحقیقت) خود اپنے سے بخل کرتا ہے۔ (یعنی اپنے ہی کو نفع دائمی سے

محروم کرتا ہے خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا)

وَاللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اور اللہ تو کسی کا محتاج نہیں بلکہ تم سب اُس کے محتاج ہو۔

پس تمہارے بخل کرنے سے یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ نعوذ باللہ خدا کو کچھ ضرر پہنچے گا بلکہ خود تم کو ہی ضرر پہنچے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جن مواقع میں صرف کی ترغیب دی ہے تمہاری ہی مصلحت کے لیئے اور تمہارے ہی نفع کے لیئے دی ہے۔

اس میں بخل کرنا ایسا ہے جیسے کسی مریض کو طبیب نسخہ لکھ کر دے اور کہے کہ یہ چار روپے کا نسخہ ہے۔ چار روپے خرچ کر کے اس کو بنالو۔ اس پر مریض کہے کہ میں تو چار روپے خرچ نہ کروں گا۔ تو حکیم کہے گا بھائی میرا کیا نقصان ہے۔ اگر تم اس میں بخل کرو گے اپنی ہی جان سے بخل کرو گے۔

غرض اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کسی سے مال مانگتے نہیں صرف ترغیب دیتے ہیں۔ وہ بھی ایک قلیل حصہ کی جو زیادہ نہیں پھر وہ ترغیب دے کر تم کو لپٹتے نہیں بلکہ نہایت استغنا سے فرماتے ہیں کہ جو بخل کرے گا اپنے ہی سے بخل کرے گا۔ اپنے ہی کو دولت ابدیہ سے محروم کرے گا۔

ایک عجیب سوال وجواب

اب یہاں یہ سوال ہوگا کہ اللہ تعالےٰ نے نعمت آخرت کو انفاق مال پر ہی کیوں موقوف کیا۔ مُفت ہی دے دیتے۔ وہ تو ایسا بھی کر سکتے تھے۔

جواب یہ ہے کہ ؎

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد   گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

جو شخص کوئی چیز مفت پا لیتا ہے اُس کی قدر نہیں ہوتی۔ ہم نے ارزاں خروں کی حکائتیں سنی ہیں کہ ایک شخص پچاس روپیہ کی شال سے دو روپیہ کا جوتا صاف کر رہا تھا۔ کسی نے ملامت کی کہ ایسی قیمتی شال کی تم نے کیسی بے قدری کی۔ کہنے لگا بات یہ ہے کہ جوتا تو میرا خریدا ہوا ہے اور شال میراث میں باپ کے ترکہ سے ملی ہے۔

ارزاں خر پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک ولائتی سے کسی رئیس نے گھوڑے کی قیمت سن کر کہا تھا کہ تم بڑے گراں فروش ہو۔ اُس نے بے ساختہ جواب دیا کہ تم بڑے ارزاں خر ہو۔ غرض مفت کی چیز کی قدر نہیں ہوتی۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے ایک کتاب طبع کے لئے عطا فرمائی تھی کہ اس کو چھاپ کر شائع کر دینا۔ پھر فرمایا کہ کسی کو مفت مت دینا کیونکہ مفت کی قدر نہیں ہوتی بلکہ کچھ قیمت رکھ دینا چاہیے دو تین ہی پیسہ ہو اسی طرح بے شک حق تعالیٰ قادر ہیں کہ آپ کو مفت ہی سب کچھ نعمتیں دیدیں کہ آپ کو نہ مال خرچ کرنا پڑے نہ محنت کرنا پڑے۔ مگر ان قیود میں یہ حکمت ہے کہ اس سے نعمت کی قدر ہوتی ہے اور نہ معلوم کیا کیا حکمتیں ہوں گی۔ یہ حکمت تو کھلی ہوئی ہے جس کو ہم جیسے بھی سمجھتے ہیں اور اگر غور کیا جائے تو واللہ حق تعالیٰ تو اب بھی آپ کو مفت ہی سب نعمتیں عطا فرماتے ہیں کیونکہ جو نعمتیں انفاق مالی کے بعد ملتی ہیں صرف ظاہر میں وہ مفت نہیں معلوم ہوتیں

مگر حقیقت میں مفت ہی ملی ہیں۔ کیونکہ جو مال آپ نے خرچ کیا ہے بتلایئے وہ کہاں سے آیا اور کس نے دیا۔ یقیناً وہ حق تعالیٰ کا مال ہے اور حق تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔

تدبیر و تقدیر

اگر کوئی یہ سمجھے کہ یہ تو میری تدبیر و سلیقہ سے حاصل ہوا ہے جیسا کہ قارون نے کہا تھا۔ قال انما اوتیتہ علی علم عندی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان تدبیروں کو راست کس نے کیا کیونکہ بہت لوگ تم سے زیادہ تدبیریں کرتے ہیں مگر ان کو خاک بھی نہیں ملتا دو طالب علم بی اے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بعض دفعہ اساتذہ اور سب طلبا یہ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں سے زید زیادہ لائق ہے اور وہ نمبر اول میں پاس ہوگا مگر نتیجہ امتحان میں اس کے خلاف ظاہر ہوتا ہے کہ زید فیل ہو جاتا اور عمرو جو اس سے کم درجہ میں ہے پاس ہو جاتا ہے۔ بتلایئے عمرو کی تدبیر کو کس نے راست کیا اور زید کو کس نے ناکام کیا۔ اگر تدبیر پر ہی مدار تھا تو زید کو نمبر اول ہونا چاہیے تھا۔ مگر مشاہدہ بارہا اس کے خلاف ہوتا ہے اسی طرح دو شخص تجارت کرتے ہیں جن میں ایک تعلیم یافتہ اور ہوشیار ہے دوسرا بیوقوف اور جاہل ہے۔ تدبیر کا مقتضا یہ تھا کہ تعلیم یافتہ کی تجارت بیوقوف سے زیادہ چلتی مگر مشاہدہ بارہا اس کے خلاف ہوتا ہے کہ جاہل کی تجارت بڑھ جاتی اور ہوشیار تعلیم یافتہ کو نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔

اسی طرح آپ غور کریں گے تو زراعت اور ملازمت وغیرہ تمام امور میں ایسی صدہا نظائر دیکھیں گے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض تدبیر

کافی نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ تدبیر راست بھی ہو جائے اور یہ بات سوا خدا کے کسی کے قبضہ میں نہیں ورنہ اپنی تدابیر کا راست ہونا کون نہیں چاہتا پھر سب کے سب مقصود میں کامیاب ہی ہوا کرتے ناکام کوئی نہ رہتا۔ حالانکہ مشاہدہ یہ ہے کہ سو تدبیر کرنے والوں میں بیس تیس کامیاب ہوتے ہیں اور زیادہ ناکام ہوتے ہیں۔ اب اگر یہ کامیاب ہونے والے اپنی کامیابی کو تدبیر کا ثمرہ سمجھیں، تو یہ محض ان کی حماقت ہے۔ ان کو سوچنا چاہیئے کہ تدبیر وہ لوگ بھی کر رہے تھے جو ناکام ہوئے۔ پھر اس کی کیا وجہ کہ وہ ناکام ہوئے اور ہم کامیاب ہو گئے یہ سب گفتگو ان لوگوں کے واسطے ہے جو سائنس کے معتقد ہیں ورنہ مسلمان تو سب کے سب ہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ محض تدبیر مؤثر نہیں بلکہ تدبیر کے راست ہونے کے لئے تقدیر کی موافقت کی بھی شرط ہے اور تقدیر مشیت الٰہیہ ہی کا نام ہے۔

اہل سائنس ناز کرتے ہیں کہ ہم نے ایسی ایسی چیزیں ایجاد کی ہیں جن کی پہلے لوگوں کو خبر بھی نہ تھی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر حقیقت میں تم ہی موجد ہو تو بتلاؤ کہ جس ایجاد کو تم نے ایک سال کے غور و فکر کے بعد ظاہر کیا ہے اس میں ایک سال کیوں لگا۔ اگر تمہارے قبضہ میں سب کام تھا تو ایک ہی دن میں یہ ایجاد کر لی ہوتی اور یہی ایک کیا بلکہ جو چیز ایجاد کرنا چاہو ایک دن بلکہ ایک ساعت بلکہ ایک منٹ میں ایجاد کر لیا کرو۔ کیونکہ سب کام تمہارے قبضہ میں ہے پھر دیر کی کیا وجہ؟ مگر ظاہر ہے کہ یہ بات کسی کے قبضہ میں نہیں کہ جب چاہے جو کچھ چاہے ایجاد کر لے بلکہ زمانہ دراز تک غور و فکر کرنے کے بعد ایجاد سمجھ میں آتی ہے اب

بتلاؤ جس وقت بات سمجھ میں آئی ہے وہ تمہارے اختیار سے سمجھ میں آئی ہے یا بلا اختیار خود بخود دل میں آ گئی۔ اگر کہو اختیار سے سمجھ میں آئی تو اختیار تو ایک سال پہلے بھی موجود تھا اس وقت کیوں نہ سمجھ لیا یقیناً کہو گے کہ دفعتہً بلا اختیار سمجھ میں آئی ہے بس یہی تقدیر ہے اور حق تعالیٰ ہی کے سمجھانے سے تمہارے ذہن میں یہ ایجاد آئی ہے۔ کیونکہ اُن کی عادت ہے کہ جب انسان کسی کام کے لئے کوشش کرتا ہے اور اپنی سی کوشش صرف کر دیتا ہے تو وہ امداد فرماتے ہیں۔ بہر حال یہ کسی کا منہ نہیں کہ اپنے مال و متاع کو اپنی تدابیر کا نتیجہ اور عقل کا ثمرہ سمجھے۔ ہر شخص کو عاجز و لاچار ہو کر ماننا پڑے گا۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ حق کا دیا ہوا ہے یعنی حق تعالیٰ کا۔ اب فرمائیے اگر آپ خدا کا دیا ہوا مال اللہ کے راستے میں تھوڑا سا صرف کر دیں اور اس کے بعد آپ کو ثواب اور نعمت عظمیٰ عطا کی جائے تو یہ نعمت مفت ملی یا نہیں۔ یقیناً مفت ملی۔

جنت کی کنجی

مگر انسان کی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ اُس کی ناتمام تدبیر کے بعد جو کچھ اُسے ملتا ہے یہ اُس کو اپنا مال سمجھتا ہے۔ حق تعالیٰ نے بھی ظاہراً اس کے جذبہ کی رعایت فرمائی ہے کہ اس کے مال کو اسی کا مال کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہم تم سے تمہارے مال نہیں مانگتے ہاں اللہ کے راستہ میں جس نے تم کو یہ مال دیا ہے کچھ خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں جس کا نفع تم ہی کو ملے گا۔ مگر انسان کا اس سے بھی دل دکھتا ہے۔ تم چاہتے ہو کہ یہ حکم بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا تاکہ دل بھی نہ دکھتا تو یہ نہیں ہو سکتا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہمارا ہی ہے۔ ہم نے ہی تم کو دیا ہے اور

ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ بدون تمہارا مال دکھائے جنت دے دیں مگر ایسا نہ ہوگا۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْا اَنْ يَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔

کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اتنا کر کے چھوٹ جائیں گے کہ ہم تو ایمان لے آئے ہیں اور اُن کے اعمال کی آزمائش نہ ہوگی۔

کیا تمہارا امتحان بھی نہ کیا جائے۔ تم کو آزمایا بھی نہ جائے۔ یاد رکھو مال ہمارا ہی ہے مگر تم اپنے ہاتھ سے دو جبھی جنت ملے گی۔

حضرت غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا حق تعالیٰ نے جنت پر قفل تو لگا رکھا ہے مگر قفل کے اندر کنجی بھی موجود ہے۔ بس ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ کنجی کو گھما دیں قفل کھل جاوے گا۔ پھر سب نعمتیں ہمارے ہی واسطے ہیں یعنی حق تعالیٰ نے جن کاموں پر جنت کو موقوف کیا ہے اُن کے اسباب بھی سب ہم کو خود ہی عطا فرما دیئے۔ مال خرچ کرنے پر بعض نعمتیں موقوف ہیں تو مال ہم کو خود ہی دیا۔ نماز پڑھنے پر بعض نعمتیں موقوف ہیں تو ہاتھ پیر زبان اور ارادہ و اختیار ہم کو عطا کر دیا اور اس کے بعد دل میں داعیہ بھی خود ہی پیدا کر دیا۔ بس ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ اس داعیہ کا اتباع کریں مخالفت نہ کریں اب بتلائیے میرا یہ کہنا صحیح ہے یا نہیں کہ قفل تو ہے مگر قفل کے اندر کنجی بھی لگ رہی ہے۔ صرف گھمانے کی دیر ہے۔ اگر کوئی اتنا بھی نہ کرے تو وہ نہایت کام چور ہے۔

مصیبت و راحت

اس پر مجھے ایک کام چور کی حکایت یاد آئی وہ ایک بزرگ کے پاس رہتا تھا اور یوں چاہتا تھا کہ میرا کام صرف توجہ و تصرف سے بن جائے کچھ کرنا نہ پڑے۔ شیخ نے بہت سمجھایا کہ کچھ کام کرو اور تصرف کے بھروسا پر رہنے سے منع فرماتے تھے کہ اس کو یہ وسوسہ ہو گیا کہ شیخ صاحب تصرف نہیں۔ حالانکہ اگر ایسا بھی ہو تو کچھ نقص نہیں۔ مگر چونکہ وہ صاحب تصرف بھی تھے اس لئے انہوں نے اس خطرہ کو دفع کرنا چاہا۔ ایک روز مسجد کے دروازہ پر ایک مٹکہ میں پانی بھر کر اور ایک پچکاری لے کر بیٹھ گئے اور راہگیروں پر پانی ڈالنا شروع کیا۔ جس پر پانی پڑتا تھا وہ بے اختیار کلمہ پڑھنے لگتا تھا۔ سینکڑوں کافروں نے کلمہ پڑھ لیا۔ پھر اس مرید کو بلا کر فرمایا کہ تصرف تو اللہ تعالیٰ نے ایسا دیا ہے مگر تجھ کو چکی ہی پسوا کر دوں گا۔ تجھے بدون محنت کے نہ دوں گا۔ تو ابتدا ہی سے کندھے سے جوا ڈال کر پھینکنا چاہتا ہے۔ ارے تھوڑا بہت خود بھی تو کچھ کیا ہوتا اس کے بعد ہی شیخ کامل کے کمال پر بھروسا کرتا۔ یہ کیا کہ شروع ہی سے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ گئے۔

تو یاد رکھو جو شخص کچھ تھوڑا بہت کام کرتا ہے اس کو تو اللہ تعالیٰ مفت بھی دولت دے دیتے ہیں باقی کام چوروں کو مفت نہیں ملا کرتی۔ (اِلَّا نَادِرًا وَالنَّادِرُ مُلْحَقٌ بِالْعَدَمِ)

ایک دفعہ مجھے بھی اس خیال نے ستایا تھا۔ طریق میں سے مجھے ایک الجھن پیش آئی۔ اس وقت خیال ہوا کہ ہم میں طلب بھی ہے گو ناقص سہی اور حق تعالیٰ کو ہماری طلب کا علم بھی ہے۔ اور وہ طلب ناقص کے بھی قدر دان ہیں

اور اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی کامل ہے اور قدرت بھی کاملہ ہے۔ وہ جلدی بھی طالب کا کام بنا سکتے ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ جلدی سے واصل نہیں کر دیتے۔ اس خطرہ کا جواب میرے ذہن میں کچھ نہ آیا تو میں نے بسم اللہ کر کے مثنوی کھولی میں اس کا معتقد نہیں کہ مولانا کی روح آتی ہے اور وہ تصرف کرتی ہے بلکہ صرف یہ خیال ہے کہ مثنوی ایک مقبول بندہ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں تسلی کی بات ہم کو بتلا دیتے ہیں۔ چنانچہ بسم اللہ کر کے جو مثنوی کھولی تو یہ اشعار نکلے جو بعینہ میرے سوال کا جواب تھے ۔

چارہ می جوید پئے من درد تو

اس میں طلب کو تسلیم کیا گیا ہے ۔

می شنیدم دوش آہِ سردِ تو

اس میں طلب کے علم کا ذکر ہے ۔

می توانم ہم کہ بے ایں انتظار رہنمایم وا دہم راہ گذار

اس میں قدرت کا بیان ہے کہ تم کو بدون انتظار کے بھی مقصود تک جلدی ہی پہنچا سکتے ہیں ۔

تا ازیں طوفان و دوراں وارہی برسرِ گنج وصالم پا نہی

تاکہ تم پریشانی سے محفوظ رہو اور راحت کے ساتھ پہنچ جاؤ۔ پھر ہم تم کو انتظار میں کیوں ڈالتے ہیں اور جلدی کیوں نہیں پہنچاتے۔ اس کی وجہ سنو ۔

لیک شیرینی و لذاتِ مقر ہست بر اندازۂ رنج سفر

آنگہ از فرزند و خویشاں برخوری کز غریبی رنج و محنت ہا بری

کہ منزل پر پہنچ کر لذت اور خوشی اپنی قرارگاہ کی اسی قدر حاصل ہوتی ہے جتنی سفر میں تکلیف پیش آتی ہے۔ جس کو سفر میں جتنی مشقت ہوگی منزل پر پہنچ کر اتنی ہی راحت ہوگی۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

جواب کا حاصل یہ تھا کہ سارے مقدمات تو تمہارے ذہن میں آ گئے مگر یہ مقدمہ ذہن میں نہ آیا کہ اللہ تعالیٰ حکیم بھی ہیں۔ حکمت کا مقتضا یہی ہے کہ انتظار کے بعد دولت دی جائے جلدی نہ دی جائے تاکہ مصیبت کے بعد راحت کی قدر ہو۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ہم بارات میں کیرانہ گئے تھے۔ راستہ میں لوٹتے ہوئے بارش زور سے ہونے لگی۔ تمام جنگل پانی سے بھر گیا۔ رات ہوگئی۔ سخت پریشانی ہوئی بس اس وقت یہ شعر ہماری حالت کا ترجمان تھا

شبِ تاریک و بیم موج گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبک سارانِ ساحل ہا

اور یہ حالت ہے۔

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا۔

گھر بہت دور نہ تھا۔ صرف چار پانچ کوس رہ گیا تھا مگر اس مصیبت کی

وجہ سے وہ چار کوس طے ہونا مشکل ہو گئے۔ اس کے بعد خدا خدا کر کے جب گھر پہنچے تو گھر پر پہنچنے کی لذت مجھے اب تک یاد ہے کہ اس وقت کیسی راحت اور چین حاصل ہوئی تھی۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

آنگہ از فرزند و خویشاں برخوری   کز غریبی رنج و محنت ہا بری

تو جس کو سلوک میں جتنی زیادہ پریشانی ہوگی اتنی ہی وصول کے بعد اُس کو راحت ہوگی اور اس نعمت کی بڑی قدر کرے گا۔ اسی طرح جس کو دنیا میں زیادہ کلفت ہوگی۔ آخرت میں اتنی ہی راحت اور جنت کی قدر ہوگی۔

میں نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ حضرت جب سارے جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے اور جنت پھر بھی خالی رہے گی اور حق تعالیٰ سے وہ عرض کرے گی کہ مجھے بھر دیجئے کیونکہ آپ نے مجھے بھرنے کا وعدہ فرمایا تھا تو حق تعالیٰ جنت کو بھرنے کے لئے اُسی وقت ایک نئی مخلوق کو پیدا فرمائیں گے تو یہ نئے لوگ بہت اچھے ہوں گے کہ ان کو مفت جنت مل گئی۔ فرمایا کیا اچھے ہوں گے اُن کو جنت سے خاک بھی لذت نہ ہوگی۔ وہ تو سمجھیں گے کہ زندہ ہو کر یوں ہی چین ہونا ہوگا۔ جیسا جنت میں ہو رہا ہے۔ اچھے انشاء اللہ تعالیٰ ہم ہوں گے کہ جنت میں دنیا کی تکالیف جھیل کر پہنچیں گے۔ ہم کو جنت کی نعمتوں سے زیادہ حظ آئے گا کہ وہاں قدم رکھتے ہی بے ساختہ زبان سے نکلے گا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ
الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ

وَلٰکِنْ یُمْسِکُنَا فِیْہَا لُغُوْبٌ۔

دنیز ہم کو مجاہدہ اور طاعات دنیویہ کی وجہ سے قرب حق اور معرفت بھی اُن سے زیادہ ہو گی۔) پس جن لوگوں کو دنیا میں زیادہ سامانِ عیش نہیں دیا گیا وہ پریشان نہ ہوں بلکہ خوش ہوں کہ اُن کو امراء سے زیادہ جنت میں راحت ہو گی۔

زیادتِ مال کے اثرات

دوسرے یہ کہ زیادہ سامان تم کو دے دیا جاتا تو تم دنیا ہی کے ہو رہتے خدا کی یاد سے غافل ہو جاتے۔ آج کل مسلمانوں کی رال ٹپکتی ہے دوسری قوموں کے سامانِ عیش کو دیکھ کر مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ خیر اور سلامتی اسی میں ہے کہ ان کو دنیا زیادہ نہ ملے۔ اگر ہم کو زیادہ مال دیا جاتا تو رات دن دنیا ہی کی فکر میں رہتے۔ آخرت سے بالکل غافل ہو جاتے۔

کانپور میں دو شخص شب قدر میں ایک بڑا سا ڈھیلہ رومال سے ڈھک کر بیٹھے اور رات بھر دُعا کرتے رہے کہ اسے اللہ اس کو سونا بنا دے۔ وعظ میں کسی مولوی سے سُن گئے تھے کہ شب قدر میں دُعا قبول ہوتی ہے۔ وہ ظالم یہ دُعا کرنے بیٹھے۔ صبح کو خوشی خوشی جو رومال کھولا تو وہ ڈھیلا کا ڈھیلا ہی تھا۔ بڑے حیران ہوئے کہ شب قدر میں دُعا کیوں قبول نہ ہوئی۔ ایک درزی نے کہا کہ اللہ میاں حکیم ہیں۔ وہی دُعا قبول فرماتے ہیں جو بندہ کے لئے مصلحت ہو خدا کا شکر کرو کہ یہ سونا نہ بنا ورنہ تم آپس ہی میں مر کٹ جاتے۔

واقعی سچ کہا بعض لوگوں کے لئے یہی حکمت ہے کہ اُن کو سامانِ عیش

زیادہ نہ دیا جائے۔

اس پر شاید ان کو یہ شبہ ہو کہ ہماری نیت تو یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ ہم کو سامان زیادہ دیں تو خوب نیک کام کریں اور اللہ کے راستہ میں خوب خرچ کریں، تو وہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ تم کو کیا خبر ہے کہ اس وقت جو ارادے اور نیتیں ہیں زیادہ مال ملنے کے بعد بھی باقی رہیں گی یا نہیں۔ اس کو تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

حضرات صحابہ سے بڑھ کر خوش نیت کون ہوگا مگر حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ سے فرمایا کہ تمہاری کیا حالت ہوگی جب میرے بعد ممالک و بلاد مفتوح ہوں گے اور تمہارے پاس کثرت سے مال ومتاع اور غلام و خادم ہوں گے۔ صحابہ نے کہا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس وقت ہم اللہ کی عبادت کے لئے فارغ ہو جائیں گے۔ نَتَفَرَّغُ لِلْعِبَادَةِ وَنُكْفَى الْمُؤْنَةَ۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں تمہاری یہی حالت اچھی ہے جو آج کل ہے۔

جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے لئے زیادتِ مال کو پسند نہیں کیا حالانکہ ان حضرات نے واقعی زیادہ سامان ہونے پر عبادات میں پہلے سے زیادہ ترقی کی اور دنیا میں منہمک نہیں ہوئے پھر ہمارے لئے کثرت مال کیونکر مفید ہو سکتی ہے۔ بس مسلمانوں کو دوسری قوموں کی حالت دیکھ کر رال نہ ٹپکانا چاہیے۔ اُولٰٓئِكَ عُجِّلَتْ لَهُمْ طَيِّبَاتُهُمْ فِي حَيٰوتِهِمُ الدُّنْيَا۔ ان کو سب راحت یہیں دے دی گئی۔ اور مسلمانوں کے واسطے راحت جنت میں ہے

بس مسلمان کو اتنی دنیا حاصل کرنا چاہیئے کہ پیٹ بھر کے روٹی مل جائے اور ستر عورت کے لئے کپڑا اور رہنے کو مختصر مکان اور اتنا بحمد اللہ اکثر مسلمانوں کو آج کل حاصل ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو صحابہ کو اتنا بھی سامان میسر نہ تھا۔ ہم لوگ تو اس زمانہ کے اعتبار سے آج کل بادشاہ ہیں کیونکہ حدیث میں ہے۔

اَصْبَحَ مُعَافیٰ فِیْ جَسَدِہٖ اٰمِنًا فِیْ سِرْبِہٖ عِنْدَہٗ قُوْتُ یَوْمِہٖ فَکَاَنَّمَا حِیْزَتْ لَہُ الدُّنْیَا بِحَذَا فِیْرِھَا۔

کہ جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ بدن میں صحت ہو اور نفس میں بے فکری۔ ایک دن کا کھانا پاس ہو اس کو تمام دنیا مل گئی۔ جب صحت و اطمینان کے ساتھ ایک دن کا کھانا گھر میں موجود ہو، تو یوں سمجھو کہ تمام دنیا گھر میں آ گئی۔ اگلے دن کی فکر نہ کرو۔ ع

مترس از بلائے کہ شب درمیانست

جس مصیبت کے درمیان میں رات حائل ہو اس سے اندیشہ نہ کرو جب کل ہوگی دیکھا جائے گا۔ کیا خبر کل کو تم بھی ہو گے یا نہیں۔ ایک بزرگ اسی کو فرماتے ہیں ؎

چوں ترا نانے وخرقانے بود ہر زماں موئے تو سلطانے بود

غرض حق تعالیٰ کی حکمت ہے کہ بعض لوگوں کو غریب رکھتے ہیں۔ اس کو کیا خبر کہ امیر ہونے کے بعد وہ کیسا ہوتا۔ ایسے شخص کو ثواب دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نیت صالحہ عطا فرما دیتے ہیں اس کے لئے یہ نیت ہی نجات

عالیہ حاصل کرنے کے لئے کافی ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو یوں خرچ کرتا حق تعالیٰ کے یہاں عجیب دربار ہے۔ وہاں کچھ انفاق ہی پر مدار نہیں، غریب کے حق میں نیت انفاق بھی بمنزلہ انفاق کے ہے۔ خود نص میں ارشاد ہے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَّاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ۔

نرم جواب دینا اور در گزر کرنا بہتر ہے اس خیرات سے جس کے دینے کے پیچھے ستانا ہو اور اللہ تعالیٰ مستغنی اور عقل والا ہے۔

پس جس کے پاس مال نہ ہو وہ حال اور قال سے ثواب حاصل کرے ۔

لَا خَيْلَ عِنْدَكَ تُهْدِيْهَا وَلَا مَالُ
فَلْيُسْعِدِ النُّطْقَ اِنْ لَّمْ يُسْعِدِ الْحَالُ

اور جس کو خدا نے مال دیا ہو وہ اپنی وسعت کے موافق خرچ کر کے خدا تعالیٰ کو راضی کرے۔

علماء کی کوتاہی اس میں واعظین و علماء بھی داخل ہیں ان کو بھی خرچ کرنا چاہئے۔ اگر زیادہ نہیں کر سکتے تو کچھ تو کریں۔ علماء کا اکثر طبقہ اس میں بہت کوتاہی کرتا ہے۔ سارا امر بالمعروف اپنی ہی بچت کے واسطے ان کو سوجھتا ہے۔ خود خرچ کرنا بہت کم جانتے ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ کہ اپنے بھائی کی روٹی بچائیں اور اپنے پاس سے خرچ کریں اور جب کسی کام کے لئے چندہ کی تحریک کریں تو سب سے پہلے خود بھی چندہ دیا کریں یہ صورت اچھی نہیں کہ دوسروں ہی کو ترغیب دی جائے اور اپنے گھر سے

کچھ نہ نکالا جائے۔ اس صورت میں اثر بھی نہیں ہوتا اور لوگ متوحش ہوتے ہیں۔ اگر تم بھی خرچ کیا کرو تو لوگوں کو وحشت نہ ہو گی۔ اب تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چندہ کے سارے وعظ کا حاصل یہ ہے کہ مولوی اپنی بچت کرنا چاہتے ہیں اور دوسروں سے وصول کرنا چاہتے ہیں۔ اگر علماء یہ کہیں کہ ہمارے پاس کہاں ہے تو میں کہتا ہوں کہ آپ کے مدرسہ میں جو مزدور دو آنہ مہینہ دیتا ہے تم اس سے کم نہیں ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم دو آنے بھی نہ دو۔

مامون رشید کے پاس ایک شخص سوال کرنے آیا۔ مامون نے کہا کہ ہٹے کٹے مضبوط آدمی کو سوال کرنا جائز نہیں ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں مامون رشید کے پاس فتویٰ لینے نہیں آیا۔ فتویٰ دینے والے بہت ہیں۔ میں آپ کو بادشاہ سمجھ کر آیا ہوں۔ اگر دینا ہو تو دے دو ورنہ صاف جواب دے دو۔ مامون رشید نے اس کو بہت سا روپیہ دیا۔ ان کے اخلاق بہت اچھے تھے۔ رعایا کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا تھا جیسا ماموں بھانجہ کے ساتھ کرتا ہے مگر عقائد اچھے نہ تھے۔

میرا مقصود اس حکایت سے یہ ہے کہ جب امر بالمعروف سے اپنی بچت مقصود ہو تو اس کا اثر نہیں ہوا کرتا پس علماء کو خود بھی خرچ کرنا چاہیئے تاکہ عوام کا یہ خیال دور ہو جائے کہ مولوی اپنی بچت کے لیے ہم سے چندے وصول کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ چندہ میں استغناء کے ساتھ تحریک کرنا چاہیئے۔ لگنا لپٹنا نہیں چاہیئے صاف کہہ دو وَلَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا۔ جیسا کہ انبیاء

علیہم السلام کا طریقہ تھا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَمۡ تَسۡئَلُهُمۡ خَرۡجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيۡرٌ وَّهُوَ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ

کہ اے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ سے جو کفار اعراض کرتے ہیں۔ کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ آپ ان سے چندہ مانگتے ہیں تو (یہ وجہ تو ہرگز نہیں)، کیونکہ خدا کی عطا سب سے بہتر ہے اور وہ سب سے بڑھ کر روزی دینے والا ہے۔

(پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کفار سے چندہ مانگنے کی کیا ضرورت ہے) اس سے معلوم ہوا کہ چندہ مانگنا مخاطبین کی وحشت کا سبب ہوتا ہے پس تم لگ لپٹ کر ہرگز تحریک نہ کرو۔ ہاں استغناء کے ساتھ ترغیب دو۔ جیسا قرآن و حدیث میں ترغیب دی گئی ہے۔ پس صاحبو! شریعت کے حکم انفاق سے آپ کیوں گھبراتے ہیں۔ آپ سے کوئی مانگتا نہیں ہے۔ ہاں خرچ کرنے کا طریقہ بتلایا جاتا ہے کہ اگر نیک کام میں اپنے نفع کے لئے خرچ کرنا چاہو تو اس کی یہ صورت ہے۔ آگے تمہیں اختیار ہے اور یہ بھی محض تمہاری مصلحت کے واسطے طریقہ بتلایا گیا ہے۔

حفاظت دین کا انتظام

ورنہ خدا تعالیٰ کو اپنے دین کی حفاظت کے واسطے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔

وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا يَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ ثُمَّ لَا يَكُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَكُمۡ۔

اگر تم (دین کے واسطے خرچ کرنے سے) روگردانی کرو گے تو

اللہ تعالیٰ ایک دوسری قوم کو پیدا کر دیں گے جو تمہاری طرح
بخیل نہ ہوگی

بلکہ جان و مال سے خدا کے دین پر قربان ہوگی۔ دیکھئے حضور صلے اللہ
علیہ وسلم کے زمانہ سے اب تک یہ دین محفوظ چلا آرہا ہے۔ کیا آپ کے ہی
تان گاڑی چل رہی ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ یہی قاعدہ چلا آرہا ہے کہ جس قوم نے
دین کی خدمت سے پہلو تہی کیا اللہ تعالیٰ نے اُن کی جگہ دوسری قوم پیدا کردی
صاحبو! مجھے اس کی شکایت نہیں کہ مسلمان چندہ نہیں دیتے یا کم دیتے ہیں،
بلکہ اصل شکایت یہ ہے کہ دین پر توجہ نہیں۔ آپ چاہے کچھ بھی خرچ نہ کریں
لیکن اپنی حالت کی اصلاح کر کے دین پر توجہ کریں اور توجہ کا طریقہ یہ ہے
کہ قلوب کو یکجا کریں۔ سب مل کر دین کی حفاظت کا اہتمام کریں۔ اجتماع میں
برکت اور طاقت ہے۔ ع

دو دل یک شوند بشکنند کوہ را

جب توجہ کروگے تو احکام دین پر عمل بھی کروگے۔ پھر عمل کے لئے
جن جن چیزوں کی ضرورت ہوگی اُن کا بھی سامان ہو جائے گا۔ ہم کو دوسری
قوموں کی تقلید کی ضرورت نہیں کہ جس طرح وہ ترقی کر رہی ہیں اسی طرح ہم
بھی ترقی کریں۔ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ مسلمان بھوکے ہیں۔ ان کے گھر
میں ترقی کے ذرائع موجود نہیں دوسروں سے مانگتے پھرتے ہیں۔ صاحبو! ہم کو
واللہ اپنے گھر کی دولت کی خبر نہیں اس لئے ہماری یہ حالت ہے ؎

یک سبد پُر نان ترا بر فرق سر ۔۔۔ تو ہمی جوئی لب نان در بدر

تا بہ زانو می میان قعر آب   وز عطش وز جوع گشتستی خراب

ہمارے گھر میں ترقی کے وہ ذرائع موجود ہیں جن کے سامنے تمام عالم گردن جھکا چکا ہے۔ پھر ہم دوسروں سے بھیک کیوں مانگیں اور وہ ذریعہ یہی ہے کہ اجتماعی حالت کے ساتھ سب اپنے دین پر توجہ کریں۔ اور دین کی پابندی کریں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب مولوی بن جاؤ بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دین سے باخبر بن جاؤ۔ کچھ تو پڑھ لکھ کر باخبر بنیں اور باقی لوگ علماء کی صحبت اختیار کریں اور ان سے مل کر دین کے احکام معلوم کریں۔ مگر صحبت ان علماء کی اختیار کرو جن کے یہاں اللہ اور رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ زیادہ رہتا ہو نہ کہ دنیا کا۔ اور اس کے منتظر نہ رہو کہ علماء خود تمہارے گھر آ کر وعظ کہا کریں بلکہ تم خود ان سے جا کر ملو اور دین کی باتیں دریافت کرو۔ اس طرح کر کے دیکھو۔ انشاء اللہ تم کو ترقی حاصل ہو جائے گی اور غیر قوموں کے طریقہ پر چلنے کی تم کو کچھ ضرورت نہیں بلکہ اسی سادگی کے طریقہ پر چلو جو اسلام نے ہم کو سکھلایا ہے۔

سادگی اور عزت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شام سے لشکر اسلام نے ایک عرضداشت بھیجی تھی کہ بیت المقدس فتح نہیں ہوتا اور وہاں کا پادری یہ کہتا ہے کہ فاتح بیت المقدس کا حلیہ ہماری کتاب میں موجود ہے۔ تم اپنے خلیفہ کو بلالو ہم دیکھ لیں گے۔ اگر ان کا وہی حلیہ ہوا جو اس کتاب میں ہے تو ہم بدون لڑائی کے قلعہ کھول دیں گے ورنہ تم قیامت تک اسے فتح نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ امیر المؤمنین

یہاں تشریف لے آئیں۔ شاید یہ قلعہ بدون لڑائی کے فتح ہو جائے۔ امیرالمومنین نے اس درخواست پر سفر کا ارادہ فرمایا۔ اب غور فرمائیے کہ یہ ایک ایسے شخص کا دورہ تھا جس کے نام سے کسریٰ و ہرقل بھی تھراتے تھے مگر حالت یہ تھی کہ جس قمیض میں آپ نے سفر کیا ہے اس میں چند در چند پیوند تھے اور سواری کے لئے صرف ایک اونٹ تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ جس پر کبھی آپ سوار ہوتے کبھی آپ کا غلام ——! آج کل ادنیٰ سے ادنیٰ ڈپٹی کے دورہ میں بڑا سامان ہوتا ہے۔ یہاں خلیفۂ اعظم کے دورہ میں کچھ بھی سامان نہ تھا۔ پھر آج کل ادنیٰ حاکم کے دورہ میں رعایا پریشان ہو جاتی ہے کیونکہ رعایا کو اُن کے دورہ کے لئے صدہا سامان کرنا پڑتا ہے۔ یہاں خلیفہ کے دورہ سے ایک متنفس کو بھی تکلیف نہیں ہوئی کیونکہ ہر شخص کے ساتھ ایک تھیلے میں ستّو اور ایک تھیلے میں چھوارے بندھے ہوئے تھے۔ منزل پر اتر کر ستّو گھول کر پی لیتے اور چھوارے کھا لیتے۔ نہ رعایا سے مرغے لئے نہ انڈے نہ دودھ لیا نہ گھی۔

جب آپ اس شان سے کبھی سوار اور کبھی پیدل چلتے ہوئے شام کے قریب پہنچے تو لشکر اسلام نے استقبال کرنا چاہا۔ آپ نے ممانعت کر دی۔ خاص خاص حضرات نے آپ کا استقبال کیا۔ اس وقت بعض صحابہ نے کہا کہ امیرالمومنین اس وقت آپ دشمن کے ملک میں ہیں اور وہ لوگ آپ کو دیکھیں گے۔ اس لئے مناسب ہے کہ اپنا یہ قمیض اتار کر دوسرا قمیص عمدہ سا پہن لیجئے اور اونٹ کی سواری چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔

تاکہ ان کی نظر میں عزت ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔
نَحْنُ قَوْمٌ اَعَزَّنَا اللّٰہُ بِالْاِسْلَامِ کہ ہم وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے اسلام سے عزت دی ہے۔

ہماری عزت قیمتی لباس سے نہیں ہے بلکہ خدا کی اطاعت سے عزت ہے مگر صحابہ کے اصرار سے ان کا دل خوش کرنے کے لئے درخواست منظور کر لی۔ چنانچہ ایک عمدہ قمیص لایا گیا جس کو پہن کر آپ گھوڑے پر سوار ہوئے دو چار ہی قدم چلے تھے کہ فوراً گھوڑے سے اتر پڑے اور فرمایا کہ میرے دوستو! تم نے تو اپنے بھائی عمر کو ہلاک ہی کرنا چاہا تھا۔ واللہ! میں دیکھتا ہوں کہ اس لباس اور اس سواری سے میرا دل بگڑنے لگا ہے۔ تم میرا وہی پیوند لگا قمیص اور اونٹ لے آؤ۔ میں اسی لباس میں اپنے اونٹ پر سوار ہو کر چلونگا

اے صاحبو! جب ایسے شخص کا دل قیمتی لباس سے بگڑتا ہے تو کیا ہمارا دل اور ہمارا منہ نہ بگڑے گا۔ پھر ہم اپنے قلب کی نگہداشت سے کتنے غافل کیوں ہیں اور ہم کو کس چیز نے مطمئن کر دیا ہے کہ ہمارے لئے کوئی لباس مضر نہیں۔ اور یہ جو حضرت عمر نے فرمایا تھا کہ نَحْنُ قَوْمٌ الخ واقعی بات یہی ہے کہ اگر ہم خدا کے مطیع و فرمانبردار ہیں تو ہم سادہ لباس میں بھی معزز ہیں ورنہ قیمتی لباس سے بھی کچھ عزت نہیں ہو سکتی ؎

ز عشق نا تمام ما جمال یار مستغنی ست
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

خوبصورت چہرہ کو زیب و زینت کی حاجت نہیں وہ تو ہر لباس میں

حسین ہے۔ بناوٹ کی احتیاج اُس کو ہے جس کو قدرتی حسن نصیب نہ ہو چنانچہ حضرت عمرؓ اپنا وہی لباس پہن کر چلے اور اونٹ ہی پر سوار ہوئے اور اُسی لباس اور اُسی سواری پر آپ کو دیکھ کر نصاریٰ نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا کیونکہ جب آپ فصیل شہر کے قریب پہنچے اور نصاریٰ کو اطلاع ہوئی کہ خلیفۂ اسلام تشریف لے آئے تو اُن کا بڑا پادری فصیل پر آیا اور کتاب کھول کر حضرت عمرؓ کے حلیہ کو اُن اوصاف سے ملانے لگا جو کتاب میں لکھے ہوئے تھے۔ اُس میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ حضرت عمرؓ ایسے لباس اور ایسی سواری پر تشریف لائیں گے۔ اس معمولی لباس ہی میں آپ کی عزت مخفی تھی۔ ع

کہ آب چشمۂ حیواں درونِ تاریکی ست

اگر آپ قیمتی لباس میں آتے تو پیشین گوئی پوری نہ ہوتی۔ چنانچہ پادری نے جب سارے اوصاف کتاب کے موافق دیکھ لئے تو وہ چیخ مار کر گر پڑا اور کہا جلدی سے قلعہ کھول دو۔ (بخدا یہی وہ شخص ہے جس کا لقب توراۃ میں حدید ہے) یہی فاتح بیت المقدس ہے۔ تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بدون جنگ وجدال کے بیت المقدس کو فتح کر دیا۔ تو صاحبو! ہمیں تکلیف اور بناوٹ کی ضرورت نہیں۔ ہماری عزت تو سادگی ہی میں ہے۔

سادگی کی چند مثالیں

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ اسی زمانہ میں ایک بزرگ

ہوئے ہیں۔ آپ سے لفٹنٹ گورنر نے ملنے کی اجازت چاہی۔ یہاں سے اجازت ہوگئی۔ اس وقت تو آپ یہ تذکرہ کررہے تھے کہ لفٹنٹ گورنر کے واسطے سونے کی کرسی ہم کہاں سے لائیں گے۔ خدام نے عرض کیا کہ اس کی حاجت نہیں وہ چوبی کرسی پر بیٹھ سکتے ہیں۔ چونکہ لفٹنٹ گورنر اس وقت مہمان ہو کر آرہے تھے اور مہمان کی مدارات اُس کے مذاق کے موافق ہوتی ہے۔ اس لئے یہ خیال ہوا مگر یہ سارے منصوبے پہلے ہی پہلے تھے وقت پر کچھ بھی اہتمام نہیں کیا گیا بلکہ آپ کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ لفٹنٹ گورنر کس دن آئیں گے۔ چنانچہ جب دن آیا اور لفٹنٹ گورنر حضرت کی خانقاہ میں پہنچے تو وہاں کوئی تکلف نہ تھا۔ سب معمولی سامان تھا۔ بعد ملاقات لفٹنٹ گورنر نے کہا کہ حضرت ہمیں کچھ نصیحت و وصیت فرمائیں۔ ارشاد فرمایا ظلم کبھی نہ کرنا۔ پھر اُس نے درخواست کی کہ ہم کو کچھ تبرک عطا فرمایا جائے۔ فرمایا میرے پاس کیا رکھا ہے۔ پھر خادم سے فرمایا کہ ارے دیکھنا مٹھائی کی ہنڈیا میں کچھ ہو، تو ان کو دے دے۔ یہ مانگ رہے ہیں۔ چنانچہ ہنڈیا میں سے مٹھائی کا چورا تھوڑا تھوڑا سب کو دیا گیا۔ جس کو سب نے نہایت ادب سے لیا اور بڑے خوش خوش واپس ہوئے۔

تو دیکھئے کہ مولانا کو اوّل تو اس زمانہ کے لحاظ سے کچھ تکلف کا خیال ہوا بھی تھا مگر آخر میں یہ سب منصوبے مٹ گئے اور وہی اسلامی سادگی رہ گئی اور اسی میں اُن کی عظمت و عزت ظاہر ہوئی۔

نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی ‌ ‌ ‌ بگڑنے میں بھی زلف اُن کی بنا کی

غرض ہم کو اسلامی سادگی پر رہنا چاہیے۔ اگر کسی مہمان کی خاطر سے کچھ تکلف بھی کیا جائے تو اس میں بھی اعتدال اسلامی کا لحاظ ضروری ہے مبالغہ نہ کیا جائے۔ اسی میں ہماری عزت ہے مگر آج کل مسلمان تقلید یورپ میں اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ اُن کا لباس، اُن کا طرز معاشرت، اُن کا طریقہ تمدن و تجارت اختیار کر کے ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کی اس میں عزت نہیں ہے۔

ایک بار میں بریلی میں تھا۔ بھائی سے جنٹ نے کہا کہ ہم آپ کے بھائی سے ملنا چاہتے ہیں۔ بھائی نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا ہم خود تو حکام سے نہیں ملتے لیکن جب وہ خود ملنا چاہتے ہیں تو اعراض کرنا مناسب بھی نہیں ہے۔ آخر وہ حاکم ہیں۔ ہم کو حق حکومت کا لحاظ ضروری ہے میں چلوں گا بھائی نے میرے واسطے قیمتی لباس کا اہتمام کرنا چاہا۔ میں نے کہا ہرگز نہیں جس لباس میں میں یہاں آیا ہوں اُسی میں جاؤں گا۔ چنانچہ میں اچکن اور کرتہ میں ان سے ملنے گیا۔ وہ شاید غسل کر رہے تھے۔ ہم کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے عصر کی نماز کا وقت آگیا اور میں نے اور بھائی نے اُن کے بنگلہ ہی پر نماز پڑھی پھر وہ آکر ملے اور مجھ کو اپنی خاص کرسی پر بٹھلایا اور خود ایک معمولی کرسی پر بیٹھ گئے میں نے اصرار بھی کیا مگر نہیں مانے۔ پھر نہایت احترام کے ساتھ باتیں کیں اور تھوڑی دیر میں رخصت ہو کر آگئے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں انگریزی لباس میں اُن سے ملتا تو وہ عزت ہرگز نہ ہوتی جو اسلامی لباس میں ہوئی۔

کلکتہ میں مولوی عبدالجبار صاحب وائسرائے سے عبا اور چوغہ پہن

کرا اور عمامہ باندھ کر ملے۔ دوسرے رؤسا انگریزی لباس میں گئے تھے۔ تو وائسرے نے اُن سے کہا کہ مولوی صاحب آپ اس لباس میں شہزادہ معلوم ہوتے ہیں یہ لباس بڑی راحت کا ہے اور ہمارا لباس بہت تکلیف دہ ہے مگر ہم اپنی قومی وضع سے مجبور ہیں۔ ہم کو آپ کے لباس پر بہت رشک آتا ہے۔

غرض ہم کو شریعت نے جو تعلیم دی ہے اس پر چلنا چاہیئے۔ پس ہوچکا خاتمہ۔ ہم کو دوسروں کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس میں اپنی ہی ذلت ہے گویا زبان حال سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے گھر میں ترقی کے اسباب و ذرائع موجود نہیں ہیں۔

طلب اور اتباع

تعلیم شریعت کا اتباع یوں ہی ہو سکتا ہے کہ علماء کا اتباع کیا جائے مگر ایسے علماء کا جو خود آپ کے متبع نہ ہوں۔ یعنی وہ آپ کے مذاق کا اتباع نہ کریں بلکہ آپ سے اپنے مذاق کا اتباع کرائیں۔ کیونکہ جو طبیب مریض کے مذاق کا اتباع کرے گا، وہ اُسے ہلاک کرے گا۔ طبیب وہ ہے جو مریض سے اپنے مذاق کا اتباع کرائے۔ آج کل بعض علماء تو طالب جاہ و مال ہیں۔ اُن کو تو علماء کہنا ہی غلط ہے کیونکہ علم کتاب پڑھنے کا نام نہیں بلکہ علم دوسری چیز ہے ؎

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد
بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

ایسے ہی مولویوں نے عوام کو چندہ کے نام سے متوحش کیا ہے جنہوں نے صرف کتابی علم حاصل کیا ہے اور حقیقی علم یعنی دین کی روح حاصل نہیں کی۔

اور بعض علماء محقق ہیں صاحب علم ہیں اور طالب آخرت۔ وہ دنیا کے طالب نہیں مگر محقق ہیں۔ خوش اخلاق بہت ہیں۔ وہ اکثر دوسروں کے مذاق کا اتباع کرتے ہیں جس میں نیت صرف دوسروں کی دینی مصلحت ہوتی ہے مگر اُن سے اپنے مذاق کا اتباع نہیں کراتے۔ اُن سے مخلوق کو نفع عام تو ہوتا ہے مگر تام نہیں ہوتا۔ اور بعضے متعارف معنی کر خوش اخلاق نہیں بلکہ کم فہموں میں بداخلاق مشہور ہیں کیونکہ وہ مریض کی رائے اور مذاق کا اتباع نہیں کرتے بلکہ مریضوں کو اپنی رائے اور اپنے مذاق پر چلاتے ہیں۔ اُن سے نفع عام تو نہیں ہوتا کیونکہ لوگ اُن سے گھبراتے ہیں مگر نفع تام ضرور ہوتا ہے کہ جو اُن کے مذاق کا اتباع کرتا ہے اُس کی اصلاح پوری ہو جاتی ہے کہ پھر وہ کسی کے قابو میں نہیں آسکتا۔ یہ لوگ محقق ہیں اور محقق سے طالب کے مذاق کا اتباع نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تو طبیب کی خیانت ہے کہ مریض میں ایک مرض دیکھ رہا ہے اور خوش اخلاقی کی وجہ سے اُس کو مرض پر مطلع نہیں کرتا کہ یہ ناراض ہو جائے گا اگر وہ سنکر ناراض ہونے آیا ہے تو پھر علاج اور طلب صحت کا نام کیوں لیتا ہے۔ وہ مہمان بن کر آئے پھر ہم اُس کے لئے سونے کی کرسی بنانے کی فکر کریں گے۔ جیسے شاہ فضل الرحمن صاحب نے کی تھی۔ گو وقت پر یاد نہ آئے غرض ہم مہمان کے مذاق کا اتباع کرنے کو تیار ہیں۔ کوئی صرف مہمان بن کر دیکھے۔ انشاء اللہ ہم بھی خوش اخلاق بن کر دکھلا دیں گے۔ باقی مریض اور طالب علاج کے مذاق کا اتباع ہم سے نہیں ہو سکتا۔ یہ گفتگو درمیان میں آگئی تھی۔

بے جا گھبراہٹ

میں یہ کہہ رہا تھا کہ لوگوں کو استغناء کے ساتھ ترغیب دینا چاہیئے۔ لگ لپٹ کر چندہ نہ مانگنا چاہیئے جس سے دوسروں کو علماء پر احتیاج کا شبہ ہو۔ کیونکہ یہ طریقہ شریعت کے خلاف ہے۔ یہاں تو یہ حالت ہے ؎

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو
دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

بلکہ یہ طریقہ شرافت کے بھی خلاف ہے۔ شریف آدمی کو احتیاج بھی ہو جب بھی وہ لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتا۔ چنانچہ ایسے ہی فقراء کی شان قرآن میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا۔

ہم نے عرب میں سائلوں کی یہ حالت دیکھی ہے کہ جہاں اُن سے کسی نے اللہ اکبر کہہ دیا تو فوراً اللہ کریم کہتے ہوئے چل دیئے۔ اس لفظ کے سننے کے بعد دوبارہ ہرگز نہیں مانگتے۔ اب اگر کسی کو دینا ہو تو خود دوڑ کر انہیں دے دے لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ اور جو لوگ سر ہو جاتے ہیں اکثر ہندوستان کی نسل میں عرب نہیں ہیں۔ مگر وہاں رہ کر صورت عربوں کی سی بنا لی ہے۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جن کو عربی بولنا بھی نہیں آتی۔

چنانچہ ایک عرب مجھ سے ملے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ عرب میں

آپ کتنے دنوں سے ہیں تو بولے۔

ثلث پیڑھی فی المدینۃ کہ مدینہ میں تین پیڑھیاں گزر چکے ہیں۔

میں نے دل میں کہا کہ تیرے پیروں میں تو بیڑیاں ڈالنا چاہئیں اگر تیری ایک پشت بھی عرب میں گذرتی تو پیڑھی کا لفظ تیری زبان سے قیامت تک نہ نکلتا۔ ایسے لوگ عرب ہرگز نہیں بلکہ ہندوستان و بنگال کی نسل ہیں۔ ورنہ جو خالص عرب ہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ اول تو وہ مدینہ سے نکلنا ہی نہیں جانتے ان کو مکہ مدینہ سے ایسی محبت ہے کہ اُس کے باہر اُن کو چین ہی نہیں مل سکتا چنانچہ ایک بدو کے لڑکے کو بعض حاجیوں نے ہندوستان ساتھ لانا چاہا اور اس کے سامنے ہندوستان کی سرسبزی اور ارزانی کا خوب تذکرہ کیا۔ وہ سب اوصاف سن کر کہنے لگا کہ ہندوستان میں کعبہ بھی ہے؟ کہا نہیں کعبہ تو وہاں نہیں تو وہ صاف کہتا ہے کہ پھر ہندوستان میں کچھ بھی نہیں ہے جب وہاں کعبہ نہیں ہمارے خوب کہا ہے

ومن ویلا فی حب الدیار لاھلھا

وللناس فیما یعشقون مذاھب

مولانا نے مثنوی میں ایک عاشق و معشوق کی گفتگو نقل فرمائی ہے۔ اس بدو کے لڑکے کا جواب بالکل اسی جواب کے موافق ہے جو مولانا نے عاشق کی طرف سے بیان فرمایا ہے ؎

گفت معشوقے بعاشق اے فتا — تو بہ غربت دیدۂ بس شہرہا

پس کدامی شہر زانہا خوشترست	گفت آں شہرے کہ دروے دلبرست
ہر کجا دلبر بود خرم نشیں	فوق گردوں ست نے قعر زمیں

ہر کجا یوسف رُخے باشد چو ماہ
جنت ست آں گرچہ باشد قعر چاہ

واقعی اہل عرب کی نظر میں جہاں کعبہ نہیں وہاں کچھ بھی نہیں۔ تو یہ لوگ اوّل تو باہر کم جاتے ہیں اور کبھی جاتے ہیں تو بہت جلد واپس ہو جاتے ہیں اور جو لوگ برسوں ہندوستان کا دورہ لگاتے رہتے ہیں ان میں خالص عرب کم ہیں، زیادہ تو یہیں کے لوگ ہیں جو عبا قبا پہن کر عرب بن گئے ہیں۔ اسی لئے اُن میں عربوں کی سی غیرت نہیں کہ سوال میں الحاح و لجاج کرتے ہیں۔

ہمارے ساتھ حج میں ایک عالم پٹنہ والے تھے۔ اُنہوں نے وہاں پٹنے ہی کا کام کیا تھا۔ وہ یہ کہ جعفر آفندی پاشا کے مترجم ۔ اصل میں ہندی تھے اہل ہند سے محبت کرتے تھے۔ ایک دفعہ حرم میں ان مولوی صاحب کا سامنا ہو گیا۔ مصافحہ کیا۔ مولوی صاحب سمجھے کہ کوئی سائل ہے۔ بہت خشک لہجہ میں پوچھا کچھ کہنا ہے۔ جعفر آفندی میں ظرافت بہت تھی۔ کہنے لگے حضور بھوکا ہوں کچھ دے دیجئے۔ وہ مولوی صاحب بڑے غصہ سے بولے تم کو شرم نہیں آتی ایسا عبا چغہ پہن کر سوال کرتے ہو اس کو بیچ کر نہیں خرچ کیا جاتا۔ جعفر نے کہا حضور اگر معمولی لباس میں ہم سوال کریں گے تو آپ پیسہ دو پیسہ پر ٹال دیں گے اور اس لباس میں دیکھ کر کم از کم دو تین روپے تو دیں گے۔ مولوی صاحب اس جواب سے اور بھی جھلائے اور بڑبڑ کرتے چل دیئے۔ دوسرے دفعہ

مولوی صاحب حرم میں میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ جعفر آفندی سامنے سے آئے۔ میں اُن کی تعظیم کو اُٹھا۔ وہ پٹنہ والے مولوی صاحب بڑے حیران ہوئے کہ یہ تو کوئی سائل نہیں معلوم ہوتا کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جعفر آفندی نے بیٹھ کر باتیں کیں اور یہ بھی کہا کہ آپ تو میری تعظیم کرتے ہیں اور یہ مولوی صاحب ہم سے بے رُخی کرتے ہیں۔ مولوی صاحب ایسے نادم ہوئے کہ سر نہ اٹھا سکے۔ کہا صاحب معاف فرمائیے گا میں معذور ہوں۔ میں نے کتاب میں دیکھا تھا کہ مکہ میں قیمتی عبا قبا والے سوال کرتے ہیں۔ اور اس کا مشاہدہ بھی میں نے کیا ہے۔ اس لئے مجھے آپ پر بھی یہی شبہ ہوا۔ جعفر آفندی نے کہا کہ آپ نے یہ بھی دیکھا ہے کہ یہ حالت عمامے والوں کی ہے یا ترکی ٹوپی والوں کی کہنے لگے کہ ہاں صاحب جتنے سائل میں نے دیکھے وہ سب عمامے ہی والے تھے۔ جعفر آفندی نے کہا پھر آپ نے مجھے ان پر کیوں قیاس کیا۔ میں تو ترکی ٹوپی پہن رہا تھا۔

چندہ کی تحریک

صاحبو! جیسے وہ پٹنہ والے مولوی صاحب عمامے اور عبا والوں کی صورت سے گھبراتے تھے ایسے ہی آج کل مسلمان مولویوں کی صورت سے گھبرانے لگے ہیں کہ بس اب چندہ کا سوال ہوگا۔ حالانکہ علماء رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وارث ہیں۔ وارثان رسول ؐ سے مسلمانوں کو وحشت ہونا سخت مضر ہے۔ اس کی اصلاح ضروری ہے جس کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ علماء چندہ کی تحریک نہ کیا کریں۔ اور بحمد اللہ جو لوگ حضور ؐ کے سچے وارث ہیں وہ اس سے خود ہی بچتے ہیں۔ بس صحیح طریقہ

یہ ہے کہ استغنا کے ساتھ لوگوں کو ترغیب عام دی جائے۔ چاہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے۔ پھر انشاء اللہ وحشت نہ ہوگی۔

ایک بات اور قابل اہتمام ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ چندہ کا وعدہ کریں پھر کسی وجہ سے وہ چندہ نہ بھیجیں تو ان کے پاس تقاضے کے خطوط نہ بھیجے جائیں۔ نہ کچھ عرصہ کے بعد ان کے نام فہرست خارج کردگان میں شائع کئے جائیں۔ اس سے بھی لوگوں کو وحشت ہوتی ہے۔

یہ تو تمہید تھی مگر تمہید بہت طویل ہوگئی۔ اب میں آیت کا بیان شروع کرتا ہوں۔

آیتِ متلوہ کا شانِ نزول

اس آیت کے نزول کا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک میں تشریف لے گئے تھے اور بجز معذورین کے سب کو ساتھ چلنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مگر کچھ لوگ غزوہ میں نہیں گئے۔ مدینہ ہی میں رہ گئے۔ جن میں زیادہ تر تو منافقین تھے اور دو چار مخلصین بھی تھے۔ آپ کی واپسی پر منافقین نے تو آکر جھوٹے بہانے کر دیئے کہ ہم کو فلاں عذر مانع تھا۔ یہ سبب پیش آگیا تھا مگر مخلصین نے اپنی خطا کا صاف صاف اقرار کر لیا کہ یا رسول اللہ ہم کو کوئی عذر مانع نہ تھا۔ محض کاہلی اور سستی سے پیچھے رہ گئے۔ حضور نے منافقین کا عذر سن کر ان کو تو معذورین میں داخل کر کے رخصت فرما دیا۔ اور ان مخلصین سے فرمایا کہ تمہارا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔ خواہ معاف فرماویں یا سزا تجویز کر دیں چنانچہ پچاس روز تک سب مسلمانوں کو ان سے قطع تعلق کا حکم دیا گیا کہ کوئی

ان سے بات چیت اور سلام و کلام نہ کرے۔ پچاس دن کے بعد ان کی توبہ نازل ہوئی تو یہ حضرات خوش خوش حضور کے پاس آئے اور شکریہ قبول توبہ میں اپنا مال حضورؐ کے پاس لائے کہ اس کو کارِ خیر میں صرف فرما دیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا مال قبول کرنے میں سوچ ہوئی۔ آپؐ نے فوراً نہیں لیا کیونکہ آپؐ کو کیا خبر کہ ان کی حالت کیسی ہے۔ اس وقت محض جوش میں دے رہے ہیں کہ بعد کو پچھتائیں گے یا اخلاص قلب سے دے رہے ہیں تو حق تعالیٰ ان مخلصین کی سفارش فرماتے ہیں کہ ان کے اموال سے صدقہ وصول فرمایئے۔ یہ لوگ مخلص ہیں۔

جیسا کہ بعض دفعہ ہمارے سامنے کوئی شخص بہت زیادہ رقم لاتا ہے اور اُس کے لینے سے رکاوٹ ہوتی ہے کہ شاید یہ اپنی وسعت سے زائد دے رہا ہو۔ تو احباب سفارش کرتے ہیں کہ یہ تو بڑی آمدنی والے ہیں مگر سادہ لباس پہنتے ہیں۔ اس لئے یہ رقم اُن کی حیثیت سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

چنانچہ کانپور میں ایک شخص میرے پاس ساٹھ روپے لائے اور مجھے اُن کے لینے سے تامل ہوا۔ پھر بعض لوگوں نے بیان کیا کہ اُن کی آمدنی تو کئی سو روپے ماہوار کی ہے جب میں نے قبول کیا۔ اور اُن سے کہا کہ ذرا اپنی صورت ایسی بناؤ جس سے معلوم ہو کہ خدا نے تم کو کتنا دیا ہے۔ حدیثؐ میں یہی حکم ہے۔

لِيُرَا أَثَرُ النِّعْمَةِ عَلَيْكَ تاکہ نعمت کا اثر تم پر معلوم ہو

تو ایسے ہی یہاں اللہ تعالیٰ سفارش فرماتے ہیں کہ یہ لوگ مخلص ہیں اُن کا صدقہ

منظور کر لیا جائے اور اسلامی کاموں میں لگا دیا جائے۔

اور مِنْ اَمْوَالِهِمْ میں ظاہر یہ ہے کہ من تبعیضیہ ہے۔ گو احتمال یہ بھی ہے کہ بیانیہ ہو تو من تبعیضیہ کے اعتبار سے مطلب یہ ہے کہ ان کے اموال کا کوئی جزو قبول کر لیا جائے۔ جس سے معلوم ہوا کہ کل مال نہ لیا جائے کیونکہ یہ ہر شخص کی حالت کے مناسب نہیں۔ صدیق اکبرؓ کی اور شان ہے وہ تو عاشق تھے۔ ان کی سخاوت تو جان دینا ہے۔ پھر ان کا کل مال لینے سے کیا انکار ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

مال دادن خود سخائے صادق ست | جان دادن خود سخائے عاشق ست

لیکن ہر شخص کی یہ شان نہیں اس لئے من تبعیضیہ سے جزو مال لینے کا امر کیا گیا مگر جزو مال عام ہے۔ اگر ثلثین سے لیا جائے جب بھی جزو صادق ہے اور ایک لاکھ میں ایک روپیہ لے لیا جائے تو اس پر بھی جزو مال صادق ہے۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا مقتضا یہ تھا کہ آپ جزو اقل پر کفایت فرماتے کیونکہ آپ کو تو شروع سے اسی میں تردد تھا کہ لوں یا نہ لوں۔ اب حق تعالے کی سفارش کے بعد لینے کا خیال تو ہوا مگر جزو قلیل کی طرف ذہن گیا ہو گا کہ تھوڑا سا لے لیا جائے لیکن اس سے دینے والے کا جی بھلا نہ ہوتا۔ تو حق تعالے نے آئندہ اس کا معیار بیان فرماتے ہیں کہ کس قدر لینا چاہیئے اور یہاں سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ انبیاء علیہم السلام کسی کا ہدیہ محض اس وجہ سے قبول فرماتے ہیں تاکہ دوسرے کا دل خوش ہو جائے کیونکہ واپس کرنے سے اس کی دل شکنی ہوتی ہے اور یہی شان اہل اللہ کی ہے کہ لوگ سر ہو کر ان کو دیتے ہیں، ناک رگڑتے

ہاں جب وہ ہدیہ قبول فرماتے ہیں۔

اس پر مجھے اپنے ایک بھتیجے کی بات یاد آئی۔ جب وہ چھوٹا سا تھا تو شوخی کرتا پھرتا تھا۔ میں نے اُسے بلایا کہ آؤ باتیں کریں۔ چنانچہ وہ آیا اور میں نے اس سے پوچھا کہ بتلاؤ عربی اچھی ہے یا انگریزی۔ کہنے لگا کہ عربی۔ میں نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگا کہ قرآن عربی میں ہے۔ میں نے کہا ٹھیک! لیکن عربی پڑھ کر کھائیگا کہاں سے؟ کہنے لگا بات یہ ہے کہ جب آدمی عربی پڑھتا ہے وہ اللہ کا ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دل میں ڈالتا ہے کہ اس کو دو۔ وہ دیتے ہیں۔ میں نے کہا یہ سچ ہے مگر اس کو ذلت سمجھتے ہیں۔ کہنے لگا ذلت کی کیا بات ہے۔ یہ خود تو کسی سے نہیں مانگتا۔ لوگ خوشامد کر کے خود دیتے ہیں۔ مجھے اس کی عقل پر حیرت ہوئی کہ ذرا سی عمر میں اُس نے حقیقت کو خوب سمجھا۔

میں نے یہ واقعہ بھائی سے بیان کیا اور کہا کہ اس بچہ کو تو خواہ مخواہ تم نے انگریزی میں ڈالا۔ اس کو عربی پڑھائی ہوتی۔ وہ بھی بہت ذہین ہیں۔ کہنے لگے کہ جب اس کی طبیعت میں عربی سے مناسبت اور شوق ہے تو اس کو تو یہ خود بھی حاصل کرلے گا۔ مجھے تو وہی تعلیم دینا چاہیئے جس سے اس کو مناسبت نہیں اور ہے ضرورت کی چیز۔ تاکہ میرے اثر سے اس کو حاصل کر کے دنیا میں راحت سے رہے۔ پھر دین کا علم تو یہ اپنی مناسبت کی وجہ سے خود حاصل کر لے گا۔ میں نے کہا کہ یہ مناسبت جو اس وقت ہے۔ وہ انگریزی پڑھنے سے زائل ہو جائے گی۔ پھر یہ محض دنیا کا رہ جائے گا۔ اور جو جوہر اس میں اس وقت

ہے برباد ہو جائے گا۔

غرض میرا مطلب یہ ہے کہ شریعت تو اس چندہ کو قبول کرتی ہے جس کی یہ حالت ہو کہ واپس کرنے میں دینے والوں کی دلشکنی ہو اور وہ خود اصرار کریں کہ ہمارے مال کا معتدبہ حصہ لے لو اور اگر ہم تھوڑا سا لیں تو اس سے اُن کا جی خوش نہ ہو بلکہ زیادہ لینے کے لئے خوشامد کریں۔ تو ایسے چندہ میں کوئی حرج نہیں۔

یہ سب بیان مقصود سے پہلے ہی کا ہے۔ ابھی میں نے مقصود عرض نہیں کیا مقصود آگے ہے۔ یہ تو تمہید تھی جس میں میں نے بتلا دیا کہ علماء مسلمانوں سے مال نہیں مانگتے بلکہ محض ترغیب دیتے ہیں۔ آگے آپ کو اختیار ہے چاہے دو یا نہ دو اور جو لوگ ترغیب سے آگے بڑھتے ہیں وہ شرعی حدود سے تجاوز کرتے ہیں۔ پس اُن کے فعل کی بنا پر مسلمانوں کو حکم شرعی سے متوحش نہ ہونا چاہئے۔ خیر یہ گھاٹی تو پار ہو گئی۔

طہارت ظاہری و باطنی

اب مقصود سنیئے۔ اس وقت میرا مقصود اس آیت کے اس جزو کو بیان کرنا ہے صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا۔ جس میں حضورؐ کو ارشاد ہے کہ صدقہ اتنا لیا جائے اور ایسا ہونا چاہیئے کہ جس سے آپ اُن کو پاک کریں اور طاہر کریں۔ یہاں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ تُزَكِّيهِمْ کے متعلق ہو تُطَهِّرُهُمْ کے متعلق نہ ہو۔ اس صورت میں تُطَهِّرُهُمْ میں خطاب نہ ہو گا بلکہ یہ صیغہ غائب کا ہے جو صدقۃً کی صفت ہے کہ وہ صدقہ ایسا ہو کہ گناہوں سے

پاک کرنے والا ہو اور آپ اُس کے ذریعہ سے مسلمانوں کا تزکیہ فرمائیں اس صورت میں اولاً صدقہ کی صفت مذکور ہوئی۔ پھر حضور کا فعل مذکور ہوا کہ آپ جو مسلمانوں کے صدقات قبول کر لیتے ہیں تو نہ اپنی مصلحت کے لئے بلکہ مسلمانوں کے تزکیہ کے لئے۔ اور ظاہر ہے کہ تزکیہ اُسی کا ہو سکتا ہے جو خود بھی طالب تزکیہ ہو۔ تو اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو شخص صدقہ سے طالب تزکیہ نہ ہو اُس کا صدقہ قبول نہ کیا جائے۔

ایک احتمال یہ ہے کہ بہا دونوں کے متعلق ہو تطہرھم کے بھی اور تزکیہم کے بھی اور یہی میرے نزدیک ظاہر ہے کہ دونوں صیغے خطاب کے ہیں اور بہا دونوں کے متعلق ہے۔ اس میں تناسب و تناسق کلام بھی باقی رہے گا۔ بہر حال اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔

ایک تو یہ کہ پاک صاف ہونا کوئی ضروری چیز ہے۔

دوسرے یہ کہ مال خرچ کرنے کو پاکی میں دخل ہے۔

اب آج کل عام مذاق یہ ہے کہ لوگ پاک ہونا ہی نہیں چاہتے نہ اس کا قصد کرتے ہیں نہ اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ وقلیل ما ہم۔ اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ ہم کو استنجا کرنا تو آتا ہے ہم تو روز غسل کرتے ہیں۔ پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ ہم پاک ہونا نہیں چاہتے۔

تو صاحبو! بس آپ نے اسی پاکی کو سیکھا ہے اور اسی پر کفایت کر لی ہے کہ بدن کو دھو لیا استنجا اور نستعلیق ہو گئے اس کے سوا اور کوئی پاکی آپ کو معلوم ہی نہیں۔ اس لئے اُس کا قصد کیونکر کریں۔ سو اس پاکی کا یہاں ذکر نہیں

جس کو آپ پاکی سمجھتے ہیں بلکہ یہاں وہ پاکی مراد ہے جس میں صدقہ کو بھی بڑا دخل ہے۔ ورنہ کیا معاذ اللہ آپ یہ کہیں گے کہ حضرات صحابہ کو استنجا کرنا اور نہانا دھونا نہیں آتا تھا۔ حضرت یہ وہ پاکی ہے جو سات سمندروں کے پانی سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی اور ظاہری ناپاکی اس کو ذرا بھی ضرر نہیں پہنچاتی۔

رامپور کے ایک قاری صاحب کی میں نے حکایت سنی ہے کہ ان کو حج کا اشتیاق ہوا لیکن روپیہ پاس نہ تھا کہیں سے ان کو سوا روپیہ مل گیا تھا۔ اس میں سے چار آنے کا ایک تھیلہ منگوایا اور ایک روپیہ کے چنے بھنوا کر اس میں بھر لئے اور پیادہ پا چل پڑے۔ راستہ میں کہیں کسی نے دعوت کر دی اور دل نے منظور کیا تو دعوت قبول فرمالی ورنہ چنے چاب کر پانی پی لیا اور آگے چل پڑے۔ اسی طرح کئی مہینے میں بمبئی پہنچے۔ جب جدہ کو جہاز جانے لگا تو قاری صاحب جہاز پر پہنچے اور کپتان سے کہا کہ اگر جہاز میں کوئی نوکری خالی ہو تو میں نوکری چاہتا ہوں۔ کپتان نے کہا کہ نوکری تو ہے مگر آپ کے مناسب نہیں کیونکہ اس نے صورت سے دیکھا کہ ایک شریف بزرگ انسان ہے اس کے لئے کوئی پاکیزہ کام چاہئے۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ آپ مناسب وغیر مناسب کو نہ دیکھئے اگر کوئی ملازمت خالی ہو مجھے دے دیجئے۔ کپتان نے کہا ایک بھنگی کی ملازمت خالی ہے مگر آپ اس کو نہیں کر سکتے کیونکہ قوت کا کام ہے اور آپ ضعیف و نحیف آدمی ہیں۔ فرمایا تم اس کی فکر نہ کرو میں سب کام کر لوں گا۔ اس نے امتحان کے طور پر کہا کہ اچھا یہ بورا پڑا ہے اس کو تو اٹھاؤ۔ وہ بورا اڑھائی تین من کا تھا جس کو قوی مزدور بھی نہ اٹھا سکتا تھا

قاری صاحب نے اُس کو ہاتھ لگایا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یہاں تک تو میرا کام تھا آگے آپ کا کام ہے میری مدد فرمائیے۔ دعا کر کے جو بسم اللہ کر کے اٹھایا ہے تو سر سے اوپر لے گئے اور نہایت سہولت سے دوسری جگہ رکھ دیا۔ کپتان نے کہا شاباس! تم واقعی یہ کام کر لوگے اور آپ کا نام لکھ لیا۔ دو غریب مسلمان شائق حج اور کھڑے تھے۔ اُنہوں نے بھی کپتان سے ملازمت کی درخواست کی۔ کپتان نے کہا کہ یہی ملازمت خالی ہے۔ اگر تم کرنا چاہو تو تم بھی آجاؤ۔ اس کام کو سن کر سب رُک گئے کہ یہ تو ہم سے نہ ہوگا۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ اللہ کے بندو! محبوب کے دربار میں جانے کے لئے رستہ موجود ہے اور تم محض اس کام کی وجہ سے رُکتے ہو۔ چلو تم نام لکھوا لو میں تمہارا کام بھی کر دیا کروں گا۔ چنانچہ اُن کا نام بھی لکھوا دیا اور خود سب کے کام کا ذمہ لیا۔ اب جہاز میں دن بھر آپ بھنگی کا کام کرتے اور نماز کے وقت نہا دھو کر پاک کپڑے پہن کر نماز پڑھتے اور رات کو تہجد میں قرآن پڑھتے۔ ہائے کیسے عجیب لوگ تھے ؎

ایں چنیں شیخے گدائے کو بکو　　　عشق آمد لا ابالی فاتقوا

ایک اور شاعر کہتا ہے ؎

عشق را نازم کہ یوسف را ببازار آورد

ہمچو صنعا زاہدے را زیر زنار آورد

ایک رات قاری صاحب تہجد میں قرآن پڑھ رہے تھے۔ قرآن بہت اچھا پڑھتے تھے کہ کپتان اُن کے پاس سے گزرا۔ اُس کو ان کا قرآن

پڑھنا پسند آیا۔ کھڑا ہو گیا۔ جب نماز سے سلام پھیرا تو پوچھا کہ تم کیا پڑھتا ہے۔ کہا یہ خدا کا کلام ہے۔ کہا ہم کو بھی سکھلا دو۔ فرمایا کہ ہاں مگر ایک شرط ہے کہ پہلے غسل کرو۔ پھر ایک کلمہ پڑھو۔ اس کے بعد قرآن سکھلائیں گے چونکہ اُسے قرآن کا شوق ہو گیا تھا، اُس نے غسل بھی کیا اور کلمہ بھی پڑھا الحمد اور قل ھو اللہ سیکھی اور شوق میں چلتے پھرتے اُن کو پڑھتا تھا دوسرے انگریزوں نے جو اُس کو قرآن پڑھتے سُنا، کہا یہ تم کیا پڑھتے ہو؟ کہا ہمارے بھنگی نے ہم کو سکھایا ہے۔ ہم قرآن پڑھتے ہیں۔ انگریزوں نے کہا کہ تم تو مسلمان ہو گیا۔ کہا نہیں ہم مسلمان نہیں ہوا۔ انگریزوں نے کہا نہیں تم مسلمان ہو گیا۔ تو وہ دوڑا ہوا قاری صاحب کے پاس آیا کہ کیا ہم مسلمان ہو گیا۔ قاری صاحب نے کہا کیا آج ہوئے تم تو کئی روز سے مسلمان ہو چکے ہو۔ اُس کو یہ سُن کر اوّل تو کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ پھر کہنے لگا اگر اس کے پڑھنے سے آدمی مسلمان ہو جاتا ہے تو ہم مسلمان ہی رہیں گے لیکن اس کلام کو نہ چھوڑینگے اس کے بعد اپنی میم سے کہا کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں، اگر تم ہمارے ساتھ رہنا چاہو تو تم بھی مسلمان ہو جاؤ ورنہ تم بھی ہم سے الگ ہو جاؤ۔ میم نے اسلام قبول نہ کیا۔ اُس نے اس کو الگ کر دیا۔ پھر جب جدہ آ گیا تو قاری صاحب کے ساتھ وہ بھی جہاز کی ملازمت سے استعفا دے کر مکہ چلا گیا اور حج ادا کیا۔

تو حضرت یہ وہ پاکی ہے جو پاخانہ اٹھانے سے زائل نہیں ہوتی ہاں اس میں رذائل باطنی سے ضرور کمی آ جاتی ہے۔

اہل اللہ کی اصلاح

اس پر اس وقت حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ والد حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا ایک واقعہ یاد آیا۔ مقصود تو یہی واقعہ ہے مگر اس سے پہلے ایک اور واقعہ انہی کا بیان کرتا ہوں۔ کیونکہ اس کا واقعہ مقصودہ سے تعلق ہے۔

وہ تمہیدی واقعہ یہ ہے کہ ایک بار بادشاہ دہلی نے آپ کو بلایا اور یہ حضرات سلاطین کی توہین نہ کرتے تھے بلکہ اُن کے حقوق حاکمانہ کی رعایت فرماتے تھے۔ چنانچہ بادشاہ کے بلانے پر آپ چلے اور قیمتی لباس پہن کر چلے۔ راستہ میں ایک کتے کا بچہ ایک گندی نالی میں سردی سے سکڑا ہوا پڑا دیکھا۔ اوّل خادم سے فرمایا اس کو باہر نکالے۔ وہ ذرا منقبض سا ہوا۔ آپ سے نہ رہا گیا۔ فوراً اپنے ہاتھ سے نکالا اور حمام وہاں قریب تھا وہاں لے جا کر اس کو گرم پانی سے غسل دیا۔ اس کو گرمی پہنچی تو وہ حرکت کرنے لگا۔ پھر اس محلہ کے آدمیوں سے فرمایا کہ اگر تم اس کی خبر گیری کا وعدہ کرلو تو میں اس کو یہاں چھوڑ دوں ورنہ اپنے ساتھ لے جاؤں۔ کسی نے ذمہ لے لیا تب آپ اس کے حوالے کر کے دربار شاہی میں تشریف لے گئے۔

اس واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ مقصودہ یہ ہوا کہ ایک دن آپ جنگل میں بٹیا کے راستہ سے جا رہے تھے۔ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں بٹیا کے دونوں طرف پانی اور کیچڑ تھا۔ صرف بٹیا کا راستہ خشک تھا کہ سامنے سے ایک کتا اسی بٹیا پر آگیا۔ بٹیا اتنی پتلی تھی کہ شاہ صاحب کتے سے بچ کر نہ نکل سکتے تھے بلکہ دونوں میں سے ایک کو پانی کیچڑ میں اترنا پڑتا تھا۔ اب شاہ صاحب ٹھہر گئے

اور کتا بھی سامنے کھڑا ہو گیا۔ شاہ صاحب نے اُس سے فرمایا کہ بھائی تم کیچڑ میں اترو۔ کہا کیوں میں ہی کیوں اتروں؟ کیا تم اپنے کو مجھ سے افضل سمجھتے ہو۔ فرمایا نہیں! صرف اس لئے تم سے اُترنے کو کہہ رہا ہوں کہ میں مکلّف ہوں۔ نماز وغیرہ پڑھتا ہوں کیچڑ میں میرے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ تو غیر مکلّف ہے پانی سے نکل کر سوکھ جائے گا۔ تیرا کچھ حرج نہ ہوگا۔ کتے نے جواب دیا کہ ہاں میرا اترنے سے کوئی حرج نہیں لیکن یہ سمجھ لو کہ اگر تم اترے تو صرف کپڑے ناپاک ہوں گے جو ایک لوٹا پانی سے پاک ہو جاویں گے۔ لیکن میں اتر گیا اور تمہارے دل میں وسوسہ آ گیا کہ میں اس کتے سے افضل ہوں تو تمہارا دل اتنا ناپاک ہو جائے گا کہ سات سمندروں سے بھی اس کی نجاست زائل نہ ہو گی۔ اب تم کو اختیار ہے جس شق کو چاہو اختیار کر لو۔ بس یہ سن کر شاہ صاحب نے کپڑے سنبھالے اور بسم اللہ کر کے خود ہی کیچڑ میں اتر گئے اور کتا بٹیا کے راستے سے چلا گیا۔

اس کے بعد شاہ صاحب کو الہام ہوا کہ عبدالرحیم خبر بھی ہے کہ یہ علم عظیم تم پر کتے کی زبان سے کیوں ظاہر کیا گیا۔ تم نے جو فلاں دن ایک کتے کے بچہ کی خدمت کی تھی۔ یہ اُس کی برکت سے عطا ہوا اور ہم نے کتے ہی کے واسطہ سے تم کو یہ علم دیا تاکہ تمہارا اُس کتے کے بچہ پر احسان نہ رہے کیونکہ اسی کی برادری کے ایک فرد نے اُس کی مکافات کر دی۔ حضرات اہل اللہ کی یوں اصلاح ہوتی ہے کسی کو کیا خبر ہے کہ ان حضرات کو کیا کیا واقعات پیش آتے ہیں۔

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

ان کو پریشانی بھی ایسی پیش آتی ہے کہ اہل دنیا کی پریشانی اُس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتی اور خوشی بھی ایسی ہوتی ہے کہ دنیا داروں کو اُس کی ہوا نہیں لگی۔ اُس خوشی کا یہ حال ہے ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے
بہ از آں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

بعض لوگ اہل اللہ کو ظاہر میں خوش پوشاک اور بے فکر دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو کچھ فکر نہیں۔ ہاں سچ ہے جس چیز کی تم کو فکر ہے اُس کی انہیں فکر نہیں یعنے دنیا کی اور جس کی انہیں فکر ہے اُس کی تم کو خبر ہی نہیں یعنی خدا کے تعلق میں کمی نہ ہونے کا۔ تم اہل اللہ کی ریس نہ کرو۔ اُن کی طرح خوش پوشاک نہ بنو، نہ اُن کے اقوال کی نقل کرو ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام

اگر تم نقل کروگے تو وہی حالت ہوگی جیسے ایک بندر نے بڑھئی کی نقل کی تھی کہ اس کو لکڑی چیرتے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ بھی اُس کے جانے کے بعد لکڑی پر آ بیٹھے اور میخ جو دو تختوں کو چیرتے ہوئے درمیان میں لگادی جاتی ہے اُن کے درمیان میں اتفاق سے آپ کی سب جمع پونجی آگئی اور آپ نے اُسی میخ کو ہلانا شروع کیا۔ اُس پر جو زور پڑا وہ میخ نکل آئی اور دونوں تختے باہم مل گئے اور دونوں کے بیچ میں آپ کی سب جمع پونجی آگئی۔ اب

کیا تھا۔ فرنطینہ ہو گیا۔ لگا چیخنے چلّانے۔ کچھ دیر کے بعد جو بڑھئی آیا اُس نے خوب مرمت کی۔ اسی لئے کہتے ہیں۔ ؎

کار لوزینہ نیست نجاری

یہی حال ان لوگوں کا ہوتا ہے۔ جو بلا تحقیق اہلِ اسرار کی نقل کرتے ہیں۔ بس بزرگوں کا اتباع اُن افعال واقوال میں کرو جن کے اتباع کا وہ حکم کریں۔ باقی اُن کی خاص حالت یا اُن اقوال کی نقل نہ کرو جو اسرار کے متعلق ہیں غرض دل کی طہارت اور چیز ہے۔ وہ استنجا سے یا دھونے مانجنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ اُس کے حصول کا طریق دوسرا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ ایک بار چلے جا رہے تھے۔ کتا سامنے آگیا آپ نے اُس سے دامن بچایا۔ کتے نے کہا کہ مجھ سے دامن اس لیے بچاتے ہو کہ میں ناپاک ہوں۔ مگر یاد رکھو میرا تو ظاہر ہی ناپاک ہے اور تمہارا باطن تکبّر کی وجہ سے ناپاک ہے۔ میری ناپاکی تو سات بار پانی بہانے سے دور ہو سکتی ہے مگر تمہاری ناپاکی باطنی سات سمندروں سے بھی پاک نہیں ہو سکتی۔ حضرت بایزید روئے اور کہا آؤ دونوں دوستی کرلیں۔ ہم بھی ناپاک تو بھی ناپاک۔ اُس نے کہا میری تمہاری کیا دوستی۔ تم جہاں جاتے ہو تمہاری تعظیم کی جاتی ہے اور میں جہاں جاتا ہوں دھتکارا جاتا ہوں۔ آپ پھر روئے اور فرمایا جو شخص کتے کی دوستی کے لائق نہ ہو وہ خدا تعالیٰ کی دوستی کے کب لائق ہوگا۔

صاحبو! اہل اللہ کی اس طرح اصلاح ہوتی ہے اور یوں اُن کے دل کو پاک کیا جاتا ہے۔ ان ہی حضرت بایزید کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک

بار عید کے دن حمام سے نہا دھو کر عمدہ لباس پہن کر نکلے آرہے تھے کہ راستہ میں ایک شخص نے اپنے مکان سے کوڑے اور راکھ کا ٹوکرا غلطی سے آپ کے اوپر ڈال دیا۔ تمام بدن اور لباس ملوث ہو گیا مگر آپ کے چہرہ پر بل نہیں پڑا۔ فوراً نفس کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے نفس تو تو جہنم کے لائق ہے۔ اگر راکھ ہی پر صلح ہو جائے تو تیری خوش نصیبی ہے۔

صاحبو! یہ ہے دل کی پاکی جس کا اس جگہ بیان ہے اس سے آج کل مسلمان بالکل بے خبر ہیں۔ اس بے خبری کی بدولت ہماری یہ حالت ہے کہ دشمنوں سے تو کیا موافقت کرتے دوستوں سے بھی اختلاف و جدال کرتے رہتے ہیں ؎

شنیدم کہ مردان راہِ خدا — دلِ دشمناں ہم نکردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام — کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

حضرت جس کو اپنی اصلاح کی فکر ہوتی ہے اس کو اتنی مہلت ہی نہیں ہوتی جو کسی سے لڑائی جھگڑا کیا کرے۔ اس کو دشمنوں سے لڑائی کا موقع تو کیا ملتا، دوستوں سے ملاقات کا وقت بھی نہیں ملتا۔ وہ سب سے الگ رہتا ہے نہ کسی سے دوستی بڑھاتا ہے نہ دشمنی پیدا کرتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

خود چہ جائے جنگ و جدال نیک و بد — کیں دلم از صلح ہا ہم مے رمد

کیونکہ تجربہ ہے کہ دشمن اتنا وقت ضائع نہیں کرتا جتنا دوست ضائع کرتے ہیں۔ اس لئے وہ دوستی سے بھی گھبراتے ہیں۔ صاحبو! اللہ والے بن کر دیکھو اس وقت تم کو اس کا یقین آئے گا کہ ان کو نہ دوستی کی فرصت ملتی ہے

نہ عداوت کی۔ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خوئی | چو بگذشت بر عارف جنگ جوئی
گر ایں مدعی دوست بشناختے | نہ بیکار دشمن نپرداختے

اس تقریر سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ دل کا پاک ہونا کیا ہے اور اس کی کس قدر ضرورت ہے۔ بس ضروری مضمون تو اسی قدر تھا کہ لوگ جس چیز کی ضرورت سے غافل ہیں اُن کی ضرورت کو ظاہر کر دیا جائے۔ اب ایک ضرورت اس کی رہ گئی کہ اس کے حصول کا طریقہ بتا دیا جائے۔

طہارتِ باطنہ کے حصول کا طریقہ

سو وہ بھی اس آیت کے سیاق و سباق اور شانِ نزول میں غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا۔ وہ یہ کہ جن حضرات صحابہ سے یہ خطا ہوئی تھی کہ وہ غزوۂ تبوک سے متخلف ہو گئے، اُنہوں نے اس کا تدارک یوں کیا کہ اول تو اپنی خطا کا اعتراف صاف صاف کیا۔ کوئی عذر یا بہانہ نہیں تراشا۔ پھر حضورؐ نے قطع کلام و سلام کا حکم فرمایا اور وہ اس سزا پر راضی رہے (یہ غزوۂ تبوک سے واپسی میں ہوا) پھر جب ان حضرات کی توبہ قبول ہوئی تو حضورؐ کی خدمت میں اپنا مال لے کر حاضر ہوئے کہ اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کر دیا جائے مجھے ان واقعات کی صورت مقصود نہیں بلکہ ان کی اصل مقصود ہے اصل ان سب کی مجاہدہ ہے جس کے معنی لغت میں مشقت میں ڈالنے کے ہیں اور شریعت میں مجاہدہ کی تفسیر یہ ہے کہ نفس کی اُن خواہشوں کی مخالفت کرنا تو ہر شخص کے نزدیک ضروری ہے۔ علماء ظاہر بھی اس کے وجوب کا

انکار نہیں کر سکتے۔ مگر شاید مقدمات معصیت کی مخالفت میں کسی کو کلام ہو لیکن علماء ظاہر نے بھی طے کر دیا ہے کہ مقدمۃ الواجب واجب و مقدمۃ الحرام حرام۔ اس لئے اس میں بھی کلام نہیں ہو سکتا کہ ان خواہشوں کی مخالفت بھی ضروری ہے۔ جو مقدمات معاصی ہیں۔ چنانچہ حضرات صوفیہ نے اپنے تجربہ سے کثرت کلام مباح وکثرت اختلاط مباح وکثرت طعام مباح وکثرت منام مباح کو مقدمۂ معاصی سمجھا ہے اور تفصیل کا موقعہ نہیں ورنہ میں ثابت کر دیتا کہ واقعی زیادہ تر معاصی ان مباحات کی کثرت ہی سے پیدا ہوتے ہیں اور جب تک ان میں تقلیل نہ کی جائے گی اس وقت تک مخالفت تقاضائے معاصی پر آسانی سے ہرگز قدرت نہ ہو گی۔ اس لئے صوفیہ تقلیل کلام و تقلیل اختلاط مع الانام و تقلیل منام کا حکم فرماتے ہیں۔ اور تقلیل تو میں کہہ رہا ہوں ورنہ وہ تو ترک کا حکم کرتے ہیں۔ لیکن مراد ان کی بھی تقلیل ہے جس کو ترک سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ بمرگش گیر تا بہ تپ راضی شود۔

صوفیاء کی یہ تعلیم ایسی ہے جیسے طبیب مسہل میں باتیں کرنے اور سونے سے منع کیا کرتا ہے کیونکہ باتیں کرنا اور سونا مسہل کے اثر کو باطل کرتا ہے اسی طرح صوفیا کہتے ہیں کہ یہ اعمال صلوٰۃ و صوم وغیرہ جو شریعت نے بتلائے ہیں یہ باطن کے لئے مسہل ہیں۔ مگر ان کی تاثیر جبھی ظاہر ہو گی جب کہ کلام و منام و اختلاط و طعام میں تقلیل کی جائے ورنہ مسہل کا اثر ظاہر نہ ہو گا۔

اس مثال سے میرا مقصود یہ ہے کہ حضرات صوفیہ کوئی نئی بات نہیں بتلاتے بلکہ وہی طریقہ بتلاتے ہیں جو تم معالجہ اجسام میں استعمال کرتے ہو مگر

حیرت ہے کہ علماء ظاہر اطباء پر تو اعتراض نہیں کرتے کہ یہ سکوت وسہر کو کدھر سے لازم کر رہے ہیں اور صوفیاء پر اعتراض کرتے ہیں حالانکہ دونوں کے التزام کا منشا ایک ہی ہے۔ پس معلوم ہو گیا کہ طہارت باطنیہ کا طریقہ مجاہدہ ہے یعنی مخالفت نفس جس میں اصل مقصود تو مخالفت تقاضائے معاصی میں ہے مگر تجربہ سے اس کا حصول مخالفت تقاضائے بعض مباحات پر موقوف ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ باتیں کم کرو اور سوچ کر کرو۔ کوئی بات خلاف شریعت نہ کرو اور کلام مباح بھی ضرورت سے زیادہ نہ کرو۔ اور سونا کم کرو۔ اگر زیادہ نہیں جاگ سکتے تو کم از کم عشاء کی نماز سے پہلے مت سوؤ۔ وَتَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ کر سوتے ہیں۔ اس لئے اگر تہجد میں نہ اٹھ سکو تو کم از کم اتنی ہی بیداری کے عادی ہو جاؤ کہ عشاء کے بعد سویا کرو اس سے پہلے نہ سوؤ۔ مگر اب تو مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ بس ہمیں کچھ بھی نہ کرنا پڑے اور خود بخود سارا کام ہو جائے باطن کی طہارت حاصل ہو جائے۔ اے صاحبو! آخر کچھ تو ظاہری طہارت میں بھی اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ پھر ستم ہے کہ باطنی طہارت میں جو اس سے اہم واشد ہے اتنا اہتمام بھی نہ ہو جتنا ظاہری صفائی میں کیا جاتا ہے۔

حالت یہ ہے کہ نماز میں نیند کی شکایت ہے۔ روزہ میں گرمی اور پیاس کی شکایت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تم یہ شکایت اسی وقت تک کر رہے ہو جب تک توجہ نہیں کی۔ بخدا تم توجہ کر کے دیکھو۔ اگر تم توجہ کرو گے تو ان شاء اللہ تم کو ایسے پاک کرنے والے بھی ملیں گے جو آسان راستہ سے

آپ کو پہنچا دیں گے۔ جیسے ظاہری سفر میں آج کل سہولت ہوگئی ہے۔ کہیں پسنجر ہے کہیں ڈاک کہیں اسپیشل ہے۔ اسی طرح آج کل طریق باطن میں بھی ڈاک اور اسپیشل موجود ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہیں وہ اپنے بندوں کی حالت سے واقف ہیں۔ جب تک لوگوں میں قوت تھی اس وقت تک یہ سہولت کے سامان موجود نہ تھے۔ جب سے لوگوں میں ضعف آگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ظاہر میں بھی سہولت کے سامان کر دیئے اور باطن میں بھی۔ پس آپ مجاہدہ کا نام سن کر نہ گھبرائیں۔ آج کل بعض لے جانے والے ایسے بھی ہیں، جنہوں نے راستہ کو آسان کر دیا ہے۔ لیکن اتنا مجاہدہ تو کرنا پڑے گا کہ ارادہ کرو، قصد کرو، اسٹیشن پر پہنچو، ٹکٹ خریدو۔ پھر انشاء اللہ بہت جلد پہنچ جاؤ گے۔ نہ راستہ میں لٹنے کا خطرہ ہوگا، نہ پیاس اور بھوک کا اندیشہ۔ بلکہ ہر مقام پر راحت کا سامان ملتا رہے گا۔ بہت سے اللہ کے بندے راحت کے ساتھ مقصود پر پہنچ گئے ہیں۔ آپ بھی توجہ کر کے دیکھئے ؎

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدیؔ سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

ترکِ معاصی کی ضرورت

میں یہ بات تجربہ اور تحقیق سے کہہ رہا ہوں کہ آج کل بعض مشائخ نہایت سہولت سے طریق طے کراتے ہیں۔ ہمارے حاجی صاحب فرماتے تھے کہ بعض مشائخ ایک مقام سے دفعتہً دوسرے مقام پر پہنچا دیتے ہیں کہ درمیانی مقامات کی بھی اطلاع نہیں ہوتی گویا طریق باطن کا یہ طفرا ہے۔ اسی کو مولانا جامی

فرماتے ہیں ؎

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار انند کہ برند از رہ پنہاں بحرم قافلہ را
ہمہ شیران جہاں بستۂ ایں سلسلہ اند روبہ از حیلہ چساں بگسلد ایں سلسلہ را

اور یہ محض نقشبندیہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر محقق کی یہی حالت ہے۔ اب بعض نادان یوں کہتے ہیں کہ ہم کو بعض کیفیات تو پیش آئی ہی نہیں جو دوسروں کو پیش آتی ہیں۔ اب یہ شیخ سے شکایت کرتے ہیں اور اُس کے احسان کا شکر نہیں کرتے کہ اُس نے سب گھاٹیوں سے دفعۃً پار کر کے اتنا جلدی پہنچا دیا ہے کہ کیفیات وغیرہ سب درمیان میں رہ گئیں اور یہ مقصود تک پہنچ گیا۔ اگر میں اس کی تفصیل کرنے بیٹھوں تو وقت بہت چاہیے۔ مگر تفصیل سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو کرنے کا کام ہے تفصیل یاد کرنے سے کام نہ چلے گا۔ توجہ کرو کام میں لگو خود مشاہدہ ہو جائے گا۔ یہ طریقہ پہلے مشائخ کا تھا کہ تمام رات بیداری کراتے تھے۔ اب تو شیوخ کا یہ طرز ہے کہ اگر مرید تمام رات جاگنا بھی چاہیے تو اُس کو روکتے ہیں اور تمام دشواری کی صورتوں سے منع کرتے ہیں بس اب طالبین کی وہ حالت ہے جو حدیث میں پرندوں کی حالت مذکور ہے کہ

تَغْدُوْ خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا صبح کو بھوکے اٹھتے ہیں شام کو پیٹ بھر کے اپنے گھونسلے میں چلے جاتے ہیں۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں تدبیر کا ابطال کر رہا ہوں ہرگز نہیں بلکہ اس مثال سے بھی تھوڑی سی تدبیر کا تو اثبات ہو گیا کیونکہ پرندے جو شام کو پیٹ بھر کے لوٹتے ہیں۔ وہ اسی کا تو نتیجہ ہے کہ صبح کو گھونسلوں سے نکل کر جنگل کی طرف

اڑ کر جاتے ہیں۔ تو اس تدبیر کی ضرورت تو ہر حال میں ہے کہ طالب بن کر کسی کے پاس پہنچ جاؤ۔ میں مطلقاً تدبیر کا ابطال نہیں کر رہا بلکہ سہولت تدبیر بتلا رہا ہوں کہ آج کل شیوخ محققین توسط کا امر کرتے ہیں مبالغہ سے منع کرتے ہیں۔ بس دو باتوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ معاصی کو قاطبۃً چھوڑ دو اور یہ کچھ دشوار نہیں میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ معاصی کا چھوڑنا بہت آسان ہے۔ اس میں کچھ تکلیف نہیں ہوتی بلکہ ترک معاصی پر قلب کو لذت و راحت ہوتی ہے۔ جب کسی نامحرم پر نظر پڑتی ہے اس وقت دل چاہتا ہے کہ اس کو دیکھو مگر دیکھنے اور گھورنے کے بعد دل میں ایک وحشت و پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ اور نگاہ نیچی کرنے میں اس وقت تھوڑی دیر تو کلفت ہوگی لیکن اس عورت کے چلے جانے کے بعد قلب پر نگاہ کرو تو ایک حلاوت موجود ہوگی اور دل خوش ہو کر یوں کہتا ہوگا ؎

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست
آفریں باد بریں ہمت مردانۂ ما

حدیث میں وعدہ ہے کہ جب کوئی شخص نامحرم سے نگاہ ہٹا لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں خاص حلاوت پیدا کرتے ہیں اور ثواب آخرت جدا رہا۔ دنیا میں یہ مزہ حاصل ہوتا ہے کہ دل کو چین و حلاوت نصیب ہوتی ہے جس سے واللہ موت بھی شیریں ہو جاتی ہے۔ اس کے واقعات سے بھی مزے لیتا ہے۔ اسی کو حضرت غوث اعظم فرماتے ہیں ؎

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست
گویم آنکس کہ ربود ایں دل دیوانۂ ما

پس گناہوں سے قطعۃً احتراز کرو اور اگر کسی سے سب گناہ دفعتہً نہ چھوٹ سکیں تو کم از کم وہ گناہ تو چھوڑ دے جن کے ترک میں دنیا کا بھی کوئی نقصان نہیں۔ جیسے بدنگاہی، جھوٹ، فریب، دغا بازی، تکبر، ریا، نخوت وغیرہ اور صورت یا لباس میں کفار و فساق کا تشبہ کرنا وغیرہ وغیرہ اور جن معاصی کے ترک میں دنیا کا نقصان معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی کی ملازمت ناجائز ہو یا تنخواہ تھوڑی ہو اور رشوت لیتا ہو اس سے میں یہ کہتا ہوں کہ ابھی آپ اس ملازمت کو ترک نہ کریں بلکہ اسی وقت سے جائز ملازمت اور حلال روزی کی فکر میں سچے دل سے لگ جائیں اور جب تک حلال روزی اور جائز ملازمت نہ ملے اسی حرام ملازمت میں رہیئے۔ مگر خدا کے لئے اس کو حرام سمجھئے اور یوں سمجھئے کہ میں مجبوری میں کھا رہا ہوں۔ ایک کام تو یہ کیجئے۔

دوسرا کام یہ کیجئے کہ روزانہ اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کیجئے کہ میرا اس حرام ملازمت کا گناہ معاف کیجئے اور دعا کیجئے کہ اللہ مجھے حلال روزی عطا کیجئے اس طرح آپ عمل کرتے رہیں۔ انشاء اللہ کوئی سبیل خلاصی کی پیدا ہو جائے گی اور جب تک خلاصی نہ ہو آپ ناجائز ہی ملازمت میں رہیئے۔ مگر اس عمل کو ترک نہ کیجئے۔

اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں ناجائز ملازمت کی اجازت دے رہا ہوں بلکہ اس ناجائز ابتلاء کو دوسری بلا کا دفعیہ بنا رہا ہوں۔ جیسا مولانا فرماتے ہیں ع

این بلا دفع بلا ہائے بزرگ

کیونکہ آج کل زمانہ ایسا ہے کہ بعض لوگ فاقہ اور تنگی میں ایمان کو خیرباد۔

کہہ دیتے ہیں۔ ایسے بہت سے واقعات ہمارے سامنے ہیں اور جو مفتی اپنے زمانہ سے واقف نہ ہو وہ جاہل ہے۔ اس لئے میں کسی کو جلدی ترک ملازمت کا مشورہ نہیں دیا کرتا بلکہ یہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم اسی حالت میں رہ کر محبت خدا دل میں پیدا کرو۔ جب محبت پیدا ہو جائے گی، تو پھر فاقہ اور تنگی سب آسان ہو جائے گی۔

نسبت راسخہ کا اثر حضرت رابعہؒ کی یہ حالت تھی کہ جب مسلسل کئی روز تک کھانے کو ملتا اور فاقہ نہ ہوتا تو رو یا کرتیں کہ شاید اللہ تعالیٰ ناراض ہو گئے، روٹھ گئے جو فاقہ نہیں دیا۔ کیونکہ وہ اپنے دوستوں ہی کو فاقہ دیا کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت رابعہؒ کے یہاں مہمان آگئے۔ آپ کے گھر میں کل دو روٹیاں تھیں۔ تھوڑی دیر میں ایک فقیر سائل آگیا۔ آپ نے وہ روٹیاں سائل کو دے دیں۔ مہمانوں کو حیرت ہوئی کہ اتنے تو مہمان گھر میں ہیں اور سوائے دو روٹیوں کے کچھ اور ہے ہی نہیں وہ بھی گھر میں نہ رکھیں۔ مگر کسی کو کیا معلوم کہ خدا کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص خوان لایا کہ فلاں رئیس نے حضرت کے واسطے کھانا بھیجا ہے۔ فرمایا لاؤ دستر خوان کھول کر آپ روٹیاں شمار کیں تو اٹھارہ تھیں۔ فرمایا۔ واپس لے جاؤ یہ میرے واسطے نہیں دی ہیں کسی اور کو دی ہوں گی کیونکہ میرے لئے بیس سے کم نہیں ہو سکتیں۔ میں نے ابھی فقیر کو دو روٹیاں دی ہیں اور میرے محبوب کا وعدہ ہے اَلْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا تو اس حساب سے پوری بیس روٹیاں ہونا چاہئیں۔ قاصد نے کہا حضور آپ کا

حساب درست ہے۔ دو روٹیاں میں نے چرائی تھیں وہ یہ ہیں۔ اب آپ نے وہ کھانا قبول کیا اور مہمان سمجھ گئے کہ حضرت رابعہؒ نے دو روٹیاں سائل کو کس لئے دی تھیں۔ حضرت جب نسبت راسخ ہو جائے گی تو اس وقت آپ بھوکے بھی رہیں گے تو مزے میں رہیں گے اور یوں کہیں گے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور یوں کہیں گے ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من — دل فدائے یار دل رنجان من

اب آپ سے نوکری بھی چھوڑوا دیں گے اور آپ کو کچھ تکلیف نہ ہوگی اے صاحبو! ایک ادنیٰ معشوق کی محبت میں کھانا پینا چھوٹ جاتا ہے۔ اس کی نظائر رات دن مشاہدہ میں آتی ہیں۔ اس سے کوئی پوچھے کہ اب یہ فاقہ کیونکر گوارا ہو گیا۔ پھر عشاق خداوندی پر کیوں تعجب ہے۔ اگر وہ فاقہ سے خوش ہوں حضرت اہل اللہ کی تو یہ حالت ہے کہ محبوب سے مل کر بھی اُن کا دل سیر نہیں ہوتا۔ اُس وقت بھی وہ تڑپتے ہی رہتے ہیں۔ پھر وہ فاقہ اور بھوک کی کیا پروا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے عشق کا اضطراب دنیا میں ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ تو آخرت ہی میں ختم ہوگا۔ عشاق مجاز تو وصال محبوب سے پہلے ہی کھانا پینا، سونا چھوڑ دیتے ہیں۔ وصال کے بعد ہر چیز کے ہوش آ جاتے ہیں۔ مگر عشاق خدا کو عمر بھر کسی چیز کا ہوش نہیں آتا۔ یعنی وہ کسی چیز کے طالب نہیں ہوتے ؎

عجب دارای از سالکان طریق — کہ باشند در بحر معنی غریق

نگویم کہ بر آب قادر نیست کہ بر ساحل نیل مستسقیند!

اور یہ ایسی باتیں ہیں کہ جب چاہو اپنے اندر ان کا مشاہدہ کر لو۔

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیر سرو و سمن در آ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن در آ

مجاہدہ کی ضرورت

ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک تو معاصی کو قاطبۃً چھوڑ دو۔ دوسرا کام یہ کرو کہ تھوڑا سا مجاہدہ کیا کرو یعنی نفس کی مخالفت کیا کرو۔ اور مجاہدہ کے دو شعبے ہیں۔

ایک مجاہدہ بدنیہ دوسرے مجاہدہ مالیہ

مجاہدہ مالیہ میں بہت لوگ کوتاہی کرتے ہیں۔ اکثر سالکین مجاہدہ بدنیہ پر تو جلد جلد راضی ہو جاتے ہیں مگر مجاہدہ مالیہ دشوار معلوم ہوتا ہے۔ بس وہی حالت ہے۔ ع

گر جاں طلبی مضائقہ نیست ور زر طلبی سخن درین است

حالانکہ مجاہدہ مالیہ بھی مجاہدہ کی ایک فرد ہے اس کو بھی اختیار کرنا چاہئے بعض لوگ ایسے ہیں جو نہ مجاہدہ بدنیہ کریں نہ مجاہدہ مالیہ۔ وہ محض وظیفوں ہی سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔ بھلا جس کا قلب مریض ہو اس کا علاج زبان کے وظائف سے کیونکر ہو سکتا ہے۔ بس اس معالجہ کی وہی حالت ہے جو مثنوی میں طبیب روحانی کے قصہ میں مولانا نے فرمایا ہے کہ جب وہ طبیب روحانی آیا اور اس نے دوسرے اطباء کا طریقہ علاج دیکھا تو کہا۔

گفت آں دارو کہ ایشاں کردہ اند آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

بیخبر بود بدانیحال درون — استغنیں اللہ مما یفترون

ایک صاحب نے مجھ سے شکایت کی کہ رات کو آنکھ نہیں کھلتی۔ کوئی وظیفہ بتلادو۔ میں نے کہا اگر اس وظیفہ کو پورا نہ کرسکے تو پھر دوسرا وظیفہ اس وظیفہ کی تکمیل کے واسطے پوچھنے آؤ گے۔ اور اگر آنکھ کھل بھی گئی اور اٹھنے میں سستی رہی تو پھر سستی کے لئے وظیفہ پوچھو گے۔ بس ایک دن یوں ہی مجموعۃ الوظائف ہوجاؤ گے۔ اس طرح کام نہیں چلا کرتا۔ پابندی تہجد کا طریقہ یہ ہے کہ ایک دن ناغہ ہو تو چار آنے نفس پر جرمانہ کرکے کسی غریب کو دے دو اور جماعت صبح کی قضا ہو تو آٹھ آنے دو اور غیبت ہو جائے تو بیس رکعت پڑھو۔ چند دن میں انشاء اللہ تہجد کی عادت اور نماز با جماعت کی عادت ہو جائے گی۔ وظیفوں سے بھی کہیں امراض قلب کا علاج ہوا ہے۔ ان کا علاج بجز مجاہدہ کے کچھ نہیں ہاں ایک تدبیر اور ہے جو اس سے بھی زیادہ ضروری ہے اور مجاہدہ میں بھی برکت وتاثیر اسی کی بدولت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو اور ان کے پاس جایا کرو۔ اگر جا نہ سکو، خط و کتابت ہی رکھو اور غیبت کی حالت میں ان کے ملفوظات و مواعظ روزانہ مطالعہ کیا کرو۔ ناول ہی سمجھ کر ان کو دیکھ لیا کیجئے جیسے ایک گھنٹہ ناولوں کے دیکھنے میں صرف کرتے ہو۔ تھوڑا سا وقت اسی میں سے اہل اللہ کے مواعظ کے مطالعہ کے لئے بھی نکال لو۔ انشاء اللہ چند روز میں زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

مراقبہ موت کی ضرورت

ایک کام اس کے ساتھ یہ بھی کرو کہ رات کو لیٹتے ہوئے اپنے اعمال کا محاسبہ کیا کرو

دن بھر کے کاموں کو سوچا کرو کہ آج ہم نے کتنے گناہ کیے ہیں اور کتنے نیک کام کیے۔ گناہوں سے توبہ استغفار کرو۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور رونے کی صورت ہی بنا لو اگر رونا نہ آئے۔ اور نیک کاموں پر شکر کیا کرو۔ اس کے بعد سونے سے پہلے موت کا تصور کر لیا کرو کہ جیسے ہم آج سو رہے ہیں اسی طرح ایک دن ایسے سوئیں گے کہ قیامت ہی میں آنکھ کھلے گی۔ پھر ملک الموت کے آنے کا اور روح قبض کرنے کا اور قبر میں تنہا دفن ہونے کا تصور کرو۔ اس سے دنیا کی محبت اور اس کے ساتھ دل بستگی کم ہو گی اور گناہوں سے نفرت ہو گی کیونکہ گناہوں کا منشا غفلت عن الآخرۃ ہی تو ہے۔ جب موت اور آخرت کا دھیان غالب ہو گا تو گناہ خود بخود چھوٹنے لگیں گے۔ اس کو کر کے دیکھو۔ پھر تو آپ بچوں کی طرح کھینچ کر بلائے جائیں گے کہ یا دست دگرے دست بدست دگرے۔ پھر انشاء اللہ ایک دن وہ بھی ہو گا کہ آپ بچپن سے نکل کر بلوغ کی حد میں داخل ہو جائیں گے اور باطنی بلوغ کیا ہے۔ اس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

خلق اطفال اند جز مست خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

بالغ وہ ہے جو ہوائے نفس سے نکل جائے۔ جب تک مسلمان ہوائے نفس سے نہ نکلے نابالغ ہے طفل ہے اور جب اس سے نکل گیا بالغ ہو گیا۔ پھر جیسے بالغ ہو کر کوئی نابالغ نہیں ہو سکتا گو اس سے سارا سامان عیش چھین لیا جائے کپڑا اور روپیہ کچھ بھی اس کے پاس نہ رہے۔ مگر اس سے وہ نابالغ نہیں ہو سکتا اسی طرح طریق باطن میں وصول کے بعد رجوع نہیں ہوتا۔ قبول کے بعد رد نہیں ہوتا جتنے لوٹتے ہیں راستہ ہی سے لوٹتے ہیں۔ واصل ہو کر کوئی راجع نہیں ہوتا۔ الفافی

لا یرد نسکے یہی معنی ہیں۔

پھر بہر حال یہ طریق ہے پاکی قلب کا جس کا حاصل مجاہدہ ہے اور مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مجاہدہ بالمال ایک مجاہدہ بالبدن پس اب دونوں مضمون ادا ہو گئے اور معلوم ہو گیا کہ طہارت قلب کا طریق کیا ہے اور طہارت قلب کی ضرورت پہلے معلوم ہو چکی تھی تو اب مقصود مکمل ہو گیا۔

خاتمۃ البیان اس مضمون کو جن کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس مقام کے مناسب یہی مضمون تھا اور اس کی یہاں ضرورت تھی اور یہ بھی معلوم ہوا ہو گا کہ شریعت نے مال کے خرچ کرنے کی کس طرح ترغیب دی ہے۔ کہ کسی پر جبر و اکراہ نہیں ہے بلکہ انفاق مال کو چونکہ تطہیر و تزکیہ میں دخل ہے اس لئے شریعت نے ہم کو اس کا امر کیا ہے۔ باقی سوال کسی سے نہیں کیا جاتا ہر شخص کو اختیار ہے جو پاک ہونا چاہے وہ مجاہدہ مالیہ کرے۔ جو پاک نہ ہونا چاہے وہ اپنے گھر بیٹھے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا، جو علماء احکام شرعیہ کی تبلیغ کرنے والے ہیں وہ انفاق مال کا مضمون بھی محض تبلیغ کے طور پر بیان کیا کرتے ہیں کسی سے اصرار و الحاح نہیں کرتے ہیں۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس مضمون سے اس مدرسہ کو بھی نفع ہو گا جہاں یہ بیان ہو رہا ہے اور میں صاف عرض کرتا ہوں کہ اس مضمون کے اختیار کرنے سے میرا یہ مقصود بھی ضرور تھا کہ سامعین کو امداد مدرسہ کی ترغیب ہو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی مقصود ضرور تھا کہ ان کو ترغیب کا طریقہ بتلا دوں کہ اہل حق اس طرح ترغیب دیا کرتے ہیں جس سے کسی کو وحشت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ محض

مبلغ احکام شریعت ہوتے ہیں اور شریعت نے جس استغناء کے ساتھ ترغیب دی ہے اس سے وحشت ہو ہی نہیں سکتی۔

میں اس وعظ کا نام تزکیہ و تطہیر رکھتا مگر دوسرے بیانات کے ناموں کی مناسبت سے انہی کے وزن پر مطاہر الاموال رکھتا ہوں جس میں اضافت لسوئے سبب ہے اور جمع کا صیغہ دلالت علی الانواع کے لئے ہے اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق ہو۔ وصلے اللہ تعالیٰ علی سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ و اصحابہ و بارک وسلم و آخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔

تاسیس البنیان

علیٰ

تقویٰ من اللہ ورضوان

احکام وآداب عبادات کے متعلق یہ وعظ ۲۷ ذوالحجہ ۱۳۲۵ھ
کو کاندھلہ میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔ جو تین گھنٹہ میں ختم ہوا۔ مولوی
اشفاق صاحب نے قلمبند فرمایا۔ حاضری ۱۵۰ کے قریب تھی

خطبۂ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہ و نستغفرہٗ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمدًا عبدہٗ و رسولہ صلے اللّٰہ علیہ و علیٰ اٰلہٖ و اصحابہ و بارک و سلم۔ امّا بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔ افمن اسّس بنیانہ علیٰ تقویٰ من اللّٰہ و رضوان خیر امّن اسّس بنیانہ علیٰ شفا جرف ھار فانھار بہ فی نار جھنم و اللّٰہ لا یھدی القوم الظٰلمین لا یزال بنیانھم الذی بنوا ریبۃ فی قلوبھم الّآ ان تقطع قلوبھم و اللّٰہ علیم حکیم

تمہید یہ دو آیتیں ہیں جن میں ایک خاص مضمون ایک خاص موقع کے مناسب مذکور ہے مگر مجھے اس سے ایک عام مضمون بیان کرنا ہے۔ لیکن اس بنا پر اس خاص مضمون کی آیات کا تلاوت کرنا بیکار اور زائد نہ سمجھا جائے نیز اس خاص مضمون سے یہ خیال نہ کیا جاوے کہ کل جو بنیاد مدرسہ کی رکھی ہے اس کے متعلق وعظ ہوگا۔ اور تحریک چندہ کے لئے وعظ ہوگا۔ ایسا خیال محض غلط خیال ہے۔ اس لئے کہ میں یہ مضمون بیان نہ کروں گا اور نہ مجھے اس مضمون کے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ جس کو دینا ہوگا خود ہی دے گا مجھے تحریک چندہ کی کیا ضرورت ہے بلکہ میں اس وقت ایک دوسرا مضمون بیان کرنا چاہتا ہوں۔

گو یہ آیت خاص ہے اور خاص موقع پر نازل ہوئی ہے مگر اس وقت اس آیت سے کوئی خاص مضمون بیان کرنا مقصود اور مدنظر نہیں ہے بلکہ ایک

عام مضمون بیان کرنا ملحوظ خاطر ہے گو وہ زیادہ عام بھی نہیں جس کا تعلق تمام حالات سے ہو بلکہ ایسا عام اُس خاص کے اعتبار سے جس میں ایک درجہ کا ایسا عموم ہے کہ اکثر لوگوں کو اس سے سابقہ پڑتا ہے یعنی آیات تو خاص مساجد کے احکام کے متعلق ہیں اور میں ذکر کروں گا عام عمارات کے متعلق جس کا عموم بھی بہ نسبت خاص عمارات مساجد کے ظاہر ہے اور جس سے بکثرت لوگوں کو سابقہ بھی پڑتا ہے۔ مگر جن بعض لوگوں کو مطلقاً عمارات سے سابقہ نہیں پڑتا اُن سب کے لیئے عام نہیں پس یہ کہنا صحیح ہو گیا کہ عام تو ہے مگر زیادہ عام بھی نہیں ہے۔

تفصیل اس عموم و خصوص اور اُس کے اعتبار سے درجات ضرورت کے تفاوت کی یہ ہے کہ مخاطب عام مکلفین ہیں۔ اور اُن سے سب کو سابقہ پڑتا ہے اور بعض مضامین وہ ہیں جن سے بعض کو سابقہ پڑتا ہے اور بعض کو نہیں اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے [illegible] زیادہ قابل اہتمام ہیں جن سے اکثر کو سابقہ پڑتا ہے گو قدر قلیل کو نہ پڑتا ہو۔ اور جن سے بعض کو سابقہ پڑتا ہو نہ کہ اکثر کو وہ اس درجہ کے اہتمام کے لائق نہیں۔

اس میں اصل کلی یہ ہے کہ احکام تابع واقعات کے ہیں اور ہر واقعہ کے متعلق کچھ احکام شرعیہ ہیں۔ جس کو وہ واقعہ پیش آوے اس کو وہ احکام سیکھنا فرض اور ضرور ہو جاتا ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کے احکام ہیں کہ ملک مال سے متعلق ہیں۔ جب تک آدمی مال کا مالک نہ ہو اُس وقت تک اُس کو احکام عملیہ زکوٰۃ کے سیکھنا فرض اور ضروری نہیں۔ گو اعتقاد فرضیت کا فرض ہے اور جب

مال کا مالک ہوا اُس وقت احکام عملیہ زکوٰۃ کے سیکھنا ضروری اور فرض ہو گئے۔ اور احکام عملیہ کی قید اس لئے لگائی کہ عقیدہ کے درجہ میں تو ہر شخص سے زکوٰۃ کی فرضیت وغیرہ کا تعلق ہے جیسا اوپر بیان ہوا مگر عمل کے درجہ میں ہر شخص سے نہیں بلکہ اسی شخص سے ہوگا جس کے پاس بقدر نصاب مال ہو اور عملی سے بھی مراد عمل ظاہری ہے نہ کہ عمل باطنی کیونکہ عمل باطنی کا بھی ہر شخص سے تعلق ہے جیسا عنقریب آتا ہے۔

اعمال باطنیہ ہر چند کہ عمل باطنی کو آج کل عمل ہی نہیں سمجھتے حالانکہ اعمال باطنی بھی ضروری ہیں (بلکہ اس وجہ سے اعمال باطنیہ زیادہ ضروری ہیں کہ اُن پر ہی مدار قبول اور عدم قبول کا ہے اور نیز اعمال باطنیہ کا تعلق بحسب العمل سب سے ہے۔) مثلاً زکوٰۃ کے اندر عمل باطنی یہ ہے کہ یہ عزم ہو کہ اگر مال ہوا تو میں زکوٰۃ دوں گا۔ یہ عمل باطنی ہے۔ تو یہ عمل ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور اس عمل کا تعلق ہر شخص سے ہے۔ اُس مفلس کو جو مالدار نہ ہو یہ عزم رکھنا ضروری ہے کہ اگر میں مالدار ہوا تو زکوٰۃ دوں گا۔ اور یہ فرض ہے۔ اور اگر یہ عزم نہ کرے یا یہ عزم کرے کہ میں اگر مالک مال ہوا تو زکوٰۃ نہ دوں گا۔ تو اس سے گنہگار ہوگا کیونکہ اُس نے ایک عمل باطنی فرض کو ضائع کیا۔ غرض یہ عزم عمل باطنی ہے اور ضروری و فرض ہے اور اس عمل کا ہر شخص سے تعلق ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بعض احکام باعتبار عمل ظاہر کے وہ ہیں جن کا تعلق سب سے نہیں بلکہ بعض سے ہوتا ہے۔ اس وقت کا بیان بھی ایسا ہی خاص

ہے کہ جس کو تعلق بعض اعمال ظاہرہ سے ہے اعمال باطنہ سے نہیں جس کا ہر ہر فرد مکلف انسان سے تعلق ہوتا۔ اس وجہ سے ایسا تو عام نہیں ہے جیسا کہ عمل باطنی یا بعض عمل ظاہری عام ہوتا ہے اور نہ ایسا خاص ہے جیسا کہ بعض احکام ظاہرہ مخصوصہ ہوا کرتے ہیں۔ لہذا یہ مضمون بہ نسبت عمل باطنی و بعض عمل ظاہری کے تو خاص ہے اور بلحاظ عمل ظاہری خاص کے عام ہے کہ سب سے تعلق نہیں صرف اکثر سے تعلق ہے۔ چنانچہ آیت سنتے ہی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ وہ عمل جس کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں مکان بنانا اور تعمیر کرنا ہے۔ سو اس کے متعلق بھی احکام شرعیہ ہیں۔ اور ان احکام کے وہی مخاطب ہوں گے جن کو تعمیر کا اتفاق پیش آتا ہے اور جن کو کبھی ایسا اتفاق ہی پیش نہیں آیا اور انہوں نے کبھی اینٹ بھی نہیں رکھی اُن لوگوں سے ان احکام کا تعلق نہ ہوگا جیسے جو شخص مالک مال نہ ہو اُس سے احکام زکوٰۃ کا تعلق نہیں۔

اسی طرح سفر حج کے احکام ہیں۔ یہ احکام بھی اسی شخص سے متعلق ہوں گے جس پر حج فرض ہے۔ اسی طرح وہ احکام ہیں جن کا وہاں جانے کے بعد سیکھنا اور معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے جیسے احکام طواف، احکام عمرہ، احکام احرام، احکام رمی وغیرہ۔ اور جس شخص پر حج فرض نہیں اُسے ہنوز احکام حج سیکھنا فرض نہیں۔ اور جن کے ذمہ فرض نہیں ہے مگر وہاں پہنچنے سے فرض ہو جاتا ہے اُس وقت اُن کو بھی احکام سیکھنا فرض ہوں گے۔

اعتدال شریعت سبحان اللہ! شریعت بھی نہایت اعتدال اور سہولت کا اور جامع قانون ہے چنانچہ جامعیت کی دلیل

یہ ہے کہ دنیا میں اس قدر مشاغل کثیرہ ہیں کہ ہر شخص کے بے حد و حساب مشاغل ہیں مگر قانون شریعت سب کو محیط ہے۔ کوئی جزئی قانون شریعت سے خارج نہیں۔ عادۃً اس قدر مشاغل کثیرہ پر کسی قانون کا احاطہ تامہ سخت دشوار تھا یہ بھی بڑی دلیل ہے قانون شریعت کے منجانب اللہ ہونے کی) اور اسی طرح سے کسی شخص نے نکاح نہ کیا ہو اور نہ ارادہ نکاح کا ہو۔ اس پر احکام نکاح سیکھنا ضروری نہیں اور جس وقت نکاح کا ارادہ کرے اس وقت احکام سیکھنا ضروری اور فرض ہے۔

اس پر اگر کوئی شخص یہ شبہ کرے کہ احکام شرعیہ کا معلوم کرنا اس طرح سے فرض ہو تو شریعت میں بے حد تنگی اور حرج لازم آوے گا۔ کیونکہ ایک عمل کے متعلق بہت بہت احکام ہیں جن کا مجتمعاً حاصل کرنا ظاہر ہے کہ سخت دشوار ہے۔ حالانکہ قرآن میں صاف واضح طور پر موجود ہے۔ وما جعل علیکم فی الدین من حرج۔ جس سے بین طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ دین میں کسی قسم کی تنگی اور حرج نہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حرج اس وقت ہوتا کہ ایک وقت میں تمام احکام کا علم واجب ہوتا۔ اس لئے کہ یہ امر بدیہیات سے ہے کہ سب احکام کا ایک وقت میں محفوظ کرنا سخت دشوار ہے مگر ایسا نہیں بلکہ جس وقت جس عمل کی ضرورت ہو اس وقت اس کے احکام کا جاننا ضروری ہے اور یہ کچھ دشوار نہیں۔ لہذا روز روشن کی طرح معلوم ہو گیا کہ حرج علمی بھی دین میں نہیں اور حرج عملی نہ ہوتا تو اس سے بھی زیادہ ظاہر ہے۔ کیونکہ اس میں اعمال کا اجتماع نہیں

ہونا۔ ایک ایک وقت میں ایک ایک عمل ہے اور وہ بھی بہت سہل اور کوئی حکم دشوار نہیں۔

سہولتِ احکام تمام احکام سہولت پر مبنی اور بے حد سہل ہیں۔ باقی اگر خود ہی کوئی شخص دشوار سمجھنے لگے اور عہدی بن جائے اُس کا علاج نہیں ورنہ کسی کام میں بھی تو مصیبت اور تنگی نہیں بلکہ تمام احکام میں سہولت ہے۔

چنانچہ دیکھئے کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھنا فرض ہے۔ اگر کسی شخص کو قیام پر قدرت نہ ہو بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے اور اس کے لئے حکم ہے کہ بیٹھ کر پڑھے اور اگر بیٹھ کر بھی قدرت نہ ہو تو لیٹ کر پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح رمضان کے روزے فرض ہیں لیکن اگر کوئی شخص مریض ہو اور اُس کو رمضان کے روزے پر قدرت نہ ہو تو اُسے اجازت ہے کہ اور ایام میں رکھ لے اور اگر یہ یقین ہو کہ اب مجھے عمر بھر قدرت نہ ہو گی تو فدیہ دے اور اگر فدیہ پر بھی قدرت نہ ہو تو استغفار کرے۔

غرض اسی طرح سے احکام میں تشقیق و تفصیل ہے جو محض سہولت کی وجہ سے کی گئی ہے۔ تو دین پر عمل کرنے میں کسی قسم کی تنگی اور حرج نہیں۔ اسی طرح جو شخص نکاح کا ارادہ کرے اس پر نکاح کے احکام سیکھنا ضروری اور فرض ہیں مگر اس وقت وہی احکام فرض ہوں گے کہ جو وقت تزوج کے ہیں طلاق کے احکام اس وقت سیکھنے فرض نہ ہوں گے۔ کیونکہ نکاح بہ نیت طلاق موجب معصیت ہے یعنی اس نیت سے نکاح کرنا کہ میں طلاق دے دوں گا موجب

گناہ ہے۔ اور اس نیت سے گناہ ہوتا ہے البتہ نکاح ہو جاوے گا مگر گناہ ضرور ہوگا۔ اور نکاح نافذ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ زنا کا گناہ نہ ہوگا۔ بہرحال جب یہ عزم اور یہ ارادہ معصیت ہوا تو یہ ارادہ نہ کیا جاۓ گا کہ طلاق دوں گا اور جب یہ ارادہ نہ ہوگا تو تزوج کے وقت احکام طلاق کا سیکھنا ضروری اور فرض بھی نہ ہوگا البتہ جب عزم طلاق ہو، اُس وقت احکام طلاق سیکھنے فرض ہونگے کہ طلاق کس وقت دینی چاہیئے۔ طہر میں یا حیض میں اور کتنے دینی چاہیئیں مثلاً تین طلاق دفعۃً دینی چاہیئیں یا متفرق طور سے۔ پھر جب طلاق موافق سنت دے دی تو اب یہ احکام سیکھنے ضروری ہیں کہ یہ طلاق رجعی ہوئی یا بائن اور عدت کے احکام سیکھنے لازم ہوں گے کہ عدت میں نفقہ ضروری ہے یا نہیں تو ان احکام کا اس وقت سیکھنا ضروری ہے۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہیں۔ زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں۔

پس اسی طرح یہ مضمون مقصود بالبیان بھی اسی قسم سے ہے کہ اس کی ہر شخص کو ضرورت نہیں ہے کیونکہ مکان تعمیر کرنے کا ہر شخص کو سابقہ نہیں پڑتا ہے۔ گو شوق اور خبط تقریباً عام طور پر سب کو تعمیر مکانات کا ہے اِلّا نادراً چنانچہ جو لوگ مکان بناتے ہیں اگر ان کو گنجائش نہیں بھی ہوتی تب بھی اپنی وسعت سے زیادہ صرف کر دیتے ہیں یہاں تک اگر حوصلہ سو کا ہے تو پانچ سو خرچ کر کے پریشان ہوتے ہیں۔ غرض تعمیر مکان کی تمام شخصوں کو حاجت نہیں ہے البتہ اکثر کو بے شک ضرورت ہے۔ ایسے افراد بہت کم ہیں کہ جن کو تعمیر مکان کی حاجت نہیں ہے۔ زیادہ وہی ہیں جن کو ضرورت ہے۔ پکا نہ سہی تو کچا سہی

اور لحاظ زیادہ افراد کا ہوا کرتا ہے۔ اس لیے کہ للاکثر حکم الکل ۔ اس لیے اگر کوئی شخص اس مجمع میں ایسا ہو کہ اس کو تعمیر مکان کی حاجت نہ ہو تو اس کی رعایت سے اس وقت اس بیان کو چھوڑا نہ جائے گا کیونکہ النادر کالمعدوم۔

خلاصہ یہ ہوا کہ یہ مضمون یعنی تعمیر مکان کا اکثر کے متعلق ہے اور چونکہ اس کے آداب اور شرائط معلوم نہیں اور ہم خود مختار ہیں نہیں اور کچھ احکام ہم پر اس کے متعلق بھی ہیں۔ اس لیے اُن احکام کے بتلانے کی ضرورت ہے اس سے بعضے جہلا یہ خیال کرتے ہیں کہ شریعت میں بڑی تنگی ہے کہ ہر چیز کے احکام ہیں کہ اس طرح کھاؤ اور اس طرح پیو۔ تمام چیزوں کے قواعد بنا دیئے ہیں بلکہ مزید برآں فی زمانہ بہت لوگ تو احکام شرعیہ کو مولویوں کی گھڑت خیال کرتے ہیں، خداوندی حکم بھی خیال نہیں کرتے اور جو خداوندی احکام خیال کرتے ہیں وہ ان احکام میں تنگی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ احکام میں بیحد سہولت ہے اور حیرت تو یہ ہے کہ گمان یہ ہو گیا ہے کہ احکام تنگی کے واسطے موضوع ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی طبیب کسی مریض کے واسطے مسہل کا نسخہ تجویز کرے مگر مریض اس مسہل کی غایت پر نظر نہ کرکے اس کے ذائقہ کی تلخی دیکھ کر طبیب کو برا بھلا کہنے لگے۔ تو جیسے اس شخص پر حیرت ہوتی ہے اسی طرح اس شخص پر بھی حیرت ہے جو دین کے احکام کو تنگی کے واسطے موضوع قرار دے۔ چنانچہ ہر شخص مریض کی باتوں کو سن کر یہی کہے گا کہ اس مریض نے غایت پر نظر نہیں کی

صاحبو! مسہل کی ناگواری اسی وقت تک ہے جب تک مواد فاسدہ

دفع ہو کر قوت عود نہ کرے اور جب مواد دفع ہو جاوے گا اور دو میل تک تفریح کے لئے بلے تکلف جا سکے گا اور فرحت اور تازگی پیدا ہو گی جو پہلے نہ تھی اس وقت مجوز مسہل کی قدر ہو گی کہ واقعی طبیب بہت شفیق تھا جس نے غایت شفقت سے مسہل دے کر مواد فاسدہ کو دفع کر دیا۔ اسی طرح سے احکام شرعیہ کی حالت ہے۔ جو لوگ عمل کرتے ہیں اُن کو عمر بھر کبھی تنگی اور پریشانی پیش نہیں آتی بلکہ وہ بحد راحت میں رہتے ہیں۔ اس مضمون کو دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔

شاید کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ ہم تو اہل اللہ کو بھی تنگی اور مصیبت میں دیکھتے ہیں۔ وہ راحت میں کہاں ہیں۔ تو اصل یہ ہے کہ معترض تنگی و پریشانی کو ذات واقعہ کی صفت اور اثر خیال کرتا ہے حالانکہ یہ اُس کا محض خیال ہی ہے۔

تنگی اور پریشانی کی وجہ

حقیقت میں تنگی اور پریشانی ذات واقعہ کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ دوسرے عوارض کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً ایک واقعہ جزئیہ ہے کسی کو بغل میں دبا لینا سو اُس کے متعلق ایک حالت تو یہ ہے کہ کوئی شخص جا رہا تھا اور پیچھے سے کسی شخص نے آکر دبا لیا۔ جب اُس نے پیٹھ پھیر کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک جانی دشمن ہے۔ تو اس وقت اُس کی حالت جو کچھ ہو گی وہ اظہر من الشمس ہے۔ یہی کوشش کرے گا کہ کسی صورت سے جلدی چھوٹوں اور جس صورت سے بھی ہو ہیں اس کے ہاتھ سے نکل جاؤں۔

ایک حالت یہ ہے کہ یہ چلا جا رہا تھا اور پیچھے سے کسی شخص نے آ

کر دبا لیا۔ اُس نے پیٹھ پھیر کر جو دیکھا تو اُس کا وہ محبوب تھا جس کی برسوں سے تلاش میں تھا اور مدت سے اُس کی وجہ سے خاک چھانتا پھرتا تھا۔ وہ اس کو دبائے ہوئے ہے۔ بتلایئے اس وقت اُس کی کیا حالت ہوگی۔ کیا اس کا دبانا کچھ ناگوار ہوگا۔ ہرگز نہیں! بلکہ اگر وہ محبوب اُس سے یوں کہے کہ اگر تجھے میرا دبانا ناگوار معلوم ہو تو میں اس تیرے رقیب کو اسی طرح سے دبالوں تو ہرگز یہ شخص پسند نہ کرے گا بلکہ یہی خواہش کرے گا کہ جتنا جی چاہے مجھے دبا لے اور اپنی کمر کو اُس سے ملا دے گا۔

تو ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں واقعہ ایک ہی ہے یعنی دونوں جگہ وہ واقعہ بغل میں دبا لینا ہی ہے۔ مگر دونوں واقعوں میں بڑا فرق ہے۔ تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذات واقعہ موجب پریشانی اور حزن نہیں بلکہ عوارض موجب حزن ہوتے ہیں۔ اگر واقعات فی نفسہ موثر ہوتے تو اس واقعہ میں دونوں جگہ اثر یکساں ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ واقعہ فی نفسہ موثر نہیں بلکہ عارض موثر ہے انتساب الی العدو کا اور اثر ہے اور انتساب الی الصدیق کا اور اثر ہے۔ یہی فرق ہے اُن واقعات میں جو اہل اللہ اور اہل دنیا دونوں کو پیش آتے ہیں کیونکہ ذات واقعہ تو پریشانی اور حزن میں موثر ہے۔

اہل دنیا کو اگر کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو تنگ اور بدحواس ہوتے ہیں اور اہل اللہ کو اگر کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو اُن کے لئے موجب فرحت ہوتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ کلفت دہ چیز سے اُن کو طبعی تکلیف بھی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس تکلیف میں بھی اُن کو فرحت عظیمہ ہوتی ہے

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی شخص کے پھوڑا نکل رہا ہو۔ جراح یا ڈاکٹر نے اُس کی حالت دیکھ کر نشتر لگانا تجویز کیا مگر ڈاکٹر کے پاس بیہوش کرنے کی دوا (کلورا فارم) اُس وقت موجود نہ تھی۔ اُس نے ہوش ہی میں نشتر لگا دیا۔ نشتر لگتے ہی تکلیف کی وجہ سے ایک آہ نکلی۔ مگر جب مواد نکل چکا اس وقت ہنس رہے ہیں اور ڈاکٹر کو انعام میں پچاس روپیہ دیئے جا رہے ہیں مگر ڈاکٹر اُس کو کم سمجھ کر واپس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ زیادہ انعام لونگا اور یہ خوش ہو رہے ہیں۔ گو نشتر لگتے ہی طبعاً تکلیف بھی ہوئی اور آہ بھی نکلی مگر باوجود اس کے بعد میں خوش ہو رہے ہیں اور انعام دیا جا رہا ہے اور مانگا جا رہا ہے۔ تو صاف ظاہر ہے کہ گو رنج طبعی ہوا مگر فرحت عقلی کی وجہ سے وہ رنج رنج نہیں سمجھا گیا۔

اسی طرح سے جو لوگ اہل اللہ ہیں اُن کو جب کوئی واقعہ پیش آتا ہے خواہ کتنا ہی موجب حزن و پریشانی ہو مگر ناگواری جس کا نام ہے وہ اُن کے پاس بھی نہیں آتی۔ گو کسی واقعہ کلفت دہ سے طبعی تکلیف ہو مگر ناگواری کا نام نہیں ہوتا بلکہ فرحت عقلیہ ہوتی ہے انتساب الی الحق کی وجہ سے کیونکہ ذاتِ واقعہ تو مؤثر نہیں بلکہ انتساب مؤثر ہے۔ تو انتساب الی الحق کی وجہ سے اُن کو فرحت ہوتی ہے اور اس وقت وہ یوں کہتے ہیں ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

غرض یہ بات ثابت ہو گئی کہ احکام شرعیہ تنگی کے واسطے موضوع نہیں

اور احکام شرعیہ میں فی نفسہ آسانی ہے محض آثار سے تنگی ہوتی ہے اور وہ آثار اسی شخص کے حالات ہوتے ہیں جن کو یہ درست کر سکتا ہے۔ اس کی شرح یہ ہے۔ یہ تنگی اسی وقت تک ہے کہ صرف علم الیقین کا درجہ ہو جو شرط ایمان ہے اور عین الیقین میسر نہ ہوا ہو۔ جب عین الیقین کا مرتبہ میسر ہو گا۔ (یہی معنی ہیں اُن آثار کے درست کرنے کے) اس وقت آپ کو بھی ہر حکم میں سہولت معلوم ہو گی۔ اور یہ درجہ کوئی سلف صالحین کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اب بھی حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ یہ مقام ولایت کا ایک درجہ ہے اور نبوت تو بیشک ختم ہو گئی مگر ولایت ختم نہیں ہوئی ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست — خم و خمخانہ با مہر و نشان است

تو نیہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ جب طاعت کرو گے اسی وقت اثر معلوم ہو گا کہ کس قدر اور کس درجہ عمل میں سہولت ہے اور کس قدر عمل سے فرحت ہوتی ہے۔ غرض احکام شریعت میں یہ خیال کر لینا کہ ان میں تنگی ہے محض خیال خام ہے۔ شریعت میں اصلاً تنگی نہیں۔ شریعت کی تنگی تو ایسی تنگی ہے جیسے ایک حکیم نے ایک مریض کے واسطے بہت سی چیزیں بتلا دیں کہ یہ مضر ہے اور یہ مفید ہے۔ اس پر کوئی یہ کہے کہ ان حکیم صاحب کے مزاج میں تنگی ہے، ان سے تو فلانے حکیم بڑے اچھے ہیں کہ وہ کسی چیز کو بھی منع نہیں کرتے اصل یہ ہے کہ وہ محض نام ہی کا حکیم ہے جو کسی چیز سے نہیں روکتا اور وہ حکیم شفیق ہے جو مضرات سے روکتا ہے اور اس وقت ہر شخص یہ کہے گا کہ طبیب کا مقصود تنگی نہیں بلکہ مقصود شفقت ہے۔ اسی طرح احکام شرعیہ کا مقصود تنگی نہیں بلکہ خوشی

ہونا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت اور شفقت ہی مقتضی ہوئی ہے ہر امر سے تعرض کرنے کی اور احکام بتلانے کی۔ تو احکام کا اصل منشا رحمت ہے تنگی نہیں ہے اس لئے ہر چیز کا قانون اور حکم معلوم کرنا ضروری ہے۔

البتہ احکام میں درجات ہیں۔ سب میں اہم تو عقائد ہیں۔ اس کے بعد مرتبہ شعائر دین کا ہے جیسے نماز روزہ۔ اس کے بعد بقیہ احکام۔ مجھ کو اس وقت عقائد یا نماز روزہ کے متعلق بیان کی چنداں ضرورت نہیں گو وہ سب سے زیادہ ضروری ہیں۔ مگر اس کی ضرورت اور جزو دین ہونا سب کو معلوم ہے بلکہ ایسے حکم کے بیان کی حاجت ہے جو واقع میں جزو دین ہے مگر لوگ اس کو جزو دین نہیں خیال کرتے۔ ایسے مضمون کے بیان کی سخت ضرورت ہے اور میں نے ایسا ہی مضمون اختیار کیا ہے۔

مگر یہ مضمون اس بنیاد کی بابت نہ سمجھا جاوے جو کل رکھی گئی ہے اجو بوجہ عموم کے اس کو بھی مشتمل ضرور ہے اور نہ مجھ کو اس بنیاد کی بابت زیادہ مضمون بیان کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی زور دینے اور نہ ترغیبی مضمون بیان کرنے کی حاجت ہے۔ وہ کام خود اپنی ضرورت ظاہر کردے گا کہ مجھے اعانت کی حاجت ہے۔ ع

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

ہاں کوئی اس کام کو کام ہی نہ سمجھے تو دوسری بات ہے۔ اس وقت استطراداً بنیاد مدرسہ پر ایک مضمون ذہن میں آ گیا۔ وہ یہ کہ بعض لوگ دینی مدارس و مساجد پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ ان میں انتظام اور صفائی نہیں۔ نہ بوریئے

درست ہیں نہ کوئی بیٹھنے کی جگہ ہے۔ اگر ہم کبھی جائیں بھی تو کہاں بیٹھیں۔ مگر میں ان معترضین سے کہتا ہوں کہ آپ یہ اعتراض کس پر کر رہے ہیں۔ صاحب مدرسہ کسی مہتمم یا متولی کا گھر نہیں۔ سب مسلمانوں کا مشترک مدرسہ ہے اگر وہاں کی بدانتظامی اور عدم صفائی سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے تو اپنے مدرسہ کی صفائی اور نظافت کا آپ خود کیوں نہیں خیال کرتے۔ مگر ہماری یہ حالت ہے کہ دوسروں کو کہتے ہیں کہ اُن کی یہ حالت ہے اور واقع میں وہ خود اپنی حالت ہے اور وہ اعتراض خود اپنے اوپر پڑتا ہے ؎

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسا ایک مشہور قصہ ہے کہ ایک بیوقوف کا لڑکا روٹی کھا رہا تھا۔ پانی پینے کی غرض سے اٹھا تو ٹکڑا لوٹے میں جا پڑا جھانک کر دیکھا تو اس میں اپنی صورت نظر پڑی۔ باپ کو آواز دی کہ ابا! اس نے میرا ٹکڑا چھین لیا۔ باپ نے آ کر دیکھا تو اُسے اپنی صورت نظر پڑی۔ تو آپ کہتے ہیں کہ تف ہے تیرے اوپر۔ بوڑھے ہو کر بچہ کا ٹکڑا چھین لیا۔ شرم نہیں آتی۔ تف ہے تیری اوقات پر۔

تو جیسے وہ اپنے زعم میں دوسرے کو کہہ رہا تھا اور واقع میں اپنے ہی کو کہہ رہا تھا۔ یہی حال ہمارا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

مساجد کی عدم خبر گیری

میں ایک دفعہ شاہجہانپور گیا۔ ایک رئیس کے یہاں دعوت تھی۔ ہم لوگ دعوت میں گئے

مگر نمازِ عشاء کا وقت قریب تھا۔ اس لئے میں نے کہا کہ پیشتر ہم نماز پڑھ لیں۔ نماز سے فارغ ہو کر کھانا کھاویں گے۔ چنانچہ ہم لوگ مسجد میں گئے مگر وہ میزبان صاحب تشریف نہ لاتے۔ وہ نماز تو پڑھتے تھے مگر مسجد میں نہ آتے تھے۔ مسجد کی حالت بہت خراب تھی۔ افسوس ہے کہ اللہ میاں کے گھر کی ایسی بیقدری کی جاتی ہے کہ نہ اُن کی صفائی کا اہتمام ہے نہ خبر گیری کی جاتی ہے۔ غرض اس مسجد میں کسی قسم کا بھی انتظام نہ تھا مٹی کی ایک ڈبیا رکھی تھی اور روشن ہو رہی تھی۔ جس کے دھوئیں اور بو سے سخت کلفت ہوئی۔ مسجد سے واپسی کے بعد میں نے اس حالت پر افسوس ظاہر کیا تو وہ رئیس شرما گئے۔

غنیمت ہے بعضے تو ایسے موقع پر شوخی سے یوں کہنے لگتے ہیں کہ ہم تو اسی واسطے اپنے گھر پر نماز پڑھ لیتے ہیں کہ مسجد میں صفائی کا اہتمام نہیں۔ مگر میں ادب و تہذیب سے عرض کرتا ہوں کہ آپ جو گھر پر نماز پڑھتے ہیں اسی لئے تو وہاں صفائی نہیں کیونکہ اب نماز پڑھنے والے صرف غرباء ہیں۔ وہ بیچارے اپنی ہمت کے موافق جو کچھ اُن سے ہو سکتا ہے انتظام کرتے ہیں۔ تو آپ کا مسجد والوں پر اعتراض کرنا درحقیقت اپنے اوپر اعتراض ہے کیونکہ مسجد سب مسلمانوں کی ہے۔ صرف غریبوں کی نہیں ہے۔ آپ بھی تو مسجد والوں میں داخل ہیں۔ پھر آپ خود کیوں نہیں انتظام کرتے۔ جب کوئی پردیسی مسجد کو اس حالت میں دیکھے گا، وہ تو یہی کہیگا کہ یہاں کے مسلمان بہت ہی ناقدرے ہیں جو مسجد کو اس حال سے رکھتے

ہیں جس میں آپ بھی داخل ہوں گے۔ کم از کم ایک آدھ وقت کی نماز تو آپ مسجد میں پڑھ لیا کیجئے۔ اور مسجد کی خبر گیری رکھئے۔ مسجد خود بتلادے گی کہ میرے اندر فلاں فلاں کمی ہے۔

اسی طرح سے مجھے یہاں کچھ ضرورت ترغیبی مضامین بیان کرنے کی نہیں ہے۔ مدرسہ خود بتلا دے گا کہ مجھے اعانت کی حاجت ہے اور اگر اس پر بھی اعانت نہ کریں تو حق تعالیٰ ہمارے محتاج نہیں ہیں۔ اگر میں اس پر ترغیبی مضمون بیان کرتا تو اس وقت تو سامعین جوش میں کچھ دے دیتے مگر بعد میں بعضے لوگ میری طرف نسبت کرتے کہ ہم نے اس کی وجہ سے دے دیا۔ لہٰذا مجھے احسان لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ دین کا کام سب مسلمانوں کا ہے میں اپنے اوپر کیوں احسان لوں۔

ابھی قریب کا واقعہ ہے کہ جلال آباد میں ایک شخص نے مدرسہ کے لئے کچھ رقم دی، مرض موت کی حالت میں۔ پھر اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے لئے فرائض کا مسئلہ مجھ سے پوچھا گیا۔ میں نے جواب تو لکھ دیا جس میں وصیت اور میراث دونوں حکموں کی تحقیق لکھ دی مگر دستخط نہیں کئے۔ بعض لوگوں نے دستخط پر اصرار کیا۔ میں نے کہہ دیا کہ دستخط سے ورثاء مجبور ہو جائیں گے۔ اور یوں کہیں گے کہ ہم نے فلاں شخص کے کہنے کی وجہ سے وصیت کو مان لیا ورنہ نہ مانتے۔ تو میں خواہ مخواہ کیوں احسان لوں ضروری جواب میں نے لکھ دیا ہے۔ اگر اس میں شبہ ہے کسی اور عالم سے فرائض نکلوالیں۔ اور اپنا اطمینان کر کے جو کچھ کریں خود کریں۔ میرے

اوپر احسان رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

سفارش کی خرابیاں

صاحبو! اسی واسطے تجربہ کاروں کی طبیعت آج کل سفارش سے رُک گئی ہے۔ اس لئے کہ اولاً تو سفارش کا اس زمانہ میں کوئی اثر ہی نہیں اور اگر اثر بھی ہو تو بہت ذلت سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ساری عمر دوسرے کا اپنی گردن پر احسان رہتا ہے کہ اس کی سفارش سے ہم نے ایسا کر دیا اور یہ تو ظاہر ہے کہ ہم جیسوں کا کوئی اثر بھی نہیں ہے۔ مگر جہاں اثر نہیں ہوتا وہاں کے لئے کوئی سفارش بھی نہیں چاہتا۔ سفارش وہیں کر لیتے ہیں جہاں کچھ اثر ہو۔ سو ایسی جگہ دوسرے کو تکلیف ہے اور جہاں اثر نہ ہو وہاں اپنی ذلت ہے۔

اس تقریر سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس میں ایجاب و سلب کا مقابلہ ہے اور یہ حصر عقلی ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ حصر عقلی نہیں ہے بلکہ ان میں باہم تضاد ہے جہاں ارتفاع دونوں کا ممکن ہے۔ اس لئے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ نہ ذلت ہو اور نہ کسی کو تکلیف ہو بلکہ سفارش کا اثر ہو محبت کی وجہ سے۔ تو جہاں یہ صورت ہو وہاں سفارش کا مضائقہ نہیں۔ مگر آج کل ایسا نادر ہے۔ وَالنَّادِرُ کَالْمَعْدُوْم۔

الحاصل سفارش کی تین صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ نہ تو محبت کا اثر ہو اور نہ وجاہت کا اس میں تو ذلت ہے۔

ایک یہ کہ وجاہت کا اثر ہو محبت کا نہ ہو اس میں مخاطب کو تکلیف ہے

ایک یہ کہ وجاہت کا اثر نہ ہو محض محبت کا ہو۔ اس میں مضائقہ نہیں
اس میں نہ سفارش کرنے والے کو ذلت نہ مخاطب کو تکلیف۔ بشرطیکہ محبت
کافی ہو۔ اور بے تکلفی بھی ہو۔ چونکہ تیسری قسم نادر الوجود ہے اس لئے میں
نے سفارش کرنی چھوڑ دی۔

اسی طرح تحریک چندہ کی بھی یہی دو حالتیں ہیں یا تو محرک کا اثر ہے
یا نہیں۔ اگر محرک کا اثر نہیں تو ذلت ہے اور اگر ہے تو تجربہ سے معلوم ہوتا
ہے کہ وہ اثر وجاہت ہی کا عموماً ہوتا ہے اور اس اثر سے چندہ لینا حلال
نہیں (الا لا یحل مال امرءٍ مسلم الا بطیب نفس منہ حدیث ہے)
اور اس وجہ سے میں بھی تحریک نہیں کرتا اور اس میں زبان کا بند کرنا ہی
بہتر خیال کرتا ہوں۔ اور چونکہ خدا کا کام ہے اس لئے زبان سے چنداں
تحریک کرنے کی حاجت بھی نہیں۔ اس کی صورت خود ہی شفاعت کرتی
اور کرتی ہے۔ صرف خلوص کی ضرورت ہے۔ کسی اثر ڈالنے اور پالیسی کی
حاجت نہیں۔ کام شروع کر دینا چاہیئے۔

چنانچہ حضورؐ نے تبلیغ اسلام میں کوئی تدبیر نہیں کی۔ کوئی کاوش نہیں کی۔
ہم لوگ اگر اس وقت موجود ہوتے تو ہم تو یہی مشورہ دیتے کہ پہلے ذی اثر
لوگوں کو اپنا متفق کرنا چاہیئے۔ جب وہ متفق اور ہم خیال ہو جاویں گے تو اور
لوگوں پر زیادہ اثر ہوگا۔ مگر حضورؐ نے ہرگز یہ تدبیر نہیں کی۔ با اثر لوگوں
کو مدد کے لئے جمع نہیں کیا بلکہ چند غرباء ہی اول حضورؐ کے ہمخیال ہوئے اور
پھر آپ نے کفار کے مقابلہ میں کتنی سخت بات کہی تھی کہ خالصاً وحدہٗ

لاشریک لہ پر ایمان لاؤ اور اپنے جھوٹے معبودوں کو چھوڑ دو۔ سو ایسی ناگوار بات پھر وہ بھی علی الاعلان۔ پھر اس میں ذی اثر لوگ ہم خیال بھی نہیں مگر پھر بھی آپ کو تبلیغ سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی اور نہ کسی تدبیر کا اہتمام ہوا اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپؐ کو ذی اثر لوگوں کو ہم خیال کرنے کی حاجت ہی کیا تھی۔ حضورؐ کا تو سچا رنگ تھا جو خود لوگوں کو اپنی طرف جذب کرتا تھا۔ اس کو کسی دوسرے اثر کی ضرورت نہ تھی ۔

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است
بآب رنگ خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

حضورؐ کی تبلیغ اسلام

شعبدوں کی اس کو ضرورت ہوتی ہے جو واقعی تصرفات پر قادر نہ ہو اور جو واقعی تصرفات پر قادر ہوں انہیں شعبدوں کی کیا ضرورت ہے۔ حضورؐ کو یہ حکم ہوا تھا کہ فاصدع بما تومر واعرض عن المشرکین اور یہ حکم ہوا تھا کہ وانذر عشیرتک الاقربین اور انجمن کرنے کا اور انجمن بنانے کا حکم آپؐ کو نہیں ہوا۔

چنانچہ حضورؐ یہ حکم سنتے ہی پہاڑ پر تشریف لے گئے اور تمام آدمیوں کو جمع کر کے فرمایا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک غنیم پڑا ہوا ہے اور وہ تم کو لوٹنا چاہتا ہے تو تم میرے قول کو کیا سمجھو گے۔ سب بولے کہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچا اور امین دیکھا ہے اس لئے ہم ضرور آپؐ کے قول پر یقین اور اعتماد کریں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ

اُس خدا کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا ورنہ سخت عذاب کا سامنا ہوگا۔ یہ سُن کر سب لوگ بگڑ گئے اور گستاخیاں کرتے ہوئے واپس ہوئے اس کے بعد بھی اسلام میں ضعفا ہی داخل ہوتے اور کسی ذی اثر کے متفق کرنے کی سعی نہیں کی گئی مگر جب حق واضح ہوگیا تو بیساختہ ذی اثر لوگوں کو بھی حلقہ بگوش اسلام ہونا پڑا اور سمجھ گئے کہ واقعی یہی طریق فلاح ہے۔

اسی طرح ہم کو بھی اوّل کام کرنا چاہیئے اور کسی کے متفق بنانے کا وہم نہ کرنا چاہیئے۔ مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ جب تک کسی ذی اثر کو کام میں داخل نہ کریں اُس وقت تک یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری انجمن کو ترقی نہ ہوگی۔ بس انجمن کی ترقی کا موجب با اثر لوگوں کو خیال کرتے ہیں۔ یہاں تک مذاق بگڑ گیا ہے۔

کانپور میں ایک جلسہ ہوا تھا۔ ایک صاحب نے تقریر کی اور پہلے سے ایک سیٹھ کو اثر ڈالنے کے واسطے پڑھا کر لائے تھے کہ جب میں تقریر کر چکوں تو کھڑے ہو کر کہہ دینا کہ میں تائید کرتا ہوں۔ چنانچہ جلسہ میں اُن صاحب نے تقریر کی۔ جب تقریر کر چکے تو وہ مہاجن صاحب کھڑے ہو کر بولے میں بھی تارید کرتا ہوں۔ ان صاحب نے آہستہ سے کہا کہ تائید۔ تو انہوں نے کہا کہ تردید کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے آہستہ سے تعلیم کی مہاجن صاحب بولے کہ میں تاکید کرتا ہوں۔ خیر وہ ساکت ہو گئے کہ تاہم تائید ہو گئی۔

غرض یہ حالت ہو گئی ہے۔ یہ بھی سلیقہ نہیں رہا کہ تائید کا کون اہل

ہے اور کون نا اہل۔ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کس شخص کا اثر ہو گا پس جس شخص کو ذی اثر سمجھتے ہیں اُسی کو تلاش کرتے ہیں۔

نا اہل کو منتظم یا مہتمم بنانا

حدیث میں ہے اذا وسد الامر الی غیر اهله فانتظر الساعة۔ آج کل یہی حالت ہے کہ نا اہل کے کام سپرد کر دیتے ہیں اور اہل کے اس واسطے سپرد نہیں کرتے کہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو آپ اہل کہتے ہیں، اُن کے کرتے یا جامے پھٹے ہوئے ہیں۔ وضع قطع غیر مناسب ہے۔ ایسے لوگوں سے ہماری مجلس کی بیقدری ہو گی۔

اس لباس پر نظر کرنے پر ایک واقعہ یاد آگیا۔ مجھے ایک مرتبہ مدعو ہو کر اپنے احباب کے ساتھ شملہ جانے کا اتفاق ہوا۔ بعد جمعہ میرا بیان تھا۔ کرنل عبدالمجید خان جن کی طرف سے وعظ کا اعلان تھا، اُن سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ کیا انہیں کا بیان ہو گا۔ اُنہوں نے کہا، ہاں۔ وہ صاحب بولے کہ ان کا لباس کیسا ہے جیسے پاخانہ میں سے آئے ہوں۔ اُنہوں نے کہا کہ بعد وعظ کے کہنا۔ چنانچہ اُنہوں نے بیان سُنا۔ بعد وعظ کے بولے کہ میں تو یہ سمجھا تھا کہ جیسے کپڑے ہیں ویسی لیاقت ہو گی مگر حال تو برعکس نکلا ہے۔

یہ قصہ مجھے بھی معلوم ہوا تو دوسرے بیان میں میں نے کہا کہ صاحبو! بعضے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مولویوں کو اعلیٰ درجہ کے اور قیمتی کپڑے پہننا چاہئیں میں اس رائے کی تائید کرتا ہوں کیونکہ اس کا منشاء محض دینی مصلحت

ہے کہ باوقعت لباس پہنے واعظ کے اثر کی وقعت ہوگی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہم لوگوں کو قیمتی کپڑے بنانے دشوار ہیں۔ اس لئے کہ اگر جائز آمدنی سے روپیہ کمانا چاہیں تو کوئی مولوی محشیہ کتب کا کیکے کھاتا ہے اور کوئی تدریس میں مشغول ہے جن میں کوئی دس کا ملازم ہے اور کوئی بیس کا۔ انتہائی معراج اور نہایت عزت ہوئی تو پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ اس آمدنی میں تو قیمتی کپڑے بنانا دشوار ہیں اور اگر اس کے سوا دوسرا طریقہ اختیار کریں کہ وعظ کہتے اور وصول کرتے پھریں۔ سو وہ عقلاً و نقلاً دونوں طرح ناجائز ہے۔ بس اس حالت میں صرف ایک یہ طریقہ رہ گیا کہ آپ لوگ ایک جوڑا بنا دیجئے اور حقیقی قیمت کا چاہے بنوا دیجئے اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اسے اپنے گھر نہ لے جاویں گے بلکہ شملہ میں ہی رکھ جاویں گے اور جب یہاں آنا ہوا کرے گا تو اسے پہن کر وعظ کہہ دیا کریں گے۔ اور اگر کسی دوسری جگہ بھی اس مذاق کے آدمی ملیں گے ہم ان سے بھی جوڑا بنوا کر رکھ لیں گے۔ اب میں منتظر ہوں کہ یہ معترض صاحب جنہوں نے محض خیر خواہی کی وجہ سے ہمارے لباس پر اعتراض کیا ہے کیسا قیمتی جوڑا بنا کر لاتے ہیں۔ ان معترض صاحب کو یہ سن کر بے حد غیرت آئی۔

بس آج کل لباس کو دیکھا جاتا ہے۔ جس کے کپڑے اچھے ہوں اس کو لیڈر اور سیکرٹری بنا لیا جنہیں کام کا طریقہ بھی معلوم نہیں۔ محض نکمے لوگ انجمنوں کے منتظم ہیں۔ ایسے مواقع میں کام کے آدمی رکھے نہیں جاتے چنانچہ آج کل ایسے منتظمین بہت ہیں اور وہ جو جی میں آتا ہے کہنے لگتے

یہ حالت ہے آج کل کے کام کرنے والوں کی۔ اسی کے متعلق حدیث میں آیا ہے۔ اذا وسد الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ۔ صاحبو! حضور نے تو ضعفاد کو پہلے متوجہ کیا تھا اور ہم ذی اثر لوگوں کو پہلے لیتے ہیں۔ حالانکہ حضورؐ کے انتخاب سے ضعفا کا مرتبہ پہلے ہے اقویا کا پیچھے۔ ضعفاد میں باطنی قوت، ہمت، برکت، خلوص زیادہ ہوتا ہے بہ نسبت اقویاء کے۔

چنانچہ مجھے ایک مرتبہ یہ قصہ پیش آیا کہ ایک گاؤں ہے کیرانہ کے راستہ میں۔ وہاں سے ایک شخص میرے پاس آیا اور اس نے مجھے اڑھائی آنے دیئے۔ میں نے فوراً لے لئے اور دعا دی۔ اس لئے کہ اڑھائی آنے کے پیسے میں اگر کوئی زبردستی بھی ریا کی نیت کرے تب بھی قادر نہیں۔ خدا تعالیٰ جانتا ہے۔ اگر کوئی سو پچاس دیتا ہے تو طبیعت رکتی ہے۔ کیونکہ احتمال ریا وغیرہ کا ہوتا ہے اور اڑھائی آنے کے پیسہ میں کسی چیز کا بھی احتمال نہیں۔

بہر حال غرباء اور ضعفاء ہی کے پیسہ میں خاص برکت ہوتی ہے حدیث میں ہے ھل تنصرون وترزقون الا بضعفائکم۔ معلوم ہوا کہ نصرت علی الاعداء بھی ضعفا ہی کی وجہ سے ہے۔ تو بیرونی برکت اور اندرونی برکت دونوں ضعفاء ہی کی وجہ سے ہیں۔ نصرت سے مراد بیرونی برکت ہے اور رزق سے مراد اندرونی برکت ہے۔ یہ سب غرباء کی بدولت ہے گو یہ ظاہری سائنس کے خلاف ہے کیونکہ ضعفا میں کوئی ظاہری اثر نہیں ہوتا مگر مشاہدہ یہی ہے۔

غرض آج کل ظاہری وجاہت پر نظر کہ کے ہر کام نا اہل کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور ہر کام میں نا اہل گھسے ہوئے ہوتے ہیں، جو بجائے کام کے روپیہ جمع کرنے کو بڑا مقصود سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اصل مقصود کام ہے خواہ کسی پیمانہ پر ہو۔ پس جس پیمانہ پر کام کرنا قدرت میں ہو اُس کے موافق شروع کر دینا چاہیے۔

کام کی برکت

حق تعالیٰ نے کام میں برکت رکھی ہے۔ چنانچہ چند ضعفائے نے اسلام کا کام شروع کر دیا تھا۔ تو مشرق سے مغرب تک آواز گونج گئی۔ چنانچہ انجیل کی ایک مثال ضعفاء اہل حق کے متعلق حق تعالیٰ نے قرآن میں نقل فرمائی ہے ارشاد فرماتے ہیں۔

کزرع اخرج شطاہ فآزرہ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بہم الکفار

(کہ جیسے دانہ زمین میں ڈالا گیا تو جیسے کھیتی کہ اُس نے اپنی سوئی نکالی۔ پھر اُس نے اس کو قوی کیا۔ پھر وہ کھیتی موٹی ہوئی پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی۔ تاکہ اُن سے کافروں کو جلاوے۔

یہ برکت ہے کام کی کہ اگر رائی کا بھی دانہ ڈالو تو کھیت میں کس قدر بڑا درخت ہو جاتا ہے۔ جب کام شروع کرنے میں اس قدر برکت ہے تو مجھے تحریک چندہ کی کیا ضرورت ہے۔

میں کانپور میں تھا جب کام شروع کیا۔ اور مدرسہ جامع العلوم کی

ابتداء ہوئی تو صرف پانچ روپیہ ہاتھ میں تھے۔ مدرسہ خدا کے نام پر شروع کر دیا۔ پھر بحمد اللہ مدرسہ نے اس قدر ترقی کی کہ کانپور میں باوجودیکہ بکثرت مدرسے تھے۔ مگر اس کے سامنے سب ماند پڑ گئے۔ لوگ دوسرے مدارس کے چندہ کی تحریک کرتے مگر سننے والے انہیں تو دیتے نہیں تھے اور جامع العلوم میں دیتے تھے۔ شہر کے لوگ کسی جگہ کے منولی کا اعتبار نہ کرتے تھے اگر کوئی مسلمان ہوتا تو اس کے اسلام کا اعتبار نہ کرتے جب تک جامع العلوم میں آکر مسلمان نہ ہوتا۔

ان سب امور کی وجہ صرف نیت خالص تھی۔ کوئی دنیاوی غرض نہ تھی۔ کسی سے یہ کبھی نہیں کہا کہ ہمارے مدرسہ میں چندہ دو اور اگر از خود دینا چاہا اور قرائن سے معلوم ہو گیا کہ یہ دوسرے میں دیا کرتا ہے اور وہاں کا چندہ یہاں منتقل کرتا ہے تو لینے سے انکار کر دیا جاتا تھا کیونکہ یہ نیت کر لی تھی کہ جب نہیں چلے گا چھوڑ دیں گے۔ اس لئے کہ غایت تو حق تعالیٰ کی خوشنودی تھی۔ اپنی ذات کے واسطے نہیں کیا تھا بس جب تک انہوں نے چاہا کام لیا۔ اگر وہ نہ چاہتے تو ہم چھوڑ کر کسی اور کام میں لگ جاتے۔

صاحبو! مدارس اور مساجد کی غایت یہی ہونی چاہیے۔ اور اگر اس کے خلاف ذہن میں ایک مقدار معین کر لیتے کہ مدرسہ اس قدر اونچا ہوتا چاہیے ایسے انداز کا ہو تو جب اس انداز کا حلال آمدنی سے نہ بنتا تو حرام سے بنانے کی سعی کرتے۔ اس کا انجام سوائے بربادی کے کچھ نہ ہوتا۔ مگر

چونکہ رضامندی خدا تعالیٰ غایت تھی اس لئے کسی قسم کی سعی نہیں کی گئی خدا نے اس میں برکت کر دی۔ واللہ خدا کے واسطے کام کر کے تو دیکھو۔ انشاء اللہ خوب خوب ترقی ہوگی۔

پیلی بھیت میں ایک بزرگ تھے اور وہ اصطلاحی عالم بھی نہ تھے لنگی بھی بنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ شاہ صاحب نے اسٹیشن پر مسجد بنانا شروع کی۔ ہندوؤں نے بھی مندر بنانے کی درخواست دے دی۔ کلکٹر نے بخوف فساد مسجد کی تعمیر کو بھی روک دیا۔ شاہ صاحب کو خبر کی گئی فرمایا اچھا بھائی خدا تیرا بھلا کرے اور تعمیر بند کر دی۔ لوگوں نے کہا کہ حضور اس میں کوشش کی اجازت دیجئے۔ ضرور کامیابی ہوگی۔ فرمایا ہم کو اس کی ضرورت نہیں۔ ہم مسجد کس کے واسطے بناتے تھے۔ ہم تو خدا کے لئے بناتے تھے لوگ نہیں بننے دیتے بس نہیں بناتے۔ ہم اپنا گھر کب بناتے تھے۔ کلکٹر کو جو کہ مسلمان تھے اس امر کی اطلاع ہوئی۔ کلکٹر خود شاہ صاحب کے مکان پر آئے۔ اور ایسی صورت سے کہ لوگ نہ پہچانیں۔ شاہ صاحب دروازہ میں بیٹھا کرتے تھے۔ وہاں ایک تخت آنے والوں کے لئے پڑا ہوا تھا اور ایک چارپائی پر شاہ صاحب تشریف فرما تھے۔ کلکٹر پہنچے، تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ اس نے بیٹھ کر کہا کہ سنا ہے کہ آپ کوئی مسجد بنانا چاہتے تھے اس کا کیا واقعہ ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ ہاں بھائی ایک مسجد بنانا چاہتے تھے مگر کلکٹر نے روک دیا۔ ہم نے کہہ دیا اچھا بھائی خدا تیرا بھلا کرے ہمیں تو ثواب مقصود تھا اور وہ نیت

سے مل گیا۔ اگر خدا کو منظور ہوتا مسجد بھی بن جاتی۔ اب اُن کو منظور نہیں ہے تو ہم بھی اصرار نہیں کرتے۔ شاہ صاحب نے جب کلکٹر سے یہ بیان کیا تو وہ اس سادگی سے متاثر ہوا اور کہا کہ وہ کلکٹر میں ہی ہوں۔ چلئے آپ مسجد کی تعمیر جاری کر دیجئے۔ فرمایا بہت اچھا خدا تمہارا بھلا کرے۔

اس پر کچھ اس کا شکریہ ادا نہیں کیا کیونکہ مسجد کوئی کسی کے باوا کا گھر تھا جو کسی کا شکریہ ادا کیا جاتے۔ ارے خدا کا گھر ہے جو بنوا دے گا اُسے خود ثواب ملے گا۔ ہم پر کیا احسان ہوا۔ مگر آج کل یہ بھی ایک طریقہ نکلا ہے کہ جب کوئی مدرسہ میں چندہ دیتا ہے تو اُس کا شکریہ ادا کرتے ہیں نہ معلوم یہ کس چیز کا شکریہ ہے۔

میں نے ایک جلسہ میں کہہ دیا تھا کہ ہم کسی چندہ دینے والے کا شکریہ ادا نہیں کریں گے بلکہ دینے والوں کو اُلٹا ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ ہم مصیبت جھیل کر ان کی رقم کی حفاظت کرتے ہیں۔ اُس کو موقع خیر میں صرف کرتے ہیں۔ اور جو لوگ شکریہ ادا کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے گھر رکھنا چاہتے ہیں۔ دیکھئے شاہ صاحب کی اس سادگی اور خلوص کی کس قدر برکت ہوئی اور کس قدر اثر ہوا۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں کہ ؂

دلفریبانِ نباتی ہمہ زیور بستند ۔ دلبرِ ماست کہ با حسن خداداد آمد
زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند
اے خوشا سرو کہ از بندِ غم آزاد آمد

سادگی اور جاذبیت

عرض سادگی تو خود جاذب ہوتی ہے مگر ہم پر تکلفات لدے ہوئے ہیں۔ اس لئے اس جذب کا احساس نہیں ہے۔ واللہ اگر علماء اس سادگی کو اختیار کریں اور یہ تصنع اور بناوٹ چھوڑ دیں تو اہل دنیا ان کے دروازہ پر خود ہی آکر مانخار گرنے لگیں۔

پچھلے دنوں دیوبند میں کچھ مخالفت تھی۔ کچھ آدمی شہر کے مدرسہ کا ممبر ہونا چاہتے تھے اور مدرسہ والوں کی طرف سے انکار تھا۔ حضرت مولانا گنگوہی سرپرست تھے۔ میں نے مولانا کی خدمت میں گنگوہ خط لکھا کہ اگر یہ لوگ ممبر بنا دیئے جاویں تو کسی سے اندیشہ تو کچھ ہے نہیں کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ فیصلہ تو کثرت رائے پر ہوگا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مدرسہ کے لوگ کثیر ہیں۔ اس وقت مصلحت اسی کو مقتضی ہے کہ ان لوگوں کو ممبر بنا دیا جاوے ورنہ یہ لوگ مخالف رہیں گے۔ جس میں مدرسہ کی قوی مضرت کا اندیشہ ہے۔

مگر ان حضرات کی عقل تو قدسی ہوتی ہے وہ دوسری ہی عقل ہے کہ اس کے برابر کسی عقل کا ہونا مشکل ہے۔ حضرت نے تحریر فرمایا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اگر ہم ان کو مدرسہ میں داخل نہ کریں گے تو غایت مافی الباب وہ لوگ مخالفت کریں گے اور ان کی مخالفت مدرسہ کو مضر ہوگی۔ اور مدرسہ ٹوٹ جاوے گا تو بلا سے ٹوٹ جاوے ہم تو نہیں توڑتے ہیں جو ہم سے سوال ہو اور اگر ہم نے ان کو داخل کر لیا تو

آخرت میں یہ سوال ہوگا کہ تم نے نااہل کو کیوں داخل کیا اور تحریر فرمایا کہ ہم کو حق تعالیٰ کی رضا مقصود ہے، مدرسہ مقصود نہیں۔

اللہ اکبر! کس قدر قوت کی بات ہے۔ پھر حضرت نے اہل شہر کی ممبری کو منظور ہی نہ کیا۔ آخر دو چار دن چلا کر سب خود ہی بیٹھ رہے اور بعد کو سب سیدھے ہو گئے۔ یہ کاہے کا اثر تھا صرف اس کا کہ حضرت کو رضائے حق مطلوب تھی، ابقاء مدرسہ مقصود بالذات نہ تھی۔ جس کا یہ مذاق ہوگا وہ اہل دنیا کی ہرگز خوشامد نہ کرے گا۔ اہل مدارس کو یہی طرز اختیار کرنا چاہیے۔ پس یاد رکھو کہ بڑی چیز دین کی محبت اور عزت ہے۔ علماء کو دین کی عزت کا لحاظ رکھنا چاہیے جس میں اُن کی بھی عزت ہوگی اور دین کی عزت استغناء میں ہے۔ علماء دنیاداروں سے جب تک استغناء نہ کریں گے اُس وقت تک اُن کی عزت نہ ہوگی۔ اور جب علماء استغناء کریں گے، اسی وقت عزت اور عظمت رونما ہوگی اور یہ دنیادار خود ان کے دروازوں پر ماتھا رگڑتے پھریں گے۔

خودداری کا تقاضا مگر آج کل تو علماء نے اپنی قدر خود کھودی ہے کہ دنیاداروں کے دروازوں پر جاتے اور کھانا لاتے ہیں۔ چنانچہ دیوبند کا واقعہ ہے کہ وہاں ایک تحصیلدار صاحب تھے۔ ایک طالب علم کا کھانا اُن کے یہاں مقرر تھا۔ وہ طالب علم روزانہ کھانا لینے کے واسطے آیا کرتے تھے اور کھانے میں اکثر دیر ہو جایا کرتی تھی تو اُن کا خالی وقت بیکار جاتا تھا۔ اُنہوں نے تحصیلدار صاحب سے

ایک دن دلسوزی سے کہا کہ میں روزانہ اتنی دیر بیکار رہتا ہوں اور آپ کا لڑکا بھی کھیلتا پھرتا ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو میں اتنی دیر آپ کے لڑکے کو کچھ عربی پڑھا دیا کروں۔ تحصیلدار صاحب نے فرمایا کہ مولانا کیا ہوگا آپ نے پڑھ کر کیا کیا۔ میرے دروازہ پر بھیک مانگنے آتے ہیں اور یہ پڑھ کر آپ کے دروازہ پر بھیک مانگنے جاوے گا۔ یہ ہے آج کل علم دین کی قدر۔ علماء کو بھی چاہئے کہ ایسوں کے دروازوں پر پیشاب بھی نہ کریں مگر صرف احتیاج کی وجہ سے اُن کی طرف دوڑتے ہیں۔ یہ دوڑنے والے عذر کرتے ہیں کہ ؎

آنکہ شیراں را کند روباہ مزاج　　　احتیاج است احتیاج است احتیاج

مگر دوسرا شعر اس کا جواب بھی ہے کہ ؎

شیر نرکے میشود روبہ مزاج　　　میزند بر کفش خود صد احتیاج

انبیا علیہم السلام کی تو یہ شان اور حالت تھی کہ جب وعظ و پند فرماتے تو صاف فرماتے ہیں۔ یٰقوم لا اسئلکم علیہ اجرا اور یٰقوم لا اسئلکم علیہ مالا کہ ہم تم سے اجر اور مال نہیں مانگتے۔ یہی تمہاری بھی حالت ہونی چاہئے۔ اگر یہ کہا جاوے کہ اگر نہ مانگیں تو کام کس طرح چلے گا۔ تو صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ کام خود ہی چلے گا۔ میں تو اکثر وعظ میں یہی کہہ دیتا ہوں کہ آپ مانگنا چھوڑ کر دیکھئے کہ اہل دنیا خود ماتھا رگڑیں گے اور آپ کو دیں گے۔

مگر افسوس ہے کہ ہم لوگوں کی خود یہ حالت ہو گئی کہ ایک جگہ ایک مدرسہ

تھا۔ اُن کے جلسہ میں ایک واعظ صاحب فرما رہے تھے کہ افسوس کی بات ہے کہ اتنی دیر اگر ایک کسبی ناچتی تو اس کو لوگ کس قدر دیتے۔ ہمیں ایک کسبی کے برابر بھی نہیں سمجھتے کہ گھنٹہ بھر سے ہم مانگ رہے ہیں اور کوئی کچھ نہیں دیتا۔ افسوس اس واعظ کو بیان کرتے ہوئے غیرت بھی تو نہ آئی مجھے تو اگر کوئی لاکھ روپیہ بھی دے تو انشاء اللہ تعالےٰ ایسی بات زبان سے کبھی نہ نکلے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک وقت میں نواب صاحب کی خواہش پر میرا ڈھاکہ جانے کا قصد ہوا اور راہ میں کلکتہ بھی ٹھہرنا ہوا۔ وہاں نواب صاحب کے ایک دوست ہم لوگوں کو لینے آئے ہوئے تھے۔ وہ مل کر کہنے لگے ہمیں آپ کے تشریف لانے سے بہت مسرت ہوئی کیونکہ آنے کی اس لئے امید نہ رہی تھی کہ یہ معلوم ہوا تھا کہ آپ نے یہ شرط لگائی ہے کہ کچھ دیا نہ جائے۔ میں نے کہا یہ شرط کون سی دشوار تھی۔ کہنے لگے ایسا کب ہو سکتا ہے اپنے محبوب کی خدمت کو تو جی چاہتا ہی ہے۔ میں نے کہا کیا محبوب کی خدمت اسی میں منحصر ہے کہ محبوب ہی محب کے گھر جاوے۔ محب بھی تو محبوب کے گھر جا کر خدمت کر سکتا ہے۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ معاف کیجئے پیاسا کنوئیں کے پاس جایا کرتا ہے۔ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جایا کرتا۔ بدتمیزی تو دیکھئے مجھ کو بے حد غصہ آیا اور میں نے کہا کہ صاحب آپ کا تو یہ خیال ہے کہ ہم پیاسے ہیں اور ہمارا یہ خیال ہے کہ آپ ہی پیاسے ہیں۔ مگر ہمارے پاس تو دلیل ہے آپ کے پاس دلیل نہیں۔ وہ

دلیل سنیئے کہ ہمارے پاس دین ہے اور اُس کی آپ کو ضرورت ہے اور وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں اور آپ کے پاس دنیا ہے اور وہ بحمد اللہ تعالیٰ ہمارے پاس بقدر ضرورت موجود ہے۔ اب آپ خود فیصلہ فرمادیں کہ پیاسا کون ہے۔ وہ صاحب یہ سُن کر معافی کے خواستگار ہوئے اور پشیمان ہوئے۔

میں نے قولاً تو اپنے مجمع کا استغناء اس طور سے ظاہر کیا اور عملاً اس طرح ظاہر کیا کہ میں پھر ڈھاکہ نہیں گیا۔ کلکتہ ہی سے واپس ہو گیا اور مکان چلا آیا۔ اس پر بعض نو تعلیم یافتہ لوگوں کے خطوط میرے پاس آئے کہ ہم کو تمہارے ڈھاکہ جانے کا بہت افسوس تھا اور اب یہ سُن کر بہت خوشی ہوئی کہ کلکتہ ہی سے واپس چلے آئے۔

علماء اور ترقی صاحبو! آپ لوگ جو ہمیں رائے دیتے ہیں کہ ترقی کرنی چاہیے تو ہمارے اندر اوّلاً تو وسائل بھی ترقی کے نہیں اور وسائل اختیار کریں مثلاً حکام سے ملیں۔ نوابوں کے یہاں وفد بنا کر لے جائیں تو بعد میں پھر آپ ہی اعتراض کریں گے کہ مولویوں کو ایسا مناسب نہیں۔ چنانچہ میرا ڈھاکہ جانا بظاہر مذاق اہل ترقی کے موافق تھا۔ مگر دیکھئے انہیں لوگوں نے بعد میں اس کا نامناسب ہونا ظاہر کیا اور واپسی پر مسرت کا اظہار کیا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اس قسم کے وسیلے اختیار کرتا ہے کہ حکام سے ملاقات وغیرہ کرے تاکہ مسلمانوں کو نفع پہنچے اور اس میں مشغول ہو کر

اُسے شمس العلماء وغیرہ کا خطاب مل جائے تو یہی ترقی کی رائے دینے والے بعد میں اعتراض کرتے ہیں کہ صاحب یہ تو مخبر ہیں اور چیان ہیں اور جنیں ہیں ہیں ایسے لوگوں کی حمایت نہیں کرتا جن کو شمس العلماء وغیرہ کا خطاب مل گیا ہے اور نہ مجھے حمایت کی ضرورت ہے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کو ان پر اعتراض کا حق نہیں کیونکہ آپ کی تو رائے کے موافق انہوں نے عمل کیا۔ مگر افسوس اہل دنیا کی رائے پر عمل کر کے بھی وہ نیک نام نہ ہوئے بلکہ بدنام ہو گئے اگر ہم اس قسم کے وسائل اور ذرائع کو اختیار نہ کرتے تو بے اعتبار نہ ہوتے اس وقت ترقی کا صرف ایک اعتراض ہوتا کہ مولوی ترقی نہیں کرتے۔ مگر وہ حالت عدم ترقی کی اس ترقی کی حالت سے ہزار درجہ افضل تھی۔

شانِ علماء

بس مولویوں کو تو اس طرح رہنا چاہیے ؎

نہ بر اشتر بر سوارم نہ چو اشتر زیر بارم

نہ خداوند رعیت نہ غلام شہریارم

یعنی ان حضرات کو صرف تبلیغ عام یا خاص سے تعلق رکھنا چاہیے مال سے تعلق ہی نہ رکھنا چاہیے۔ بلکہ اس باب میں نہایت آن بان سے رہنا چاہیے۔

چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے یہاں پانچ روپے بھیجے اور یہ لکھا کہ طلباء سے دعا کرا دینا۔ میں نے روپے واپس کر دیئے۔ اور یہ لکھ دیا کہ یہاں دعا کی دکان نہیں ہے اور دعا بکتی نہیں ہے۔

ایک مرتبہ کا اور واقعہ ہے کہ ایک شخص پانی پت کے قریب کے

رہنے والے تھے اور مجھ سے بیعت تھے اُنہوں نے مدرسہ کے لئے
پندرہ روپیہ مجھے دیئے۔ میں نے کہا کہ باوجود پانی پت میں مدرسہ ہونے کے
جو آپ سے قریب ہے آپ یہاں کے مدرسہ میں کیوں دیتے ہیں۔ اس میں
مجھے یہ شبہ ہے کہ تم یہاں اس نیت سے دیتے ہو کہ مدرسہ میں بھی یہ روپیہ
صرف ہوگا۔ اور پیر صاحب بھی خوش ہوں گے۔ دونوں باتیں حاصل ہو جاویں گی
اور میں نے یہ بھی کہا، دیکھو سچ بتانا اخفا نہ کرنا۔ اُنہوں نے کہا جی ہاں مقصود
تو یہی تھا۔ میں نے کہا ایسے روپیہ کو میں پسند نہیں کرتا جن سے خوشنودی خدا
تعالیٰ اور میری خوشی دونوں مقصود ہوں۔ میں اسے شرک سمجھتا ہوں۔ آپ
نے تقرب خدا تعالیٰ میں مجھے بھی شریک کیا۔ اُن کی سمجھ میں آگیا اور واپس
لینے پر رضامند ہو گئے۔ پھر صبح کو اُنہوں نے کہا کہ بے شک اس وقت تو
میرا یہی مقصود تھا لیکن اب رات کو میں نے سوچا تو اب میرا جی یہی چاہتا
ہے کہ اسی مدرسہ میں دوں اور دوسری نیت سے توبہ کر لی اس وقت
وہ روپے میں نے لئے۔ میری اس غیرت سے اُخروی فائدہ تو ظاہر تھا مگر
ظاہری اور دنیاوی فائدہ بھی نہ ہوا۔

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ ایک صاحب نے دو سو روپے میرے پاس
مدرسہ کے لئے بھیجے اور اسی کے ساتھ وہاں بلانے کی تحریک بھی کی۔ میں
نے روپے واپس کر دیئے اور اُن کو لکھ دیا کہ اگر ان کے ساتھ میرے
بلانے کی درخواست نہ ہوتی تو میں قبول کر لیتا۔ اب تو یہ شبہ ہے کہ آپ
مدرسہ میں یہ رقم دے کر گویا مجھ پر احسان رکھ کر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں ہو

مدرسہ میں رقم دینے کا مجھ پر کیا احسان ہے۔ اُن صاحب کا جواب آیا آپ روپیہ وصول کر لیجئے میں نہیں بلاتا۔

تو یہ سارا استغنا محض اس وجہ سے ہے کہ مجھے مدرسہ کا چلانا مقصود نہیں بلکہ محض رضائے حق مطلوب ہے اور یہ نیت کر لی ہے کہ اگر حدود کے اندر کام چلتا رہا چلاتے رہیں گے اور جس دن کچھ تجاوز کرنا پڑا یا تدبیریں سوچنا پڑیں کہ اب کیا انتظام کریں، کہاں سے رقم لائیں، اُسی دن مدرسہ بند کر دوں گا۔ غرض یہ نیت رکھنی چاہیے کہ جس روز مدرسہ نہ چلے گا نہ چلے۔ ٹوٹ جاوے گا تو بلا سے۔ کوئی ہمارا ذاتی کام تو ہے نہیں۔

اگر یہ کہا جاوے کہ اس طرح مسلمانوں کی سبکی اور ذلت ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ علوشان کی حاجت ہی کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام۔ تو ہماری علوشان کے لئے اسلام کافی ہے۔ ہمیں تو خدا نے اسلام سے عزت دی ہے۔ اگر مسجد چونہ اور پتھر کی نہ بنے بلا سے نہ بنے۔ جعلت لی الارض مسجدا وطھورا۔ تمام زمین مسجد ہے۔ یہ نیت کر لینا کہ اس قدر طول وطویل ہوا ور ایسی ہیئت وشکل پر ہو فضول ہے۔ ہر کام میں یہی نیت رکھیے کہ کوئی شخص آپ کے ساتھ خوشی سے شریک ہو فبہا ورنہ چھوڑ دیجئے یہ نیت رکھو کہ بالکل نہ رہے گا نہ سہی اور کم پیمانہ پر ہوگا تو کم ہی سہی۔

ایک ہندو کی حکایت ہے کہ وہ بے پور سے ہردوار کو چلا جس کے پاس گنی تھی۔ پھر کسی موقع پر خیرات کرنے کے لئے روپوں کی ضرورت ہوئی۔

تو ایک دکاندار سے کہا کہ مجھے ایک گنی کے روپے دے دو۔ اُس نے کہا کہ پورے پچیس روپے نہ دوں گا بلکہ بیس دوں گا۔ یہ راضی ہو گیا تو اُس نے اور کم کرنا شروع کئے اور یہ راضی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ دس تک نوبت آگئی۔ اُس نے کہا کہ لا تو دس ہی دے دے۔ تو وہ بولا کہ معلوم ہوتا ہے تم چُرا کر لائے ہو جو اس طرح کم کرتے جاتے ہو۔ تو اُس نے جواب دیا کہ اصل یہ ہے کہ میں اس وقت دان پُن کے واسطے چلا تھا۔ تو تو جس قدر کم دیتا میں اُس میں پُن کی نیت کر لیتا۔ اگر تو یہ بھی کہتا کہ میں کچھ بھی نہیں دیتا تب بھی میں راضی ہو جاتا اور تجھے گنی دے دیتا۔

تو صاحبو! حیرت ہے کہ ایک ہندو تو مقصود اصلی کو سمجھا اور مسلمان مقصود اصلی کو نہ سمجھے۔ جس طرح اُس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ مقصود ثواب ہے خواہ گنی زیادہ میں جائے یا کم میں مجھے ثواب پورا ہی ملے گا، اسی طرح مسلمان کو سمجھنا چاہیے کہ کام خواہ اعلیٰ پیمانہ پر چلے یا ادنیٰ پیمانہ پر مقصود تو ثواب ہے اس کی فکر نہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ پیمانہ پر ہی کام ہو۔

طاعت اور توفیق

صاحبو! اسلام نے غیرت کی بھی تعلیم دی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ انلزمکموھا وانتم لھا کارھون۔ تو کیا ہم اس کو تمہارے گلے مڑھیں اور تم اس سے نفرت کئے چلے جاؤ۔ اور فرماتے ہیں کہ لست علیھم بمصیطر۔ آپ اُن پر مسلط نہیں ہیں اور فرماتے ہیں۔

ولو شاء ربک لآمن من فی الارض جمیعاً فانت تکرہ

الناس حتی یکونوا مومنین وما کان لنفس ان تومن الا باذن اللہ۔
اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے۔ سو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں جس میں وہ ایمان لے ہی آویں حالانکہ کسی شخص کا ایمان لانا بدون خدا کے حکم کے ممکن نہیں۔

اور فرماتے ہیں۔

وان کان کبر علیک اعراضھم فان استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتاتیھم بآیۃ ولو شاء اللہ لجمعھم علی الھدی فلا تکونن من الجاھلین۔
اور اگر آپ کو ان کا اعراض گراں گزرتا ہے اور اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ لو پھر کوئی معجزہ لے آؤ تو کرو اور اگر اللہ کو منظور ہوتا تو ان سب کو راہ پر جمع کر دیتا۔ سو آپ نادانوں میں نہ ہو جیئے۔

اور فرماتے ہیں۔

قل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔
اور آپ کہہ دیجیے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے سو جس کا جی چاہے ایمان لے آوے اور جس کا جی چاہے

کافر ہے۔

تو ان سب آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو استغناء کے ساتھ رہنا چاہیئے۔ کسی کے پیچھے نہ پڑے۔ اسی طرح مدرسہ والے بھی اس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ بھی مدرسہ میں کچھ دے دے، وہ بھی کچھ امداد کر دے۔ کسی کے پیچھے پڑنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب خدا کا حکم ہوتا ہے جب ہی کوئی دیتا ہے۔

زکوٰۃ، خیرات اور احسان

جب کوئی دیتا ہے تو کسی پر کیا احسان ہے ؎

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی
منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

خدا کا احسان ہے کہ وہ ہم کو اپنی طاعت کی توفیق دے دیں اور ہماری طاعت بدنیہ اور مالیہ کو قبول فرمالیں۔ اگر وہ قبول نہ فرماویں تو ہم کیا کر سکتے ہیں غرض جو کوئی مدرسہ کی امداد کرتا ہے خود اپنے اوپر احسان کرتا ہے۔ مہتمم مدرسہ پر کیا احسان ہے۔ پھر وہ کیوں کسی کی خوشامد کرے اور کیوں کسی کا شکریہ ادا کرے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے استغناء ہی سے کام لیا ہے۔

چنانچہ ایک شخص منافق تھا۔ اُس نے بکریاں پالیں اور حضورؐ سے دعا برکت چاہی۔ آپؐ نے دعا فرمادی۔ وہ بہت بڑھ گئیں۔ اُس سے زکوٰۃ مانگی گئی تو اُس نے زکوٰۃ ادا نہ کی۔ پھر خود لایا تو حضورؐ نے بوجہ وحی کے نہ لی۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں زکوٰۃ دینا چاہی مگر حضورؐ کی متابعت میں زکوٰۃ نہ

قبول کی گئی۔ پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں دینی چاہی اُس وقت بھی نہیں قبول کی گئی۔ حضرت عثمانؓ نے بھی نہیں لی۔ پھر وہ آپ کے زمانہ میں مر گیا۔ اس وحی خاص میں جس کی متابعت حضرات خلفاء نے بھی کی یہ بھی نکتہ تھا تاکہ ظاہر ہو جاوے کہ زکوٰۃ ادا کرنے میں کسی پر کچھ احسان نہیں صرف اپنا ہی نفع ہے اگر تم ایک بار انکار کروگے تو ہم دس بار واپس کر دیں گے۔ اس وجہ سے میں کہتا ہوں کہ آپ کا کوئی احسان نہیں بلکہ چندہ لینے والے کا احسان ہے کہ اُس نے لے کر آپ کو پاک صاف کیا۔

بقاءِ علم کی صورت خاص کر جب کہ یہ ایسی جگہ ہے جو ایک زمانہ تک مرجع خلائق رہی ہے تو اس کا حق ادا کرنا سب ہی کے ذمہ ہے نہ کہ ایک شخص پر تمام بار ڈال کر اس کا انتظار کیا جاوے۔ کیا وہ سب سے مانگے اور ■ زمانہ مفتی الٰہی بخش صاحبؒ کا تھا جو اپنے وقت کے آفتاب تھے۔ اور وہ حق یہ ہے کہ ایسی جگہ درس تدریس کا سلسلہ ضرور قائم و باقی رکھا جاوے۔

اس کی بقا کی صورت ہمارے تجربہ سے تو یہ ثابت ہوئی ہے کہ مدرسہ کا ایک خاص مکان ہو جس میں کچھ جگہ درس تدریس کے لئے ہو اور کچھ جگہ طلبا کے رہنے کی ہو اور کتب خانہ بھی ہو اور وہ مکان وقف ہو اور مدرسہ کی ملک ہو اور اُس میں طلبہ و مدرسین درس و تدریس میں مشغول رہیں اگر عقلاء اس کے سوا ہمیں اور کوئی صورت قیام علم کی بتلا دیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھ کو سمجھا دی جاوے میں ضرور قبول کر لوں گا۔ اور یہ بھی وعدہ

کرتا ہوں کہ دو چار مدرسے جن میں میرا من وجہ اختیار ہے ان کے ویران کرنے کی سب سے اوّل میں ہی کوشش کروں گا۔ مگر یہ شرط ہے کہ وہ ایسی صورت ہو کہ تجربہ سے اُس کا صحیح اور درست ہونا معلوم ہو گیا ہو۔ تو اُس وقت میں ان منتظم مدرسوں کو اس مجذوب کی لنگوٹی کی طرح رخصت کر دونگا جیسے ایک مجذوب کا قصہ ہے یہ خدا کو معلوم ہے کہ واقع میں بھی مجذوب تھے یا نہیں۔ غرض وہ ننگے پھرا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مریدوں نے لنگوٹا باندھ دیا مگر چونکہ مجذوب تھے اس واسطے کھانا اس طرح کھاتے تھے کہ روغن وغیرہ سب لنگوٹے پر گرتا تھا آخر وہ چکنا ہو گیا۔ چوہوں نے اُسے کترنا شروع کر دیا۔ جب چوہے بکثرت ہو گئے تو اُن کے لئے بلی پالی گئی تاکہ چوہوں کو کم کرے۔ بلی نے ہر چیز کھانی شروع کر دی۔ جو چیز کھانے کو رکھی گئی وہی کھا گئی اُس کے واسطے کتا پالا گیا۔ جب کتے نے ستانا شروع کیا تو اُس کی حفاظت کے واسطے ایک نوکر رکھا گیا اور جب وہ اِدھر اُدھر نظر کرنے لگا تو اس کا نکاح کر دیا گیا اور اقتران صغریٰ وکبریٰ سے نتیجہ پیدا ہو گیا۔ ایک دن مجذوب صاحب کو جو کچھ افاقہ ہوا تو ایک ہجوم دیکھ کر پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ میرے آس پاس یہ ہجوم کیسا ہے مریدین نے سارا قصہ بیان کیا تو مجذوب صاحب نے لنگوٹی اتار کر پھینک دی کہ یہی بکھیڑے کی جڑ ہے ہم اسی کو نہیں باندھتے۔

تو ہم بھی اگر آپ بقائے علم کی اور کوئی تدبیر بتلائیں گے اور سمجھا سکیں گے تو ان مدرسوں کو لنگوٹا سمجھ کر پھینک دیں گے۔ مگر جب بقاءِ علم

کی صورت اہلِ تجربہ کے تجربہ سے اسی صورت میں منحصر ہو گئی ہے تو اب اُس کے ابقاء کی کوشش میں کیا عذر ہے اور اس کو خوب سمجھ لیجئے کہ صرف مدرسہ ہی آپ کا محتاج نہیں بلکہ آپ بھی اس کے محتاج ہیں۔ یعنی مدرسہ جیسے آپ کی اعانت کا محتاج ہے اسی طرح آپ مدرسہ کی برکت کے محتاج ہیں بلکہ مدرسہ تو مجازاً ہی محتاج ہے مگر آپ حقیقت میں محتاج ہیں۔ جیسے فقیر سخاوت کا حقیقتہً محتاج ہے اور سخاوت کو فقیر کی مجازاً حاجت ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

بانگ می آید کہ اے طالب بیا   جود محتاج گدایاں چوں گدا

اور احتیاج سے مراد توقف ظہور ہے مجازاً احتیاج سے تعبیر کر دیا اور عجیب بات ہے کہ باوجودیکہ ظاہراً مولانا پر جذب کا غلبہ کم ہے عارف شیرازی سے مگر اس مضمون کو حافظ شیرازی نے نہایت متین عنوان سے تعبیر کیا ہے اور مولانا کا عنوان ذرا موہم ہے۔ اس لئے کہ مولانا نے احتیاج سے تعبیر کیا ہے برخلاف حافظ صاحب کے کہ انہوں نے شوق سے تعبیر کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

سایۂ معشوق گر افتاد بر عاشق چہ شد

ما بہ او محتاج بودیم او بما مشتاق بود

تو حافظ کا اشتیاق سے تعبیر کرنا مولانا کی اس تعبیر سے سہل ہے گو حق تعالیٰ تو اشتیاق لغوی سے بھی جو کہ ایک قسم کا انفعال ہے منزہ ہیں۔ مگر اس کے سہل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ لفظ اشتیاق حدیث میں وارد

ہے۔ چنانچہ حدیث بیہقی میں ہے۔ قال جبریل علیہ السلام ان اللہ قد اشتاق الی لقائک۔ (کذا فی نشر الطیب) تو اشتیاق کا لفظ حدیث میں موجود ہے برخلاف لفظ احتیاج کے کہ وہ حدیث میں موجود نہیں ہے یہ سب کلام مدارس دینیہ کی ضرورت کے متعلق تھا۔

مسجد ضرار کی وجہ تسمیہ

اب مقصود آیت کی طرف عود کرتا ہوں جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اس وقت مدرسہ کی عمارت کی نسبت خصوصاً اور جملہ عمارات کی بابت عموماً بیان ہوگا چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں افمن اسس بنیانہ علی تقوی۔ یہ آیت ایک خاص قصہ اور ایک خاص مسجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر مجھے اس سے علت مشترکہ نکال کر دیگر مساجد اور مدارس کی تعمیر کا حکم بیان کرنا ہے۔ اور اس پر پھر جملہ تعمیرات کو قیاس کرنا ہے۔ غرض یہ آیت مسجد خاص کے قصہ میں نازل ہوئی ہے۔

ملخص قصہ کا یہ ہے کہ مدینہ منورہ کے قریب ایک محلہ ہے قبا اس کا نام ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے ہیں تو اول اسی محلہ میں قیام فرمایا۔ پھر شہر میں تشریف لائے تھے تو زمانہ قیام میں جس جگہ آپ نماز پڑھتے تھے وہاں اس محلہ کے مومنین مخلصین نے ایک مسجد بنالی اور اس میں نماز پڑھا کرتے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

در منزلیکہ جاناں روزے رسیدہ باشد   باخاک آستانش داریم مرحبائے

منافقین نے جو کہ اسلام کی بیخ کنی کی تدبیروں میں ہر وقت لگے رہتے تھے، یہ سوچا کہ ایک مکان مسجد کے نام سے جداگانہ بنایا جاوے اور ظاہر میں وہ مسجد کی شکل ہو اور واقع میں انجمن ہو اور اس کا پریذیڈنٹ ابو عامر راہب بنایا گیا جو کہ اسلام کا سخت دشمن تھا۔ اور ابو عامر کا ہرقل شاہ روم سے میل جول تھا۔ ابو عامر نے مسلمانوں کے ضعف پر نظر کر کے یہ کہا کہ میں ہرقل سے اہل اسلام کے مقابلہ کے لئے لشکر لاؤں گا جس سے اسلام نیست و نابود ہو جاوے گا۔

ان لوگوں نے اپنی کثرت اور مسلمانوں کی قلت دیکھ کر یہ خیال پختہ کر لیا تھا مگر یہ نہ سمجھے کہ خربوزوں کی چاہے کتنی ہی کثرت ہو مگر چھریوں کی قلت بھی ان کے نیست و نابود کرنے کے لئے کافی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ تو ایک چھری ان اللہ معنا کی تھی کہ کفار کسی صورت سے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور افسوس ہے کہ آج کل یہی چھری مسلمانوں کے پاس نہیں رہی اور اگر ہے بھی تو تیز نہیں ہے کند ہو رہی ہے۔ کیونکہ مرضیات الٰہی سے مسلمان بہت کچھ ہٹ رہے ہیں۔ اس لئے مخالفوں کا کبھی ان پر غلبہ ہو جاتا ہے۔ اگر مسلمان اس چھری کو تیز کر لیں یعنی خدا تعالےٰ کو راضی کرنے کی کوشش کریں تو پھر وہی نمونہ سامنے آ جائے جو کبھی پہلے تھا۔

غرض ان لوگوں نے انجمن کی نیت سے مسجد کی شکل میں ایک مکان اس غرض سے بنایا کہ اس میں تخریب اسلام کا مشورہ کیا کریں گے۔ مسجد

کی نیت سے نہیں بنایا تھا۔ صرف صورۃً مسجد کی شکل تھی۔ غرض جب وہ مکان تیار ہوا تو حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ ایک بار وہاں چل کر نماز پڑھ لیجئے تو پھر وہاں نماز ہونے لگے گی۔ تو گویا مقصود رجسٹری کرانا تھا۔ جیسے بیعنامہ کی رجسٹری کرائی جاتی ہے۔

حضورؐ نے جداگانہ مسجد بنانے کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگے کہ ہماری نیت بالکل نیک ہے محض عام مسلمانوں کی آسائش کی غرض سے بنائی تھی تاکہ وسعت و سہولت ہو۔ گرمی سردی میں سایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مسجد میں سب سما نہیں سکتے۔ اس سے گنجائش ہوگئی۔ نیز کوئی بیمار ضعیف دور نہ جا سکے تو پاس کے پاس اس میں نماز پڑھ لے۔ حضورؐ نے بنا پر حسن ظن تصدیق فرما کر وعدہ کر لیا۔ غرض حضورؐ نے وعدہ فرما لیا کہ تبوک سے آکر اس میں نماز پڑھوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حقیقت حال کی اطلاع کر دی اور وہاں نماز پڑھنے سے منع فرما دیا اور یہ آیت نازل ہوئی۔

والذین اتخذوا مسجدا ضرارا و کفرا و تفریقا بین المؤمنین و ارصادا لمن حارب اللہ و رسولہ من قبل و لیحلفن ان اردنا الا الحسنی و اللہ یشھد انھم لکاذبون لا تقم فیہ ابدا لمسجد اسس علی التقوی من اول یوم احق ان تقوم فیہ فیہ رجال یحبون ان یتطھروا و اللہ یحب المتطھرین۔

اور بعضے ایسے ہیں کہ جنہوں نے ان اغراض کے لئے مسجد

بنائی ہے کہ ضرر پہنچائیں اور کفر کی باتیں کریں۔ اور ایمانداروں
میں تفریق ڈالیں اور اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس
کے قبل سے خدا و رسول کا مخالف ہے اور قسمیں کھاجاوینگے
کہ بجز بھلائی کے ہماری اور کچھ نیت نہیں اور اللہ گواہ ہے
کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ آپؐ اس میں کبھی نہ کھڑے ہوں البتہ
جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس
لائق ہے کہ آپ اُس میں کھڑے ہوں۔ اُس میں ایسے آدمی
ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالےٰ
خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غرض آیت میں خدا کے یہاں سے اُس مسجد کی مذمت ظاہر کی گئی کہ
یہ مسجد صرف صورۃً ہے اور واقع میں کفر کی قوت کے واسطے اور مسلمانوں
کو ضرر پہنچانے اور اُن میں تفریق ڈالنے کے واسطے تیار ہوئی ہے۔ اور
ابو عامر راہب کے ٹھہرنے کے لئے اور اُس کی پناہ کے واسطے تیار
کی گئی ہے۔ اور یہ لوگ قسمیں کھاویں گے کہ بجز بھلائی کے اور کچھ نیت نہیں
حالانکہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ آپ اس مسجد میں نہ کھڑے ہوجیئے اور نہ نماز
پڑھیئے۔ البتہ آپ اس مسجد میں نماز پڑھیئے جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ
پر رکھی گئی ہے۔ اُس میں ایسے آدمی ہیں کہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے
ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غرض اس مسجد میں نماز کی نیت سے جانے سے ممانعت ہوگئی چنانچہ

حضورؐ نے بوجہ اس کے کہ وہ مسجد کی نیت سے نہ بنائی گئی تھی اور اس کے علاوہ مفاسد کثیرہ اس سے ناشی ہوتے تھے چند صحابہ کو بھیج کر اس میں آگ لگوادی اور منہدم کرادی۔ اس مسجد کا لقب مسجد ضرار مشہور ہے کیونکہ وہ اضرار کے لیے بنائی گئی تھی۔

قرآنی طرزِ نصیحت

اس سے آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ۔ افمن اسس بنیانہ علی تقویٰ من اللہ ورضوان خیر امن اسس بنیانہ علی شفا جرف ھار فانھار بہ فی نار جھنم۔ ہمزہ استفہام کا ہے اور فا تفریع کا ہے۔ اوپر دو قسم کی مساجد کا ذکر فرمایا ہے۔ اب یہ بتلاکر کہ ان میں سے ایک کی تو بنا تقویٰ پر رکھی گئی ہے اور دوسری کی کفر پر۔ اس پر تفریع فرماتے ہیں کہ بتلاؤ ان میں سے کون افضل ہے جب بناؤں کی حالت معلوم ہو گئی تو اس سے بانی کی بھی فضیلت معلوم ہو گئی اور بنیان مصدر ہے مبنی کے معنی میں اور ہ کی ضمیر من کی طرف راجع ہے اور من اللہ تقویٰ کی قید ہے تاکہ کوئی متقی ایسی پاکی پر ناز نہ کرے کہ ہم نے پاکی حاصل کی اس واسطے کہ تقویٰ من جانب اللہ ہے اور رضوان بھی مقید ہے من اللہ کے ساتھ۔

مطلب یہ ہے کہ آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خوف خدا و خوشنودی خدا پر رکھی ہو یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھاٹی کے کنارے پر ہو کہ گرنے ہی کو ہو ا رکھی ہو۔ یہ طرز بلاغت ہے کہ فیصلہ مخاطب کے اوپر چھوڑ دیا۔ پس دونوں کے افعال بیان کر

دیئے اور مخاطب کے ذمہ فیصلہ چھوڑ دیا کہ تم سوچ لو یہ بہتر ہے یا یہ بہتر ہے۔ یہ طرز نصیحت کا بڑا مؤثر ہے۔ اور اگر ناصح خود ہی فیصلہ کر دے تو اس سے مخاطب پر گرانی ہوتی ہے۔

چنانچہ اس کی تائید میں ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک مدرسہ میں جلسہ تھا۔ ایک واعظ صاحب نے وعظ فرمایا اور وعظ میں یہ فرمایا کہ علی گڑھ کالج والے سود ی ڈگریاں کرتے ہیں اس لئے ملعون ہیں۔ بات تو صحیح تھی مگر الفاظ سخت تھے اس لئے سامعین کو گراں گزرا اور ناگوار ہوا۔ سامعین بگڑ گئے جب لوگوں کی ناگواری کا مہتمم جلسہ کو احساس ہوا تو اس کا تدارک کرنے کے واسطے کھڑے ہوئے۔ اور خود تقریر کی کہ خدا اور رسول نے یہی کہا ہے جو واعظ صاحب نے فرمایا ہے۔ وغیرہ ذلک مگر مہتمم صاحب کی تقریر سے بھی اس کا کوئی تدارک نہ ہوا۔ تو مہتمم صاحب میرے پاس بھاگے ہوئے آئے۔ غریب کی جورو سب کی بھابی۔ چونکہ مجھ کو اپنے کرم فرماؤں سے انکار کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس لئے ہر ایسے موقع پر مجھے ہی سب پھنسانا چاہتے ہیں۔ اوّل تو میں نے کہا کہ تمہاری یہی سزا ہے۔ بات کہو مگر نرمی سے کہو سختی کی کیا ضرورت ہے۔ کرو تم اور بھگتوں میں۔ یہ اچھی رہی مگر وہ اصرار کرنے لگے تو میں کھڑا ہوا۔

میں نے کہا، صاحبو! اعمال و افعال مباحہ میں نیت پر مدار ہے۔ تو اگر کوئی شخص سخت لفظ کہہ دے مگر نیت مذموم نہ ہو تو ناگوار نہ ہونا چاہیے کیونکہ نیت تو مذموم نہیں ہے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ مولوی صاحب

کی نیت کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے محض شفقت کی راہ سے کہا ہے۔ جیسے کسی کا لڑکا زہر کھانے لگے اور وہ اس کو سختی کے ساتھ دھمکائے تو اس سے کسی کو ناگواری نہیں ہوتی کیونکہ جانتے ہیں کہ منشاء اس کا محض شفقت ہے۔ اب بتلایئے کہ ہم لوگ جو برے افعال کرتے ہیں۔ ان سے مولوی صاحب کا کیا نقصان ہے اور اگر ہم پارسا ہو جائیں تو اس سے مولوی صاحب کا کیا نفع ہے۔ ظاہر ہے کہ نفع نقصان جو کچھ ہے ہمارا ہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص ہم کو مضر باتوں سے سختی کے ساتھ روکتا ہے تو یہ اس کی شفقت ہے یا نہیں۔ اس کو آپ کی حالت بگڑنے پر افسوس ہوتا ہے اس لئے غصہ اور تیزی کے ساتھ آپ کو روکنا چاہتا ہے۔ اگر شفقت نہ ہوتی تو اس کی جوتی کو غرض پڑی تھی جو کسی کی اصلاح کے درپے ہوتا۔

علاوہ ازیں مجھ کو حیرت ہے کہ آپ لوگ تو فطرت کے بہت معتقد ہیں اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ آدمی فطرۃً مختلف المزاج پیدا ہوئے ہیں۔ مزاجوں میں باہم بہت بڑا تفاوت ہے۔ چنانچہ انبیا علیہم السلام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تیزی سب کو معلوم ہے اور ایک حضرت عیسےٰ علیہ السلام ہیں اور ایک ہمارے حضور سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تو آپ نے مولوی صاحب کی سختی کو فطرت کا تابع کیوں نہ تجویز کر لیا۔

پھر میں نے اسلامی احکام اور کالج والوں کا ان سے بُعد بیان کر

کے آخیر میں کہا کہ اب آپ ہی بتلایئے کہ ایسا شخص جو ان احکام کی پابندی نہ کرے مرحوم برحمت خاص ہو سکتا ہے یا رحمت خاص سے اُس کو بُعد ہوگا اور یہی معنی ہیں لعنت کے۔ بس آپ ہی فیصلہ کر دیجئے ہم کچھ نہیں کہتے تو میں نے دونوں قسم کے افعال بیان کر کے فیصلہ خود اُن سے چاہا جس سے سب سامعین خود معترف ہو گئے کہ ہم ہی خطا وار ہیں۔

تو ایک طرز تو یہ ہے کہ اُن کے اقوال و افعال اجنبیانہ طور پر بیان کر دیئے جائیں اور کسی خاص شخص کو مخاطب نہ کیا جائے۔ پھر خود اُن سے ہی فیصلہ دریافت کر لیا جائے تو یہ طرز زیادہ مؤثر ہوتا ہے اور ایک طرز یہ ہے کہ خود فیصلہ کر کے حکم لگا دو کہ تم ملعون ہو۔ جیسے ان مولوی صاحب نے کیا تھا۔ یہ طرز موثر نہیں ہوتا۔

تو حق سبحانہ تعالیٰ بھی یہی پہلا طرز اختیار فرما کر دریافت فرماتے ہیں کہ بتلاؤ ان دونوں میں کون بہتر ہے یعنی جس شخص نے اپنی بنیاد تقویٰ اور خدا کی رضا پر رکھی ایک شخص تو یہ ہے اور ایک شخص وہ ہے جس نے بنیاد کسی گھاٹی کے کنارہ پر جو گرنے ہی کو ہو رکھی ہو۔ یعنی ڈھانگ پر رکھی ہو۔ جس کی عمارت میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ ڈھانگ پر رکھی ہے اور پھر یہ خرابی ہے کہ وہ ڈھانگ گرنے ہی کو ہے۔ تیسری خرابی یہ ہے کہ بانی کو لے کر گرے گی۔ جب مکان گرا تو بانی جو اس میں رہتا تھا وہ بھی گر گیا۔ یہ سب سے زیادہ ضرر ہے۔ اور اگر بانی سلامت رہے تو کیا غم ہے۔

تعمیری بنیاد

ایک نظیر یاد آگئی۔ میں بھرت پور گیا تھا۔ خواجہ عزیز الحسن صاحب میرے ہمراہ تھے۔ چند وعظ بیان کرنے کا اتفاق ہوا جو خواجہ صاحب نے لکھے۔ وہ سفر میں تھے اُن کے ہمراہ ایک بیگ تھا جس میں وعظ بھی تھے۔ وہ بیگ ریل میں چوری چلا گیا خواجہ صاحب کو وعظوں کے ضائع ہونے کا بہت رنج ہوا۔ میں نے ان کے رنج دفع کرنے کو کہا کہ میاں سر سلامت چاہیے ٹوپیاں بہت۔ یعنی واعظ رہے تو وعظ بہت۔

اسی طرح اگر بانی رہ جاوے اور مکان گر جاوے تو ایسا ضرر نہیں مکان بہت بن سکتے ہیں۔ اصل ضرر یہ ہے کہ بانی کو لے کر مکان بیٹھ گیا۔

اس بیٹھ جانے کے متعلق ایک بات یاد آگئی کہ آج کل یہ بھی مرض ہے کہ بہت اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں۔ پھر جب وہ گرتی ہیں تو کسی چیز کا پتہ نہیں چلتا۔ سب کو لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ان آفات سے محفوظ تو گاؤں کے مکان ہیں جو نیچا ہونے کی وجہ سے زلزلہ میں بھی نہیں گرتا ۲۸ راپریل منگل کے دن کانگوڑے میں زلزلہ آیا۔ زلزلہ میں شدت تھی۔ ایک تو زلزلہ کی شدت دوسرے بڑے اور اونچے مکانوں میں حرکت۔ تو میں نے کہا یا اللہ تیرا شکر ہے کہ ہمارے مکان چھوٹے چھوٹے ہیں جو زلزلوں کے اثر سے محفوظ ہیں۔ اس واسطے کہ یہ قاعدہ ہے کہ مرکز سے محیط کو جس قدر بُعد ہوگا۔ اُس میں حرکت زیادہ ہوگی۔ دیوار جس قدر لمبی ہوگی

زلزلہ میں حرکت زیادہ ہوگی۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ نیچے نیچے گھر والے دنیا میں بھی شدت زلزلہ سے محفوظ رہیں گے اور خدا تعالیٰ کے یہاں بھی محفوظ رہیں گے۔ خدا تعالیٰ کو یہ مسئلہ بھی بتانا تھا کہ مکان ایسا بنانا چاہیئے جو مکین کو زلزلے بیٹھے اور کچے مکانوں اور نیچے گھروں میں گو بعض تکالیف ہوتی ہیں مگر راحتیں زیادہ ہیں۔ اگر کبھی گر پڑا تو جلدی سے دوسرا ویسا ہی بن سکتا ہے ۔

خدا گر بحکمت بہ بندد درے　　کشاید بہ فضل و کرم دیگرے

اور یہاں اللہ تعالےٰ نے تاسیس بنیان پر نکیر نہیں فرمایا بلکہ بنیان مقید بقید خاص پر نکیر فرمایا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ خود مکان بنانا مذموم نہیں بلکہ وہ تو اگر بقید ضرورت ہو تو محمود ہے۔

مکان کی اہمیت

ہاں بناء الفاسد علی الفاسد نہ ہو۔ وجہ یہ کہ بغیر مکان کے گزر نہیں ہوسکتا اور سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب مکہ تشریف لے گئے تو فاقوں کو تو جھیل لیا مگر مکان کی تکلیف نہ برداشت فرما سکے۔ دعا کی کہ اے اللہ ایسی بیٹھنے کی جگہ مرحمت فرمائیے کہ جس سے کوئی اٹھا نہ سکے۔ ایک روز مطاف میں تشریف رکھتے ہوئے ذکر میں مشغول تھے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور کچھ پیسے ہاتھ پر رکھے اور فرمایا تمہارے ہاتھوں لاکھوں کا خرچ رکھا گیا۔ حضرت نے عرض کیا میں اس کا متحمل نہیں۔ البتہ ایک ایسا گھر چاہیئے۔ فرمایا یہ بھی ہو جائے گا۔ جس کا غیب سے

یہ سامان ہوا کہ ایک شخص نے حضرت کے نام مکان خرید دیا۔ حضرت نے اس مکان میں بیٹھتے ہی معاً وقف نامہ لکھا کہ حیات تک میں رہوں گا پھر میرے بعد یہ مکان دوسرے اغراض محمودہ کے لئے وقف ہے۔ اور اس طرح کی شرط لگانا وقف میں جائز ہے کہ اپنے انتفاع کی یا اپنی اولاد کے یا اولاد کی اولاد کے انتفاع کی شرط لگا لے۔ یہ بھی ثواب کا مرتبہ ہے مگر میں اس کا کسی کو مشورہ نہیں دیتا۔ کیونکہ بعض دفعہ وقف کرنے کے بعد اولاد کو کوئی ایسی تکلیف ہوتی ہے جس سے اولاد کو مجبوری کی وجہ سے مکان بیچنا پڑتا ہے۔ مثلاً کسی وقت وہ محلہ ویران اور خطرناک ہو گیا یا ہمسائے شریر ہو گئے۔ اب مکان بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے، مگر وقف کی وجہ سے اس کو بیع نہیں کر سکتے۔ آگے ہر شخص اپنی مصلحت سمجھ سکتا ہے۔

غرض مکان کے نہ ہونے کی بہت تکلیف ہوتی ہے۔ حافظ عارف شیرازیؒ بھی مقام امن کی ضرورت کو فرماتے ہیں ؎

مقامِ امن و مے بے غش و رفیق شفیق
گرت مدام میسر شود زہے توفیق

ہاں شرط یہ ہے کہ مقام امن ہو گڑبڑ نہ ہو ورنہ پھر مکان سے خاک بھی فراغت نہیں ہوتی۔

اپنے اختیار کی جگہ نہ ہونے کی تکلیف پر ایک قصہ یاد آیا۔ ہم ایک دفعہ عدن میں اترے۔ عدن مشہور جگہ ہے اور یہ بھی عوام میں مشہور ہے

ہے کہ وہاں بہشت تھی مگر وہ جنت اسی قبیل سے ہے کہ تسمع بالمعیدی
خیر من ان تراہ۔ غرض یہ غلط مشہور ہے کہ وہاں بہشت ہے۔ تو میں جب
عدن پہنچا ایک دو ساتھی اور بھی ہمراہ تھے۔ ہم کو عدن کی سیر کرتے کرتے
شام ہو گئی۔ سوچا کہ مسجد میں جا کر سو رہیں گے کیونکہ مسجد خدا کا گھر ہے وہاں
کسی کا دعویٰ نہیں چل سکتا۔ چنانچہ مسجد میں پہنچے۔ پھر سوچا کہ چپکے سے چھت
پر جا کر لیٹ رہیں۔ تاکہ مؤذن وغیرہ آ کر نہ نکال دیں۔ چنانچہ چھت پر بستر بچھا
کر چپکے سے لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد مؤذن آیا۔ اس نے آ کر کہ نکلو کون
ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ ہم نے بھی بہت مسافروں کو مساجد سے نکالا ہے
آج اس کی قدر ہو گی۔ غرض ایک ساتھی نے مؤذن کو دھمکایا اور کہا کہ تمہیں
خبر نہیں کہ ہم آتے جاتے ہمیشہ یہاں ٹھہرتے ہیں اور تجارت کرتے ہیں اور
عربی میں کہا کہ تو جانتا نہیں ہم عرب ہیں۔ تو وہ مؤذن ذرا ٹھنڈا ہوا اور کہا کہ
کہ آ کر اندر مسجد میں لیٹ جاؤ۔ اس وقت ہم چھت سے اتر کر مسجد کے
اندر آ گئے اور پردہ چھوڑ کر لیٹے اور کہا کہ خدا تیرا بھلا کرے۔ تو واقعی مکان
نہ ہونے سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔

قوم عاد کی تقلید

مگر مختصر مکان ضرورت کے لائق کافی ہے۔ زیادہ
اونچا مناسب نہیں۔ حدیث میں ہے وبیت یدخل
فیہ کہ مکان ایسا ہو جس میں بے تکلف داخل ہو سکے۔ زیادہ اونچا کرنا مکان کا
قوم عاد کی میراث ہے۔ قوم عاد شان کے لئے نئے نئے اونچے اونچے
مکان بنایا کرتے تھے۔ ہمارے یہاں تھانہ بھون میں بھی بعض مکان اندر سے

تو بہت ہی مختصر ہیں مگر دروازہ نہایت عالیشان اور نہایت بلند ہے۔ عذر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ چوروں سے حفاظت رہتی ہے مگر یہ سب امور فضول اور لغو ہیں۔ چور تو جہاں چوری کرنا چاہتے ہیں تو اونچے سے اونچا مکان بھی مانع نہیں ہو سکتا۔ وہ تو نقب کے ذریعہ سے کام کرتے ہیں بہت لوگ ایسے ہیں جن کے مکان بہت چھوٹے اور نیچے ہیں مگر چور ساری عمر میں بھی کبھی اُن کے گھر نہیں آئے تو اونچے مکان کے لئے چور کا نہ آنا اور نیچے مکان کے واسطے چور کا آنا لازم نہیں۔ چور کے آنے کے اسباب اور ہیں۔

غرض بلا ضرورت اونچا اور وسیع مکان بنانا فضول ہے بقدر ضرورت چاہیے۔ ہاں اگر کسی شخص کو ضرورت زیادہ ہو کہ آدمی بھی ہوں اور جانور بھی اُن کی مقدار کے موافق وسعت کرنے میں مضائقہ نہیں ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے نفس بنیان پر نکیر نہیں فرمایا۔ ہاں بنیان مذموم پر نکیر فرمایا ہے چنانچہ اُس کی ایک فرد کے باب میں فرمایا ہے کہ فانھار بہ فی نار جہنم اور تاکید وعید کے لئے یہ بھی فرمایا۔ واللہ لا یھدی القوم الظلمین۔

غرض یہاں دو مسجدوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک وہ مسجد جس کی بنا میں غرض باطل اور نیت فاسد پر تھی۔ اور ایک وہ جس میں غرض صحیح تھی۔ یہ تو مساجد خاصہ تھیں جن کا ذکر اس مقام پر ہے۔ اب میں اُن سے اور مساجد کی طرف حکم کا تعدیہ کروں گا۔ پھر مدارس کی طرف پھر جملہ عمارات کی طرف۔ مگر اوّل ایک غلطی پر متنبہ کر دینا ضروری ہے۔

اہل فتاوی کی غلطی

یہاں پر بعض اہل فتاوی کو مساجد کے متعلق سخت غلطی ہوئی۔ وہ یہ ہے کہ جب کسی قدیم مسجد کے مقابلہ میں کوئی جدید مسجد بنی تو انہوں نے جدید پر فوراً مسجد ضرار کا حکم لگایا کہ یہ مسجد فساد اور لڑائی کی وجہ سے ہے اور محض تفاخر پر مبنی ہے۔ یہ یقینی امر ہے کہ اگر نیت مذکورہ ہے تو معصیت ضرور ہے مگر اس سے یہ حکم لگانا کہ مسجد ضرار ہے کیسے صحیح ہے۔ غرض جو مسجد جدید بنی اس کو مسجد ضرار فوراً کہہ دیا اور الشئ اذا ثبت ثبت بلوازمہ ہی کے قاعدہ سے بعض اس سے آگے بڑھے کہ اس کے جلانے اور گرانے کا حکم کر دیا۔ بے شک مسجد ضرار کا تو یہی حکم ہے مگر پہلے یہ تو ثابت ہو جاوے کہ یہ مسجد ضرار ہے یا نہیں۔ اس کے بعد ہی تو بقیہ تفریعات ہو سکتی ہیں۔ تو جو مسجد ریا اور تفاخر کے لئے بنائی جاوے مجھے اس کے مسجد ضرار کہنے میں کلام ہے۔

اگر کوئی کہے کہ مسجد ضرار پر قیاس ہے تو میں کہوں گا کہ یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ مقیس علیہ میں تو درحقیقت مسجد ہی بنانے کی نیت نہ تھی کیونکہ ان کے اعتقاد سے مسجد بنانا موجب تقرب نہ تھا۔ بخلاف مقیس کے کہ وہاں بانی مسجد بنانے ہی کی نیت کر رہا ہے اور مسجد بنانے کے موجب کو تقرب سمجھتا ہے گو اس میں نیت فاسد بھی ملی ہوئی ہے۔ تو فساد نیت کو فساد عقیدہ پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

اصل یہ ہے کہ مساجد کی تین قسمیں ہیں۔ ایک مسجد صلوٰۃ، ایک مسجد ضرار، ایک مسجد صلوٰۃ وضرار یعنی ایک تو وہ محض نماز کے لئے ہو اور ایک وہ جو محض اضرار

کے لئے ہو اور ایک وہ جو اضرار اور نماز دونوں کے لئے ہو۔ تو جو محض اضرار کے لئے ہو وہ مسجد ضرار ہے اور جو نماز اور اضرار دونوں کے لئے ہو وہ مسجد ضرار نہیں۔ خوب سمجھ لو۔ مسجد ضرار کے لئے اصل شرط یہ ہے کہ مسجد ہی بنانے کی نیت نہ ہو جو حاصل ہے آیت کا اور جب یہ شرط متحقق نہ ہو گو ریا اور کوئی دوسری غرض بھی شامل ہو تو مسجد ضرار نہ ہو گی۔ اس لئے احکام ظاہری میں وہ مسجد ہے گو عنداللہ وہ مقبول نہ ہو۔

جیسے کوئی شخص کافروں کے ہاتھ سے قتل ہوا اور نیت خالص نہ تھی تو گو وہ عنداللہ شہید نہ ہو مگر ظاہری احکام شہید کے تو اس پر لگائے ہی جاوینگے غرض مسجدیت اور مقبولیت میں تلازم نہیں۔ فقہا جن کی شان یہ تھی کہ لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصٰہا کہ تمام جزئیات کا انہوں نے احاطہ کیا ہے مگر یہ جزئی کہیں ان سے منقول نہیں کہ مسجد بہ نیت ریا وغیرہ احکام میں بھی مسجد نہیں ہوتی۔ اگر کوئی صاحب منقول ہونے کا دعوی کریں تو مہربانی کر کے دکھائیں ہم نے کسی مجتہد سے کہیں یہ جزئی منقول نہیں دیکھی۔ باوجودیکہ فقہا کے زمانہ میں بھی اس کی ضرور ضرورت ہوتی تھی۔ مگر فقہاء نے کہیں یہ تفریع نہیں کی حالانکہ احکام مساجد کتب فقہ میں موجود ہیں۔ اور مسجد ہونا نہ ہونا احکام فقہیہ میں سے ہے۔ پھر عدم تعرض دلیل ہے اس امر کی کہ مسجد تفاخر وغیرہ کی نیت سے بنانا احکام ظاہری اور فقہی کے اعتبار سے مسجد ہی کا حکم رکھتی ہے۔ لہذا ہر مسجد کو ضرار کہہ دینا دعوی بلا دلیل ہے۔

پھر جب ایسی مسجد مسجد ضرار کے حکم میں نہیں ہو سکتی تو یہ خیال کر کے کہ

یہ مسجد ضرار ہے اس کے ویران کرنے کی کوشش جائز نہیں ہو سکتی۔ پھر کسی کی نیت
پر فتویٰ کا مدار کیونکر ہو سکتا ہے جب کہ نیت کا علم کسی کو سوائے خدا کے
نہیں ہو سکتا۔ پہلے اس شخص سے تو تحقیق کر لو جو بانی مسجد ہے۔ ممکن ہے کہ اس
کی نیت اچھی ہو۔ (اور وہاں تو نیت کا حال وحی سے معلوم ہو گیا تھا اور اب
بوجہ انقطاع وحی ہمیں نیت کا حال معلوم ہو نہیں سکتا) اور جس طرح کسی مسجد کو
مسجد ضرار نہیں کہہ سکتے اسی طرح کسی مدرسہ پر بھی مدرسہ ضرار کا حکم نہیں لگا سکتے
اس لئے کہ مسجد دار العمل ہے اور مدرسہ دار العلم ہے۔

مدرسے اور کھالیں

جب ایک شہر میں مساجد متعدد ہو سکتی ہیں تو مدارس
کے متعدد ہونے میں کیا مضائقہ ہے! البتہ اسی طرح
دو دو یا تین تین مدرسے چلانے سے کیا فائدہ جیسے مدارس آج کل چل رہے
ہیں اور چلتے ہیں کہ جب قربانی کے دن آئے تو جہاں مدارس متعدد ہیں وہاں
گھر گھر مدرسہ والے بھاگے پھرتے ہیں۔ پھر ہر ایک اپنے مدرسہ کے لئے
کھال لینے کی کوشش کرتا ہے۔ جانوروں کی کھال اترنے سے پہلے آدمیوں
کی کھال اترنے لگتی ہے۔ اس قدر ذلیل افعال سے غیرت بھی تو نہیں آتی!
ایسے مدرسہ کے چلانے سے کیا فائدہ؟ ایسی صورت میں تو مدرسہ والوں کو
چاہئے کہ ایک جگہ دو مدرسے چلانے کا نام بھی نہ لیں۔ اور کھال کی کوشش
تو مدرسہ والوں کو کسی حال میں بھی مناسب نہیں گو ایک ہی مدرسہ ہو۔ اس میں
دوسرے اہل حاجت سے کشمکش ہوتی ہے۔ چنانچہ جہاں پہلے سے قربانی
کی کھال مؤذنوں کو دینے کی عادت تھی وہاں مؤذنوں کی کھال اترتی ہے۔

جہاں بقرعید کے دن آئے اور مؤذنوں نے مدرسہ والوں کو دیکھا، کوسنا شروع کر دیا کہ خدا ان مدرسہ والوں کو کھو دے۔ انہوں نے ہماری آمدنی تباہ کر دی۔ غرض کھال کے قصہ میں مولویوں سے اکثر لوگ ناخوش ہیں، تو علماء بلا ضرورت کیوں مبغوض بنیں۔

فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ علماء کو دستاویز پر دستخط نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس سے عداوت ہوتی ہے۔ اسی طرح علماء کو کھال کے قصہ میں بھی نہ پڑنا چاہئے کیونکہ یہ بھی باعث عداوت ہے۔ اگر کہیں سے آ گئی لے لی ورنہ پھرنے پھرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مدرسہ دیوبند پھر غنیمت ہے کہ وہ اس طرح کھالوں وغیرہ پر زور نہیں دیتے بلکہ یہ لکھ دیتے ہیں کہ جہاں اوروں کا خیال کرتے ہو وہاں ہمارا بھی خیال کر لینا۔ غرض علماء کو آزاد رہنا مناسب ہے۔ خوب کہا ہے ؎

زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند | خوشتر آں سرو کہ از بند غم آزاد آمد

خصوص جہاں کئی مدرسے ہیں وہاں تو بہت ہی چپقلش ہے اور کسی کا کسی پر بس تو چلتا نہیں۔ لہٰذا مسجد ضرار و مدرسہ ضرار کے لقب سے ملقب کر کے اپنے دل کا غبار نکالتے ہیں۔ حالانکہ صاف اور واضح طور سے قرآن میں ایسے القاب سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ ولا تنابزوا بالالقاب بلکہ اگر واقعی بھی کسی کا کوئی برا لقب ہو تو چڑانے کی نیت سے بھی نہ کہنا چاہئے۔

تعمیر مساجد اور احتیاط

اب میں خاص مسجد کی خاص عمارت سے متعلق مساجد کی عمارت عامہ کی طرف حکم کا تعدیہ کرتا ہوں اور مساجد کی عمارات میں جو کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں، اُن کا مختصر بیان کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ آج کل لوگ تعمیر مساجد میں اپنے کو شتر بے مہار سمجھتے ہیں کسی قسم کی حدود و قیود کی رعایت نہیں کرتے اور اس جواب کو کافی خیال کرتے ہیں کہ ہم اپنا گھر تو نہیں بناتے۔ حالانکہ یہ جواب بالکل ناکافی ہے کیونکہ خدا کے گھر میں تو بدرجہ اولیٰ احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہاں احتیاط نہ کرنا زیادہ رنج و ملال کی بات ہے۔ چنانچہ مساجد میں گنبد کو ضروری خیال کرتے ہیں اور استرکاری تو درجہ فرائض میں سے ہے۔ بلا ان امور کے تو مسجد مسجد ہی نہیں ہو سکتی۔ منارہ کو اس قدر طویل کرتے ہیں کہ جس کا بیان نہیں۔ اور منارہ کی طوالت کی اکثر یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ دُور سے نظر آوے کہ مسجد ہے مگر یہ وجہ بھی صحیح نہیں بعض دفعہ آڑ ہوتی ہے تو طویل منارہ بھی دُور سے نظر نہیں آتا۔

علاوہ ازیں دُور سے نظر آنا بھی ضروری نہیں۔ منارہ بنانے کی اصل وجہ تو صرف یہ ہے کہ مسجد دوسری عمارات سے مشتبہ نہ ہو۔ منارہ مسجد ہونے کی علامت ہے اور وہ علامت نفس منارہ ہے نہ کہ منارہ کا اس قدر طول و طویل ہونا۔ سو علامت کے لئے چھوٹے چھوٹے گز گز بھر کے منارے کافی ہیں۔ یا بجائے منارہ کے اور کوئی علامت کر دی جائے۔

بعض لوگ طوالت منارہ کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں شان اسلام ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر یہ بات ہے تو نشان کے برابر تو لمبا ہونا چاہیئے تھا۔ پھر تو سب مساجد کے منارے کم ازکم قطب کی لاٹھ کے برابر تو ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسجد بنانا تو دشوار ہی ہو جاتی ہے بس ایک منارہ پر ہی عمریں تمام ہو جاتی ہیں۔

جیسا کہ قطب کی لاٹھ کی بابت مشہور ہے کہ بادشاہ کا مسجد بنانے کا قصد تھا مگر اس وقت تک ایک ہی منارہ بنا تھا کہ بادشاہ صاحب چل بسے۔ دوسرا منارہ نہ بنا اور نہ پوری مسجد بنی ورنہ معلوم نہیں کیا کیا تکلفات ہوتے۔ ہماری ان رسوم سے ہماری مساجد کی واقعی وہی حالت ہو رہی ہے کہ مساجد ہمہ عامرۃ و ھی خراب۔ کہ ظاہر میں تو مساجد آباد ہیں مگر باطن میں خراب ہیں۔ ان میں روح نہیں فقط ظاہر ہی ظاہر ہے۔

چنانچہ بمبئی کی یہ حالت ہے کہ ظاہر میں تو وہاں کی مساجد بے حد آباد ہیں۔ لمبے لمبے اور بہت جھاڑ فانوس فرش فروش مگر سنت کے خلاف جماعت میں متفرق طور پر آدمی کھڑے رہتے ہیں اور پورے طور سے صف بندی بھی نہیں ہوتی۔ اور اس کی وجہ مکہ مکرمہ کی تقلید ہے مگر وہاں تو خط مستقیم کھینچنا دشوار ہوتا ہے اس لئے کہ خانہ کعبہ کے رُخ پر نماز پڑھتے ہیں اس لئے پورے طور سے صف بندی دشوار ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اکثر متفرق طور پر صفوف رہتی ہیں۔ مگر بمبئی میں کوئی عذر نہیں۔ بمبئی والے نماز کے افعال و ہیئت میں اکثر مکہ والوں کی تقلید کرتے ہیں۔ امام و مؤذن بھی

زیادہ تر عرب ہی ہیں مگر یہ سب دین کی ظاہری صورت ہے اور باطنی حالت یہ ہے کہ سر سے پیر تک بدعات میں غرق ہیں۔

ایک ہمارے دوست طالب علم بمبئی میں ملے اور قصہ بیان کیا کہ ان سے کسی نے شیخ سدو کے بکرے کی بابت دریافت کیا۔ انہوں نے ناجائز کہہ دیا بس شور مچ گیا۔ اب جس مسجد میں جاتے ہیں وہاں حکم ہوتا ہے کہ نکالو وہابی ہے۔ اس جہالت کی بھی کوئی حد ہے کہ مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے روکتے ہیں۔ حالانکہ قرآن میں ہے ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیہا اسمہ وسعی فی خرابہا۔ غرض جس جگہ اور جس مسجد میں جاتے ہیں وہابی کہہ کر نکال دیئے جاتے ہیں۔ اتفاق سے ایک مسجد شافعیہ کی تھی وہاں جا کر نماز پڑھی۔ میں نے کہا کہ میاں فتویٰ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کہہ دیا ہوتا کہ مجھے معلوم نہیں۔

غرض یہ بہانہ محض لغو ہے کہ مسجد کی زینت و آرائش سے شوکت اسلام بڑھتی ہے۔ اسلام کی شوکت تو اتباع احکام سے بڑھتی ہے۔ اگر ان اشیاء سے شوکت اسلام بڑھا کرتی تو جس زمانہ میں شوکت اسلام عروج پر تھی اس زمانہ میں ان باتوں کا ضرور وجود ہوتا مگر ان چیزوں کا کہیں پتہ نہیں۔

دیکھئے حضرت عمرؓ کتنے بڑے صاحب شوکت و سلطنت و سیاست تھے اور کس قدر عالی دماغ اور بلند حوصلہ تھے۔ لیکن جب مسجد نبوی بنوانے لگے تو بخاری میں ہے کہ مستری سے فرمایا کہ اکن الناس من الحر والبرد یعنی مسجد ایسی بناؤ کہ گرمی اور بارش سے بچاؤ ہو جاوے۔ چنانچہ حضرت

عمرؓ نے باوجود کثرت فتوحات کے نقش و نگار کی اجازت نہیں دی۔ تو اُس زمانہ میں قلت زینت مساجد کی وجہ سے کیا عروج اسلام میں کچھ کمی آگئی تھی ہرگز نہیں بلکہ ایسا عروج تھا کہ آج مسلمان اُس کو ترستے ہیں۔

تھانہ بھون کے اسٹیشن پر جب مسجد بنی ہے تو معمار نے اس میں نقش و نگار بھی نکالنا شروع کر دیئے تھے۔ خربوزہ اور تربوز بنانے شروع کر دیئے منتظم نے روکا کہ یہ قصہ مت کرو اور میرا حوالہ دیا کہ وہ پسند نہ کرے گا۔ معمار نے کہا کہ اگر وہ پسند نہ کرے گا تو مزدوری نہ دینا۔ منتظم نے کہا کہ یہ تو یقینی امر ہے کہ وہ پسند نہ کریں گے۔ پھر مزدوری بھی یقینی طور پر نہ ملے گی۔ معمار نے اس کو بھی منظور کیا۔ پھر میرا مسجد دیکھنے کی غرض سے وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے سب نقش و نگار دھلوا کر صاف کرا دیئے۔ اور معمار کو موافق وعدہ (و نیز بوجہ قاعدہ شرعیہ) اُجرت نہیں دی گئی۔ کیونکہ اگر مسجد میں اس طرح سے نقش و نگار کئے جاویں تو مسجد مسجد نہیں رہتی بلکہ تماشا گاہ ہو جاتی ہے کہ سیاح اُس کو دیکھنے کو آتے ہیں اور نمازی بھی اگر وہاں نماز پڑھتے ہیں تو خیال نقش و نگار کی طرف رہتا ہے۔ نماز کی طرف نہیں رہتا۔ جب مساجد میں ان خرافات کی اجازت نہیں اور مساجد میں یہ خرافات فضول ہیں حالانکہ اُن کی زینت یا شوکت میں ایک گونہ دینی مصلحت بھی محتمل ہے تو بقیہ عمارات میں بدرجۂ اولیٰ یہ قصہ فضول ہے۔

مکان اور تقویٰ

غرض عمارات میں ریا و تفاخر و اسراف سے تحرز لازم ہے ہر عمارت میں تقویٰ اور رضوان کی ضرورت ہے

اگر دونوں جمع ہو جائیں سبحان اللہ! ورنہ صرف تقویٰ بھی بدرجہ ادنیٰ کافی ہے
اور تقویٰ اور رضوان میں جو فرق ہے اُس کو بیان کرتا ہوں۔

طلب رضوان جو وجودیات سے ہے اور تقویٰ عدمیات سے یعنی
طلب رضوان کا حاصل ثواب کے لئے فعل مامورات ہے خواہ واجب ہوں
یا مستحب اور تقویٰ کا حاصل احتراز عن المنہیات ہے۔ پھر تقویٰ اور رضوان کو
یہاں لفظ واو سے جمع کیا گیا ہے اور لفظ واو ہر چند کہ جمع کے لئے آتا ہے
مگر اجتماع کے لئے نہیں آتا۔ پس ہر عمارت میں تقویٰ اور رضوان کا جمع کرنا ضروری
نہیں کیونکہ عمارت کی دو قسمیں ہیں بعض عمارت جیسے مساجد وغیرہ میں تو رضوان و
تقویٰ کا اجتماع ہوتا ہے کیونکہ نیت بھی ثواب کی ہوتی ہے اور خلاف شرع
افعال و نیت سے بھی بچنا ضروری ہوتا ہے اور اگر اپنا مکان بناویں تو اس
میں تقویٰ تو ہر حال میں ضروری ہے لیکن رضوان و ثواب کی رعایت قدرے
مشکل ہے۔ اگر اس میں بھی رضوان و ثواب کا قصد شرعاً ضروری ہوتا تو ہم اس
صورت میں مکان بنانے میں خوشنودی خداوندی کی آخر کیا نیت کرتے تکلف
ہی کرنا پڑتا۔ چاہے حق تعالیٰ ہمیں کسی نیک نیت پر جو ہم بہ تکلف کریں،
ثواب دے دیں مگر نیت کرنا خود ہوتا تکلف۔

جیسے ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ اُن کے ایک مرید نے مکان
بنایا تھا تو وہ بزرگ مکان دیکھنے تشریف لائے۔ دریافت کیا کہ بھائی یہ
روشندان کیوں رکھا ہے۔ عرض کیا کہ حضور روشنی کے واسطے۔ فرمایا اگر یہ
نیت کر لیتے کہ اس میں سے اذان کی آواز آوے گی تو ثواب بھی ملتا اور

مدشئی تو ہر صورت میں ہوتی ہی۔
مگر پسیح یہ ہے کہ ہر فعل میں اس قسم کی نیت ہے مشکل۔ یہ خاص لوگوں کا کام ہے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ رضوان کی رعایت ہر عبادت میں مامور بہ نہیں۔ ہاں اگر نیت خیر ہو اس کے مستحب ہونے میں کلام بھی نہیں مگر سب میں ایسی ہمت کہاں کہ کھانا کھاوے، چلے پھرے، ہر ایک فعل مباح میں کوئی خاص نیت کرے۔ عوام اگر نیت کریں گے بھی تو محض درجہ لفظ میں ہو گی نہ کہ حقیقۃً۔ بہرحال ہر کام میں ایسی نیت دشوار ہے۔ نتیجہ اس کاوش کا یہ ہوتا کہ غیر ضروری نیت کے ساتھ ضروری نیت بھی چھوٹ جاتی۔
جیسے ایک صاحب کو میں نے دیکھا میزان پڑھانے بیٹھے تو الحمد للہ میں تقریر کرنے لگے کہ الف لام کی چار قسمیں ہیں۔ استغراق اور جنس اور عہد ذہنی اور عہد خارجی وغیرہ۔ حالت یہ تھی کہ وہ بیان کر رہے تھے اور طلبا ان کا منہ تک رہے تھے۔ میں نے کہا کہ ان پڑھنے والوں کے نزدیک تو الف لام کی ایک ہی قسم ہے یعنی استغراق۔ کیونکہ یہ بیچارے سب مستغرق ہو گئے۔ تو وہ مبتدی جس نے میزان شروع کی ہے۔ ان باتوں کو کیا سمجھ سکتا ہے پھر اس کا نتیجہ کیا ہے۔ بجز اس کے کچھ نہیں کہ جب سمجھ میں نہ آوے تو چھوڑ دے تو نتیجہ اس دشواری کا اکثر ضروری چیز کا بھی ترک ہوتا ہے۔
اکثر واعظین اس قسم کی حکایات عوام کے سامنے بیان کر دیتے ہیں اول ان کا درجہ بیان کرتے نہیں۔ عوام ان کو ضروری سمجھ جاتے ہیں۔ جس سے ان سب امور کا نتیجہ ترک عمل ہوتا ہے۔ اگر ہر عبادت میں طلب رضوان و ثواب

کی نیت کا مکلف بنایا جائے تو عوام تقویٰ کو بھی چھوڑ بیٹھیں گے۔ غرض عمارت کے لئے دو چیزوں میں سے بطور مانعۃ الخلو کے کسی ایک کی ضرورت ہے تقویٰ کی یا رضوان کی اور اس لفظ واؤ سے تقویٰ اور رضوان کا مجتمعاً پایا جانا ضروری نہیں ہو گیا۔ کیونکہ یہاں تو واؤ سے فقط حکم میں دونوں کو جمع کرنا منظور ہے نہ کہ وجود میں اور وہ حکم ہے خیریت۔ تو یہاں جمع فی الخیریت مراد ہے کہ خیر ہونے میں دونوں شریک ہیں۔ پس ہر شخص کے ذمہ یہ ضروری نہیں کہ ہر عمارت میں تقویٰ اور رضوان دونوں باتوں کو مجتمع کرے بلکہ بعض عمارات میں جہاں رضوان و ثواب کی نیت میں تکلف ہو، صرف تقویٰ بھی کافی ہے۔

مکان اور ضرورت

اب تقویٰ کی مختصر فہرست بتلاتا ہوں جس میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بے ضرورت مکان نہ بناؤ یہ بھی خلاف تقویٰ ہے۔ جب ضرورت ہی شدید ہو تو مجبوری ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ سب چیزوں میں اجر ملتا ہے مگر عمارات کہ ان میں اجر نہیں ملتا اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عمارات میں زیادتی ہو ہی جاتی ہے اور میں خود اس خبط میں مبتلا ہوں۔ کہیں ذرا سا گوشہ نکلا ہوا برا معلوم ہوتا ہے کہیں نیچا ہے اس کا مساوی کرنا ہے۔ کہیں صرف اس ضرورت سے کہ مقابلہ ٹھیک نہیں ہوتا کوئی چیز بنائی جاتی ہے۔ اگر دروازہ سے پورا تقابل نہیں ہوتا تو مقابلہ میں دروں کے نشان بلا ضرورت ڈالتے ہیں۔ غرض عمارت وبال ہے البتہ ضرورت مستثنیٰ ہے۔ حدیث میں او بیت یکن خلی فیہ وارد ہے مگر یہ ضرور ہے کہ ہر شخص کی ضرورت مختلف قسم کی ہوتی ہے

اس لیئے اختصار بھی ہر ایک کے لحاظ سے مختلف ہے۔

جیسے مشہور ہے کہ ایک بزرگ کی خانقاہ میں ایک شخص آٹھ دس روٹی کھایا کرتا تھا۔ لوگوں نے شکایت کی۔ بزرگ نے نصیحت کی کہ بھائی کم کھانا چاہیئے۔ خیر الامور اوساطہا۔ اُس نے عرض کیا کہ حضرت میری خوراک چالیس روٹیاں ہے اس لیئے میرا اوسط یہی ہے بلکہ اوسط سے بھی کم ہے غرض ہر شخص کی ضرورت جُدا ہے۔

ایک شخص ہے کہ اُس کے گھوڑے وغیرہ بھی ہیں۔ اُس کو ان وجوہ سے بڑے مکان کی حاجت ہے۔ اس لیئے ہر شخص کا اوسط جدا ہے غرض بحد ضرورت میں تعمیر کرنا چاہیئے اور ضرورت سے زائد کو ترک کرنا چاہیئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو آسائش ہے اور ایک آرائش ہے آسائش کی مقدار تک تو مکانوں میں وسعت جائز ہے۔ مگر آرائش کا اہتمام مذموم ہے۔ خصوص جب ساتھ میں نمائش بھی ہو۔ بس ہر عمارت میں یہ امر ضروری و قابل لحاظ ہے کہ یہ تعمیر آسائش کے واسطے یا آرائش و نمائش کے واسطے ہے۔ تو جو عمارتیں آرائش و نمائش کے واسطے ہوں وہ تقویٰ کے خلاف ہیں۔ اور اکثر عمارات تو ایسی ہی ہیں جن میں ضرورت کا لحاظ نہیں کیا جاتا چنانچہ بعض مکانوں میں دروازے بہت بلند ہیں بلکہ بعضے مکان تو ایسے ہیں کہ دروازہ تو نہایت عالیشان مگر اندر سے مکان بہت ہی مختصر۔ وہی مثل ہے کہ خوان بڑا خوان پوش بڑا کھول کے دیکھا تو آدھا بڑا۔ پرانی عمارتوں میں اکثر ایسے دروازے دیکھے جاتے ہیں جو ٹھیک اس شعر کے مصداق ہیں۔

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ　　آثار پدید ست صنادید عجم را

ان مکانوں میں اکثر مکان ایسے بنائے گئے ہیں کہ جس لاگت میں ان کے دروازے بنے ہیں اتنی لاگت میں دو تین حویلیاں تیار ہو سکتی تھیں۔ تو اس کو سوائے نقش بلکہ نمائش کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

میرے ایک عزیز تھے انہوں نے تین سو روپیہ میں ایک حویلی خرید لی جس میں ایسا عالیشان برج تھا کہ تین سو روپیہ کا تو وہی ہو گا اور اندر سے مکان کچھ بھی نہیں۔ غرض آج کل شان اور فخر سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ معمولی مکان بنانے سے عار آتی ہے۔

عشق اور وظیفہ

یہ عار وہ بلا ہے کہ انسان کو تباہ کر دیتی ہے اسی عار ہی کی وجہ سے ابو طالب مقصود سے رہ گئے حالانکہ وہ حضورؐ کے عاشق اور جانثار تھے۔ حضورؐ نے مرتے وقت ان سے فرمایا کہ ایک دفعہ کلمہ کہہ دو۔ اے چچا جان! اس وقت ابو جہل بھی پاس بیٹھا تھا کہنے لگا۔ اترغب عن ملة قریش۔ تو ابو طالب حضورؐ سے کہنے لگے کہ میرے بھتیجے! میں تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا مگر لوگ کہیں گے کہ ابو طالب نے عذاب کے ڈر سے اپنا دین چھوڑ دیا۔ غرض آخر کلمہ ان کی زبان سے یہ نکلا ھو علی دین عبد المطلب۔

غرض یہ عار وہ بلا ہے جس کی وجہ سے ابو طالب ایمان نہ لا سکے۔ پس اس کا علاج کرو اور اس کا علاج وظیفوں کا پڑھنا نہیں بلکہ عشق پیدا کر لو۔ یہ اس سے ضرور جاتا رہے گا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد | او ز حرص و عیب کلی پاک شد
شاد باش اے عشق خوش سودائے ما | اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما | اے تو افلاطون و جالینوس ما

اور فرماتے ہیں کہ ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت
ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

تیغ لا در قتل غیر حق براند | در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت | مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

اور خود یہ عشق بھی وظیفوں سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ صحبت سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسے خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے پس اس کی تدبیر یہ ہے ؎

قال را بگذار مرد حال شو | پیش مرد کاملے پامال شو

تو عشق کے پیدا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ عشاق کی صحبت اختیار کرو یعنی اُن کا اتباع اور انقیاد کرو جو وہ تجویز کریں اور تعلیم کریں اُس پر عمل کرو یاد رکھو وہ وظیفے نہ بتادیں گے نہ وہ اپنے پاؤں دبوادیں گے بلکہ لوگوں کی خدمت کرادیں گے۔ ان امور کو جان و دل سے قبول کرنا چاہیے اگو نفس کو ناگوار ہو ؎

صبر کن در کار خضر اے بے نفاق | تا نہ گوید خضر رو ہذا فراق

مگر یہ سختی چند ہی روز ہوتی ہے۔ پھر اُن سے بڑھ کر کوئی شفیق نہیں ہوتا۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی ایک بزرگ

تھے۔ میں اُن کی خدمت میں دو دفعہ گیا۔ آخری مرتبہ اُن کی ایسی شفقت تھی کہ جب میں روانگی کی اجازت چاہتا تھا۔ فرماتے تھے کیا جلدی ہے۔ مگر اوّل مرتبہ لہجہ تند تھا اور خفگی نمایاں تھی۔

اکثر خفگی اور تندی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان حضرات کو خلاف سنت سے تنگی ہوتی ہے۔ چنانچہ مسجد میں جاتے وقت کوئی بایاں پیر پہلے رکھ دیتا تھا تو مولانا کو ناگوار ہوتا تھا اور غصہ آجاتا تھا۔ مجھ سے جس مرتبہ تند لہجہ میں بولے تھے اُس کی وجہ بھی یہ تھی کہ میں رات کو گیا تھا اور حدیث میں رات کو جانے کی ممانعت آئی ہے۔ لہٰذا خفگی ہوئی۔ مگر میں نے سمجھا کہ یہ خفگی میرے لئے اصلاح ہے۔ اس لئے ذرا ناگوار نہ ہوئی۔ بلکہ دوبارہ پھر حاضر ہوا۔ اُس وقت مولانا نہایت شفقت سے پیش آئے اور حصن حصین کا درس شروع کرا دیا اور حدیث وغیرہ کی اجازت دی اور بہت توجہ فرمائی۔

پس بزرگوں کی خفگی کو چند روز برداشت کر لو تو پھر تم کو وہ اپنی دولت سے رنگ دیں گے اور اگر خفگی کی وجہ سے کوئی اُن سے بھاگے تو ان حضرات کا اس میں کیا نقصان ہے اپنا ہی نقصان ہے۔ افسوس عشق کی طلب اور ذرا سی خفگی سے ناگواری ؎

تو بیک زخمے گریزانی ز عشق — تو بجز نامے چہ می دانی ز عشق

اور خود اُن کی یہ شان ہوتی ہے کہ اگر کوئی اُن کو بُرا بھی کہے تو اُن کو اس کی بھی پرواہ نہیں بقول حافظ ؎

گرچہ بد نامی ست نزد عاقلاں — مانمی خواہیم ننگ و نام را

نہ یہ تکلفات جانتے ہیں۔ تکلفات کے متعلق ان کا مذاق یہ ہوتا ہے کہ خرقہ کو بھی تکلف سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ؎

ایں خرقہ کہ من دارم در رہن شراب اولیٰ
ویں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

اس شراب سے مراد شراب محبت ہے یعنی اس خرقہ کو شراب محبت میں ڈبونا چاہیئے۔ ورنہ بدون اس کے وہ آگ میں جلانے کے قابل ہے کما قال ؎

نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بیغش باشد
اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

بہت لوگ خرقہ پہن کر عجب و تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ حقیقت میں صوفی نہیں۔ ان میں کھوٹ ہے۔ ان کو ابھی مجاہدہ کی ضرورت ہے تاکہ یہ خناس دماغ سے نکلے۔ اگر یہ خناس موجود ہے تو حقیقت میں وہ صوفی نہیں۔ جب یہ خناس نکل جاوے گا تب صوفی ہوگا۔ اس وقت یہ حال ہوگا کہ نہ جاہ کی طلب رہے گی نہ عزت کی بلکہ ہر حال پر راضی ہو کر کہے گا ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
جاں شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

جب یہ حالت ہو جاوے گی تب عشق پیدا ہو جاوے گا۔ اور جب عشق پیدا ہوگا اس سے نخوت خود بخود جاتی رہے گی پس تفاخر کا علاج یہی ہے کہ عشق پیدا کرو اور جب تک عشق پیدا نہ ہوگا اس وقت تک عادت میں لباس

میں وضع قطع میں ہر چیز میں یقیناً تفاخر پیدا ہوگا اور اس سے بچنا دشوار اور قریب بہ محال ہوگا۔ غرض ایک امر تقویٰ کے خلاف تو یہ ہے کہ عمارت فضول اور بے ضرورت بناتے ہیں۔

تواضع اور رحم کا فقدان

دوسری چیز اس فہرست کی یہ ہے کہ اپنی عمارت کی اصلاح کے لئے جس کی زمین پاس دیکھی دبالی تاکہ اپنی عمارت نہ بگڑے۔ صاحبو! افسوس ہے کہ پہلے زمانہ میں تو کفار سلاطین بھی ایسا نہ کرتے تھے۔ پھر حیرت ہے کہ ہم مسلمان اور ضعیف القدرۃ ہو کر یہ حرکتیں کریں

نوشیرواں بادشاہ تھا۔ جب اپنا محل بنانا چاہا تو ایک بڑھیا کا مکان محل کے قریب تھا جس کے ملانے کی ضرورت تھی ورنہ محل میں ریخ رہتا تھا مگر اس نے دینے سے انکار کردیا تو نوشیرواں نے اس پر زور نہ دیا اور نہ جبر کیا بلکہ اپنا مکان ٹیڑھا ہی بنالیا اور ایک گوشہ کے بگڑنے کا خیال نہ کیا۔

اصل یہ ہے کہ پہلے لوگوں میں طبعاً یا عقلاً خلوص اور تواضع اور حفاظت حدود تھی۔ اسی لئے ان کی تعمیرات پائدار اور مضبوط اور خوشنما بھی ہیں اور آج کل یہ حالت ہے کہ سب سے پہلے اس پر نظر پڑتی ہے کہ کسی کی زمین پاس ہے اس کو دیکھ کر آدمی باؤلا بن جاتا ہے کہ کسی طرح یہ بھی میرے مکان کے اندر آجائے۔ اور اگر کسی غریب اور کمزور کی ہے تو روز بروز اپنی عمارت کو تھوڑا تھوڑا ادھر کھسکانا شروع کردیتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ آج کل تواضع اور رحم بالکل نہیں اور اس کے فقدان سے آخرت کا تو ضرر ہے ہی۔ مشاہدہ ہے

کہ عمارت بھی ناپائدار ہوتی ہے۔

تواضع کے ذکر پر اس کے متعلق ایک ضروری بات یاد آگئی۔ وہ یہ کہ تواضع سے میرا مطلب یہ نہیں کہ تم چھوٹوں کو اپنے سر پر بٹھاؤ بلکہ یہ مطلب ہے کہ کسی کو حقیر نہ سمجھو، کسی کا حق ضائع نہ کرو، نہ کسی کا حق دباؤ اور بعض بزرگوں سے جو ایسے واقعات منقول ہیں کہ انہوں نے چھوٹوں کو سرہانے بٹھلا لیا تو یہ غلبۂ حال ہے۔ بعض اہل حال بزرگوں پر تواضع کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

چنانچہ مولانا محمد مظہر صاحب ایک مرتبہ پائنتی بیٹھے تھے۔ حجام خط بنانے کے واسطے آیا تو آپ نے فرمایا کہ سرہانے بیٹھ کر بنا دو۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت آپ سرہانے بیٹھ جاویں۔ فرمایا اگر تمہیں خط بنانا ہو تو یہیں بیٹھ کر بنا دو، ورنہ پھر کسی وقت جب مجھے سرہانے بیٹھا دیکھو اس وقت آکر بنا دینا۔ اب تو میں اٹھ کر سرہانے نہیں بیٹھتا۔ وہ حجام مجبور ہو گیا اور سرہانے بیٹھ کر ہی خط بنانا شروع کر دیا۔

مگر یہ غلبۂ حال ہے۔ اس وقت مولانا پر کوئی خاص کیفیت تھی سب بزرگوں کا ایسا ہونا ضروری نہیں بلکہ بعض دفعہ بزرگ جن پر اس حالت کا غلبہ نہیں ہوتا اپنے چھوٹوں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کرتے بلکہ چھوٹوں ہی کا سا معاملہ کرتے ہیں کیونکہ انہیں قرائن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر ہم اس درجہ تواضع کریں گے تو چھوٹوں کو تکلیف ہو گی یا گرانی ہو گی یا اس کے لئے مضر ہو گا اس مصلحت سے وہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ معاملہ چھوٹوں کا سا کرتے

ہیں اور تواضع نہیں کرتے۔ لیکن اگر کوئی بزرگ تواضعاً ایسا کریں بھی تب بھی چھوٹوں کو نہ چاہیئے کہ اُن کے سرہانے بیٹھیں اور حکم موکد اس سے مستثنیٰ ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ پر ایسی تواضع کا خاص طور پر مذاق غالب تھا۔ چنانچہ ایک بار مولانا تھانہ بھون تشریف لائے اور آپ کا وعظ ہوا تو مولانا پائینتی بیٹھے تھے اور ہماری قوم شیخ زادہ کو دیکھئے کہ وہ مولانا کے سرہانے بیٹھے تھے۔ مولانا تو قوم کے بھی شیخ زادہ تھے۔ اگر مولانا سرہانے نہ بیٹھے تھے تو اُن لوگوں کو یہ زیبا تھا کہ اُس پلنگ کو خالی چھوڑ دیتے اور اس پر کوئی نہ بیٹھتا۔ مگر اللہ بچائے ایسی شیخ زادگی سے بھی کہ کسی کی تعظیم و تکریم بھی نہ کریں۔ مگر مولانا کی یہ خاص شان تھی کہ اُن کو اپنے سرہانے کسی کے بیٹھنے سے ذرا ناگواری نہ ہوتی تھی بلکہ وہ تو قصداً پائینتی بیٹھتے تھے مگر بعض کا مذاق دوسرا ہوتا تھا۔

چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ چھوٹوں ہی کا سا معاملہ کرنا چاہیئے۔ اس سے اُن کا دل خوش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ مجھے عزیزم میاں اشرف علی لکھا کرتے تھے۔ اور حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ خط میں مخدوم مکرم وغیرہ الفاظ لکھتے۔ میں نے ایک مرتبہ عریضہ لکھا کہ حضرت سے یہ توقع نہیں کہ حضرت چھوٹوں کے القاب سے مجھے یاد فرماویں اس لئے اگر حضرت "عنایت فرما" وغیرہ تحریر فرمادیا کریں تو بھی گوارا کرلونگا

پھر اس کے جواب میں جو خط آیا اس میں بھی وہی مخدوم و مکرم وغیرہ القاب موجود تھے۔

حضرت مولانا سلمہٗ[1] پر بھی تواضع کا ذوق غالب ہے اور احکامِ شرع پر یہ مذاق غالب ہے کہ اگر کوئی چھوٹا شخص ان کی پائینتوں بیٹھتا ہے تو بیٹھے دیتے ہیں۔ اہتمام کرکے اُس کو اپنے سرہانے نہیں بٹھلاتے۔ لیکن اگر وہ چھوٹا پہلے سے سرہانے بیٹھا ہو تو خود اہتمام کرکے اُس کے سرہانے بھی جا کر نہیں بیٹھتے۔ مگر ہماری نخوت کی تو یہ حالت ہے کہ اگر کہیں مجلس میں جائیں اور کوئی غریب آدمی سرہانے کی طرف پہلے سے بیٹھا ہو تو اُس کو دھکا کر پائینتی کی طرف کرکے خود سرہانے بیٹھیں گے۔

عبادات اور نخوت

بھلا یہ تو عادات میں نخوت تھی بعض متکبر تو عبادات میں بھی نخوت کرتے ہیں۔ کانپی کی مسجد میں ایک داروغہ صاحب تشریف لائے اور ایک بچارا گندھی مسافر تاجر بھی اسی مسجد میں آیا۔ داروغہ صاحب نے نماز بہت جلدی جلدی پڑھی جب وہ سلام پھیر چکے تو اس گندھی نے کہا کہ آپ نماز کا اعادہ کر لیجئے۔ آپ کی نماز نہیں ہوئی۔ داروغہ جی کو گندھی کی اصلاح بہت ناگوار معلوم ہوئی اور اس کو دھمکایا کہ تو ہمیں اصلاح دیتا ہے۔ گندھی نے کہا، صاحب چاہیے آپ پٹوا بھی لیجئے مگر نماز کا اعادہ کر لیجئے آپ کی نماز نہیں ہوئی! اور لوگوں

---

[1] اس بیان کے وقت حضرت زندہ تھے۔

سے جو وہاں حاضر تھے اُن سے کہا کہ داروغہ جی اس میں آپ کا نقصان ہی کیا ہے آپ نماز کا اعادہ کر لیجئے۔ خیر اُنہوں نے مجبور ہو کر نماز کا اعادہ کیا۔ اب تو وہ گندھی صاحب مشہور ہو گئے۔ جدھر جاتے ہیں لوگ بلاتے ہیں کہ حضرت یہاں آ بیٹھے۔ ہر ایک اپنے پاس آنے کی درخواست کرتا ہے۔ خوب عطر تیل کی بکری ہوئی اور تعظیم تکریم بھی ہوئی۔ اور واقعی اُن کی یہ بات تھی بھی تعظیم کے لائق۔ دیکھئے ان داروغہ نے عبادات میں بھی نخوت سے کام لیا۔

ہماری اکثر یہ حالت ہے کہ ظاہر میں تو متواضع ہیں۔ بات بات پر خاکساری ظاہر کرتے ہیں لیکن اگر کوئی نصیحت کر دے تو یہ حال ہو جاتا ہے واذا قیل له اتق الله اخذ ته العزة بالاثم۔ پس ہماری تواضع محض تصنع ہے بقول مولانا ؎

کہ گہے آہے ور وغے میزنی ۔۔۔ از برائے مسکہ دوغے میزنی

مگر بناوٹ سے کام نہیں چل سکتا۔ نہ تصنع حق تعالیٰ پر مخفی رہ سکتا ہے ؎

کار با او راست باید داشتن ۔۔۔ رایت اخلاص و صدق افراشتن

غرض یہ نخوت بہت ہی بُری چیز ہے اور یہ عشق ہی سے زائل ہوتی ہے اور عشق کے پیدا کرنے کی تدبیر جیسا اوپر مذکور ہوا صحبت عشاق ہے اور جب تک صحبت عشاق میسر نہ ہو اُس وقت تک یہ تدبیر کی جاوے کہ ذلت کے افعال اختیار کئے جائیں اور متواضعین کے طریقہ کو بتکلف دستور العمل بنایا جاوے۔ مثلاً کوئی مسجد میں نماز کی غرض سے آوے اکیلے

یا تشدد اُس کے واسطے لوٹہ بھر کر رکھ دیا یا اُس کے جوتے اٹھا کر رکھ دیئے اس لیئے کہ سہ

النفس کالطفل ان تھملہ شب علی
حب الرضاع وان تفطمہ ینفطم

یعنی نفس کی مثال بچہ کی سی ہے اُس کو جیسے کاموں کی عادت ڈالو گے اُسی کا اثر قبول کرلے گا۔ پس ابتدا ہی میں نفس کو ذلت کے کاموں کا عادی کرو۔ پہلے ہی دن بڑے بننے کی فکر نہ کرو۔ پس جیسا ابھی مذکور ہوا ابتداء میں یہ کام کرو کہ مسجد میں جاکر فرش بچھا دیا اذان کہہ دی۔ کیونکہ آج کل لوگ اذان کہنے کو بھی بہت عیب خیال کرتے ہیں اور مؤذن کو بہت ذلیل سمجھتے ہیں اس سے نخوت کا علاج ہو جاوے گا جس کی وجہ سے عمارات میں کسی کا حق دبانے کا خیال ہو جاتا ہے۔ اگر تم سب کو اپنے سے بڑا سمجھو تو پھر ایسی سبلے راہی کی کبھی ہمت نہ ہو۔

تعمیر میں خلوص کا اثر

غرض مکان بنانے میں اس کی رعایت رکھو کہ کسی کی زمین نہ دباؤ۔ کسی کی زمین میں دروازہ مت کھولو۔ کسی کی ملک میں نالی نہ نکالو۔

مجھے ایک مکان کی ضرورت تھی۔ اس لئے میں نے ایک مکان خریدا اُس مکان کا جو صدر دروازہ تھا اُس کی بابت لوگوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ یہ دروازہ دوسرے کی زمین میں بنا ہوا ہے۔ گو صدر دروازہ کے لائق وہی جگہ تھی مگر میں نے اُسے بند کرادیا اور بند بھی اس طرح کرایا کہ اینٹ نکلوا

کہ بطور اتصال تربیع کے ردہ سے ملوا دیا تاکہ کبھی ملک کا شبہ تک نہ رہے۔ اگر کوئی زمیندار اس مکان کو خریدتا تو ایسے موقع کو غنیمت خیال کرتا مہتمم تعمیر نے اس سمت میں باجازت مالکان زمین موریاں رکھ دی تھیں۔ میں نے ان کو بھی بند کرا دیا کیونکہ اب تو یہ تبرع ہے۔ پھر یہی حق سمجھا جانے لگے گا۔ تو مکان میں ان امور کا لحاظ رکھا جاوے۔

تیسری چیز اس فہرست کی یہ ہے کہ تعمیر میں حرام مال نہ لگایا جائے ورنہ بروئے حدیث ویرانی کی جڑ یہی ہے۔ تھانہ بھون میں پیر محمد صاحب کی مسجد عالمگیر کے وقت کی ہے جس کی دیواریں اور گنبد گارے کے ہیں۔ مگر پائیداری کی اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ مال حلال تھا اور نیت میں خلوص تھا۔ اور جو شخص تعمیر میں ان امور کی رعایت نہ کر سکے تو مثل مشہور شعر گفتن چہ ضرور، وہ تعمیر ہی نہ کرے۔ اور ان امور کی رعایت تو قدر ضرورت کی تعمیر میں ہے۔ باقی ضرورت سے زیادہ تعمیر تو اصل ہی سے ناپسند ہے اس کی نسبت ختم آیت پر فرماتے ہیں۔

واللہ لا یھدی الظلمین   کہ حق تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو ہدایت نہیں کرتے۔

یہ اپنے عموم سے اس کو بھی شامل ہے۔ آگے ان منافقوں کی عمارت کا حال بیان فرماتے ہیں کہ اس کے گرنے کے بعد ان کے قلب کی کیا حالت ہونے والی ہے۔ فرماتے ہیں۔

لا یزال بنیانھم الذی بنوا ریبۃ فی قلوبھم الا ان تقطع

قلوبہم واللّٰہ علیم حکیم۔

ان کی یہ عمارت یعنی وہ مسجد جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان
دلوں میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہے گی۔ کیونکہ جس غرض سے بنائی تھی وہ
نہ ہوئی اور نیت کی قلعی کھل گئی وہ الگ۔ اور پھر اوپر سے منہدم کر دی
غرض کوئی ارمان نہ نکلا۔ اس لئے ساری عمر اس کا افسوس اور ارمان
ہاں اس کے وہ دل جن میں یہ ارمان ہے اگر وہی فنا ہو جاویں تو وہ ار
اس وقت ختم ہو جاوے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں۔ ان
شرارتوں کو جانتے ہیں۔ حکمت والے ہیں۔ مناسب سزا دیں گے۔
جس چیز کو مقصود سمجھتا ہے اس کے عدم حصول سے جو حالت ہوتی
حالت ان کی تھی جنہوں نے یہ انجمن تخریب اسلام کے لئے بنائی تھی
علت بھی مشترک ہے تمام عمارات میں کہ جن لوگوں نے اپنی عمارات
ناپاک اغراض کے لئے ایسے مواقع پر بنائی ہیں وہ سب برباد بھی ہوں گی
ان لوگوں کی یہ حالت ہوئی کہ بے چینی ان کے لازم حال ہو گئی۔ چنانچہ
اور مشاہدہ ہے کہ بری نیت سے جو عمارت بنائی گئی ہے اس کو قیام
اب میں الا ان تقطع قلوبہم کے متعلق ایک نکتہ بیان
ختم کرتا ہوں۔

قلب اور موت

اس کا ایک مطلب تو ظاہر ہی ہے کہ یہ ارمان ان
لوگوں کے دل سے کبھی نہ نکلے گا بجز اس کے کہ ان
کے دل ہی قطع ہو جاویں اور یہ مر جاویں۔ تب تو یہ حسرت نکل سکتی ہے کیونکہ

جب دل ہی نہ رہے گا جو محل ہے حسرت کا تو پھر ارمان اور حسرت کس طور سے باقی رہے گا۔ پس ایک تو یہ توجیہ ہے الا ان تقطع قلوبھم کی کہ بعد فنا و موت کے اس خاص حسرت سے راحت ہو جاوے گی۔

ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے اور یہ نہایت لطیف ہے کہ الا ان تقطع قلوبھم تاکید ہے دوام حسرت اور ارمان کی کہ اُن کو حسرت اور ارمان ہمیشہ رہے گا اور یہ کھٹک ہمیشہ رہے گی۔ موت سے بھی یہ کھٹک دور نہ ہو گی کیونکہ قلب کو موت نہیں آسکتی۔ اس لئے کہ قلب کی دو قسمیں ہیں

ایک تو قلب جو مضغہ صنوبری ہے۔

دوسرا قلب حقیقی جو محل ادراکات ہے۔ عقائد وغیرہ کا حصول بھی اسی قلب سے ہوتا ہے۔

یہ قلب جس چیز کو ادراک کرتا ہے اُس کی بقا ضروری ہے اسی وجہ سے کہ یہ قلب ہمیشہ باقی رہتا ہے اس لئے کفر بھی باقی رہتا ہے۔ اخلاق جو ناپاک ہیں وہ بھی ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ عشق کا ذوق بھی باقی رہتا ہے۔ اگر کوئی کسی پر عاشق ہو جاوے تو یہ عشق مرنے سے چھوٹتا نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی اس مصیبت میں گرفتار رہتا ہے۔ بعض عشاق مرنے کے بعد اس غم سے رستگار ہو جانے کا دعوے کرتے پھرتے ہیں، بالکل غلط ہے۔ اس غم سے واقع میں جدائی مشکل ہے کیونکہ قلب حقیقی پر موت نہیں آتی اور نہ اس کی کیفیات زائل ہوتی ہیں۔ غرض کہ اگر قلب کی تفسیر قلب حقیقی کی جاوے چونکہ قلب حقیقی کو موت نہیں۔ اس لئے اس کے ارمان اور حسرت کو

بھی دوام رہے گا۔ اس تقدیر پر الا ان تقطع قلوبھم میں استثناء ا[illegible]
جیسا کہ اس شعر میں ہے ؎

ولا عیب فیھم غیر ان سیوفھم
بھن فلول من قراع الکتائب

ای ان کان فیھم فھو ذالک!
وھذا لیس بعیب فلا عیب فیھم اصلاً

اسی طرح یہاں پر مطلب ہے کہ ان کے ارمان جب نکلیں ج[illegible]
قلب ہلاک ہوجاوے اور عدم ہلاک قلب ثابت ہے لہٰذا دوام حسر[illegible]
وارمان بھی دواماً ثابت ہے۔

حاصل یہ ہے کہ یہ نتیجہ ہے ان کی عمارت کے غیر تقویٰ و رضوان [illegible]
لئے ہونے کا۔ تو جو عمارات غیر تقویٰ رضوان حق پر مبنی ہوں گی اُن کے [illegible]
کے لئے بے چینی لازم حال رہے گی۔ مگر تقویٰ اور رضوان اور جس عم[illegible]
کی بنا تقویٰ اور رضوان پر ہو وہ البتہ خیر ہی خیر بہتر ہے۔ واللّٰہ علیم [illegible]
اللہ تعالیٰ جاننے والے ہیں کہ کس شخص کی کیا نیت ہے اور وہ حکی[illegible]
ہیں کہ قوانین حکمت سے مقرر کرتے ہیں اور عامل و تارک کو مناسب [illegible]
سزا دیتے ہیں۔

الحمد للہ! بیان ختم ہوگیا۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق ع[illegible]
آمین! والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی الہ واصحاب[illegible]
اجمعین۔

مواعظی انسائیکلوپیڈیا

اگر ہم اپنے حالات کا جائزہ لیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں :-

① ہم اللہ جل شانہٗ کا دیا ہوا رزق کھاتے ہیں لیکن اس کی اطاعت نہیں کرتے۔
② ہم اُس کے ملک میں رہتے ہیں لیکن اُس کے قانون کا احترام نہیں کرتے۔
③ ہم دوستوں کے وعدوں پر یقین رکھتے ہیں لیکن اُس کے وعدوں پر اعتبار نہیں کرتے۔
④ ہم اُس کے رسول مقبول ؐ کو برحق سمجھتے ہیں لیکن اُن کے اسوہ حسنہ کا اتباع نہیں کرتے۔
⑤ ہم اُس کے قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں لیکن اُس کے مطابق عمل نہیں کرتے۔
⑥ ہم موت کو یقینی سمجھتے ہیں لیکن دوسروں کو دفن ہوتے دیکھ کر عبرت حاصل نہیں کرتے۔
⑦ ہم حسابِ روزِ محشر کا عقیدہ رکھتے ہیں لیکن دوسروں کی حق تلفی سے دریغ نہیں کرتے
⑧ ہم جنّت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن اس کے حصول کی قطعاً فکر نہیں کرتے۔
⑨ ہم دوزخ کا یقین رکھتے ہیں لیکن اس کی آگ سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے۔
⑩ ہم شیطان اور نفس کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں لیکن ان کی خواہش پر چلنا ترک نہیں کرتے
⑪ ہم دوسروں سے خدمت خلق چاہتے ہیں لیکن خود کسی کی خدمت نہیں کرتے۔
⑫ ہم دوسروں سے ہمدردی چاہتے ہیں لیکن خود رشوت، سفارش یا واقفیت کے بغیر کسی کا کام نہیں کرتے۔

ہم برائے نام مسلمان ہیں اور ایک جھوٹی اور منافقانہ زندگی بسر کر رہے ہیں ابھی

لئے قرآن نے کہا ہے :-

لَا تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (الحجرات)

"تم یوں نہ کہو کہ ہم ایمان لائے بلکہ کہو کہ اسلام لائے اس لئے کہ ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا"

ورنہ ہمارا عمل کتاب و سنت کے مطابق ہوتا۔ ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ :-

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ــــــ!

لوگوں کو اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت و موعظت سے بلاؤ اور اس طرح اس دین حق کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچاؤ :-

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۔ (الفتح)

وہی ہے جس نے اپنا رسولؐ بھیجا ہدایت اور سچے دین کے ساتھ تاکہ اُسے غالب کرے ہر دین پر۔

دوسروں کو دین کی طرف بلانا بجائے خود رہا ہم خود ہی دین حق پر مستقیم نہیں رہے اور نہ جنہیں ہم کافر کہتے ہیں وہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں اپنے اپنے دین، مذہب اور عقیدہ کو پھیلانے میں اجتماعی طور پر شب و روز مصروف ہیں کمیونسٹ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ہر ممکن ذریعہ سے لامذہبیت پھیلا رہے ہیں ہندوستان میں پورے جبر و تشدد کے ساتھ مسلمانوں کو ہندو بنایا جا رہا ہے ۔ مرزائی بڑی جد و جہد کے ساتھ یورپ، امریکہ اور افریقہ میں اپنے مراکز قائم کر کے اپنا دین پھیلا رہے ہیں ۔ قرآن کریم کے مختلف بالوں

ں تراجم چھاپ رہے ہیں اور عیسائی یورپ، کینیڈا اور امریکہ ایسے دور دراز ممالک سے
نیائی ممالک میں خدمت خلق اور تبلیغ دین مسیح کا فریضہ ادا کر رہے ہیں مگر ایک ہم ہیں کہ
یضہ تبلیغ کو بھلائے ہوئے ہیں اور عافیت کی نیند سو رہے ہیں۔

ان لئے موجودہ دینی بے حسی اور بے رغبتی کو دُور کرنے کے لئے ضروری ہے
م خود دین کا ضروری علم حاصل کریں اور اپنی اولاد کو دینی تعلیم دلائیں اور اپنے قرب و
میں تبلیغی مہم چلائیں اور اس غرض کے لئے ان بزرگانِ دین کی کتابوں سے مدد لیں۔
ی ساری عمر وعظ و تبلیغ میں گزر گئی اور جن کی خدمتِ دین حق تعالیٰ کو اتنی پسند آئی
نہوں نے اُن کے تمام سرمایہ رشد و ہدایت کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ
نے کے اسباب پیدا کر دیئے۔ جس کی بدولت آج ہمارے پاس بیش بہا علمی، دینی
رفانی ذخیرہ موجود ہے۔

ان علماء میں سرفہرست حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا نام نامی ہے
کے مواعظ و خطبات کا ایک ایک لفظ خود ان کا نظر ثانی کردہ محفوظ ہے۔ ان میں تمام
ی، اجتماعی، قومی اور روحانی بیماریوں کا بے خطا علاج موجود ہے۔ ان میں آج بھی وہی
زگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے جو وعظ و ارشاد کے وقت تھی۔ یہ ایک ایسا مواعظی
یکلو پیڈیا ہے جس سے دین کے متعلق پوری پوری واقفیت و بصیرت حاصل
تی ہے اور طبیعت خود بخود مائل بہ اصلاح ہونے لگتی ہے۔

ہم نے ان مواعظ اشرفیہ کو آٹھ آٹھ سو صفحات کی ۳۰ جلدوں میں شائع کرنے
م کیا ہے۔ ہر جلد بذاتِ خود اپنے موضوع پر ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتی
س وقت بفضلہٖ تعالیٰ مندرجہ ذیل جلدیں شائع ہو چکی ہیں :-

۱۔ دنیا و آخرت ۲۔ علم و عمل ۳۔ دین و دنیا ۴۔ میلاد النبیؐ ۵۔ حقوق و فرائض ۶۔ نظام شریعت۔ ان میں سے جلد ۲۔۳ اس وقت نایاب ہے۔ اس سال ۶۲ء میں ہم مندرجہ ذیل جلدیں شائع کر رہے ہیں۔ ۷۔ حقیقت عبادت ۸۔ حقیقت مال و جاہ ۹۔ فضائل صبر و شکر ۱۰۔ فضائل صوم و صلوٰۃ۔ ہم اس سیٹ کے مستقل خریداروں کو موجودہ قیمتوں میں بھی ایک تہائی رعایت دیتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کو یہ دینی لٹریچر قریباً اصل لاگت پر مل جاتا ہے۔ اس طرح ہماری نشر و اشاعت کا نفع براہ راست خریدار کو پہنچتا ہے اور بصورت ثواب ان حضرات کو پہنچتا ہے جو اس تبلیغی سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے مالی امداد دیتے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں آپ سے یہ اعانت چاہتے ہیں:۔

۱۔ آپ اس سلسلہ کے مستقل خریدار بن کر اس سے دینی اور دنیوی فائدہ اٹھائیں۔

۲۔ اگر ممکن ہو تو ایک کی بجائے دو جلدیں خریدیں۔ ایک اپنی ذات اور گھر والوں کے مطالعہ کے لئے رکھیں اور دوسری اپنے دوستوں، ہمسایوں وغیرہ کو پڑھائیں۔

۳۔ اگر کچھ وقت نکال سکیں تو کسی مناسب جگہ پر اپنے قرب و جوار کے لوگوں کو جمع کر کے روزانہ یا ہفتہ وار اس کے کچھ صفحات پڑھ کر سنانے کا اہتمام کریں۔

۴۔ اپنے عزیزوں بزرگوں کے ایصال ثواب کیلئے زیادہ مقدار میں خرید کر عوام میں تقسیم فرمائیں۔

۵۔ اپنی زکوٰۃ یا مالی امداد سے اس تبلیغی منصوبہ کو جو ایک صدقہ جاریہ کی حیثیت رکھتا ہے مستحکم بنائیں۔ اور اس طرح گھر بیٹھے بٹھائے تبلیغی فریضہ ادا فرمائیں۔

ہر جلد کا حجم قریباً ۸۰۰ صفحات۔ سیاہ پارچہ کی سنہری ڈائیدار مضبوط جلد۔ قیمت ۱۴/۷ روپے محصولڈاک فی جلد ۸۰ پیسے۔

آپ کا خادم:۔ منشی عبدالرحمٰن خاں

ناظم مکتبہ اشرف المعارف۔ پھاٹک۔ ملتان شہر۔

سلسلہ مواعظِ اشرفیہ نمبر ۹

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

حقیقتِ مال و جاہ

از افاضات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مرتبہ

منشی عبد الرحمٰن خاں

شائع کردہ

مکتبہ اشرف المعارف چہلیک

ملتان شہر ـــــــ فون نمبر ۳۶۷۵